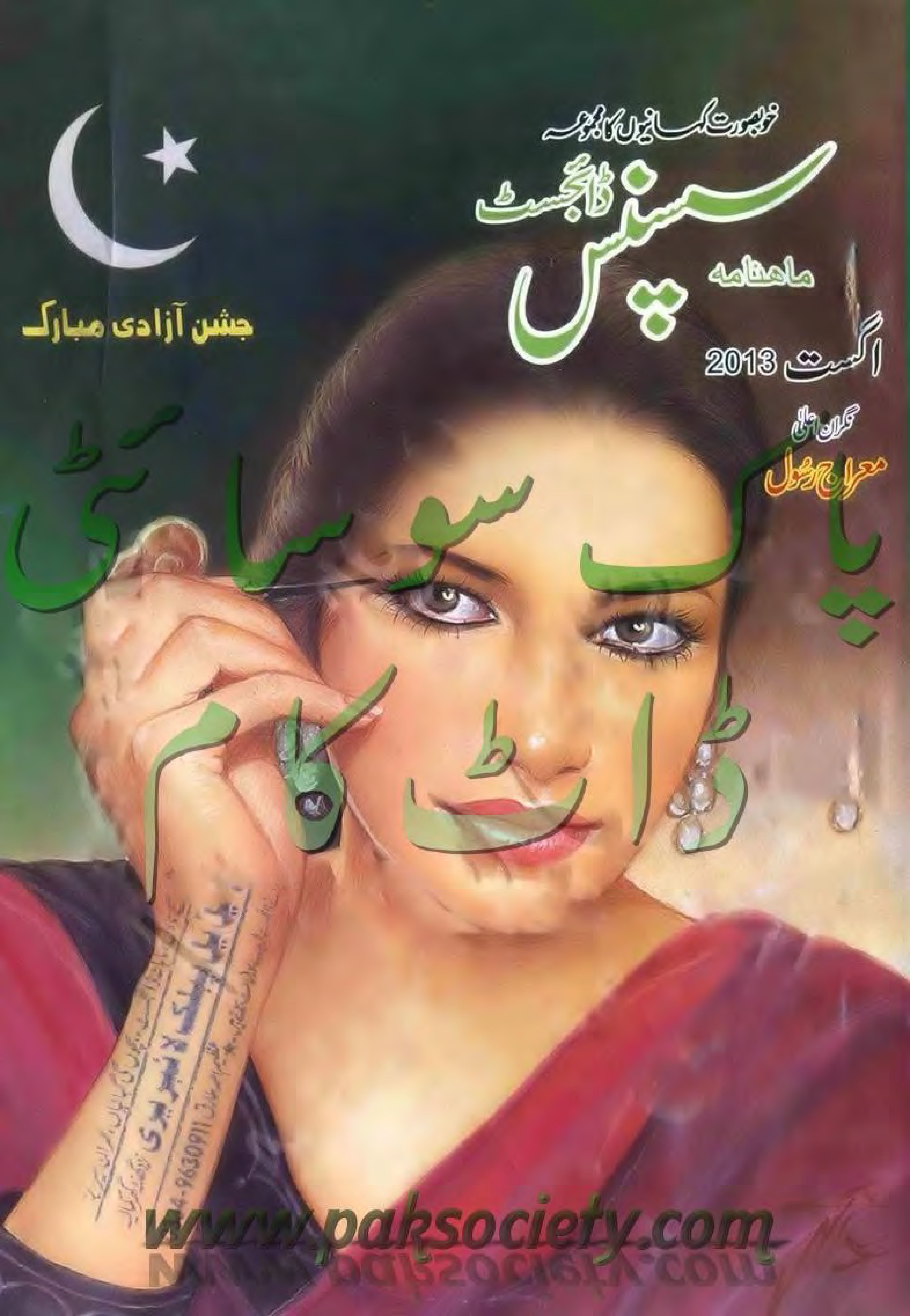

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
اگست 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
جشن آزادی مبارک
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

آئیڈیل پبلک لائبریری
0334-30911

سسپنس ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

11
انشائیہ
جون ایلیا
آزادی کے معنی و مفہوم تلاش کرنے والے ایک حساس دل فلسفی کا غم

12
آپ کے خط
مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

20
چاند سلطان
ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

51
اتفاقات
مریم کے خان
قدم قدم پر نئے تجربات...... ایک سراغ رساں کی مشکلات کا احوال

70
کشکول
انوار صدیقی
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

99
چکنی مچھلی
ش م جمیل
پولیس میں جرائم کی تفتیش اور مجرم کی بھاگ دوڑ کا عجب انداز

112
رائی کا پہاڑ
ملک صفدر حیات
بے جرم و خطا زندگی کی قیمتی متاع کھو دینے والے مظلوم کی کتھا

141
پوسٹ کارڈ کی چوری
نجمہ مودی
مغربی دنیا سے ایک دلچسپ انتخاب..... ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ

152
محفل شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

155
چادر
عائشہ فاطمہ
آلام و مصائب میں گرفتار ایک لاوارث انسان کی کہانی

172
مسافر
ناصر ملک
گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

213
خالد میاں کے ہاں
منظر امام
اچھوتا انداز...... معاشرتی مسائل کا انوکھا سلسلہ

219
خلیفہ ابوالقاسم
ضیا تسنیم بلگرامی
آخرت کے متمنی...... دنیا سے بے پروا ایک ولی کا قصہ

233
تعاقب
سلیم انور
مغربی قوانین کی پاسداری کے عذاب میں مبتلا ایک شخص کی بے چینی

238
بازگشت
کاشف زبیر
یوم آزادی کے موقع پر سطر سطر دل میں کسک بن کر اتر جانے والی داستان

000
کترنیں
ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

جلد 43 • شمارہ 08 اگست 2013 • زر سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

انشائیہ

جون ایلیا

آزادی

وقت نے بہت سے دشمنوں کو دوست بنایا ہے اور بہت سے دوستوں کو دشمن۔ سیاسی اور اجتماعی حکمتِ عملی کے تقاضے حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ سیاسی اور اجتماعی حکمتِ عملی تو کیا، خود کائنات ہر لحہ بدلتی رہتی ہے۔ یونان کے عظیم ترین فلسفی ہرقلیطاس نے کہا ہے کہ آپ ایک دریا میں دوبار پاؤں نہیں ڈال سکتے۔ ہرقلیطاس نے جو بات کہی ہے وہ اپنی جگہ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ آپ دریا میں ایک بار بھی پاؤں نہیں ڈال سکتے۔ اس لیے کہ آپ جس لمحے دریا میں پاؤں ڈال رہے ہوں گے، اس لمحے کے لاکھویں حصے میں دریا یکسر بدل چکا ہوگا۔

آج کا دشمن آنے والی کل کا بہترین دوست اور آج کا دوست آنے والی کل کا بدترین دشمن ثابت ہو سکتا ہے۔ جو لوگ حقیقت کو چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی ایک ٹھہرا ہوا پانی سمجھتے ہیں، ان کی رگوں میں جوہڑ سڑتے ہیں اور ان کے سانس زندگی کی زندگی پرور فضا میں زہر پھیلاتے ہیں۔

ہمارے عہد کی دشمن ترین قومیں آج ایک دوسرے سے افہام و تفہیم کی دانشمندانہ حالت میں گفتگو کر رہی ہیں۔ تاریخ سیاست کے وقتی رویوں سے کہیں بڑی حقیقت ہے۔ تاریخ عظیم اور جلیل وقت کی نمائندگی کرتی ہے اور تاریخ کے حساب سے پچاس ساٹھ برس لمحوں کے ٹھٹول سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ قوموں کو تاریخ کا اور تاریخ کی خلاق حرکیت کا پوری طرح احترام کرنا چاہیے اور اس کی عظمت کو سلام کرنا چاہیے...... مودبانہ سلام۔ جو قومیں تاریخ کے شعور کا ثبوت دینے میں ہچکچاہٹ سے کام لیں گی، وہ اپنے قتل نامے کے "محضر" پر مہر ثبت کریں گی۔ زندگی کی تمام حقیقتوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ، پرجلال تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کی جو بھیانک سزا بھگتنی پڑتی ہے، اسے ہم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان گزشتہ اکسٹھ، باسٹھ برس سے باہمی دشمنی کو اپنا اخلاقی اور سیاسی فرض سمجھتے رہے ہیں۔ تاریخ سے مخول کرنا ان کی عادت بن چکا ہے۔ ہمیں اپنے نقطۂ نظر کے صحیح ہونے پر ہرگز کوئی اصرار نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کی باہمی دشمنی ہی ان دونوں کے پیچیدہ ترین مسئلوں کا حل ہو لیکن میں اور معراج رسول ایک سوال کرنا چاہتے ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا آپ دونوں کی باہمی دشمنی نے آپ کے پیچیدہ ترین مسئلوں کو حل کیا ہے یا انہیں اور پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ اگر آپ ہمارے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے اس سوال کا خود ہی جواب دینا ہوگا اور وہ جواب یہ ہے کہ آپ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں بلکہ دردناک حد تک خود اپنے دشمن ہیں، آپ دونوں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے جس سمت میں چلتے اور آگے بڑھتے رہے ہیں اس سمت کی ہوا میں آپ کے سانسوں کے لیے زہر ہی زہر ہے۔

سمت کے لفظ پر خیال آیا کہ نفرت اور خونریز عداوت اور تباہ کن خیالوں اور رویوں کا سارا کھیل شمال کے آسمان کے نیچے اور شمال کی زمین کے اوپر کھیلا جاتا رہا ہے۔ دوسری سمتوں کا عیب و ہنر تو بس یہ تھا کہ وہ تھیں اور یہ ہے کہ وہ ہیں۔ ان سمتوں کو یہ بات سن کر ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی "اہمیت" کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، یہ تو ایک اور ہی بات ہے جو نہایت آرٹ کے ساتھ کہی جا رہی ہے۔

آسمانِ شام کے پرندے شمال کی طرف پرواز کر رہے ہیں اور معراج رسول اور میں اسلام آباد، دلی، لاہور اور لکھنؤ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر ان پرندوں کے پروبال پر کیا گزرتی ہے؟ ہمیں بتایا جانا چاہیے کہ آخر کیا گزرتی ہے ان پرندوں کے پروبال پر اور ان کے ساتھ دوسری سمتوں کی طرف پرواز کرنے والے پرندوں کے پروبال پر؟

ہم بہت سوچتے ہیں مگر کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے بزرگوں نے انگریزی سامراج کی پتھریلی چوٹی سے آخر کیوں ٹکر لی تھی۔ انہوں نے اس سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کیوں اپنا لہو بہایا تھا، کیوں اذیتیں اٹھائی تھیں اور کیوں عذاب بھگتے تھے، کیا یہ وہی آزادی تھی جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ کے خط

عزیز قارئین

السلام علیکم!

برکھارُت کا خاص تحفہ اگست 2013ء کا دلکش شمارہ آپ کے زیرِنظر ہے۔ بعض اوقات تاریخ صرف اعداد و شمار میں ہی خود کو نہیں دہراتی اکثر حالات و واقعات میں بھی دہراتی ہے جیسے کہ اس ماہ وہی تاریخی لمحات ایک بار پھر رمضان المبارک اور عیدالفطر کی خوبصورت اور بابرکت ساعتوں کے درمیان منائے جا رہے ہیں جب 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اگر حالات کی مماثلت کا بھی جائزہ لیا جائے تو احساس ہوگا کہ اس وقت ایک خاص مقصد اور نظریے کے تحت غیروں کے ہاتھوں خون خرابا تھا اور آج بلا مقصد اپنوں کے ہی ہاتھوں گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی جاتی ہے۔ حالات کے تناظر میں اگر میزان کو پرکھا جائے تو حساب بہت خطرناک نتائج کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ دوسری جانب ہر سال کی طرح اس بار بھی بجٹ سے قبل اور بعد میں اشیائے خورونوش کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافے پر حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی اس مہنگائی کے ذمہ دار وہ ذخیرہ اندوز اور منافع خور ہیں جو رمضان جیسے بابرکت مہینے کے تقدس کا بھی خیال نہیں کرتے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ہم سب کو روزے اور عید کی سچی خوشیاں نصیب فرمائے اور پاکستان کو مضبوط و مستحکم بنائے (آمین) ہماری عوام الناس سے یہی درخواست ہے کہ اپنے اردگرد ضرورت مند لوگوں کو بھی ان خوشیوں میں شرکت کا موقع ضرور دیجیے۔ گزشتہ سالوں میں ہم نے شاید سہولتوں کے نام پر اذیتوں کو جنم دیا اور ترقی کے نام پر تنزلی کی سمت محوِ سفر ہوئے۔ نئی حکومت نے ذمہ داریاں سنبھال تو لیں مگر مسائل کا انبار جوں کا توں ہے۔ وہی لوڈشیڈنگ وہی سی این جی کی قلت۔ لوڈشیڈنگ کے دورانیے میں اضافے کے ساتھ ساتھ فی یونٹ نرخ میں اضافہ...... اچھا امتزاج ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیمی نظام اب تک جو رہا سو رہا لیکن نئے بجٹ میں تعلیم پر 17 فیصد ٹیکس عائد کر دینا ہرگز عوام کی فلاح میں نہیں ہے۔ دوسری جانب اساتذہ کا 11 ماہ سے تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ اور اہلِ خانہ کی کفالت سے معذور افراد میں مایوسی کی یہ انتہا کہ اساتذہ خودسوزی پر مجبور ہو گئے۔ اربابِ اقتدار اور ذمہ داروں کو اب اپنی بے حسی کی چادر اتار دینی چاہیے اور سنجیدگی سے ان معاملات کا نوٹس لے کر مسائل کا سدباب کرنا چاہیے۔ اتنے حبس زدہ موسم میں کچھ باتیں خوشی کی بھی ہیں جیسے کہ حال ہی میں ہوا سے توانائی پیدا کرنے کا پروجیکٹ سندھ کے علاقے میں لگایا گیا ہے جس سے ہوا کے رخ پر تو اثر پڑ سکتا ہے مگر زمین اور علاقے میں موجود آبی ذخائر پر کسی قسم کا برا اثر نہیں پڑ سکتا اور یہ خوش آئند بات ہے۔ کیونکہ توانائی کے حصول کے لیے اکثر ذرائع ماحول دوست نہیں ہیں۔ باصلاحیت قوم کے حوالے سے ایک خوشخبری یہ بھی ہے کہ ایشین جونیئر اسکواش چیمپئن شپ پاکستانی ٹیم نے جیت لی۔ جس میں سید علی شاہ بخاری نے طلائی تمغہ حاصل کیا اور اب ورلڈ جونیئر اسکواش چیمپئن شپ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اللہ سے کامیابی کی دعا ہے اور اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں ہم اپنے اس میدان کی جانب جہاں ایک سے بڑھ کر ایک کھلاڑی موجود ہے۔

✠ **آفتاب احمد نصیر اشرفی**، کریم پارک راوی روڈ لاہور سے تشریف لائے ہیں ”نئی حکومت کے نئے بجٹ کے بعد پیدا ہونے والی زبوں حالی کے تاثرات سرورق کی خاتون کے چہرے پر عیاں تھے۔ متوسط طبقے کی بہت سی خواتین کی طرح وہ بھی پریشان ہے کہ اب کیا ہوگا؟ ہوگا اب بھی کچھ نہیں، چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے ترسنے والے لوگوں کی خودکشیوں میں کچھ اضافہ ہو جائے گا بس۔ جون ایلیا صاحب کی خواہش بھی پوری نہیں ہوگی۔ کوئی نئی صف بندی نہیں ہوگی نہ حوصلوں کی اور نہ ولولوں کی۔ کچھ بھرم ہمارے موجودہ حکمران ہی رکھ لیں اور اس پاک سرزمین کا کچھ فرض ادا کر دیں۔ اپنی محفل میں جانے اور ساتھیوں سے ملاقات کرنے سے پہلے تذکرہ ہو جائے کشکول اور مسافر کا، اس مرتبہ کی اقساط میں دونوں ہی میں ہوس اور درندگی نے عورتوں کو عریاں کر دیا۔ سکندر علی شاہ کے مالِ غنیمت پر کسی اور نے ہاتھ صاف کر دیا اور دوسری طرف چندو کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ روح کو لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔ انوار صدیقی اور ناصر ملک خوش قسمت ہیں کہ ان معاشرتی برائیوں کو عیاں کرنے کی صلاحیت سے مالامال ہیں۔ اب ہم داخل ہوتے ہیں اپنی محفل میں۔ خدا کی پناہ! کیا حال ہو گیا ہے محفل کا سینئرز کی غیر حاضری سے۔ سب اپنا قبلہ درست کر لیں اور سب سے پہلے بابر عباس صاحب آپ کی خبر لی جا رہی ہے۔ اور زیادہ کچھ اس لیے نہیں کہا جا رہا کہ آپ کے ساتھ بھابی شامل ہیں۔ ویسے بیٹی کی مبارکباد قبول فرمائیں اور ماہین بابر کو ہماری طرف سے بہت پیار کیجیے گا۔ اعجاز احمد راحیل کو وزارتِ اعلیٰ مبارک۔ آپ کا تبصرہ پسند آیا لیکن خواتین کے بارے میں آپ کی گستاخیاں اچھی نہیں لگیں۔ آپ کو اتنی سی بات نہیں پتا کہ یہ صنف صرف احترام اور محبت کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ مہر اختر عباس آپ کو چھوٹ اس لیے دی جا رہی ہے کہ آپ تصویر العین صاحبہ کو پسند کرنے لگے ہیں اور ہمیں ہر وہ شخص پسند ہے جو خواتین کو پسند کرتا ہے۔ قیصر اقبال کچہ آپ کا تبصرہ بھی دلکش تھا۔ اس ماہ کی حد تک ہم زادہ خان سے متفق ہیں کہ آپ کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے اور زویا اعجاز سے بھی کہ پھول پھول ہوتا ہے بھلے وہ گلاب کا ہو یا گوبھی کا۔ جیسے ڈگری ڈگری ہوتی ہے بھلے وہ اصلی ہو یا جعلی ہو۔ میانوالی، ساہیوال اور سرگودھا کی جیلوں سے محمد تقی، قیصر گل اینڈ منشی، رانا حماد فریاد اور زیڈ اے بخاری ہم آپ کے دکھ اور تکلیف کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ آپ کے لیے دعاگو بھی رہتے ہیں۔ تقی عباس صاحب آپ کی یہ بات دل کو لگی کہ والدین کی نافرمانی ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ زویا اعجاز، تصویر العین، زارا خان اور فیض خان بھلا آپ چار خواتین مسز بابر عباس کو بھی ساتھ ملا لیں تو آپ ساڑھے چار خواتین ساڑھے اٹھارہ حضرات سے کس طرح مقابلہ کریں گی؟ آپ کو اپنی اقلیت میں بدلتی ہوئی صورتحال کا نہ اندازہ ہے نہ ادراک، ویسے آپ فکر نہ کریں ہم آ گئے ہیں خود ساختہ جلاوطنی بلکہ جلا محفلی ختم کر کے ایک ایک کو دیکھ لیں گے۔ اب آخر میں تفسیر عباس صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ تو ہمارے پرانے ساتھی ہیں۔ کیا آپ ہمیں خوش آمدید نہیں کہیں گے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی زخمِ گل، واقعی ہماری تاریخ زخمی ہی تھی کیونکہ سلطان غیاث الدین کا حضرت نظام الدین اولیا جیسی بلند پایہ ہستی سے عناد ہماری تاریخ کا زخم ہی تو ہے۔ حسن گنگو کا کردار ہماری تاریخ کا امر کردار ہے جس نے اپنے اس ہر عہد کی پاسداری کی جو اس نے اپنی کسمپرسی کے دور میں کیا۔ زہر باد پر جب ہم نے ناہید سلطانہ اختر کا نام دیکھا تو سمجھ گئے کہ ہم اس شمارے کی سب سے خوبصورت تحریر پڑھنے جا رہے ہیں۔ ماں باپ کے لیے نہیں بلکہ صرف باپ کے لیے یہ تحریر ایک آئینہ تھی جس میں کئی لوگوں کو اپنے چہرے نظر آئے ہوں گے۔ خوفِ محبت کاشف زبیر کی حسبِ روایت اچھی کھوج تھی۔ کرسٹن نے بے شمار قتل کیے جن میں اس کے بھائی اور ماں کا قتل بھی شامل تھا نفسیاتی الجھنوں کا شکار کرسٹن آخرکار ایک

عورت کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ تہ دام، انصاف، واپسی اور چلتر مناسب تھیں۔ عشق بھلائے نہ بھولے، محمد الیاس صاحب کا شہ پارہ تھا۔ عشق کا جذبہ اگر سوز کی آگ میں نہ جلے تو کندن نہیں بنتا۔ کاکے اور پینو کا جذبۂ محبت نے ہی ایک کو اس کا محبوب بخشا اور دوسرے کو محبوب کے ساتھ زندگی بھی۔ ضیاء تسنیم صاحب کی شمع فروزاں ان کی سابقہ تحریروں کی طرح چومنے کے لائق تھی۔ مرزا امجد بیگ کافی منہ زور ہو گئے ہیں۔ کسی کیس کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ اور آخر میں آخری مرحلہ ایچ اقبال، آخر تک شناخت کا سبب بنتی رہے گی۔ جذباتی بھونچال اور سرکش موجوں کے درمیان کھو جانے والی یہ شاہکار کہانی اپنے اندر ہر وہ رنگ سمیٹے ہوئے تھی جو ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ بختیار نے آخرکار طویل آزمائشوں کے بعد فروزاں کے دل میں گھر کر ہی لیا۔ شبانہ آفتاب اور کنور فقلین اپنی تمام تر شرانگیزیوں کے ساتھ انجام کی قبر میں دفن ہو گئے۔ معصوم پروین کو کاشف نے اپنا کر انسانیت کا ثبوت دیا اور فروزاں نے اسے قبول کر کے اعلیٰ ظرفی کا۔ ایچ اقبال بہت خوبصورت لکھتے ہیں اور کبھی کبھی تو بہت ہی خوبصورت۔ کترنیں اور اشعار مناسب تھے۔ سوہا جی، تفسیر عباس، ابرار وارث، عاصم اقبال، صوبیہ تفسیر، قاضی عرفان اور احمد علی کے اشعار اچھے تھے خاص کر رمضان پاشا کا۔“

✠ **ابرار وارث**، میانوالی سے ”جولائی کا شمارہ مہینے کے آخری دنوں میں بڑی مشکلوں سے ملا۔ سرورق جاذبِ نظر تھا۔ خطوط سب کے ہی بہت اچھے تھے، اپنا خط دیکھ کر میٹھی سی لہر دل میں اٹھی۔ مسافر میں ابھی تک چندو کی داستان جاری ہے امید ہے اگلے ماہ ختم ہو جائے گی اس کی داستان۔ ایچ اقبال کی آخری مرحلہ، پڑھی ہر جگہ لگتا کہ یہ شخص مجرم ہے لیکن سسپنس آخر تک قائم رہا اور سب سے اینڈ میں جا کر کہانی پسند آئی جہاں پروین کو بختیار نے مسز بختیار بنا دیا، تیسری کہانی ناہید سلطانہ اختر کی زہر باد پڑھی سچ پوچھیں لگتا تھا کہ یہ بھی مغل صاحب کا شاہکار ہے اتنی زبردست تحریر تھی۔ ناہید جی پلیز ہر ماہ تشریف لایا کریں مہربانی ہوگی۔ معصومہ جو سب سے زیادہ محبت کرتی تھی والد سے، اسے ہی مہنگی پڑ گئی یہ محبت۔ ایسے بھی باپ ہوتے ہیں جو اپنی خوشیوں کا گلا خود ہی گھونٹ دیتے ہیں۔ بابر عباس کو اللہ نے بیٹی دی ہے ان کو میری طرف سے مبارکباد اور پلیز مریم کے خان، کاشف زبیر اور مغل انکل کو آخری صفحات پر لے آئیں۔“ (لیجیے جناب آپ کی خواہش پوری ہو گئی۔ اس ماہ آخری صفحات کاشف زبیر کے نام ہیں)۔

✠ **قیصر اقبال کچہ**، بکلول، ضلع بھکر سے لکھتے ہیں ”کہتے ہیں کہ اگر کسی کے محبوب کی آمد آمد ہو تو اس کا ایک ایک پل راہ تکتے اور انتظار کی سولی پر لٹکتے ہوئے گزرتا ہے۔ اور چونکہ ہم نے سسپنس کو اپنا محبوب بنایا ہوا ہے تو آنکھیں اس کے انتظار میں کہتی تھیں ”ساری رات میں تکاں تیری راہ انہاں تاریاں تو پچھ چن وے“ تو دیر آید، درست آید کی ترجمانی کرتا جولائی کا سسپنس 19 جون کو جا کر خریدا۔ سیدھا پہنچے اپنی محفل میں۔ زنانہ اور مردانہ نام کا حسین امتزاج لیے اعجاز احمد راحیل کو زنانہ اور مردانہ گفتگو کرتے کرسیٔ صدارت پر دیکھا۔ اور بالکل ہی نہ سمجھ سکے کہ موصوف کا جھکاؤ کس طرف ہے؟ اختر عباس بھائی، وہ پھول ہی کیا جس کی عمر کا حساب لگایا جائے؟ زویا اعجاز، آپ نے اچھا کیا کہ یہ نہیں بتایا کہ آپ میٹرک میں کس سن میں تھیں۔ بھنوں کے تلخ تجربات بیان کرتی تصویر العین صاحبہ، اس عمر میں یقیناً آپ کو پتا نہیں چلتا ہوگا کہ بہار کب آئی اور خزاں کب گزری، عمر ہی ایسی ہے۔ ہمایوں سعید، پرنسپل ہم اس وقت ہوتے ہیں جب بچے ہمارے سامنے پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ محفل میں تو ”ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز“ والی بات ہے۔ اور آپ نے یقیناً یہ نہیں پڑھا ہوگا کہ انسان بھی ایک معاشرتی حیوان ہے۔ مظہر سلیم، پہلی انٹری اور وہ بھی اتنی زبردست، محفل میں ضرور آتے رہنا۔ چوہدری احمد خان چکری، آپ کو اس لیے کم جگہ دی جاتی ہے کیونکہ اگر آپ کو زیادہ جگہ دی جائے تو آپ کو چکر آنے لگتے ہیں۔ سنا ہے کہ جب ہمایوں سعید کسی کا کھلا منہ دیکھتا ہے تو اس کا اپنا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ کہانیوں میں آغاز مسافر سے کیا۔ انسان نما درندوں نے چندو ماہی کو جس طرح پامال کیا اور روندا وہ ہمیں خون کے آنسو رلا گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی کہانی میں انٹری اچھی لگی۔ کشکول میں اور نگزیب اور سراج ابھی تک بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں اور فی الحال شیخ حامد نامی ڈور کا سرا ان کے ہاتھ سے دور ہے۔ جرم کے پردوں کو بے نقاب کرتی مرزا امجد بیگ کی منہ زور میں بیگ صاحب نے ایک بار پھر اپنی وکالت کا سکہ جمایا۔ ڈاکٹر ساجد امجد زخمِ گل لائے۔ کوئی شک نہیں کہ حسن نے اپنے زورِ بازو سے اپنا مقام پیدا کیا اور تاجدارِ دکن بن بیٹھا۔ اور اپنے عمل سے عوام میں مقبول ہوا۔ آخری صفحات پر بھی ایچ اقبال کی خوبصورت کہانی آخری مرحلہ میں بختیار جیل سے فرار ہو کر پروین کے پاس پناہ گزین ہوا۔ اور ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھا۔ مگر پروین کو اپنا نام دے کر اس غلطی کا ازالہ بھی کر دیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی زہر باد میں انسان سے حیوان بن کر معصومہ کا خون کرنے والا اس کا باپ جو دنیا کی عدالت سے تو رہا ہو گیا مگر کیا وہ اپنے ضمیر کی عدالت سے رہائی پا سکے گا؟ باقی کہانیوں میں محمد الیاس کی عشق بھلائے نہ بھولے اور کاشف زبیر کی خوفِ محبت پسند آئیں۔

✠ **محمد جاوید گل چندا**، فیصل آباد سے تشریف لا رہے ہیں ”ماہ جولائی 2013ء کا خوبصورت شمارہ کافی انتظار کے بعد اور کافی لیٹ ملا۔ ایک شخص سے گپ شپ ہونے لگی وہ صاحب بھی سسپنس کے لیے بے تاب تھے۔ باتوں باتوں میں مجھے اس نے بتایا کہ میرا نام اعجاز احمد راحیل ہے اور بندۂ ناچیز شاعر بھی ہے اور ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے تین شماروں جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت کا قاری بھی۔ آج میں اعجاز احمد راحیل ہی کی وجہ سے محفل میں حاضر ہوں۔ سرورق مجموعی طور پر سسپنس کے بالکل عین مطابق لگا۔ جون ایلیا صاحب کی خواہش اچھی لگی، اداریے میں آپ کی لکھی گئی باتیں موجودہ دور کی مکمل عکاسی کرتی محسوس ہوئیں۔ سب سے پہلے صدرِ محفل جناب اعجاز احمد راحیل کو اس خوبصورت کاوش لکھنے پر خصوصی مبارکباد۔ مسافر پڑھی اور وہ بھی موبائل کی لائٹ میں، میڈم شکیلہ کی روداد حیات کافی دردناک ہے۔ پراسراریت سے بھرپور تجسس آمیز اسٹوری کشکول کی موجودہ قسط ہر لحاظ سے زبردست تھی۔ آخری صفحات پر موجود آخری مرحلہ بھی کامیاب داستان ہے۔ عشق بھلائے نہ بھولے مجھے بالکل اپنی زندگی کی کہانی لگی۔ پہلی کاوش ہے، امید ہے شائع ہو جائے گی۔“ (خوش آمدید)

✠ **توصیف احمد**، پٹھان کالونی کراچی سے ”اس بار سرورق کی حسینہ کچھ حیران و پریشان سی نظر آئیں۔ سوڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھے دوستوں کی خبرگیری کرنے پہنچ گئے، جہاں اعجاز احمد راحیل ایک نمبر کی شرٹ پہنے میدان میں نظر آئے۔ مبارک ہو بھائی۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم شاعر لوگ دل کے اچھے ہوتے ہیں جبکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ شیر علی خان صاحب کو ملک گیر دعوتِ ولیمہ دینے پر اکسا کر موصوف کی جیبیں خالی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ تصویر العین آپ واقعی کم گو ہیں، یہ تو آپ سے ملنے کے بعد پتا چلے گا کہ ڈسپرین سے کام چل جائے گا یا کسی برین اسپیشلسٹ سے رجوع کرنا پڑے گا۔ ہمایوں سعید ہمیں آپ سے صد فیصد اتفاق ہے کہ ماما ایمان صرف قابلِ احترام ہی نہیں بلکہ انتہائی زیرک اور الفاظ میں بلا کی خوبصورتی رکھنے والی تبصرہ نگار ہیں۔ بابر عباس صاحب

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی بیٹی پیدائش پر میری طرف سے مبارک باد قبول کرلیں۔ چوہدری احمد خان یہ آپ کی محبت ہے کہ مشکلات کے باوجود آپ نے محفل میں حاضری دی۔ محی الدین اشفاق صاحب اللہ تعالیٰ آپ کے والدین کی مغفرت فرمائے، آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور آپ کو اچھے نمبروں سے کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ ابرار وارث اگر آپ کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے تو فوراً کرلیجیے۔ سارا سارا دن تو تو اور میں میں ہی ہوگا۔ کہانیوں کی ابتدا حسب معمول تاریخی کہانی سے ہی کی۔ زخم گل میں حسن گنگو کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا۔ افسوس کہ مدت محبت کافی سے زیادہ مختصر رہی۔ مرزا صاحب کی منہ زوران نوجوانوں کے لیے عبرت اثر کہانی تھی جو بھاگنے یا بھگانے کی جستجو رکھتے ہیں۔ واپسی میں خرم نے ناہید کو تاور کے چنگل سے آزاد کرانے میں مدد تو کی مگر شادی نہیں کرسکا۔ کترنوں میں ریاض بٹ صاحب کی تجویز بہت پسند آئی۔ جبکہ محفل شعر و سخن میں طاہرہ گلزار کا انتخاب اچھا لگا۔"

✠ **حسیب احمد چنائے**، الگڈی کرک سے حاضر ہیں "پچھلے دنوں کوئٹہ کے علاقے چمن میں دہشت گردوں نے اسکول بس کو نشانہ بنایا۔ واقعی میں افسوسناک اور بزدلانہ حملہ تھا۔ چمن میں تو ہماری پیاری بہن ماریہ فاروق بھی رہتی ہیں اللہ کریں کہ وہ جہاں بھی ہوں صحیح سلامت ہوں اور جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین کو اللہ صبر عطا فرمائے۔ ان تمام رائٹرز سے درخواست ہے جو باہر کی کہانیاں پیش کرتے ہیں کہ کہانی میں جو کردار کے نام ہیں اگر ان کی جگہ آپ اسلامی نام لکھا کریں گے تو پڑھنے والے کو آسانی سمجھ آجائے گی۔ میری طرف سے سسپنس کی پوری ٹیم اور محفل کے تمام دوستوں کو رمضان مبارک اور ایڈوانس میں عید مبارک۔ کیا ہم خطوط بذریعہ ای میل بھیج سکتے ہیں؟ (بالکل جناب) بالآخر سسپنس کا دیدار 20 جون کو ہوا۔ ٹائٹل پر بیٹھی عورت کسی گمنام سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ خطوط میں جھانکا، اپنا خط نہ پاکر افسوس ہوا سارے دوستوں سے التماس کہ میرے پیپرز ہوگئے دعا کریں کہ اچھے نمبر لے سکوں (اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ آمین) اعجاز راحیل برادر صدارت مبارک۔ ہمایوں سعید آپ کے پیچھے نہا کے پڑے ہوں گے۔ بابر انکل میری عمر 17 سال ہے کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں۔ ہمایوں برادر میں نے کوئی حد کراس نہیں کی آپ نے بلاوجہ میرے اوپر طنز کیا۔ زارا خان کنول صاحب کے تبصرے میں ایسا کیا ہوتا ہے کہ آپ اسے پسند کرتی ہو۔ پاشا انکل میرا چاچا بھی اسی وقت سے سسپنس پڑھتا ہے جب سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ اسی کی وجہ سے تو آج میں بھی سسپنس پڑھتا ہوں۔ ابرار برادر آپ کے پاس جو پین ہے اسے کہیں پھینک دیں۔ کیونکہ آپ جب بھی تبصرہ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں آدھا تبصرہ لکھنے کے بعد وہ خراب ہوجاتا ہے اور آپ کو مجبوراً آدھے تبصرے سے کام لینا پڑ جاتا ہے۔ طاہرہ یاسمین دو ماہ سے غیر حاضر ہیں خیریت تو ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انصاف پڑھی، من مانی کرنے والے رچرڈ کو مارتھا نے سزا دے دی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی واپسی بھی لاجواب تھی۔ ناہید بھی ایسی دلدل میں پھنس گئی تھی بالآخر اس کے بیٹے نے اور خرم نے اسے رہائی دلائی۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی شمع فروزاں میں ابوبکر کا واقعہ پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ ناہید سلطانہ اختر کی زہر باد میں سنگدل باپ کے ہاتھوں اپنی بیٹی کا قتل ہوا۔ مسافر کی یہ قسط تھوڑی بہت بورنگ تھی۔ ایچ اقبال کی آخری مرحلہ اسٹوری آف دی منتھ۔ بیگ صاحب نے بھی اس مرتبہ اپنے موکل کاشف کو باعزت بری کرا کے اصل ملزم بشارت مرزا کو جیل پہنچا دیا۔"

✠ **عباسہ مغل**، نامعلوم مقام سے "حسب معمول شمارہ 21 جون کو ملا۔ ٹائٹل حسینہ اپنے محبوب کی مسلسل غیر حاضری سے مایوس کن انداز میں اس کے انتظار میں غرق نظر آئی۔ ہمیں تو بجلی کا انتظار ہے مگر بے وقوف حسینہ کو اتنی گرمی میں بھی اپنے محبوب کا۔ جون ایلیا کی خواہش پر رکے، ان کی خواہش جان کر حیرت نہیں ہوئی کیونکہ یہ تو خواب ہے دیوانے کا۔ کرسی صدارت پر اعجاز احمد راحیل بیٹھے نظر آئے آپ کو بے وفا کرسی مبارک ہو۔ ماہا ایمان جی دو ماہ سے سسپنس سے غائب، تصویر الحسین صاحب، میں بھی آپ ہی کی قبیل کی ہوں مجھے بھی سردی اور گرمی کے علاوہ کسی موسم کا پتا ہی نہیں چلتا ویسے آپ کی سوچ مجھے اچھی لگی۔ رضوان تنولی کریڑوی جی آپ کا تبصرہ ہمیں ہنسا گیا ہر بار کی طرح میرا دل آپ کو کریڑوی کے بجائے کڑوی کہنے کو کرتا جی کستوری لگا کے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی میڈم کا ماضی کافی گھناؤنا ہے مجھے تو جو زفین بھی فراڈ ہی لگتی ہے۔ واپسی پڑھی جو احسانوں کے بوجھ تلے دبی ایک مشرقی بیوی کی کہانی تھی۔ عشق بھلانے نہ بھولے پڑھی، ہم بھی اسی طرح کھیلا کرتے تھے ماموں زاد و کزنز کے ساتھ۔ کہانی نے پہلے تو ہنسایا پھر اینڈ دکھی کر گیا۔ اب کی بار کا شمارہ حقیقت کے بہت زیادہ قریب ترین تھا سب سے زیادہ اچھی کہانی زہر باد لگی۔ یہ واحد کہانی ہے اس شمارے کی جس میں معصومہ کی موت نے رلا دیا۔ آخری مرحلہ میں بختیار کا فیصلہ بہت پسند آیا جس کی زندگی اجاڑی پھر سنوار بھی دی۔" (اللہ آپ کے والد کو صحت عطا کرے اور آپ کو کامیابی، آمین)

✠ **ابن مقبول جاوید احمد صدیقی**، راولپنڈی سے شرکت کر رہے ہیں "خوبصورت، دلفریب رنگوں والا ٹائٹل بہت سے ینگ قارئین کی دھڑکنیں یقیناً بڑھا دے گا۔ فہرست قابل تعریف ناموں سے بھرپور اور مضامین بہترین۔ پہلے تو رمضان المبارک کی آمد کی مبارک باد تمام قارئین کو دعا ہے خاص کہ ہماری خواہشات اللہ کریم پوری کرے اور ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکے، آمین۔ اعجاز احمد راحیل مسند صدارت پر مع شرارتوں کے خوب براجمان ہیں۔ اور بقول اعجاز کے کہ یہ سسپنس کی محبت کی انتہا ہی تو ہے جو سات آٹھ سال سے حاضر در دولت ہوتا رہتا ہوں اور اس عرصہ کے پرانے ساتھیوں کو گوہر نایاب کی طرح ڈھونڈتا بھی ہوں۔ ہاں شیر علی خان کو شادی کی بے حد مبارک باد۔ تصویر الحسین جی آپ فوراً ڈاکٹر کو دکھائیں کہ نہ بہار کا احساس نہ خزاں کا۔ یہ علامتیں خطرناک ہیں۔ ویسے ہم بھی رعنا شیخ، بشریٰ افضل، ثاقب راجا ثاقب کو بے حد یاد کرتے ہیں۔ چوہدری احمد خان ہمارے شہر کے گرائیں، اچھے تبصرے کے ساتھ براجمان تھے۔ لیجیے محترم رمضان پاشا صاحب ہمارے پڑوسی اور محلہ دار (صرف عمر کے حساب سے) 15،10 سال کے فاصلے پر رہنے والے بھی حاضر ہوگئے ہیں۔ جی آیاں نوں جناب۔ آپ نے لڈو والی بات اور نیا نوشہ والی نصیحت خوب چھوڑی۔ محی الدین اشفاق صاحب کے والد محترم کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ ابرار وارث مسلسل حاضر رہو محفل خطوط میں یقین رکھو میں تو تو کیا بلکہ تو تو میں، میں سب میں "گرو" ہو جاؤ گے۔ کہانیوں میں کشکول اول اول پڑھی۔ لیاقت حسین نبی اور پیچیدہ پوزیشن میں پھنس گیا ہے دیکھیں کیا کرتا ہے اور کیسے؟ سکندر علی شاہ بھی ضرور بھگتے گا۔ زہر باد بڑی اچھی معاشرتی کہانی تھی مگر ناہید سلطانہ اختر نے انتہائی قدم اٹھوا کر معصومہ کو مروا دیا۔ زخم گل اچھی تھی مگر ڈاکٹر صاحب ماضی قریب میں آکر کوئی کہانی سنائیں۔ محمد الیاس کی کہانی بڑی اچھی رہی اور حسب معمول الیاس صاحب کا طرز تحریر بھی مزہ دے گیا۔ مسافر ابھی زیر مطالعہ ہے۔ چلتر تو زبردست رہی۔ شمع فروزاں ناقابل بیان تھی۔ یہ تو سچ ہے کہ

سسپنس انتہائی خوبصورت، ادبی معاشرتی اور بدیسی کہانیوں کو پیش کرنے میں یکتا ہے۔" (بہت شکریہ جناب)

✠ **احسان سحر**، میانوالی سے چلے آرہے ہیں "خوبصورت تخلیوں پر مشتمل پھول کی طرح تازہ اور چمکتا ہوا سدا بہار سسپنس میرے سامنے اپنی خوشبو بکھیر رہا ہے۔ جب یہ ملتا ہے تو میرے اجڑے ہوئے دل میں گویا رونق اتر آتی ہے (اللہ رحم...... کیا محبت ہے آپ کی) ٹائٹل کا نرالا انداز دیکھا۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی کہ صنف نازک اپنے گلشن میں کرخت صفت آدمی کو دیکھ کر حیرت کا اظہار فرما رہی ہیں...... یا غصے کا؟ ستاروں کی محفل میں قدم رکھا جہاں اعجاز احمد راحیل ایک ماہ کے لیے چاند کا لقب پانے میں کامیاب ہوئے۔ آپ چودھویں کے چاند کی طرح تو نہیں البتہ ساتویں کے چاند جیسی روشنی بکھیرنے میں کامیاب ہوئے، مبارک ہو۔ اب ان دوستوں کی محبت کو جدا مت ہونے دینا جس طرح پھول سے خوشبو جدا نہیں۔ توصیف کافی عرصے سے ہمایوں کی جیب گیری کرتے نظر آئے۔ جو بھی کھو رونق کبھی تمہارے چہرے پر نہیں آئے گی۔ پہلی تحریر زہر باد آنکھوں سے پڑھ کر دل میں قید کی۔ اپنے گھروں کی مثالیں یہاں بکھری پڑی ہیں۔ اس مہنگائی اور پریشانی نے ہر ایک کو ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ کشکول بہت زیادہ کرداروں اور تحیر کے اضافے نے اس اسٹوری کو بور اور الجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔ عجیب و غریب ہوتی جارہی ہے۔ کاشف زبیر خوف محبت لے کر آئے۔ منہ زور میں بیگ صاحب نے کافی مہارت اور اپنے تیز وار سے قاتل کو ہمیشہ کی طرح بے نقاب کیا۔ تہ دام اچھی کاوش رہی اور بدقسمتی سے شکار پھر ایک دفعہ پرانے جال میں آکر پھنس گیا۔ انصاف تنویر ریاض کی اسٹوری نے کافی متاثر کیا۔ مارتھا نے لورین کا انتقام کافی مہارت اور بھیانک انداز سے لیا۔ ڈاکٹر صاحب ایک لڑکی کی حساس تحریر لے کر حاضر ہوئے جو واقعی سسپنس کے لیے مثال ہیں کافی عرصے سے مختصر مگر پراثر کاوشیں ارسال کرکے کافی پذیرائی حاصل کرچکے ہیں۔ ایمان افروز سلسلے نے ہمیشہ کی طرح متاثر کیا۔ محمد الیاس اپنے انداز میں آئے اور خوب آئے۔ بچپن کے پیار کو حاصل کرنا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بچپن کے پیار کو قائم رکھنا۔ آخری صفحات کی زینت آخری مرحلہ ایچ اقبال صاحب لے کر آئے۔ سچا اور پاکیزہ عشق صدیوں تک جوان اور تازہ رہتا ہے۔ بختیار کا عشق بھی ہمیشہ جوان رہا۔ خوشبو بن کر فروزاں کی یاد دلاتا رہا۔ کافی عرصے سے سسپنس کا مقبول سلسلہ نگے اور ٹینس بانڈ، کا رکا ہوا ہے اسے پلیز دوبارہ شروع کریں اصل مزہ تو انہیں پڑھ کر آتا تھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کو سسپنس کے آخری صفحات کے لیے واپس لائیں۔ تشور ہادی پلیز اب ویسی اسٹوریز نہیں مل رہیں جیسے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ امید کرتا ہوں آپ ہماری التجا پر عمل کریں گے۔ اللہ پاک ہمارے پاکستان اور اس میں رہنے والوں کو خوشیاں نصیب فرمائے۔ ایڈوانس میں رمضان المبارک کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں۔"

✠ **اعجاز احمد راحیل**، ساہیوال سے "18 جون کی ایک اداس سی شام کو اپنی ایک غزل مکمل کرکے ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ میرے بگ باس رضوان تنولی صاحب نے بذریعہ ایس ایم ایس اطلاع دی کہ سسپنس مارکیٹ میں آگیا ہے اور آپ کا تبصرہ پہلے نمبر پہ ہے۔ بس پھر بے قراری تھی کہ بڑھتی گئی آخر خدا خدا کرکے 19 جون کی شام سسپنس نے شرف دیدار بخشا۔ سرورق پر موجود اداس سی صورت والی حسینہ بھی یقیناً کسی اپنے کی راہ دیکھ رہی ہے۔ جون ایلیا کی خواہش پڑھ کر بے اختیار دل میں خواہش جاگی کہ کاش ان کی یہ خواہش پوری ہوجائے۔ آپ کا خوشبو کی نوید دیتا اور پر فکر اداریہ خامے کام کی شے لگا۔ اپنا تبصرہ پہلے نمبر پر دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی کے ساتھ ساتھ آپ کی تحریر شناسی کا گرویدہ ہونا پڑا۔ شکریہ جی۔ بہرحال صنف نازک کے دل کا حال، فی الحال بے حال ہی ہوا ہوگا۔ اوکاڑہ سے تصویر الحسین کا نت کھٹ سا تبصرہ پڑھ کر اچھا لگا۔ ویسے لڑکی اور قلم کو بات ہضم نہیں ہونے والی۔ محترم بھائی بابر عباس صاحب خواتین کے بارے میں اتنا دماغ نہ کھپایا کرو۔ دوسری بات جب کارخانے کے مالک آپ جیسے زندہ دل لوگ ہوں تو رضوان بابو کو پیسوں کی کیا فکر؟ فضا خان کا مختصر سا تبصرہ عمدہ لگا ویسے اپنوں کی محفل میں آنے کے لیے سوچنا ضروری نہیں ہوتا۔ محترم سید محی الدین اشفاق کا تبصرہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا، بھائی آپ کے والد محترم کی موت کا دلی دکھ ہوا۔ لگتا ہے سعدیہ بخاری صاحبہ بھی ماہ رمضان سے تین ماہ قبل ہی اعتکاف میں بیٹھ گئی ہیں۔ محفل کی قابل احترام ہستی مس طاہرہ گلزار بھی بلیک لسٹ میں قیلولہ فرما رہی ہیں۔ ناصر ملک کی مسافر اپنے فل عروج پہ جارہی ہے۔ چندو ماس کی آبلہ پائی کی رتیں ابھی جاری و ساری ہیں موجودہ قسط غمناک کرگئی، محبتوں چاہتوں میں گندھی، رسم و رواجوں میں جکڑی تحریر زخم گل دم آخر تک اپنا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ کشکول کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا بس گزارہ ہے۔ جلد سے جلد محی الدین نواب سے کوئی نیا سلسلہ شروع کروایا جائے۔ آخری صفحات پر موجود جذبوں، رشتوں سے لبریز کہانی آخری مرحلہ انٹرسٹنگ اور دل کو چھو لینے والے موضوع کی وجہ سے متاثر کن ثابت ہوئی۔ خوف محبت اور واپسی کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ پراثر تحریر منہ زور بھی زبردست لگی بیگ صاحب کے مضبوط دلائل نے مرزا بشارت جیسے شاطر کو بھی انجام تک پہنچایا۔ بابر نعیم کی چلتر نے یہ ثابت کیا کہ عورت کی محبت کے پیچھے بھی کوئی مقصد چھپا ہوتا ہے۔ سلسلہ اولیا میں شمع فروزاں کے عنوان پر لکھی گئی تحریر زود اثر ثابت ہوئی خواجہ ابوبکر کے حالات زندگی مشعل راہ ثابت ہوئے۔ محفل شعر و سخن میں رضوان تنولی، قیصر اقبال کچھ، تفسیر عباس بابر، عمرین ناز سوہا ، ہی لاہور کینٹ کے اشعار اچھے لگے۔"

✠ **رضوان تنولی کریڑوی**، اورنگی ٹاؤن کراچی سے محفل میں شریک ہیں "سرورق کی حسینہ نے سرورق پہ مونچھوں والی شخصیت کا سخت برا منایا احتجاجاً منہ کمول کے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ جون ایلیا جی ہمارے اور آپ کے بعض معتبر بزرگوں کے حسین خواب کو تعبیر ملی تو ظہور اور مقدس سیاست مداروں نے اس خواب کے منہ پہ بے دردی سے طمانچا مارا۔ سریلی بلبل کے نغمے بکھیرتی، کوئل کی دلکش کوک کوک، باغیچہ محفل میں قدم رکھتے ہی دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ حسین لفظوں کو سچے موتیوں کی لڑی میں پرو کے چمن کے پھولوں کو سخن تحریر کا روپ سنگھار دے کے اعجاز کا تبصرہ ٹاپ کر گیا۔ سید محی الدین اشفاق آپ کے والد مرحوم کو حوض کوثر سے ساقی کوثر کے بابرکت نورانی ہاتھوں سے جام کوثر نصیب ہوں، آمین۔ تصویر الحسین اپنی ایک گز لمبی زبان کو قینچی کی طرح کٹر پٹر چلاتے ہوئے چھرا لے کے میرے پیچھے دوڑ پڑی۔ توصیف احمد آپ نے میرے آستانے میں شاندار انداز میں جھاڑو پوچھا لگا کے حق مجاوری ادا کردیا۔ بھیا قیصر لالہ جی دوستوں کو بتائیے تو ہم لچے لفنگے ٹائپ کو قابو کر کے کستوری لگانے والے ماہر عامل کامل ہیں یا نہیں؟ رمضان پاشا ناں آپ بابر عباس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ اجی دونوں ہم عمر ہو اس لیے اللہ ہو کا ذکر کیا کرو۔ ماہا ایمان اپنے پوتوں، نواسوں کو پوپلے منہ سے الم غلم فرضی قصے سناتی رہتی ہیں کستوری لگا کے۔ کہانیوں کی ابتدا ڈاکٹر ساجد امجد کی زخم گل سے کی، نظام الدین اولیا کی پیش گوئی، حسن گنگو گیندے کے پھول کے مابین داستان دل کے تاروں کو چھو گئی۔ ناہید سلطانہ اختر کی زہر باد، ذیشان، سلمان، ملیہ، معصومہ کی ننھی منی

WWW.PAKSOCIETY.COM

شوخیاں بکھیرتی کہانی معصومہ کے انجام نے افسردہ اور رنجیدہ کردیا۔ کشکول نکھرتی جارہی ہے۔ کوبرا خبیث کی باری تو جب آئے سو آئے گی ہاتھ آئے دشمنِ وطن وشنو کو بغیر ویزے پاسپورٹ کے ٹینٹو دبا کے عالم ارواح کی جانب مفت فلائٹ سے روانہ کردینا چاہیے، کستوری لگا کے۔ کاشف زبیر کی خوف محبت کرسٹن نے ایلن کو قتل کرنا چاہا ایلن تو بچ گئی مگر کرسٹن کا کریا کرم ہوگیا۔ ناصر ملک جی کی مسافر راہ پرخار پے دربدر ٹھوکریں کھاتی چندو ماہی اس بادشاہ گر بیگ جا پہنچی جس کا ذکر صوفی رضوان نے کیا تھا۔ گوشۂ تصوف سے ضیا تسنیم بلگرامی نے ولی ابوبکر کی شان شمع فروزاں کے خوب صورت عنوان سے قلمبند کی۔ مدتوں یاد رکھی جانے والی کہانی کا تحفہ الیاس صاحب نے عشق بھلائے نہ بھولے کے روپ میں دیا۔ آخری صفحات پر ایچ اقبال نے آخری مرحلہ کا رنگ بکھیرا، کہانی یوں تو کافی اچھی رہی مگر انجام حسب منشا نہ رہا آفتاب نے شبانہ کے قتل میں اپنے کزن بختیار کو پھنسانے کی کوشش کیوں کی؟ کنور ثقلین اور فروزاں کے عشق کا ڈنکا تو بجایا مگر تفصیل کا خانہ خالی چھوڑ دیا۔ اشعار کی محفل میں مہرین ناز، مریم کائنات، محمد رشید سیال، اعجاز احمد راحیل، حلیم شہزادو کا انتخاب پسند آیا۔"

زویا اعجاز، لاہور سے "اس ماہ کا سسپنس خلافِ معمول قدرے تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل پر بائیں جانب ایک خلائی مخلوق نما چیز نے کافی حیران کیا۔ انشائیہ میں بیان کردہ خواہش کافی دلگداز تھی۔ محفل میں کھینچا تانی جاری تھی۔ قیصر اقبال کے میرے تبصرے پر طفلانہ تجزیے پر نو کمنٹس۔ بابر عباس صاحب آپ اپنے ذہن سے شکوک کے جالے صاف کرلیجیے۔ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس نے ہم خیال اور ہم ذوق افراد کے لیے روابط تیز کردیے ہیں۔ محترم تفسیر عباس صاحب ہم اس میدان کارزار میں نو وارد ہیں اور آپ اس دشت کے پرانے سیاح۔ ہم جتنے بھی دانت تیز کرلیں آپ کے پایہ تک تو کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ کہانیوں کا آغاز اس مرتبہ زہرباد سے کیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی تعریف کرنا تو گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یہ تحریر ہمارے بدترین معاشرتی المیہ کی عکاس تھی۔ جن گھروں میں والدین متوازن شخصیت کے مالک نہ ہوں وہاں اولاد کی زندگیاں یونہی دنیا میں جہنم بنی رہتی ہیں اور کسی نہ کسی نفسیاتی کجی کا شکار رہتی ہیں۔ آخری مرحلہ کا یہی اختتام متوقع تھا۔ آغاز میں ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ سارا جنجال آفتاب اور ثقلین کا پھیلایا ہوا ہے۔ مسافر میں چندو ماہی اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی بہت بھیانک سزا بھگت رہی ہے۔ اس ماہ کی قسط کا اختتام خاصا پُرتجسس تھا۔ دیکھتے ہیں اب کون سی بلی تھیلے سے باہر آئے گی۔ کشکول اپنی سابقہ ڈگر پر رواں دواں ہے۔ لیاقت حسین کی گرفتاری اب جانے کیا گل کھلائے گی۔ تاریخی کہانیوں میں قلوپطرہ جیسے منفرد موضوعات پر کچھ لکھوائیں (آپ کی فرمائش نوٹ کرلی ہے) دیگر کہانیوں میں واپسی ان والدین کے لیے لمحۂ فکریہ تھی جو بلاتحقیق اپنی بیٹیوں کے ہاتھ ولایت پلٹ کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔ خوفِ محبت قانون و جرم میں رسہ کشی کا دلچسپ احوال تھی۔ ایلس کا انتقام بہت پسند آیا۔ شمع فروزاں اور چلتر بھی خوب رہیں۔ منہ زور عاقبت نااندیش لڑکیوں کے لیے کافی سبق آموز ہے۔ کورٹ میرج ہر مسئلے کا حل قطعی نہیں ہوتی۔ والدین کی عزت سے کھیلنے والیوں کے لیے یونہی رسوائی و بربادی مقدر بنتی ہے۔ عشق بھلائے نہ بھولے میں بچپن کی حسین یادوں اور محبت نے بہت متاثر کیا۔ محفل شعر و سخن میں سکھر سے ریحانہ کا انتخاب پسند آیا۔"

ماریہ فاروق، چمن سے لکھتی ہیں "سسپنس کے شمارے میں جتنی چیزیں موجود ہیں وہ دلچسپی کا باعث ہیں۔ مجھے شدید غصہ آتا ہے جب میرا خط بلیک لسٹ کیا گیا ہو۔ رمضان کی آمد سب دوستوں کو مبارک ہو اور اس ماہ کا ٹائٹل اچھا لگا واقعی تخلیق کار کے ہاتھوں میں اوپر والے نے نور رکھا ہے۔ اب ذرا محفل یاراں کی جانب۔ تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے، کدھر غائب ہیں ہمارے عمران حیدر بلوچ صاحب؟ اب اس محفل والے بھی بےوفا ہوتے جارہے ہیں۔ ماہ جولائی میں میرے موسٹ فیورٹ سید محی الدین اشفاق صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیابی کے ساتھ ساتھ آپ کے والد مرحوم کا صبر بھی عنایت کرے۔ بےچارے مجھ سمیت بلیک لسٹ کے ڈبے میں بند تھے۔ خیر میرا کام ہے خط بھجوانا، اب شائع نہ کرنا اسٹاف کا قصور ہے۔ جو میری محبت کو بھی نظرانداز کررہے ہیں (آپ کی محبت اور خوبصورت خط ردی کی ٹوکری میں نہیں جاتا بس کبھی کبھی جگہ کی کمی آڑے آجاتی ہے) کہانیاں سب ہی اچھی تھیں۔ خاص کر تنویر ریاض کی انصاف، بےشک جو خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے اسے ٹھوکر بھی بڑے زور کی لگتی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے اب تک جتنا لکھا واقعی اچھا لکھا اور داد کے مستحق ٹھہرے۔ جس شمارے میں کاشف زبیر، مرزا صاحب اور صفدر حیات صاحب کی کاوشیں نہ ہوں وہ شمارہ بے رونق سا ہی لگے گا۔"

ماہا ایمان، سیالکوٹ سے لکھتی ہیں "مون سون کی پہلی برستی بارش میں جامن کے درخت کے نیچے بیٹھی چھاتا اوڑھے تبصرہ لکھتے ہوئے پُرسکون فطری ماحول کو انجوائے کررہی ہوں۔ سیاحت میرا دوسرا شوق ہے جسے میں وقتاً فوقتاً پورا کرتی رہتی ہوں۔ پچھلے چند ماہ سے ہاکر صاحب ڈائجسٹ بہت لیٹ پہنچاتے رہے۔ اس بار سرورق عام سا تھا۔ یکسانیت کا شکار۔ اداریے میں آپ سے رمضان المبارک کی مبارک وصول کی۔ میری طرف سے بھی تمام قارئین کو رمضان المبارک کی بابرکت ساعتیں مبارک ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ تمام دہشت گردوں کو نیست و نابود کرکے پاکستان کو دوبارہ سے اقوام عالم میں سربلند کردے۔ آمین! صدرِ محفل ایک شاعر محترم ٹھہرے۔ اعجاز احمد راحیل صاحب محبت کا خالص ہونا شرط ہے ورنہ تو یہ آج کل وقت اور دل کا بہلاوا ہی ہے۔ زویا اعجاز نیا جمہوری اقتدار ارباب اختیار کو مبارک ہو ہم عوام کے لیے تو آج کل سب ایک ہے یعنی بےبس اور بےاختیار۔ انکل بابر عباس ہیں تو آپ بھی ایک متعصب مرد لیکن میں خاصی صاف گو ہوں سو کہہ رہی ہوں کہ آپ کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے۔ سید محی الدین اشفاق ہماری دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کو صبر اور آپ کے والد محترم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں، آمین! رمضان پاشا سر جی واللہ آپ اتنے ایجڈ ہیں، ہمیں کبھی محسوس ہی نہ ہوا۔ فضا خان لاہور، تمہارا تبصرہ مجھے پسند آیا بچی بڑی کل اے جی۔ ابرار وارث چندو اگر آپ سے مشورہ کرتی تو شاید آپ ہی سے شادی کرلیتی نہیں؟ اور ویلکم بیک تفسیر انکل، آخر آپ کب ایجڈ ہونے کے ختم ناک دردناک فیز سے باہر نکل کے کچھ اور کہیں، ہنسیں گے۔ اور میرے نکوں میں تیل بہت، آپ بس تیل دیکھیں اور تیل کی دھار انجوائے کریں۔ تحریروں کی سحر ناک دنیا کا ذکر کروں تو مسافر نے آج کل خوب اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے میڈم شکیلہ عرف چندو کی داستان خاصے پیچ و خم سے گزری ہے۔ کشکول بہت زیادہ سنجلک تحریر ہے دماغ خاصا تھک جاتا ہے اور ہم تو خود کو بوجھل محسوس کرتے ہیں پڑھتے ہوئے۔ ہرفن مولا کاشف زبیر صاحب کی مختصر تحریر خوف محبت لاجواب تھی جس میں ایلس نے بڑی ہوشیاری سے کرسٹن پارچی کو بےنقاب کرکے حوالۂ پولیس کیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی گھر کو گھر بنانے اور رشتوں کی اساس کو واضح کرتی ایک شاہکار تحریر زہرباد پسند آئی۔ چلتر اور عشق بھلائے نہ بھولے درمیانے درجے کی تحریریں تھی۔ محفل شعر و سخن میں تقریباً سبھی شعر قارئین کے عمدہ ذوق کے عکاس

تھے لیکن رضوان تنولی اور جنید احمد ملک کے اشعار زبردست تھے۔"

رمضان پاشا، گلشن اقبال کراچی سے "اطلاعاً عرض ہے کہ یہ عاجز سسپنس سے ترکِ تعلق کررہا ہے وہ اس لیے کہ گزشتہ ماہ میں نے جیت کی بار پر تبصرہ لکھا تھا اسے آپ نے نامکمل چھاپا۔ اب ارادہ ہے سسپنس سے ناتا توڑ کر کسی اور کے در پر دستک دوں یہاں تک کی باتیں آف دی ریکارڈ (کہانیوں پر آپ لوگوں کے تبصرے ہم بہت غور سے پڑھتے ہیں اور نوٹ بھی کرتے ہیں آپ کے خط کو تو بہت کم ایڈٹ کیا گیا اور آپ اتنا ناراض ہوگئے۔ ان قارئین سے پوچھیے جن کے 20، 20 صفحات پر مبنی خطوط کو مختصر کرکے شائع کیا جاتا ہے لیکن وہ ناراض نہیں ہوتے) اور اب جولائی 2013ء کے سسپنس پر آخری بار تبصرہ کررہا ہوں۔ سرورق حسبِ معمول اچھا تھا، فہرست میں کوئی جدت نہیں تھی، جون صاحب کی تحریر ہمیشہ کی طرح تلخ و ترش تھی، خطوط کی محفل میں اول نمبر آنے والے اعجاز احمد راحیل صاحب کو مبارکباد، موصوف نے میرے تبصرے کو بھی سراہا، اس کے لیے ان کا شکریہ۔ تصویر الحسین صاحب دوستوں سے بحث والی بات تو سمجھ میں آتی ہے یہ شرارتیں کیونکہ ضروری ہیں؟ وضاحت کریں، فضا خان نواب صاحب کی کہانی کا مجھ پر اثر ہونا ہی تھا، کیونکہ موصوف نے اپنی ایک کہانی میں میرے نام کا ایک کردار منفی انداز میں پیش کیا تھا اسی طرح حسام بٹ صاحب نے بھی میرے نام کی مٹی پلید کی تھی، حالانکہ میرا نام ایک اسلامی، مقدس و متبرک ماہ کا نام ہے جو اس ماہ سے آغاز ہورہا ہے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری غلطی کی تصحیح فرمائی آئندہ اپنی کوتاہی کو یاد رکھوں گا۔ اور اب کہانیوں پر تبصرہ آخری بار "زخم گل" پڑھ کر تاریخی معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ زہرباد وشام طرازی کرنے والے اور اپنے بچوں پر تشدد کرنے والوں کے لیے ایک زبردست تازیانہ ہے۔ کشکول کی اس قسط میں لطف نہیں آیا، اختتام بھی بےمزہ تھا۔ خوفِ محبت، کہانی بہت دبنگ تھی، تسلسل ایسا تھا کہ درمیان میں وقفہ کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا حتیٰ کہ سگریٹ نوشی کے لیے بھی کوئی موقع نہیں ملا، ایسی ہی کہانیوں کی خاطر میں سسپنس خریدتا ہوں، حسام بٹ کی کہانی منہ زور بڑی تہلکہ خیز تھی، حسبِ معمول عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ تہ دام بھی خوفِ محبت کی تعریف میں آتی ہے۔ تجسس اور سسپنس سے بھرپور کہانی انصاف کافی عرصہ یاد رہے گی۔ اس بار مسافر نے کشکول کو پیچھے چھوڑ دیا، یہی مسافر کی تعریف ہے۔ واپسی بھی پُراثر تھی۔ عشق بھلائے نہ بھولے، کہانی شاندار تھی، اختتام بھی جاندار تھا۔ کہانی چلتر مختصر مگر متاثر کن تھی، عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی اس کے اندر چلتر کا عنصر بہرحال موجود ہوتا ہے۔ آخری مرحلہ کہانی تو بہت عمدہ تھی مگر اسے اتنی وسعت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اشعار کی محفل میں حبیب احمد چنائے کا انتخاب پسند آیا، ابرار وارث کا چناؤ بھی اچھا تھا، جاوید شبیر بریدہ کا قطعہ بھی دل کو بھایا۔ کترنیں بھی لاجواب تھیں۔"

احمد خان توحیدی، کراچی سے شریک ہیں "شمارہ جولائی ایک دن لیٹ 18 جون کو ملا۔ حسینۂ ٹائٹل گرمی، لوڈشیڈنگ، بجٹ و مہنگائی سے ہاتھ سر پر دھرے پریشان نظر آتی ہے۔ الیکشن کے بعد نئی حکومت مہنگائی کا طوفانی بجٹ بھی لے آئی، سب امیدیں دم توڑ گئیں۔ انشائیہ جون ایلیا خواہش، ہمزاد کے حوالے سے، عظیم لوگوں کا حوالہ ہے ہم اول انسان دوم مسلمان سوم پاکستانی بن کر رہیں تو کوئی مسئلہ نہ رہے۔ محفل خطوط اعجاز راحیل کرسی صدارت مبارک ہو۔ قیصر اقبال گچہ، تصویر الحسین، چوہدری احمد خان چکری، توصیف احمد، رضوان تنولی، ہمایوں سعید، سائقہ راج، بابر و تفسیر بابر عباس اچھے تبصرے۔ طویل کہانیاں...... زخم گل، ڈاکٹر ساجد امجد معلوماتی کہانی۔ زہرباد ناہید سلطانہ، ناجائز سختی بچوں کو ضدی و سرکش بنا دیتی ہے۔ کشکول، لیاقت حسین کا شکر خوب رہا۔ آکٹوپس کدھر غائب ہے؟ سکندر شاہ پر شگرہ کی گرفت۔ نتیجے کے منتظر، منہ زور کہانی میں بشارت مرزا کا ذکر آتے ہی اصل مجرم ہی کا ذہن میں خیال آیا۔ محفل شعر و سخن، سوہا جی، قیصر اقبال گچہ، جاوید بشیر، اطہر حسین، مہرین ناز، مسز بابر عباس، اعجاز راحیل، اچھے اشعار۔ مسافر، ڈاکٹر منور شاہ اچانک چندو ماہی کے لیے فرشتہ بن کر نمودار ہوئے۔ چندو ماہی مشکل حالات سے گزر کر اجمل گیلانی سے عقد۔ واپسی شادی کے بعد نادر کی اصلیت ظاہر ہونے پر ناہید کو قانون سے مدد لینی تھی، طلاق کے بعد خرم سے شادی کرلیتی تو اچھا تھا۔ عشق بھلائے نہ بھولے۔ ایسے گھر اور شادیاں تو بچپن میں ہم بھی کرتے رہے۔ اتفاقیہ دلچسپ واقعات پیش آئے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔"

قدرت اللہ نیازی، جیم ٹاؤن خانیوال سے لکھتے ہیں "جولائی کا شمارہ ہمارے لیے سومنات کے مندر کی فتح سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا 15 تاریخ سے طاہر نیوز ایجنسی پر ہمارے حملے شروع ہوئے اور 20 جون تک جاری رہے 20 جون کی شام گوہر مقصود ہاتھ آیا۔ سرورق پر موجود حسینہ بھی گرمی سے تنگ نظر آئیں اور ہاتھ سر پر رکھے بارانِ رحمت کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ جون ایلیا ہمیشہ کی طرح اقتدار کے ایوانوں پر قابض گروہ کی اصلاح کی خواہش کرتے نظر آئے۔ محفل یاراں میں گئے تو اپنا نام کہیں نظر نہ آیا۔ اگست کا شمارہ موصول ہونے تک رمضان کا مبارک مہینا شروع ہوچکا ہوگا، اللہ ہم سب کو اس مبارک مہینے کی تمام برکتیں اور رحمتیں نصیب فرمائے۔ سب سے پہلے حاجی عبدالحکیم صاحب خانیوال سے گزارش کرتا ہوں کہ بزرگوار محترم اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔ اعجاز احمد راحیل کرسی صدارت مبارک۔ ہو تبصرہ واقعی اچھا تھا۔ سعدیہ بخاری کے بارے میں آپ کا اندازہ غلط ہے وہ ہمارے کسی بھائی کے پلے پڑ کے اس کی زندگی خراب کرنے جارہی ہیں۔ پیارے بھائی سے ہمیں پوری ہمدردی ہے۔ زویا اعجاز، سسپنس کی پرانی قاری ہیں اور میٹرک سے پڑھ رہی ہیں ہم تو پھر آپ سے بھی پرانے ہوئے کہ چھٹی کلاس میں ہی سسپنس سے رشتہ جڑ گیا تھا۔ محمد ہمایوں سعید تضحیک اور مزاح کے فرق کو سمجھتے تو آپ ایسا نہ کہتے۔ بابر عباس ماضی میں جینا چھوڑیں یار آپ کو ہر کوئی ارم سعد بخاری اور بشریٰ افضل کیوں لگتی ہیں؟ بیٹی کی مبارکباد قبول کریں۔ محمد تقی عباس یہ تو ٹائٹل گرل سے پوچھیں تاکہ آپ کو دیکھ کے کیوں پریشان تھی۔ رمضان پاشا جی آپ تو ہمارے بزرگ ہوئے گستاخیاں معاف کردیں جو ماضی میں ہوگئیں۔ جولائی کا شمارہ اس حساب سے بہترین لگا کہ اس میں دیسی کہانیوں کا تناسب بیرونی کہانیوں سے زیادہ رہا جو اکثر ہماری خواہش رہی ہے۔ کشکول کا تیچو اس بار کافی سلو تھا، کوئی خاص واقعہ رونما ہوسکا اور کہانی ایک جگہ

انتقالِ پُرملال

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے دیرینہ کارکن جناب رضی الدین مشیت ایزدی سے انتقال کرگئے۔ ہم ان کے اہلِ خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین سے سورۂ فاتحہ کی درخواست ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جکڑی ہوئی نظر آئی۔ مسافر میں چندو پر رونما ہونے والے ستم پڑھے حالیہ کئی کردار ماضی میں اس کی داستان کا حصہ رہے ہیں، چندو ماہی کی بیٹی بھی یقیناً ری انٹری دیں گی۔ ناہید سلطانہ اختر زہر باد لے کر آئیں ابا کے روایتی کردار کے گرد گھومتی کہانی کا مرکزی آئیڈیا اچھا لگا یقیناً گھر سے باہر مرد حضرات کو کئی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تاہم کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا اثر گھر اور بچوں پر نہ پڑے۔ خوف محبت والدین سے شاکی ایک اور کردار کی کہانی جس میں والدین کی کم توجہ نے کرسٹن کی نفسیات میں ایسا بگاڑ پیدا کیا کہ اس نے درجنوں خون کر ڈالے یہاں تک کہ اپنی ماں تک کو مار ڈالا۔ سلیم انور کی تہ دم، خاص متاثر کن نہیں لگی۔ انصاف میں مارتھا نے رچرڈ سے خوب انصاف کیا واقعی وہ ہی لورین کا بالواسطہ قاتل تھا۔ محمد الیاس عشق بھلائے نہ بھولے، کے ساتھ موجود رہے، سچ کہا گیا ہے کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ بچپن میں دوسروں کی چیزیں اپنے زیر تسلط لاتے لاتے چھوٹے بھائی کی دولت اور محبت پر بھی قابض ہو گیا۔ باہر رہنے والوں کا بہر حال کسی پر بھی اندھا اعتماد کرنا ایسی صورتحال کا ہی سبب بنتا ہے۔ بابر نسیم مختصری چلتر لے کر آئے جو عورت کے چلتر پن کا شکار ایک اور مرد کی کہانی تھی۔ ایچ اقبال کی آخری مرحلہ ابھی زیر مطالعہ ہے سو تبصرہ سے معذرت۔ محفل شعر و سخن میں سوہالا ہو، ابرار وارث اور زیڈ اے نیازی کا انتخاب اچھا تھا، کترنیں بھی کافی مقدار میں اور معیاری تھیں۔"

☩ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ سے "ماہ صیام کے بابرکت ایام رب دو جہاں نے اپنی رحمتوں کے تمام دروازے کھول دیے ہیں۔ امت مسلمہ کو دعوت خاص و عام دی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ بصد خلوص و عقیدت آئے اور رب عظیم کی رحمتوں کا میلہ لوٹ لے۔ سرورق پر یرقان زدہ سی دوشیزہ سرورق کے سامنے والے دو دانت نمایاں طور پر بطور اشتہار پیش کیے گئے۔ اوپر کونے میں بے ہنگم سا نمونہ بنانے کی کیا تک تھی؟ انشائیہ میں جون ایلیا کی خواہش ناتمام کو دیوانے کا خواب کہہ لینے میں یقیناً کوئی حرج نہیں۔ مسند صدارت پر ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی محنت، کوشش اور کاوش قابل تحسین و داد ہے۔ اور ہم نے تو سنا ہے ماہا ایمان کو سلیکشن کے بعد انکیشن بھی ہو چکا ہے واللہ عالم بالصواب۔ کرسی وزارت پر بیٹھ کر ایسے ہی مشورے سرکار کے گوش گزار نا چاہئیں لیکن حکام بالا ہوں وزیر اعلیٰ یا مدیر اعلیٰ سنا ہے کہ سنتے ہیں اور اگر خدانخواستہ کبھی سن بھی لیں تو فوراً بھول جاتے ہیں۔ لاہور سے زویا اعجاز، آپ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ آپ کس عہد قدیم میں میٹرک میں ہیٹ ٹرک کر رہی تھیں غالباً 70ء کی دہائی میں۔ کھاریاں سے بابر عباس کی خصوصی شرکت باعث مسرت و افتخار ثابت ہوئی۔ لیہ کے سید محی الدین اشفاق، اللہ آپ کو اور دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ناصر ملک کے قلم کا شاہکار سازشوں کی غلام گردش میں بھٹکتے ہوئے بے سمت مسافروں کا احوال قلزم ہستی میں تنکوں کی طرح بکھر جانے والوں کے تلخ و سفاک شب و روز چندو ماہی کی داستان دلخراش نے مغموم و مضطرب کر دیا۔ ابتدائی صفحات کی خاص سوغات۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی پر اثر معلوماتی اور سبق آموز تحریر و تحقیق۔ زخم گل تاریخ کے ایک اہم باب اور معتبر شخصیت سے آگاہی ہوئی۔ کشکول میں پر اسراریت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔ بہر حال اگر اسے جرائم اور پولیس کے تناظر میں دیکھا جائے تو بہترین ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی مسموم و سفاک تحریر زہر باد۔ والدین کا رویہ اور گھر کا ماحول بچوں کے ذہن و قلب اور پندار شخصیت پر بہت گہرے منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ والد تو شفقت، محبت اور عاطفت کا نام ہے۔ بہترین مصنف کاشف زبیر کی بہترین تحریر و تخلیص خوف محبت رہی کی عمدہ پرفارمنس اور ایلس کی بہترین کارکردگی نے متاثر کیا۔ مرزا امجد بیگ کا ایک اور کامیاب کیس۔ منہ زور، نہایت دلچسپ اور عبرت آمیز رہا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تلخ تحریر واپسی بھی خوب رہی۔ عشق بھلائے نہ بھولے، حضرت عشق کی کج ادائیاں، کرم فرمائیاں۔ عشق حد سے گزرتا ہے تو حد کرتا ہے۔ چلتر، تہ دم اور انصاف نے بھی بور نہیں کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کے ایمان افروز سلسلے کی ایک اور کڑی پسند آئی۔ آخری صفحات کی خاص ترین کہانی ہمایوں اقبال کی آخری مرحلہ جذبۂ محبت کی مثلث کا پراثر فسانہ۔ فروزاں کی اندھی محبت۔ بختیار کی بے لوث و بے مثل وفا۔ اور کنور تمکین کی منافقت حرص و ہوس بہترین انجام نے مطمئن بھی کیا اور متاثر بھی۔"

☩ مظہر سلیم، رحیم یار خان سے "22 جون کو سسپنس سامنے آیا۔ ہم نے اس عرصۂ وصال کو غنیمت جانا اک نعمت غیر مترقبہ تصور کیا۔ پاکستان میں بالخصوص بلوچستان، زیارت اور کراچی میں برپا ہونے والے خونیں واقعات نے ایک دنیا کو حیرت ہے، نجانے کون سے شرپسند عناصر ہیں جو ماؤں کی گود اجاڑ رہے ہیں۔ کئی سہاگنوں کے سہاگ چھین رہے ہیں، کئی بچوں کو یتیمی کا داغ سہنے پر مجبور کر رہے ہیں، تاریخی املاک کو تباہ کن ہتھیاروں سے زمین بوس کر رہے ہیں۔ رب کائنات سے دعا ہے کہ وہ پاک ذات ہم سب کا حامی و ناصر ہو آمین! جی ہاں سرورق پر دو رنگی چوڑیاں والی حسینہ نجانے کن سوچوں میں غلطاں نظر آئی۔ جون ایلیا کی خواہش کا احترام کیا۔ آپ کے خط، میں آپ کا اداریہ پڑھ کر خود کو آپ کے انداز فکر سے متفق پایا۔ خطوط میں اعجاز احمد راحیل نے خوبصورت لفظوں کا جال بچھا کر پچھلے ماہ کے صدر شیر علی خان کو شکار کیا اور ان سے صدارت کی کرسی چھین کر خود قابض ہو گئے۔ ہمایوں سعید آپ نے جس کتنے پر غیر معمولی حد تک ناقص رائے کا اظہار کیا ہے اس پر اپنی ناقص رائے تو سعدیہ بخاری اور ماہا ایمان ہی دے سکتی ہیں۔ اور یہ اپنے بابر عباس صاحب، آپ کے من موہنی جاپانی حسینہ کا اپنی کسی کلاس فیلو سے موازنہ کرتے وقت پاس بیٹھی آپ کی زوجہ نے رقیبانہ جذبات سے مغلوب ہو کر آپ سے کہا کچھ نہیں؟ زویا اعجاز نے میٹرک سے سسپنس پڑھنے والی بات کر کے اپنی عمر کی طرف اشارہ کیا ہے تو ان کی سسپنس سے رغبت اس بات کی غماز ہے کہ محترمہ 1973ء سے سسپنس کا مطالعہ فرما رہی ہیں۔ رضوان تنولی، تفسیر عباس بابر اور محفل میں وارد ہونے والی نئی تبصرہ نگار فضا خان نے بھی خطوط کی محفل میں گویا فضائی جائزہ لیا۔ سید محی الدین اشفاق صاحب آپ کے والدین کی رحلت کے بارے میں پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، ناصر ملک صاحب خون دل سے لکھی گئی اس داستان میں آپ کیوں ہمیں خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ خواہشوں کو کرچی کرچی ہوتے دکھایا ہے۔ چندو ماہی کے احساسات کی بھرپور ترجمانی کرنا لائق تحسین ہے۔ تاریخی کہانی زخم گل ڈاکٹر ساجد امجد کے مشاق قلم سے لکھی گئی داستان میں ایک عام آدمی کو کن کا تاجدار بنتے دیکھا۔ جس نے عام آدمی سے تاجدار بننے کے بعد تمام نظاموں کو خوش اسلوبی سے چلایا۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضمون شمع فروزاں میں حضرت ابوبکرؓ کے حالات زندگی پڑھ کر قلب منور ہو گیا۔ منہ زور میں مرزا امجد بیگ صاحب نے اپنے بھرپور دلائل سے نادرہ کے اصل قاتل بشارت کو عدالت کے روبرو کھڑا کر کے بے نقاب کیا۔ کشکول میں اورنگزیب اور سراج کی مشکلات ہنوز جاری ہیں جبکہ لیاقت حسین نے ایک بار پھر خود کو لوہے کا چنا ثابت کیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی زہر باد پڑھ کر کافی دیر ان کی مشاق قلم کے سحر میں ڈوبے رہے۔ ایم الیاس کی عشق بھلائے نہ بھولے نے بچپن کی یادیں تازہ کر دیں، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی واپسی اچھی لگی۔ کاشف زبیر کی خوف محبت ہمیشہ یاد رہ جانے والی تحریروں

میں سے ایک تھی۔ اس مرتبہ ترجمہ کہانیاں بھی اچھی رہیں۔ آخری صفحات کا توشۂ خاص آخری مرحلہ ایچ اقبال کی خاص تحریر تھی فروزاں نے بختیار کا بھرپور ساتھ دیا تو بختیار اپنے کیے کا کفارہ ادا کر سکا۔ کترنیں بھی خوب رہیں۔"

☩ بابر عباس اہلخانہ سمیت، کھاریاں سے لکھتے ہیں "مرچی سسپنس کا نیا شمارہ جولائی 2013ء بڑی جان لیوا تگ و دو کے بعد جون کی ایک سرد دوپہری 19 تاریخ کو ملا۔ اس بار ذاکر صاحب نے اپنے فن کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ ایک خرانٹ قسم کی عورت کو پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے دکھلایا ہے، جو اپنی عمر کو بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر سر پر ہاتھ رکھے پریشان ہے۔ کونے میں موجود صنف وجاہت سے تعلق رکھنے والا غربت کا مارا بندہ مجھے ہمایوں سعید لگا جس کو ویسے صنف مخالف سے ہمدردی کا زیادہ شوق ہے۔ جون ایلیا مرحوم صاحب کے بارے میں اکثر یہ کہتا ہوں کہ ان جیسی شخصیت دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتی ان کے انشائیے نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں، خواہش بھی ان کا ایک ایسا ہی انشائیہ ہے۔ سر آپ کو بھی آپ کے ساتھ سسپنس کے دیگر اراکین کو بھی ماہ رمضان کی آمد مبارک ہو۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ ماہ رمضان کا بابرکت مہینا خیریت سے گزر جائے۔ یہ مٹھی بھر دہشت گرد ہمارے جذبوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم زندہ قوم ہیں پائندہ قوم ہیں ہم سب کی ہے پہچان ہمارا پاکستان۔ اس بار کرسی صدارت پر ایک ماہ کے لیے ساہیوال سے ہمارے پیارے دوست اور شاعر شال۔ بھایا چوہدری اعجاز احمد راحیل صاحب، تبصرہ زبردست تھا کیونکہ اس میں میرا ذکر بھی تھا بیٹا اختر عباس تھراج محی الدین نواب صاحب ایک پرفیکٹ رائٹر ہیں نواب صاحب اپنے قلم سے مکمل انصاف کرنے والے انسان ہیں۔ قیصر اقبال بچہ میرا مطلب ہے کہ اب آپ اتنی بھی لمبی لمبی نہ چھوڑیں۔ محمد جاوید شبیر صاحب مئی اور جون میں سخت گرمی ہی ہوتی ہے نہ کہ سردی، بچوں والی باتیں مت کیا کریں۔ تصویر العین آپ نے خلوص دل سے تفسیر عباس بابر کو یاد کیا تو جناب بھی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گئے۔ سعید بیٹا میری بیگم مجھ سے لڑتی بھی ہے اور خوش بھی ہوتی ہے شادی کر دو گے تو پتا چلے گا، باقی تم بھلا کیسے کہہ سکتے ہو میرے مسٹس بچوں والے ہوتے ہیں۔ مظہر سلیم صاحب زادے کیا تمہیں کسی نے بزرگوں کا احترام کرنا نہیں سکھایا بیٹا ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ محمد تقی عباس بیٹا بہت بہت شکریہ تم نے ہم بوڑھوں کو خوش رہنے کی دعا دی۔ خدا جلد از جلد اس اذیت خانے سے رہائی دلائے آمین۔ چوہدری احمد یار خان صاحب بیوی بیوی ہوتی ہے چاہے گریڈ 18 کی ملازم ہو یا گھریلو، آپ کیوں جلتے ہیں۔ فضا خان صاحبہ آپ کو بھلا کس پاگل نے کہہ دیا تھا کہ محفل میں حاضر ہوں، اچھا اچھا دل نے...... دل تو پاگل دل دیوانہ ہے۔ شاہ جی آپ کے والد صاحب کا پڑھ کر بڑا افسوس ہوا۔ رمضان پاشا صاحب اس بات سے لگتا ہے کہ آپ کا تعلق آثار قدیمہ سے ہے۔ ابرار وارث صاحب آپ واقعی امن پسند ہیں۔ ہر دل عزیز شخصیت علامہ تفسیر عباس بابر آف اوکاڑوی جناب آپ کا انتظار محفل میں ہم بھی کو رہتا ہے۔ یہ قدیم مخلوق ہی تھی جس سے محفل میں رونق رہتی تھی تیز و تند جملوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا نئی پود میں وہ دم خم نہیں ہے۔ سر جی اس میں کوئی شک نہیں، آپ کی مہربانی سے سسپنس کے قارئین ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔ اس بار آغاز مسافر سے کیا جس میں میڈم شکیلہ عرف چندو ماہی ابھی تک شہریار کو اپنی کہانی سنا رہی ہے آخر میں چندو ماہی کے آپ کہنے نے دل میں تجسس پیدا کر دیا ہے اب تو بڑی بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ مرزا امجد بیگ صاحب کا کیس حسام بٹ صاحب کی تحریر میں منہ زور اور حسب معمول بیگ صاحب نے ایک اور کیس جیت لیا۔ آخری صفحات کی سوغات ایک اور زبردست رائٹر، ایک اور زبردست کہانی بلکہ یادگار کہانی ایچ اقبال صاحب کی تحریر کردہ آخری مرحلہ، ویل ڈن! آپ کی تخلیق آخری مرحلہ نے بڑا متاثر کیا۔ آغاز سفر کی کہانی ڈاکٹر ساجد امجد کی زبانی یعنی کہ شروع کے صفحات پر حسب معمول ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر اپنی تاریخی کہانی زخم گل کے ساتھ موجود تھے۔"

☩ گل مروت، لکی مروت سے "سسپنس کی محفل میں شرکت کے لیے پہلی بار خط لکھ رہی ہوں (خوش آمدید) جولائی کا رسالہ 20 جون کو ہاتھ لگا، حسینہ کو ایسے دکھایا گیا ہے جیسے گھڑ دوڑ میں اس کا گھوڑا بری طرح ہار رہا ہو۔ جون ایلیا مرحوم کی خواہش پڑھ کر اپنی محفل میں آ کر دیکھا تو اعجاز راحیل بھائی کو پہلی پوزیشن پر دیکھا، ویسے بھی راحیل بھائی سسپنس ڈائجسٹ کی جتنی تعریف کر رہے تھے تو صدارت تو ملنا ہی تھی۔ زویا اعجاز نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے کس سن میں میٹرک کیا تھا سن 1935ء یا 1940ء۔ قیصر اقبال بھائی کے کیا کہنے، زویا اعجاز کا اتنا اچھا تبصرہ بھی موصوف کو پسند نہیں آیا۔ تصویر العین نے سسپنس اور بجلی آنے کی خوشی کو اچھے لفظوں میں کمپیئر کیا ہے۔ بابر عباس بھائی کا تبصرہ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ عبدالغفور بھائی خوردبین لگا کر حسینہ کی خامی کو تلاش کرنے میں کامیاب رہے۔ ملک بھائی کو بس اتنا کہنا ہے کہ چوڑیاں وغیرہ نہ بھی ہوں بس شکل صورت اچھی ہونا چاہیے۔ زارا خان اور فضا خان ہماری طرح نئی نئی وارد ہوئی ہیں ان سے التماس کہ آتی رہا کریں۔ رمضان پاشا انکل نے اچھا کیا جو بتا دیا ورنہ ہم انہیں تو جوان ہی سمجھ رہے تھے۔ ابرار وارث کو مشورہ کہ دل کی آبیاری کیا کریں ورنہ آپ کے گارڈن گارڈن کے پھول کملا جائیں گے۔ تفسیر بھائی کے خط کو دیکھ کر اور پڑھ کر اچھا لگتا ہے، ویسے آج کل تفسیر بھائی اور ماہا ایمان کی نوک جھونک ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ اب ذکر کرتے ہیں مسافر کا، ناصر ملک صاحب نے کہانی کے اندر ایک اور کہانی کو خوب انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ چندو ماہی کی کہانی اصل کہانی سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ آخری صفحات پر آخری مرحلہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ کہانی نے پوری طرح اپنے حصار میں لیے رکھا۔ بختیار کے آخری فیصلے نے کہانی میں پازیٹو احساس دلایا اور فروزاں کی تو بے بلے۔ اس نے بھی بروقت فیصلہ کر دکھایا۔ مرزا صاحب کی منہ زور عدالت کی کارروائی اور رموز سے آگاہی ہوئی۔ جرح کے حربے لوٹنے اور مرزا صاحب کی محنت رنگ لائی اور ایک بے گناہ کو رہائی ملی۔ زہر باد میں ایک سخت گیر باپ کو دکھایا گیا جسے اپنے غصے پر قابو نہیں تھا ایسے ہی ایک باپ کو ہم بھی جانتے ہیں لیکن وہ اتنا سفاک نہیں ہے۔ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے رسالہ پورا نہیں پڑھ سکی ہوں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

عاصم اقبال، جہال۔ سالم جمیل سرگودھا۔ محمد صفدر، خانیوال۔ مہرین ناز، حیدر آباد۔ یونس احمد کراچی۔ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ مسعود احمد خانزادہ، نوشہرو فیروز۔ افتخار حسین اعوان، مظفر آباد، آزاد کشمیر۔ ایم کامران خالد، چھب اٹک۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

چاند سلطان

ڈاکٹر ساجد امجد

آسمان رنگ بدلتا ہے... سمندر کی لہریں کروٹ لیتی ہیں... حالات پلٹا کھاتے ہیں... اور پھر آتے جاتے موسم کائنات کے دائرے میں رونما ہونے والی تبدیلی کا پتا دیتے ہیں لیکن اس دائرے کے گرد کھنچی لکیر ویسی ہی رہتی ہے... البتہ ان تبدیلیوں کی وجہ میں ایک طاقت کارفرما نظر آتی ہے... پھر یہی طاقت ور ہاتھ حکمرانوں کے روپ میں ڈھل کر ایک عہد ترتیب دیتے ہیں... عقل مندوں کے نزدیک گزشتہ دنوں کے آئینے میں ہمیشہ آنے والے کل کا عکس محفوظ ہوتا ہے بشرطیکہ دیکھنے والی نگاہ ہو اور جس کا عکس جتنا مضبوط اور واضح ہوتا ہے اس کی یاد اتنی ہی دیرپا ہوتی ہے۔ ان تمام شبیہوں میں طبقہ اشرافیہ کے معاملات نے تاریخ میں ہمیشہ نمایاں مقام حاصل کیا ہے... اقتدار کی جنگ، طاقت کا حصول، لرزہ خیز واقعات اور سنسنی خیز حالات نے مل کر ہمیشہ ایک یادگار داستان رقم کی ہے... اور اگر خوش بختی سے ان صاحبِ اقتدار شخصیات کو مخلص اور دانش مند احباب کی صحبت بھی نصیب ہوجائے تو ترقی ایسے شاہوں کے قدم چومتی ہے مگر بعض اوقات خود پسندی، اور اپنی ذہانت پر اندھا اعتماد انہیں بھنور میں بھی لے آتا ہے۔ بدقسمتی سے شاہوں کے گرد ہمیشہ چاہنے والے مخلص احباب کے ساتھ ساتھ شرپسند، سازشی ساتھیوں کا اجتماع بھی رہتا ہے ایسے میں سب کچھ بدل جاتا ہے مگر پھر بھی منظر پہلے جیسا ہی نظر آتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

WWW.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY.COM

جنوبی ہندوستان کی واحد ہندو ریاست کا راجا رام راج تعصب اور نفرت کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ اس کا بھائی تنگنا دری اس کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔ سامنے اس کی راج گدی کے اہم لوگ اس انتظار میں خاموش بیٹھے تھے کہ رام راج کچھ کہنے کے لیے اپنے ہونٹ کھولے تو معلوم ہو کہ اس نے کس لیے ہم سب کو یہاں بلایا ہے۔

رام راج کو اپنے دونوں بیٹوں کا انتظار تھا۔ جب وہ بھی آچکے تو رام راج نے سب کو مخاطب کیا۔ اس کی آواز میں شامل زہر سب کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

”آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ مغل پایۂ دکن کی تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ہماری مملکت بے جانگران کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اتنی بڑی طاقت کا ہم اکیلے مقابلہ نہیں کر سکتے جبکہ ہمیں اپنے پڑوس کی تین مسلم ریاستوں سے بھی یہی خطرہ ہے۔ اگر ہم تینوں مسلم ریاستوں کو ختم کر کے ایک عظیم ہندو مملکت قائم کرلیں تو مغلوں کو یہاں قدم دھرتے ہوئے سوچنا پڑے گا۔“

”مہاراج! کیا یہ کام اتنا ہی آسان ہے؟“

”کوئی کام آسان نہیں ہوتا لیکن عقل استعمال کرو تو سب ممکن ہو جاتا ہے۔“

”مہاراج! مملکتوں پر حملہ آور ہونے کے لیے تلواروں سے کام لینا ہوگا۔ کیا ہم عادل شاہیوں، قطب شاہیوں اور نظام شاہیوں سے بہ یک وقت لڑ سکتے ہیں؟ اگر ایک پر بھی حملہ کیا تو سب مسلمان ہونے کے ناتے اس کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔“ رام راج نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور پھر اپنے لوگوں کو مخاطب کیا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں عقل استعمال کرو۔ ہمیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو ایسا منتر پھونکوں گا کہ مسلمان آپس میں لڑ بھڑ کر ختم ہو جائیں گے۔“

”مہاراج، وہ منتر ہمیں بھی تو معلوم ہو تاکہ ہم اسی حساب سے تیاری کرلیں۔“

”راج سنگھاسن پر بیٹھنے والوں کے لیے قلعوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میں یہی داؤ چلوں گا۔ شولا پور اور کلیان کے قلعے یوسف عادل شاہ کے زمانے تک اور اس کے بعد بھی بے جاپور کی مملکت میں تھے پھر احمد نگر والوں نے ان پر زبردستی قبضہ کرلیا۔ اب میں بیجا پور کے موجودہ حکمران علی عادل شاہ کے پاس اپنا قاصد بھیجوں گا جو اسے یاد دلائے گا کہ یہ قلعے اس کے ہیں۔ وہ اگر چاہے تو ہماری مدد لے کر ان قلعوں کو بازیاب کروالے۔ اس طرح میں اسے احمد نگر پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دوں گا۔ بات قلعوں تک نہیں رہے گی۔ پورے احمد نگر کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ رہ گئی قطب شاہیوں کی سلطنت گولکنڈہ، اس پر ہم حملہ آور ہوں گے اور اسے اپنی مملکت میں شامل کرلیں گے۔ بعد میں بیجا پور کا بھی دھڑن تختہ کر ہی دیں گے۔ اس کی مدد کو پھر کون آئے گا۔“

”مہاراج کی جے ہو لیکن کیا عادل شاہ اپنے دھرم کے باسیوں کے خلاف لڑنے کو تیار ہو جائے گا؟“

”راج باسیوں کو دھرم باسیوں کی پروا نہیں ہوتی۔ علی عادل میری مدد کا آسرا پا کر ضرور تیار ہو جائے گا۔ یہ تو آپ لوگ بتائیں کہ میری تجویز سے اتفاق ہے یا نہیں؟“

کس کی مجال تھی جو اس کی تجویز سے اتفاق نہ کرتا۔ اپنا فائدہ بھی اسی میں نظر آرہا تھا لہٰذا اس کے بھائی اور بیٹوں سمیت تمام سالاروں نے اتفاق کیا۔ وہ اتفاق نہ بھی کرتے تو بھی رام راج فیصلہ کر ہی چکا تھا۔

☆☆☆

رام راج کا قاصد علی عادل شاہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ رام راج کا پیغام اس کے گوش گزار کر چکا تھا اور اب جواب کا منتظر تھا۔ اس پیغام کا جواب اتنا آسان نہیں تھا کہ علی عادل شاہ فوراً کسی فیصلے پر پہنچ جاتا۔ اسے یہ بھی دیکھنا تھا کہ انکار کی صورت میں رام راج کا ردعمل کیا ہوگا اور یہ بھی سوچنا تھا کہ رام راج اس پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس وقت قاصد کو رخصت کر دیا جائے اور امرا سے مشورے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچا جائے۔

قاصد کے رخصت ہونے کے بعد علی عادل شاہ کی خودسر طبیعت نے ضروری نہیں سمجھا کہ کسی سے مشورہ کیا جائے۔ شاید وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نکل آئے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے تیز رفتار قاصد والیِ احمد نگر حسین نظام شاہ کے پاس یہ پیغام لے کر بھیجا۔

”یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ کلیان اور شولا پور کے قلعے عادل شاہی خاندان سے متعلق ہیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کے عہدِ حکومت میں سلطنت میں خرابی پیدا ہوئی اور یہ قلعے نظام شاہیوں کے قبضے میں آگئے۔ اگر آپ نظام شاہی اور عادل شاہی خاندانوں میں دوستی اور اچھے مراسم کے خواہاں ہیں تو یہ دونوں قلعے مجھے واپس کر دیجیے۔ اگر دونوں قلعوں کی واپسی ممکن نہ ہو تو صرف کلیان کا قلعہ ہی واپس کردیں، بے حد ممنون

ہوں گا۔“

اس خط کے الفاظ نہایت نرم تھے لیکن حسین نظام شاہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ علی عادل شاہ، رام راج سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ وہ اس کے اس فعل سے خوش نہیں تھا۔ اس پیغام کے پیچھے بھی اسے رام راج کی شرارت نظر آرہی تھی لہٰذا اس نے اس خط کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

حسین نظام شاہ کے مصاحبِ خاص شاہ حسین انجو نے اس خط کو ملاحظہ کیا تو اندیشے اس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے، اس نے حسین نظام شاہ کو مشورہ دیا۔

”اگر آپ نے اس وقت یہ قلعے واپس نہیں کیے تو علی عادل پوری طرح رام راج کی مٹھی میں چلا جائے گا۔ اس وقت ضروری ہے کہ مسلمان ریاستیں متحد رہیں۔ قلعے واپس کر کے عادل شاہ سے دوستانہ مراسم استوار کرلیجیے۔“ اس کا مشورہ صائب تھا لیکن حسین نظام شاہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

یہ معاملہ طول کھینچتا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ علی عادل شاہ کا ایک اور خط پہنچ گیا۔ شاہ حسین انجو کے اندیشے مجسم ہو گئے۔ خط کی زبان بدلی ہوئی تھی۔

”ایسے اہم اور ضروری امور میں غفلت سے کام لینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اگر آپ عاقبت اندیشی اور انجام بینی کو مدِنظر رکھ کر یہ دونوں قلعے مجھے واپس کر دیں تو ہم میں خوشگوار مراسم پیدا ہو جائیں گے بصورتِ دیگر آپ یقین کیجیے کہ میرا لشکر آپ کی رعایا اور آپ کے ملک کا برا حال کر دے گا اور ایک فتنۂ عظیم پیدا ہو جائے گا۔“

یہ خط ایسا نہیں تھا کہ جسے پڑھ کر حسین نظام خاموش رہ جاتا۔ اس نے قاصد کا خیال کیے بغیر علی عادل کی شان میں ایسی گستاخیاں کیں جو تہذیب و متانت کے خلاف تھیں۔ قاصد پر بھی ایسی برہمی کا اظہار کیا کہ اسے اپنی جان کا خطرہ ہو گیا اور وہ احمد نگر سے فرار ہو کر بیجا پور پہنچ گیا اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔

اب مصالحت کی ہر امید ختم ہو گئی تھی۔ اس نے احمد نگر پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ رام راج کو بھی پیغام بھجوا دیا کہ وہ اس کی مدد کے لیے تیار رہے۔

رام راج کی ہنسی اور زیادہ مکروہ ہو گئی۔ ”علی عادل بالآخر میرے جال میں پھنس گیا۔ اب دیکھو میں مسلمانوں کا کیا حال کرتا ہوں۔“

علی عادل نے اعلانِ جنگ کے لیے اپنے جھنڈے کا رنگ تبدیل کر دیا۔ پہلے زرد تھا اب نظام شاہیوں کی طرح سبز رنگ اختیار کرلیا اور حسین نظام شاہ کو پیغام بھجوا دیا۔

”اگر تم میں ہمت ہے تو اپنا نشان مجھ سے چھین لو۔“

دکن کی رسم تھی کہ ایک فرماں روا کا نشان دوسرا اختیار نہیں کر سکتا تھا اور جب رنگ تبدیل کیا جاتا تو اس کا مقصد جنگ کرنا ہوتا تھا۔ رنگ کی تبدیلی نے حسین نظام شاہ کو چوکنا کر دیا۔ اس نے ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔

علی عادل کا اشارہ پاتے ہی رام راج اپنا لشکر لے کر بیجا پور کے نواح میں پہنچ گیا۔ علی عادل بھی اس کے ساتھ آکر مل گیا اور دونوں احمد نگر کی طرف بڑھے۔

رام راج کی مراد بر آئی تھی۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی تباہی تھا اور علی عادل شاہ نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ یہ دونوں لشکر جب احمد نگر کی طرف روانہ ہوئے تو پرندہ سے جنیر تک اور احمد آباد سے دولت آباد تک تباہی و بربادی کا بازار گرم ہو گیا۔ بیجانگر کے ہندو ایک عرصے سے ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ خوب جی کھول کر ظلم و ستم کیے۔ مسجدوں اور قرآنوں تک کو نذرِ آتش کر دیا۔ علی عادل شاہ ان مظالم کو دیکھتا رہا اور خاموش رہا حالانکہ رام راج سے اس نے عہد لیا تھا کہ مسلمان آبادیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا لیکن اب اس کی ہمت نہیں تھی کہ رام راج کو روکتا۔

حسین نظام نے جب دیکھا کہ دونوں دشمن متحد ہو کر اس کی تباہی پر تل گئے ہیں اور وہ ان سے مقابلے پر عاجز ہے تو اس نے قلعہ کلیان علی عادل کے حوالے کر دیا۔ جنگ ملتوی ہو گئی۔ رام راج اور علی عادل اپنے اپنے ملک کو واپس چلے گئے۔ واپس ہوتے ہوتے بھی رام راج نے مسلمان علاقوں کو خوب لوٹا۔

حسین نظام شاہ نے صلح کرلی تھی لیکن یہ مجبوری کا سودا تھا۔ اس صلح میں اس کی خوشی شامل نہیں تھی۔ وہ مسلسل اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح اپنی طاقت کو بڑھایا جائے تاکہ علی عادل اور رام راج کا مقابلہ کر سکے۔ حسین نظام شاہ نے اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے قطب شاہیوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ حسین نظام کی دو بیٹیاں تھیں۔ بی بی جمال اور چاند بی بی۔ اس نے بڑی بیٹی بی بی جمال کی شادی گولکنڈہ کے حکمران قطب شاہ سے کر دی۔

بیجا پور کے علی عادل نے اسے اپنے لیے ایک خطرناک اقدام سمجھا۔ اس سے زیادہ رام راج کے لیے یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ اب احمد نگر اکیلا نہیں تھا، قطب شاہ بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے ساتھ تھا۔
علی عادل شاہ نے سو سواروں کو ساتھ لیا اور اپنے ایک امیر کشور خاں کے ہمراہ بیجانگر پہنچ گیا۔ رام راج کے دربار میں پہنچ کر اس نے تمام حالات اس کے سامنے رکھ دیے۔
’’حسین نظام نے اپنی بیٹی کی شادی قطب شاہ سے کردی ہے۔ دونوں کے درمیان ایک رشتہ طے ہوگیا ہے۔ یہ ہمارے لیے اچھا شگون نہیں ہے۔ یہ دونوں مملکتیں یکجا ہوکر ہمارے خلاف حرکت میں آسکتی ہیں۔‘‘
’’میرے بھائی تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔‘‘ رام راج نے کہا۔ ’’اس سے پہلے کہ سانپ اپنا پھن اٹھائے اسے کچل دینا چاہیے۔‘‘
’’رام راج میں کچھ سمجھا نہیں؟‘‘
’’میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ حسین نظام کی باتوں میں مت آؤ۔ تم نے میری مرضی کے بغیر اس سے صلح کرلی اور اسے اتنا وقت دے دیا کہ وہ قطب شاہیوں سے ساز باز کرسکے۔ بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اچانک احمد نگر پر حملہ کردیں۔‘‘
’’کیا قطب شاہ اس کی مدد کو نہیں پہنچے گا؟‘‘
’’یہ حملہ اتنی رازداری سے ہوگا کہ اگر قطب شاہ اس کی مدد کو پہنچا بھی تو بہت دیر ہوچکے گی اور وہ ہماری طاقت کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔‘‘
علی عادل کی ہمت اب بھی نہیں ہورہی تھی لیکن رام راج کی ہوسِ اقتدار اسے جلد بازی پر مجبور کررہی تھی۔ وہ پچاس ہزار سواروں اور دو لاکھ پیادوں کے ساتھ علی عادل شاہ سے آملا۔ تقریباً اتنا ہی لشکر علی عادل کے پاس بھی تھا۔ حسین نظام کو اس تیاری کی خبر ملی تو اس نے قطب شاہ کو گولکنڈہ سے اپنے پاس بلالیا جو اپنے لشکر کے ہمراہ احمد نگر پہنچ گیا۔
احمد نگر کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے علی عادل اور رام راج کے لشکر نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ حسین نظام اور ابراہیم قطب شاہ نے آپس میں مشورے سے طے کیا کہ دشمن پر شب خون مارا جائے اور یہ ایسا بھرپور ہو کہ علی عادل کا متحدہ لشکر نقصان اٹھا کر واپس ہونے پر مجبور ہوجائے۔
اس شب خون کے لیے قطب شاہ کے سالار مصطفیٰ خاں اور حسین نظام کے سالار رستم خاں حبشی کا انتخاب کیا گیا۔ دونوں سالاروں کے پاس اپنے اپنے لشکر تھے جو رات ہوتے ہی متحرک ہوگئے۔ اندھیرے میں اندھیرا بن کر آگے بڑھتے گئے۔
علی عادل کے پڑاؤ میں نیند کا غلبہ ہوا تو دونوں سالار اپنے اپنے لشکروں کو لے کر دو مختلف سمتوں سے ٹوٹ پڑے۔ نیند میں ڈوبے ہوئے فوجی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ گاجر مولی کی طرح کٹ کر رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ رام راج کا سپہ سالار روسواس راؤ اور علی عادل کا سپہ سالار مرتضیٰ خاں حرکت میں آتے، شب خون مارنے والوں نے اپنا کام مکمل کیا اور احمد نگر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ صحیح سلامت احمد نگر تک پہنچ گئے۔ حسین نظام شاہ کے محل میں خوشی کے شادیانے بج گئے۔ شب خون کامیاب ہوگیا تھا اور اب یہی اندازہ کیا جارہا تھا کہ اتنا نقصان اٹھانے کے بعد دونوں لشکر بیجاپور اور بیجانگر کی طرف لوٹ جائیں گے۔
حسین نظام شاہ نے ایک جنگی چال چلی اور اپنے داماد ابراہیم قطب شاہ کو اپنے پاس بلالیا۔
’’میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم گولکنڈہ واپس چلے جاؤ اور اپنی عسکری طاقت کو محفوظ رکھو جو کسی وقت بھی میرے کام آسکتی ہے۔ اول تو علی عادل کی اب اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ احمد نگر کی طرف قدم بڑھائے اور اگر بالفرض وہ ایسا کرتا ہے تو میں نے احمد نگر کی حفاظت کا بندوبست کرلیا ہے۔ وہ محاصرے پر مجبور ہوجائے گا۔ تم جب محاصرے کا سنو تو گولکنڈہ سے اپنا لشکر لے آنا۔ وہ دونوں طرف سے گھر کر رہ جائے گا۔‘‘
ابراہیم قطب شاہ نے اس کی بات مان لی اور لشکر لے کر نکل گیا۔
حسین نظام نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رستم شاہ حبشی سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے بھی احمد نگر خالی کردیا۔ رستم خاں کو احمد نگر کی حفاظت پر مقرر کیا اور خود اپنے بیٹے مرتضیٰ خاں کے ساتھ جنیر شہر پہنچ گیا۔ حکمت عملی یہی تھی کہ اگر محاصرہ ہوا تو وہ اور ابراہیم قطب شاہ باہر سے حملہ آور ہوجائیں گے۔ اندر سے رستم خاں تیر اندازی کرے گا۔ یہ سہ طرفہ حملہ ہوگا علی عادل جس کی تاب نہیں لاسکے گا۔
قطب شاہ خطرات سے بے پروا ہوکر گولکنڈہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دشمن کا لشکر شب خون کے مقام سے آگے بڑھ آیا ہوگا۔ اس کی قسمت کہ وہ اس وقت دشمن کے لشکر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ چند پہاڑیاں حائل تھیں اس لیے وہ علی عادل کے لشکر کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ اس کے لشکر کے قدم تو اس وقت رک گئے جب انہوں نے دو سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ یہ صرف دو تھے اس لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔
’’تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟‘‘ قطب شاہ کے ایک امیر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔
’’ہم کوئی بھی ہوں، ہمیں ابراہیم قطب شاہ کے پاس لے چلو۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے اسی سے کہیں گے۔‘‘
’’زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں، جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔‘‘
’’ہم صرف دو ہیں، کوئی چالاکی کرکے ہم اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالیں گے۔‘‘
ان کی بات مناسب تھی لہٰذا ابراہیم قطب شاہ کے ہاتھی کے پاس پہنچا دیا گیا۔ سپاہی ان دونوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔
’’ہم جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ سپاہیوں کی موجودگی میں نہیں کہہ سکتے۔‘‘
ابراہیم قطب شاہ نے سپاہیوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور فیل بان کو حکم دیا کہ ہاتھی کو نیچے بٹھا دیا جائے۔ سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔ ہاتھی نیچے بیٹھ گیا۔
’’ہم علی عادل شاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے قاصد ہیں۔‘‘
’’کیا پیغام لے کر آئے ہو؟‘‘
’’ہمیں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ آپ اپنے لشکر کو لے کر گولکنڈہ نہ جائیں بلکہ علی عادل اور رام راج کے ساتھ مل جائیں۔‘‘
’’یہ بات تم اتنی آسان سمجھتے ہو۔ اگر علی عادل ایک ہندو راجا کو ساتھ لے کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا ہے تو کیا میں بھی اس کا ساتھ دوں؟‘‘
’’اعلیٰ حضرت، ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم سے تو یہ کہا گیا ہے کہ اگر آپ انکار فرمائیں تو آپ کو یہ پیغام بھی پہنچا دیا جائے کہ اگر آپ گولکنڈہ چلے گئے تو علی عادل اور رام راج دونوں احمد نگر کو چھوڑ کر گولکنڈہ پر حملہ آور ہوجائیں گے۔ آپ اپنی سلطنت بچالیں یا اپنا سسر حسین نظام شاہ۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔‘‘
قطب شاہ نے بے بسی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس کا معمولی لشکر ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ گولکنڈہ کا دفاع کرسکتا جبکہ یہ امید بھی نہیں تھی کہ حسین نظام شاہ اس کی مدد کو پہنچ سکے۔ اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور اپنے لشکر کا رخ علی عادل کی لشکر گاہ کی طرف موڑ دیا۔
علی عادل نے خود آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اسے اپنی مسند پر بٹھایا۔ اسے طرح طرح کے لالچ دیے۔ یہی لالچ بہت بڑا تھا کہ گولکنڈہ محفوظ رہے گا۔ وہ دل سے تو اس کے ساتھ نہیں ہوا لیکن مجبوری تھی۔
اب رام راج کی سوچ کے مطابق تین طاقتیں ایک ساتھ مل گئی تھیں یعنی وہ خود، عادل شاہ اور قطب شاہ لہٰذا اس نے اپنے لشکر کو لوٹ مار کی کھلی اجازت دے دی۔ ان لشکریوں نے دل کھول کر مسلمان آبادیوں میں قتل عام کیا۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی مسجدوں کی بے حرمتی کی اور گھروں کو لوٹا۔
ملک کو تباہ و برباد کرتا ہوا احمد نگر کے قریب پہنچ گیا۔ قطب شاہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کے ساتھ تھا۔ علی عادل شاہ نے آگے بڑھ کر پایۂ تخت کا محاصرہ کرلیا۔ رام راج کے لشکری آس پاس کے دیہات میں گھس گئے اور انہیں تہس نہس کردیا۔
محاصرہ طول کھینچنے لگا، اہل شہر کے لیے غلے کا قحط پڑنے لگا۔ بارشیں بھی ہونے لگیں۔ راستے کیچڑ بن گئے جس سے عادل شاہ کے لشکر میں بھی غلے کی کمی ہونے لگی۔
قطب شاہ بہ ظاہر علی عادل شاہ کے ساتھ تھا لیکن اس کا دل اپنی سسرال احمد نگر کے ساتھ تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بارش کی وجہ سے شہر میں غلہ پہنچنے میں تاخیر ہورہی ہے اور اہل قلعہ سخت مشکل میں ہیں تو اس نے وہ کام کیا جو وہی کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے لشکریوں کو ساتھ ملایا اور راتوں رات کے وقت جب محاصرہ کرنے والے بھی تھک کر سو گئے، علی عادل شاہ کے ذخیرے سے اناج کی بوریاں اٹھا کر احمد نگر شہر میں منتقل کردیں اور پھر یہ روز کا معمول ہوگیا۔ چند ہی روز میں عادل شاہ اور رام راج کے ذخیرے خالی ہونے لگے۔ رام راج کے سپاہی کھڑی فصلوں کو جلا چکے تھے۔ ارد گرد کے دیہات میں جتنا اناج تھا لوٹ کر لا چکے تھے۔ اب کہیں سے کچھ ملنے کی امید نہیں تھی۔ اب یہ کوششیں ہونے لگیں کہ جلد از جلد شہر فتح کرلیا جائے لیکن شہر کا بندوبست رستم خاں حبشی جیسے بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ عادل شاہ اور رام راج کے لشکری شہر پناہ کے جس حصے پر حملہ آور ہوتے ایسی سخت مدافعت کا سامنا کرنا پڑتا کہ سخت نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑتا۔ بارشوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اناج کے ذخیرے خالی ہوگئے تھے۔ علی عادل شاہ نے ان خطرات کو اچھی طرح سمجھ لیا اور انجام صاف نظر آنے لگا۔ اس نے ان خطرات سے رام راج کو بھی آگاہ کیا۔ رام راج کو بھی اپنے لشکر کی تباہی صاف نظر آنے لگی۔ دونوں رہنماؤں نے اسی میں عافیت جانی کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ واپسی کا سفر بڑا اداس تھا۔ دونوں فرماں روا سر جھکائے اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ چلے جارہے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھ آئی فتح ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو کھمبا ہی نوچا جائے کے مصداق رام راج کے ذہن میں ایک اور خیال نے سر اٹھایا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا علی عادل کے قریب آ گیا۔

"اس وقت دونوں لشکر بھی تیار ہیں اور تیاری بھی مکمل ہے۔" رام راج نے کہا۔ "کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم اپنے علاقوں کی طرف جانے کے بجائے شولاپور کا رخ کریں اور قلعے پر قابض ہوجائیں۔ اس وقت حسین نظام شاہ میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ہمارا تعاقب کرتا ہوا شولاپور پہنچے۔ یہ موقع ہاتھ سے مت جانے دو۔"

علی عادل کا ایک امیر کشور خاں کچھ فاصلے پر چلتا ہوا یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ رام راج اس کے سامنے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی فیصلے پر پہنچے بغیر خاموش ہوگیا اور پھر گھوڑا پھیر کر اپنے لشکر کی طرف چلا گیا۔ کشور خاں کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔

"حضور یہ وقت قلعہ شولاپور پر قبضے کے لیے مناسب نہیں۔ آپ رام راج کی بات ہرگز نہ مانیں۔ وہ آپ کی مدد سے قلعہ فتح کرے گا اور خود اس کا دعویدار بن جائے گا۔ شولاپور ایک ایسے مقام پر واقع ہے کہ اگر رام راج کا اس پر قبضہ ہوگیا تو بیجاپور اس کی دسترس سے دور نہیں ہوگا۔ وہ مسلمان دشمن ہے، ہمارا دوست کیسے ہوسکتا ہے۔ آج احمد نگر کی بربادی پر تلا ہوا ہے کل ہمارے خلاف ہوجائے گا۔ مسلمانوں کی بستیوں کو اس نے کس طرح اجاڑا ہے اس کے آپ خود شاہد ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کشور خان۔ اب تم یہ بتاؤ میں اسے کس طرح ٹالوں۔ وہ موقع دیکھ کر پھر بات کرے گا۔"

"آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ برسات کا موسم ابھی ختم نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ اگر حسین نظام نے ہمارا تعاقب شروع کردیا تو ہمارے لشکر کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم فی الحال ایک نیا قلعہ تعمیر کرتے ہیں۔ وہاں اپنی طاقت جمع کریں اور پھر کسی وقت شولاپور پر حملہ کریں۔"

علی عادل شاہ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس نے رام راج کو اعتماد میں لیا اور اسے نلدرک کے مقام پر لے گیا۔ نلدرک میں پرانے زمانے میں ہندو کے راجا نل نے اپنے بیٹے کے لیے جس جگہ محل بنوایا تھا وہ جگہ قلعہ کی تعمیر کے لیے منتخب کی گئی۔ موسم برسات میں ہی اس قلعے کی دیواریں اینٹ اور پتھر سے بنائی گئیں اور اس کا نام قلعہ شاہ درک رکھا گیا۔

قلعے کی تعمیر کے بعد دونوں فرماں روا اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ گئے۔

کشور خان کے اندیشے غلط نہیں تھے۔ شولاپور پر رام راج کا قبضہ نہ ہوسکا تو اس کے سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ غصے سے پاگل ہوگیا اور علی عادل کی دوستی کی پروا کیے بغیر اس کے کمانداروں نے بیجاپور کے قصبوں اور بعض شہروں پر حملے شروع کردیے۔

علی عادل اب بھی یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہورہا ہے یا رام راج کے بھائی تنکناوری کی شرارت ہے۔ اس نے شکایت کے لیے اپنا سفیر بیجانگر بھیجا۔ رام راج نے اس سفیر کے ساتھ نہایت توہین آمیز رویہ اختیار کیا اور علی عادل کی شکایتوں کو سختی سے رد کردیا بلکہ چند شہروں کا مطالبہ کیا کہ وہ علی عادل اس کے حوالے کردے۔

علی عادل کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں لیکن مجبور تھا حسین نظام شاہ سے کس منہ سے مدد مانگتا اور اکیلے رام راج سے مقابلہ کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ مجبور ہوکر اس نے چند شہر رام راج کی تحویل میں دے کر اپنے آپ کو بچالیا۔

اس وقت تو وہ بچ گیا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ رام راج کی فرمائشیں اب رکنے والی نہیں۔ اس نے مسلمانوں کو آپس میں لڑوادیا تھا اور اب اپنی من مانی کرنے میں آزاد تھا۔

رام راج اور اس کے بھائی کی دست درازیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ خطے میں لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ اس کی وحشتوں کا شکار والی گولکنڈہ بھی ہورہا تھا لہٰذا عادل شاہ کے پاس ابراہیم قطب شاہ کے پیغامات آنا شروع ہوگئے تھے۔ علی عادل اس کشمکش میں تھا کہ وہ کس پر بھروسا کرے۔ احمد نگر ایک طاقت ور ریاست تھی مگر علی عادل اس سے بگاڑ چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں رام راج نے ایسے حالات پیدا کردیے تھے کہ علی عادل اور حسین نظام میں دوریاں پیدا ہوجائیں۔

علی عادل شاہ نے ان سب حالات کو سامنے رکھتے ہوئے صاحب فہم امرا ابوتراب شیرازی اور کشور خاں کو طلب کیا۔

"رام راج کی معاندانہ حرکتیں اب میرے لیے ناقابل برداشت ہوگئی ہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اس کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کی جائے۔ آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟"

دونوں امرا نے بصد ادب عرض کیا۔ "آپ کا فیصلہ وقت کا تقاضا ہے۔ اس پر مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں لیکن

اس سے پہلے ضروری ہے کہ تمام مسلمان فرماں رواؤں کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ رام راج سے اکیلے لڑنا دانش مندی نہیں ہوگی۔"

"کشور خاں، کیا یہ معاملہ اتنا ہی آسان ہے اور اگر ہے تو میں تمہیں مختارِ کل بناتا ہوں۔ اسے جس طرح چاہو نمٹاؤ۔"

کشور خاں نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بادشاہ کے پاس سے اٹھنے تک اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا کہ وہ اس گتھی کو کیسے سلجھائے گا۔ علی عادل، رام راج کے ساتھ مل کر جو کچھ کرچکا تھا اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ علی عادل پر بھروسا کرے اور رام راج کی سرکوبی کے لیے اس کا ساتھ دے۔ وہ مختلف ترکیبوں پر غور کرتا رہا پھر اس کے ذہن میں والی گولکنڈہ ابراہیم قطب کا نام گونجا۔ وہ حسین نظام شاہ کا داماد بھی تھا اور رام راج کی زیادتیوں کا براہ راست نشانہ بھی بن رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک قاصد گولکنڈہ کی طرف بھیجا۔

"رام راج کی طاقت کو کچلنے کے لیے ضروری ہے کہ تینوں مسلمان طاقتیں اپنے اختلافات بھلا کر یکجا ہوجائیں۔ آپ اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں اور کسی بھی طرح حسین نظام شاہ کو اتحاد کے لیے آمادہ کریں۔"

ابراہیم قطب شاہ کی طرف سے مثبت جواب آیا۔ اس نے علی عادل اور حسین نظام شاہ میں دوستانہ مراسم پیدا کرنے اور قلعہ شولاپور جو بنائے فساد بنا ہوا تھا، حسین نظام شاہ سے علی عادل کو واپس دلوانے کا وعدہ کیا۔

قاصد کو واپس آئے چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک شخص مصطفی خاں اردستانی بیجاپور پہنچا۔ یہ شخص ابراہیم قطب شاہ کی جانب سے بطور سفیر آیا تھا۔ اس نے علی عادل سے تنہائی میں ملاقات کی اور احمد نگر جاکر جو کچھ حسین نظام شاہ سے کہنا تھا اس کی منظوری لے کر احمد نگر روانہ ہوگیا۔ مصطفی خاں اردستانی کے حسین نظام شاہ سے قدیمی تعلقات تھے لہٰذا نظام شاہ نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اپنے قریب بٹھا کر حال احوال دریافت کیے۔

"میں تو خیریت سے ہوں لیکن ملک دکن کا حال اچھا نہیں ہے۔ رام راج نے مسلمانوں کے خلاف طوفان بدتمیزی اٹھایا ہوا ہے۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن جب مسلمان ہی مسلمانوں کے دشمن ہوجائیں تو ہندو تو سر اٹھائیں گے۔ علی عادل شاہ کو ہی دیکھ لو۔"

"اب علی عادل شاہ کی بھی آنکھیں کھل چکی ہیں وہ آپ سے دوستی کا خواہاں ہے۔"

"اب وہ کس منہ سے مجھ سے دوستی چاہتا ہے؟"

"یہ موقع ایسی باتیں کرنے کا نہیں۔ آپ جانتے ہیں سلاطین بہمنی کے عہد حکومت میں جب تمام ملک دکن پر ان کی حکومت تھی کبھی مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں فتح حاصل کرتے تھے اور کبھی بیجانگر کے ہندو مسلمانوں پر غالب آتے تھے۔ اب دکن کا ملک کسی ایک حکمران کے تابع نہیں ہے بلکہ چند حکمرانوں میں تقسیم ہوچکا ہے۔ اس لیے دانش مندی اسی میں ہے کہ تمام مسلمان فرماں روا ایک دوسرے کے دوست بن کر رہیں۔ باہمی اتفاق و اتحاد سے کام لیں تاکہ زبردست دشمن کے شر سے بچ کر رہیں۔ رام راج کی طاقت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کرناٹک کے تمام فرماں روا اس کے تابع ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمان فرماں رواؤں کا ایک دوسرے سے کشیدہ صورت حال میں رہنا بالکل بے جا ہے۔"

احمد نگر کے امرا قاسم بیگ، حکیم تبریزی، ملا عنایت اللہ قزوینی بھی موجود تھے۔ انہوں نے مصطفی خاں کی رائے سے مکمل اتفاق کیا اور اس پر غور کیا جانے لگا کہ دونوں سلطنتوں میں قربت کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں۔ ان لوگوں نے آپس میں مل کر یہ طے کیا کہ حسین نظام شاہ اپنی بیٹی چاند بی بی کی شادی سلطان علی شاہ سے کردے اور اپنی بیٹی کو جہیز میں شولاپور کا قلعہ دے دے اور عادل شاہ اپنی بہن ہدیہ سلطان کو حسین نظام شاہ کے بڑے بیٹے شہزادہ مرتضیٰ سے بیاہ دے۔ اس طرح دونوں فرماں رواؤں میں رشتے داری قائم ہوجائے گی اور تعلقات بہتر ہوجائیں گے۔

اس نتیجے پر پہنچتے ہی مصطفی خاں بیجاپور آیا اور علی عادل شاہ کو اس تجویز سے آگاہ کیا۔ علی عادل شاہ نے ان رشتوں پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔

ایک ہی دن دونوں طرف شادی کی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ چاند بی بی بیجاپور آ گئی اور ہدیہ سلطان کو احمد نگر روانہ کردیا گیا۔

چاند بی بی دونوں مملکتوں کے درمیان اختلافات ختم کروانے کا ذریعہ بنی تھی لیکن چند ہی روز میں علی عادل کو اندازہ ہوگیا کہ چاند بی بی ان خواتین میں سے ایک ہے جو اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے تاریخ کا حصہ بنی ہیں۔ وہ تیر اندازی میں ماہر، گھڑ سواری میں مشاق اور تیغ زنی میں طاق تھی۔ امور مملکت میں ایسا دخل رکھتی تھی کہ آتے ہی اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشوروں سے نوازنا شروع کردیا تھا۔ علی عادل شاہ خوش تھا کہ اب اسے بات بات پر امرا کو طلب کرنا نہیں پڑے گا۔ اس کی خواب گاہ میں خود ایک مشیر موجود ہے۔

وہ یہ بھی نہیں بھولی تھی کہ وہ بیجاپور کس لیے بھیجی گئی ہے۔ اس نے یہاں ہونے والی سرگرمیوں کا کچھ دنوں جائزہ لیا پھر اپنے شوہر کو اس کا مقصد یاد دلایا۔

”میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ شادی کے بعد اپنے مقصد کی طرف سے غافل ہوگئے ہیں۔ کیا میری فکر نے آپ کو رام راج کی فکر سے آزاد کردیا ہے؟“

”میں ابھی رام راج سے الجھنا نہیں چاہتا۔“

”جب ڈور الجھے گی نہیں تو سلجھے گی کیسے۔ رام راج نے آپ کے اور ابراہیم قطب شاہ کے جن شہروں اور قلعوں پر قبضہ کیا ہے انہیں واپس لینے کی کوشش تو کریں۔“

”تمہارے خیال میں ان شہروں کو واپس لینا اتنا آسان ہوگا؟“

”میں آپ سے جنگ کرنے کو نہیں کہہ رہی ہوں۔ آپ کو اپنا قاصد رام راج کے پاس بھیجنا چاہیے۔ رام راج سے تقاضا کرنا چاہیے کہ تمہارے شہر تمہیں واپس کردے۔“

”تم بھی کمال کرتی ہو، قاصدوں کے ذریعے کہیں شہر بازیاب ہوتے ہیں۔“

”اسے احساس تو ہوگا کہ تم بھولے نہیں ہو۔ کسی وقت بزور طاقت بھی حاصل کرسکتے ہو۔ اب تک اسے یہ بھی معلوم ہوچکا ہوگا کہ اب احمد نگر آپ کی سسرال ہے۔“

علی عادل نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا کہ قاصد بھیج دیا جائے جو وہاں جاکر شہروں کی واپسی کا مطالبہ کرے۔

علی عادل کا قاصد بیجانگر پہنچا ضرور لیکن رام راج نے طاقت کے گھمنڈ میں سفارتی آداب کا خیال بھی نہیں رکھا اور اسے دھکے دے کر بیجانگر سے باہر نکلوا دیا۔

قاصد کی بے عزتی حکمران کی بے عزتی سمجھی جاتی تھی۔ رام راج نے قاصد کی نہیں علی عادل کی بے عزتی کی تھی۔ اس کا طیش میں آنا لازمی تھا۔ اس کے غصے کا پہلا شکار تو چاند بی بی ہوئی۔

”میں نے تمہارے کہنے سے قاصد کو بھیجا تھا۔ تم نے سن لیا رام راج نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ سچ کہا ہے کسی نے عورتوں کی رائے پر عمل کرنے والا بے وقوف ہوتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں قاصد میرے کہنے سے بھیجا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ رام راج آپ کے قاصد کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ اس کے بعد آپ کو غصہ آئے گا اور آپ وہ قدم اٹھائیں گے جسے اٹھانے سے گریز کررہے تھے۔ اب آپ نے رام راج کے متکبرانہ فعل کا مشاہدہ خود کرلیا۔ اس کا سرِ غرور کچلنے کے لیے آپ جو کرسکتے ہیں کریں۔“

”میں نے تو یہ سوچا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ اور تمہارے والد کو اس واقعے سے آگاہ کروں اور ان سے درخواست کروں کہ رام راج سے جنگ کے لیے مستعد رہیں۔“

”دکن سے تعلق رکھنے والی ایک اور طاقت بھی ہے۔ آپ اسے کیوں بھولتے ہیں۔ انہیں بھی اپنے ساتھ شامل کریں۔“

”وہ کون سی طاقت ہے جس کی طرف ابھی تک ہمارا دھیان نہیں گیا؟“

”آپ بریدی مملکت کے علی برید کو بھولے جارہے ہیں۔ بے شک وہ کسی گنتی میں نہیں لیکن آپ اسے اپنے ساتھ شامل کریں گے تو وہ اسے اپنے لیے اعزاز سمجھے گا۔“

بریدی مملکت کا بانی ایک شخص قاسم برید تھا۔ بہمنی سلطنت کے امرا میں شامل ہوا۔ نہایت بہادر اور دلیر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سازشی بھی بلا کا تھا۔ اقتدار کے داؤ پیچ سے بہ خوبی واقف تھا۔ بہمنی سلطنت کے حکمران نے اس کی کارگزاری سے خوش ہوکر مرہٹوں کے کئی علاقے اسے دے دیے تھے جہاں اس نے خود مختار سلطنت قائم کرلی۔ ان مرہٹوں نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کرلیا۔ اسی قاسم برید کی اولاد میں سے ان دنوں بریدی سلطنت کا حکمراں علی برید تھا۔

علی عادل شاہ نے علی برید سے رابطہ کیا اور اسے رام راج کے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا۔

یہ چاروں فرماں رواں (علی عادل، قطب شاہ، حسین نظام، علی برید) مقررہ تاریخ کو بیجاپور کے قریب ایک جگہ جمع ہوئے اور پھر بیجانگر کی طرف بڑھنے لگے۔

سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے دریائے کرشنا کے کنارے ایک مقام پر پہنچے۔ یہ علاقہ عادل شاہ کے قبضے میں تھا۔

رام راج کو اطلاع مل چکی تھی کہ مسلمان اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس نے اپنے دو بھائیوں کو لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا بعد میں خود بھی پہنچ گیا اور دریائے کرشنا کے ساحل پر قبضہ کرلیا۔

ایک کنارے پر مسلمان تھے دوسرے کنارے پر رام راج کا قبضہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے دریا پار کرنا مشکل تھا۔

اس وقت چاروں مسلمانوں کی ذہانت کام کرگئی۔ انہوں نے دریا کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیا۔ ہندو یہ سمجھے کہ مسلمانوں نے کوئی نیا گھاٹ تلاش کرلیا ہے جہاں پانی کی گہرائی کم ہے۔ یہ لوگ اس جگہ سے دریا کو پار کریں گے۔ انہوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیا۔ عاقبت نااندیشی یہ کی کہ اصل گھاٹ پر اپنی فوج کا کوئی حصہ نہیں چھوڑا۔

مسلمان پانچ کوس تک بڑھتے چلے گئے اور پھر مسلمانوں کے سالار اچانک اپنے لشکر کے ساتھ اس تیز رفتاری سے پلٹے کہ دو تین روز کی مسافت صرف بارہ گھنٹے میں طے کرلی۔ رام راج کا لشکر بھی پلٹا لیکن مسلمان ان سے پہلے گھاٹ پر پہنچ گئے اور نہایت اطمینان سے دریا پار کرلیا۔

یہ رات گزاری اور صبح ہوتے ہی مسلمانوں کے لشکر نے رام راج کے لشکر کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ رام راج نے اس لشکر کو اپنے سے قریب دیکھا لیکن گھبرانے کی بات نہیں تھی۔ اسے اپنی عددی فوقیت کا گھمنڈ تھا۔

مسلمانوں نے صفیں درست کیں اور مدمقابل پر حملہ آور ہوگئے۔ فریقین میں زوردار معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ دوپہر کے وقت رام راج اپنے سنگھاسن پر بیٹھ کر لڑائی کے لیے نکلا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے بہت روکا لیکن وہ نہ مانا۔

”یہ تو لڑکوں کی لڑائی ہے بھلا اس میں گھوڑے پر سوار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ دشمن ابھی سامنے سے فرار ہوجائے گا۔“ یہ اس کا گھمنڈ تھا جو بول رہا تھا۔ دو ہزار ہاتھی اور ایک ہزار کا توپ خانہ اس کے پیچھے تھا جس پر وہ اترا رہا تھا اور بے خوف تھا۔

رام راج کا خیال تھا کہ مسلمان جنگ سے پہلو تہی کرکے میدان جنگ سے فرار ہوجائیں گے لیکن جنگ طول پکڑنے لگی تو وہ خوفزدہ ہوگیا۔ سنگھاسن سے نیچے اترا اور ایک مرصع کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے حکم کے مطابق اس کے چاروں طرف اشرفیوں اور موتیوں کے ڈھیر لگا دیے گئے۔

اس نے اعلان کردیا کہ جو سپاہی کامیاب و کامران ہوکر میرے پاس آئے گا وہ مال و دولت سے سرفراز کیا جائے گا۔ اس اعلان کے سنتے ہی اس کے سپاہی انعام کے لالچ میں پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے لڑنے لگے۔

میدان جنگ، میدان حشر بن گیا۔ ہندو سپاہی بڑھ چڑھ کر حملے کررہے تھے اور مسلمان پیچھے ہٹنے لگے تھے۔

یہ دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہونے لگے لیکن حسین نظام شاہ نے اپنے حواس پر قابو رکھا۔ اس نے حکم دیا کہ توپ میں پیسے رکھ کر دشمن کی طرف گرائے جائیں اور خود

روزہ کا دورانیہ

عرب ممالک......16 گھنٹے
مارکو......14 گھنٹے
چائنا......14 گھنٹے
جاپان......14:30 گھنٹے
کوریا......12 گھنٹے
انگلینڈ......16:30 گھنٹے
فرانس......16 گھنٹے
ڈنمارک......21 گھنٹے
آئس لینڈ......20:20 گھنٹے
نیدرلینڈ......18:30 گھنٹے
ارجنٹینا......9:30 گھنٹے
پاکستان......15:30 گھنٹے
کینیڈا......18 گھنٹے
امریکا......15 گھنٹے
میکسیکو......13 گھنٹے
ساؤتھ افریقا......10:30 گھنٹے
انڈیا......14:30 گھنٹے

ورلڈ رپورٹ کے مطابق فجر کی اذان سب سے پہلے اسلامک اسٹیٹ انڈونیشیا سے شروع ہوتی ہے اور پھر سمارٹا، ملائیشیا، ڈھاکا، سری لنکا، انڈیا، پاکستان، افغانستان، مسقط، سعودیہ، کویت، دبئی، یمن، عراق، ایران، استنبول، طرابلس، لیبیا، امریکا تک لگاتار 9 گھنٹے فجر کی اذان ہوتے ہوئے واپس انڈونیشیا میں پہنچتی ہے جہاں پھر ظہر کی اذان کا وقت ہو جاتا ہے اور اس طرح پانچ وقت کی اذان اور اللہ تعالیٰ کا ذکر مبارک سے پوری زمین پر ایک بھی سیکنڈ ایسا نہیں جب اذان کی آواز اور اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہوتا ہو، سبحان اللہ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو اسلام کی دولت سے مالا مال فرمائے اور ہمیں صحیح معنوں میں سچا اور پکا مسلمان بننے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

مرنے کو تیار ہوکر دشمن پر جا پڑا۔ رام راج اتنا خوفزدہ ہوا کہ کرسی سے اٹھ کر دوبارہ سنگھاسن پر بیٹھ گیا لیکن اس پر بیٹھنا اسے کچھ ہی دیر نصیب ہوسکا۔ جو کہار سنگھاسن اٹھائے ہوئے تھے اتنے خوفزدہ ہوئے کہ رام راج سمیت سنگھاسن پھینک کر بھاگ گئے۔ اسی دوران حسین نظام کا ایک ہاتھی وہاں پہنچ گیا۔ فیل بان کی نگاہ پہلے سنگھاسن پر پڑی پھر رام راج پر۔ اس نے ہاتھی کو حکم دیا۔ ہاتھی نے رام راج کو اپنی سونڈ میں لپیٹ لیا اور حسین نظام کے پاس لے جانے کے لیے بھاگا اور حسین نظام شاہ کے توپ خانے کے افسر رومی خاں کے پاس پہنچ گیا۔ رومی خاں نے رام راج کو گرفتار کرلیا اور حسین نظام شاہ کے پاس پہنچا۔ نظام شاہ نے اسی وقت راجا کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اس کا سر میدان جنگ میں پھینک دیا۔

ہندو لشکریوں نے جب راجا کے سر کو دیکھا تو ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان گنت ہندوؤں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ ایک روایت کے مطابق اس جنگ میں ایک لاکھ ہندو قتل ہوئے۔

مسلمان فرماں رواؤں نے حکم دیا کہ سوائے ہاتھیوں کے مال غنیمت میں سے کوئی چیز سپاہیوں سے نہ لی جائے جو چیز جس سپاہی کے ہاتھ آگئی ہو اس کو عطا کردی جائے۔

مسلمانوں نے بیجانگر کے نواح تک کی تمام عمارتوں کو مسمار کردیا۔ دیہات بے رونق ہوگئے۔ لاتعداد مسلمان بھی زخمی ہوئے تھے۔ چاروں فرماں رواؤں نے طے کیا کہ فی الحال اسی مقام پر پڑاؤ جاری رکھ کر زخمیوں کی مرہم پٹی کی جائے۔ اس کے بعد بیجانگر پر قبضے کے لیے آگے بڑھا جائے۔

رام راج کا بھائی تنکناوری میدان جنگ سے فرار ہوکر ایک جگہ روپوش ہوگیا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بساط الٹ چکی ہے تو اس نے اپنے قاصد مسلمانوں کے پاس بھیجے۔

''میں نہایت عاجزی سے معافی کا طلب گار ہوں۔ یہ سب کیا دھرا رام راج کا تھا اس کے مرنے کے بعد اگر بیجانگر کا حکمران مجھے تسلیم کرلیا جائے تو میں اطاعت کا وعدہ کرتا ہوں اور یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ علی عادل شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے جو علاقے ہم نے چھین لیے تھے انہیں واپس کردوں گا۔''

مسلمانوں کے ارادے تو کچھ اور تھے لیکن اس کی عاجزی کو دیکھ کر مزید کشت وخون سے ہاتھ اٹھالیے اور بیجانگر اسے سونپ کر چاروں فرماں روا اپنے اپنے مرکزی شہروں کی طرف لوٹ گئے۔

علی عادل شاہ بیجاپور آیا اور قصر میں داخل ہوا تو چاند بی بی اور اس کی دوسری بیویاں اس کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ ملازم ہیرے جواہرات کی کشتیاں لیے کھڑے تھے۔ علی عادل نے جیسے ہی قصر میں قدم رکھا، ملازموں نے ہیرے اور موتی نچھاور کیے۔ چاند بی بی آگے بڑھی اور علی عادل شاہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کی مسند تک لائی۔

دو چار دن گزر گئے اور علی عادل شاہ میدان جنگ کی تھکن اتارنے کے بعد امور مملکت کی طرف راغب ہوا تو چاند بی بی نے موقع دیکھ کر بیجانگر کے نئے حکمران تنکناوری کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

''تنکناوری وہ سانپ ہے جسے مرنے کے بعد بھی مردہ نہ سمجھے گا۔''

''یہ تمہیں تنکناوری کی یاد اس وقت کیسے آگئی؟''

''اس لیے کہ وہ حکمران بنتے ہی رام راج سے زیادہ بدتر شکل میں آپ کے سامنے آئے گا۔''

''اتنی بڑی شکست کے بعد وہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

''اس کے باوجود اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کی ضرورت ہے۔''

''تم چاہتی ہو میں اس سے بھی جنگ کروں؟''

''جنگ ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتی پھر یہ بھی سمجھ لیجیے کہ مسلمان فرماں روا ہمیشہ اس طرح متحد نہیں ہوں گے جیسے اب ہوئے تھے۔ اس لیے ایسی پیش بندی کی ضرورت ہے کہ جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔ آپ کو اس کی طاقت میں کمی کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے اتنے بڑے علاقے کا حکمراں نہ رہنے دیں۔ اس کا کوئی ایسا حریف پیدا کردیں جس سے وہ الجھتا رہے اور آپ سکون سے رہیں۔'' چاند بی بی نے ایسی دور اندیشی کی بات کردی تھی کہ جو ایک زیرک حکمران ہی سوچ سکتا تھا۔

''تمہیں تو کسی مملکت کی خود مختار رانی ہونا چاہیے تھا۔''

''کیا اب نہیں ہوں۔''

''تو رانی صاحبہ یہ بھی بتادیجیے کہ تنکناوری کا حریف میں کہاں سے پیدا کروں؟''

''یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔'' چاند بی بی نے ایک ادائے خاص سے کہا اور علی عادل شاہ کو پیش کرنے کے لیے مشروب تیار کرنے لگی۔

علی عادل کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ اسے یاد آیا، دوران جنگ رام راج کے ایک بھائی تمراج کی درخواست اس کے پاس آئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ''رام راج کا راج پاٹ ختم ہوتے ہی تنکناوری اس کا جانشیں بن جائے گا۔ میری حیثیت کچھ بھی نہیں رہے گی، میں آپ کی فرماں برداری کا دم بھرتا ہوں۔ مجھے اناگندی اور اس کے مضافات پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی جائے۔''

یہ درخواست اس وقت تو رد کردی گئی تھی لیکن علی عادل سوچ رہا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تمراج کو یہ حکومت دے کر تنکناوری کے سامنے ایک حریف کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

صبح ہوتے ہی اس نے ایک قاصد کو تمراج کے پاس روانہ کردیا اور ایک فرمان لکھ کر دے دیا کہ اسے اناگندی کا حاکم مقرر کیا جاتا ہے۔

ایک اور قاصد تنکناوری کی طرف روانہ کیا اور اسے کہلوایا۔ ''تمراج میرے حکم کے مطابق اناگندی پر حکومت کے لیے آرہا ہے لہٰذا اس سلسلے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کرنا۔ اس علاقے کی حکوت اس کے حوالے کردو۔''

تنکناوری میں اس وقت اتنی طاقت نہیں تھی کہ علی عادل کے فرمان سے روگردانی کرتا، خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔

دو سال بعد ہی احمد نگر سوگ کی چادر میں لپٹ گیا۔ حسین نظام شاہ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ اس کا جانشین ہوا۔

شہزادے کا دور شباب تھا اس لیے اس کے پردے میں اس کی ماں ملکہ خونزہ ہمایوں حکومت کررہی تھیں۔ یہی خونزہ ہمایوں چاند بی بی کی بھی والدہ تھیں۔

خونزہ نے اپنے دو بھائیوں تاج خاں اور عین الملک اور ایک خواجہ سرا اعتبار خاں کو امرائے کبار میں شامل کرلیا تھا اور خود پردے کے پیچھے بیٹھ کر قاسم بیگ حکیم کے مشورے سے امور سلطنت انجام دیا کرتی تھی۔ یہ انداز حکومت چھ سال تک رہا۔

تنکناوری نے کسی مصلحت کے تحت تلکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا اور بیجانگر ویران پڑا تھا۔ حسین نظام شاہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ علی عادل شاہ نے بیجانگر کو فتح کرنے کے لیے عسکری تیاریاں شروع کردیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ تمراج کو اناگندی سے نکال کر تلکنڈہ کا حاکم بنادے اور خود بیجانگر اور اس کے مضافات پر قابض ہوجائے۔

لطائف

ایک امیر آدمی نے ٹیکسی سے اتر کر ڈرائیور کو پانچ کا نوٹ دیا تو ڈرائیور بولا۔ ''جناب! کل آپ کے صاحبزادے نے مجھے دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔''

امیر آدمی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''وہ ایک کروڑ پتی کا بیٹا ہے مگر میں تو یتیم ہوں۔''

.......☆☆.......

مجرم۔ ''حضور! میں بھوکا تھا بے گھر تھا بے یار و مددگار تھا اس لیے میں نے چوری کی۔''

جج۔ ''تمہاری حالت قابل رحم ہے میں چھ مہینے کے لیے تمہارے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

.......☆☆.......

بیوی اپنے شوہر کو بزدلی کا طعنہ دے رہی تھی کہنے لگی۔ ''میں پوچھتی ہوں تم آدمی ہو یا چوہے؟''

شوہر نے مودبانہ جواب دیا۔ ''چوہا ہوتا تو تم میرے سامنے تھر تھر کانپ رہی ہوتیں۔''

.......☆☆.......

ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا۔ ''اب تو جھوٹ پکڑنے کی مشین بھی ایجاد ہوگئی ہے۔''

دوست نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

پہلے نے جواب دیا۔ ''میں نے شادی کرلی ہے۔''

مرسلہ: بابر عباس، کھاریاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تنکناوری کو جب علی عادل کے اس ارادے کی اطلاع ملی تو وہ سخت پریشان ہوا۔ اس نے اپنے قاصد مرتضٰی نظام شاہ اور اس کی والدہ خونزہ ہمایوں کی طرف دوڑا دیے۔

ملکہ سے گزارش کی ”حسین نظام شاہ نے یہ علاقہ مجھے عطا کیا تھا۔ اب علی عادل شاہ اسے میرے قبضے سے نکال کر خود اس پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ مجھے اپنا بہی خواہ سمجھ کر میری مدد فرمائیں گے اور مجھے عادل شاہ کے فتنے سے نجات دلائیں گے۔“

خونزہ ہمایوں نے یہ سوچ کر کہ علی عادل شاہ اس کے مرحوم شوہر کے عہدنامے کا پاس نہیں کر رہا ہے امرا سے مشورہ کیا اور مرتضٰی نظام شاہ کو ساتھ لے کر احمد نگر سے نکلی اور بیجاپور کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔شہر کا محاصرہ کر لیا۔

علی عادل شاہ اپنے لشکر کے ساتھ اناکندی تک پہنچ چکا تھا۔ اسے اس حملے کی اطلاع ہوئی۔ اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کیا اور بیجاپور کے قریب آ کر نظام شاہ کے مقابلے میں صف آرا ہو گیا۔

چاند بی بی اسی وقت کے انتظار میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر واپس آ چکا ہے اور کسی بھی وقت جنگ کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اس نے چند باشرع علما کو اپنے ساتھ لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر قصر شاہی سے نکلی۔ اس کے بال سوگواروں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ سر سے پاؤں تک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر سیاہ نقاب تھا۔ صرف خوب صورت اداس آنکھیں نقاب کے باہر تھیں۔ اس کے حکم پر شہر کا دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک خیمے کے باہر لہراتا ہوا سبز پرچم نشاندہی کر رہا تھا کہ اس خیمے میں ملکہ خونزہ ہمایوں موجود ہے۔ وہ خیمے کے سامنے موجود پہرے داروں سے صرف اتنا کہہ سکی۔

”ملکۂ عالیہ سے کہو، چاند بی بی آئی ہے۔“ پہرے داروں نے اجازت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور اسے راستہ دے دیا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے علما بہ دستور باہر کھڑے تھے۔ ملکہ نے اس حالت میں دیکھا تو اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا بیجاپور میں مرد ختم ہو گئے ہیں جو تمہیں آنا پڑا؟“

”میرا شوہر مقابلے کے لیے تیار ہے لیکن میں گھر کی بات گھر ہی میں رکھنا چاہتی ہوں۔“

”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے شوہر نے تمہارے مرحوم باپ کا عہدنامہ پامال کیا ہے؟“

”یہ صرف ان کا نہیں دیگر لوگوں نے بھی اس پر مہر ثبت کی تھی۔ اس پر میرے شوہر نے بھی دستخط کیے تھے۔“

”حسین نظام شاہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ علی عادل شاہ کو یہ قدم اٹھانے سے پہلے ان سب سے اجازت لینی چاہیے تھی جنہوں نے تنکناوری کو بیجانگر پر حکمرانی کا حق دیا تھا۔“

”ان میں سے تو کوئی تنکناوری کی حمایت میں نہیں آیا۔ آپ کا داماد ابراہیم قطب شاہ بھی نہیں۔“

”تنکناوری نے ہم سے مدد مانگی، ہم آ گئے۔“

”یہ بھی نہیں سوچا کہ بیجاپور میں آپ کی بدنصیب بیٹی چاند بی بی بھی رہتی ہے۔ اگر اس معرکے میں اس کا شوہر کام آ گیا تو کیا ہوگا؟“

”یہ تو علی عادل کو سوچنا چاہیے تھا۔“

”آپ کو معلوم ہے تنکناوری کے عزائم کیا ہیں۔ وہ اپنی بندرگاہوں پر موجود پرتگالیوں کے سربراہ پاپن جین کو آمادہ کر رہا ہے کہ وہ اپنا لشکر لے کر آئے اور تنکناوری کے ساتھ مل کر بیجاپور پر قبضہ کر لے اور پھر احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔ یہ کام تو رام راج نے بھی نہیں کیا تھا جو تنکناوری کر رہا ہے۔ علی عادل اگر اس کی سرکوبی کے لیے نکلا ہے تو کیا غلط تھا۔“

اس کے بعد چاند بی بی نے والدہ سے اجازت لے کر علما کو اندر بلا لیا۔ ان علما نے بھی ملکہ کو سمجھایا کہ دو ہم مذہب فرماں رواؤں کو ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی کرنا زیب نہیں دیتا۔ مناسب یہی ہے کہ صلح کر لی جائے۔

”اس کے لیے دوسرے فریق یعنی علی عادل کی رضامندی بھی چاہیے ہوگی۔“ ملکہ نے کہا۔

”وہ بھی نہیں چاہیں گے کہ دو مسلمان آپس میں لڑیں۔“

چاند بی بی نے ایک منزل بہ خوبی طے کر لی تھی۔ علی عادل کو راضی کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ وہ ان علما کو لے کر اس کے لشکر میں گئی۔ وہاں بھی یہی باتیں ہوئیں پھر طرفین ایک جگہ بیٹھے۔ دونوں میں صلح ہو گئی۔ مرتضٰی نظام شاہ واپس احمد نگر آ گیا۔

خونزہ ہمایوں ایک مہم جو عورت تھی۔ اس نے یہ تو گوارا کر لیا کہ چاند بی بی کی خاطر جنگ سے ہاتھ اٹھا لے لیکن جب علی عادل کی صورت میں ایک اتحادی اس کے ہاتھ آ گیا تو اس کا شوق معرکہ آرائی کروٹیں لینے لگا۔ اس نے مرتضٰی نظام شاہ کو برار کے حاکم کرتقال خاں کی بدعہدی یاد دلائی۔

”تمہیں یاد ہے، جب رام راج سے لڑائی کے لیے تمام مسلمانوں کو اکٹھا کیا جا رہا تھا تو یہ شخص جان بوجھ کر بیجانگر

کے ہنگامے سے دور رہا تھا۔ یہ وقت ہے کہ اس وقت اس سے بدلہ لیا جائے۔ علی عادل شاہ ہمارا پورا ساتھ دے گا۔“

مرتضٰی نظام اور علی عادل نے باہمی اتفاق اور اتحاد سے برار پر حملہ کر دیا۔ یہ دونوں برار کی حدود میں بڑی دور تک تباہی پھیلا کر انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرتے رہے۔

انہی دنوں برسات کا موسم آ گیا۔ کرتقال خاں کو اب اپنا بچاؤ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ علی عادل کی خدمت میں حاضر ہوا اور بہت سی دولت دے کر اسے واپسی کے لیے راضی کر لیا۔

علی عادل نے برسات کا بہانہ کیا اور مرتضٰی کے ساتھ واپس آ گیا۔

برار سے مال غنیمت کی صورت میں جو کچھ علی عادل کو ملا اس سے اس نے اپنے سالار اور امیر کشور خاں کی نگرانی میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

مال غنیمت تو مرتضٰی نظام کے بھی ہاتھ لگا تھا لیکن وہ کوئی پراسرار بیماری بھی ساتھ لگا لایا تھا۔ وہ خلل دماغ کا شکار ہو گیا تھا۔ مکمل طور پر خلوت نشینی اختیار کر لی تھی۔ چند خاص لوگوں کے سوا کوئی اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ سلطنت کے تمام کام ملکہ خونزہ ہمایوں انجام دے رہی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب شہزادہ صحت مند تھا اس وقت بھی کاروبار سلطنت ملکہ ہی کے ہاتھ میں تھا۔

شہزادے کی بیماری کو پوشیدہ رکھا گیا تھا لیکن اتنی بڑی بات چھپ نہیں سکتی تھی۔ کم از کم چاند بی بی سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے معلوم بھی ہوا اور وہ بھائی سے ملنے احمد نگر گئی بھی۔

وہ واپس آئی تو وہاں کے حالات سے زیادہ خوش نہیں تھی۔ اس نے آ کر بتایا کہ ملکہ نے اپنے بھائیوں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا ہے اور اب وہ اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ ملکہ بھی ان کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ ان لوگوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے لشکر میں بھی انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اسے افسوس تھا کہ نظام شاہی حکومت کی شان و شوکت باقی نہیں رہی۔

علی عادل نے یہ حالات سنے تو احمد نگر کے بعض علاقوں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ خود اس مہم پر جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ چاند بی بی سے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ اپنے امیروں کو لے کر ملکہ کی مدد کے لیے بھیجنا چاہتا ہے۔

علی عادل نے اسد خاں لاری اور کشور خاں کو منصب و علم عنایت کیا اور بیس ہزار سواروں کے لشکر کے ساتھ نظام شاہی سلطنت کی طرف روانہ کیا۔

خونزہ ہمایوں کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے چند دکنی امرا کو کشور خاں کے مقابلے پر روانہ کیا۔ کشور خاں نے ان امیروں کو شکست دی جو بہ حال تباہ احمد نگر کی طرف لوٹ گئے۔ اس نے سرحد کے باشندوں کو اپنا بنا لیا اور ربیع و خریف کی فصلوں کا لگان وصول کیا اور اس میدان میں جہاں اسے فتح حاصل ہوئی تھی ایک پختہ قلعہ تعمیر کروایا۔ غرض پوری طرح صاحب اقتدار ہو گیا۔ اس قلعے کا نام دارور رکھا گیا۔

ملکہ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے ایک فوج تیار کی اور مرتضٰی نظام شاہ (جس کی طبیعت اب کچھ بہتر ہو گئی تھی) کو ساتھ لے کر کشور خاں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گئی۔

شاہی مصاحبین جو نظام شاہ کے ساتھ تھے اور ملکہ کے اقتدار سے سخت عاجز تھے ملکہ کی گرفتاری کے لیے اکسایا۔ مرتضٰی خود بھی اپنی والدہ سے تنگ تھا اور دیکھ رہا تھا کہ دربار کے تمام ملازم اور شاگرد پیشہ ملکہ کے طرف دار

SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔ اس کا کوئی حکم ہی نہیں چلتا لہٰذا فوراً تیار ہو گیا۔

شاہی لشکر دامن کافور میں تھا کہ ملکہ کی گرفتاری کے لیے ڈول ڈالا گیا۔ مرتضیٰ شاہ نے حبشی خاں کو اپنی والدہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔

حبشی خاں ملکہ کے سراپردہ کے قریب پہنچا۔ ملکہ کو اس کے ارادے کی خبر ہو گئی۔ اس نے ترکش، خنجر اور تلوار وغیرہ سے خود کو آراستہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ حبشی خاں بھی گھوڑے پر سوار تھا۔ اسی عالم میں وہ ملکہ کے قریب گیا۔

''بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ آپ بھی دوسری عورتوں کی طرح پردے میں بیٹھ جائیں اور حکومت کے کاموں میں دخل نہ دیں۔'' خونزہ ہمایوں ایسی باتوں کی عادی کہاں تھی، تڑخ کر جواب دیا۔

''اے غلام! تیری یہ ہمت، یہ مجال کہ آج تو اس انداز سے مجھ سے مخاطب ہے۔''

حبشی خاں نے ملکہ کا بازو پکڑ کر اسے اتارنے کی کوشش کی۔ ملکہ نے اپنا خنجر نکالا اور حبشی خان پر وار کرنا چاہا، حبشی خاں نے ملکہ کا ہاتھ پکڑ کر مروڑا۔ خنجر ملکہ کے ہاتھ سے گر پڑا۔ ملکہ کے دونوں بھائی عین الملک اور تاج خاں وہاں موجود تھے لیکن انہوں نے اپنی بہن کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

حبشی خاں نے بڑے اطمینان سے ملکہ کو گرفتار کر کے پالکی میں بٹھا دیا اور مرتضیٰ نظام کے پاس لے آیا۔ بادشاہ نے اسے نگہبانوں کے سپرد کر دیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ کشور خاں کی طرف بڑھا۔ کشور خاں نے قلعے کو پوری طرح مستحکم اور فوج کو مرتب کیا۔ اخلاص خاں اور نور خاں کو جو اس کی مدد کے لیے علی عادل کی طرف سے بھیجے گئے تھے، ساتھ لیا اور مرتضیٰ نظام شاہ کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ امرا کشور خاں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے ناخوش تھے اور اسے نیچا دکھانا چاہتے تھے لہٰذا مرتضیٰ نظام کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر بھاگ گئے اور جاتے جاتے یہ پیغام دے گئے۔

''ہم میں اتنی قوت نہیں کہ مرتضیٰ نظام سے جنگ کریں۔ اس لیے ہم لوگ تم سے جدا ہو کر احمد نگر میں فتنہ و فساد پیدا کرنے جا رہے ہیں۔ اس اقدام سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ مرتضیٰ نظام شاہ اس طرف نہ آئے اور ہمارے تعاقب میں احمد نگر کی طرف روانہ ہو۔''

ان لوگوں کا اندازہ غلط نکلا۔ مرتضیٰ نظام کشور خاں کی سرکوبی کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتا تھا لہٰذا کشور خاں ہی کی طرف رخ کیا۔ قلعے سے مرتضیٰ کے لشکر پر بہت آتش بازی کی گئی لیکن مرتضیٰ نظام کی ہمت پست نہ ہوئی اور اس نے قلعے کا محاصرہ جاری رکھا۔

کشور خاں قلعے کی فصیل پر کھڑا جنگ کا جائزہ لے رہا تھا کہ اتفاق سے ایک تیر اسے لگا اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔ کشور کے ساتھیوں نے جب اپنے سردار کو مرتے دیکھا تو انہوں نے فوراً قلعے کا دروازہ کھول دیا اور بھاگ گئے۔ مرتضیٰ نے قلعے پر قبضہ کر لیا اور پھر وہ تمام پرگنے بھی واپس لے لیے جو علی عادل کی حکومت میں شامل ہو گئے تھے۔

کشور خاں کی موت اور مرتضیٰ نظام شاہ سے شکست کے بعد علی عادل شاہ بہت اداس ہو گیا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے ایک دوسرے سالار مصطفیٰ خاں کو بلایا۔ اس سے وہ گھنٹوں باتیں کرتا رہا پھر قصر میں چلا آیا۔

چاند بی بی کئی دن سے اس کی یہ حالت دیکھ رہی تھی۔ کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ اس وقت ضبط نہ کر سکی۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کچھ دنوں سے پریشان ہیں۔ میں کچھ پوچھنے کی جسارت کر سکتی ہوں؟''

''میں تو خود تم سے بات کرنے والا تھا بلکہ مشورہ کرنے والا تھا۔''

''زہے نصیب! آپ نے ہمیں اس قابل تو سمجھا۔''

''میں کئی دن سے ایک لشکر ترتیب دے رہا ہوں جس کے ذمے ایک مہم لگانے والا ہوں۔''

''آپ پھر کسی مہم پر جائیں گے؟''

''میرا بیجاپور میں رہنا بہت ضروری ہے۔ یہ مہم تو میں اپنے کسی امیر کے سپرد کروں گا۔''

''ہمیں بھی تو معلوم ہو ارادہ کدھر کا ہے؟''

''اس مرتبہ قلعہ ادھونی کو فتح کرنے کا ارادہ ہے۔''

''یہ قلعہ ہے کہاں؟''

''اس کا حدود اربعہ چھوڑو یہ پوچھو کہ اسے فتح کرنا کیوں ضروری ہے اور اس وقت مجھے کیوں ضرورت پیش آ گئی۔''

''یہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد کوئی مشورہ دے سکوں گی۔''

''یہ قلعہ دراصل رام راج کی یادگار ہے۔ اس پر اسی کا قبضہ تھا۔ اس کی طرف سے ایک حاکم وہاں متعین تھا جب

ہم نے رام راج کو شکست دی تو اس قلعے کا حاکم خود مختار ہو گیا۔ اس نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا۔ تنکناوری اپنی قوت میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔ پرتگالیوں سے بھی اس کی سازباز بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ قوت حاصل کرنے کے بعد یقیناً قلعہ ادھونی پر قبضہ کرنے کا سوچے گا۔ اگر اس قلعے پر اس کا قبضہ ہو گیا تو بیجاپور اس کی دسترس سے دور نہیں رہ سکے گا۔ میں چاہتا ہوں تنکناوری سے پہلے میں قبضہ کر لوں تاکہ بیجاپور کا دفاع ہو سکے۔ اب تو جو کچھ کرنا ہے مجھ ہی کو کرنا ہے کیونکہ احمد نگر کی حالت تم دیکھ ہی رہی ہو۔ حسین نظام شاہ کی بات کچھ اور تھی۔''

چاند بی بی نے اس کی دور اندیشی کی داد دی اور اس کے ارادے کا خیر مقدم کیا۔

یہ قلعہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا تھا۔ اس کا حصار نہایت وسیع تھا، اس میں کئی خوب صورت چشمے اور بلند عمارات تھیں۔ اس کے استحکام اور مضبوطی کا یہ عالم تھا کہ سلاطین بہمنیہ بھی اسے کبھی فتح نہ کر سکے تھے۔

علی عادل شاہ نے اپنے ایک سالار انکش خاں کو آٹھ ہزار سواروں اور پیادوں اور بہت بڑے توپ خانے کے ساتھ قلعہ ادھونی کی طرف روانہ کیا۔ قلعہ ادھونی کے حاکم نے انکش خاں کا مقابلہ کیا لیکن ہر بار شکست کھائی۔ بار بار شکست نے اسے پریشان کر دیا اور اسے قلعے میں محصور ہونا پڑا۔ قلعہ ایسا مضبوط تھا کہ نقب اور توپ وغیرہ سے اسے فتح کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک ہی صورت تھی کہ طویل محاصرہ کیا جائے اور محصور حاکم کو باہر آنے پر مجبور کر دیا جائے۔ انکش خاں نے یہی راستہ اختیار کیا۔ یہ محاصرہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ حاکم قلعہ غذا کی قلت کی وجہ سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے جان کی امان طلب کی اور قلعہ انکش خاں کے سپرد کر دیا۔ یہ ایسی کامیابی تھی کہ علی عادل شاہ نے پوری سلطنت میں جشن فتح منانے کا اعلان کیا۔ جتنے علاقے اس کے قبضے میں تھے سب جگہ چراغاں کیا گیا۔

☆☆☆

تنکناوری کے دارالخلافہ فلکنڈہ میں گہما گہمی عروج پر تھی۔ شہریوں میں تشویش کے ساتھ خوشی بھی تھی کہ رام راج کی موت کا بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔ جس طرح بیجانگر تباہ ہوا تھا اب بیجاپور ویران ہوگا۔ تنکناوری نے بڑی ترکیب سے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے طاقت جمع کی ہے۔

یہ خوشی اس لیے تھی کہ پرتگالیوں کا سربراہ پابن جبین پرتگالیوں کا ایک بڑا لشکر لے کر اپنی جنوبی بندرگاہ سے فلکنڈہ پہنچا تھا۔

تنکناوری کا سالار اعلیٰ وسواس راؤ، اس کا بھتیجا بھیم راج اور دیگر سرکردہ لوگوں نے آگے بڑھ کر استقبال کیا تھا۔

راج محل میں تنکناوری اپنے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسے خبر مل چکی تھی کہ لشکر پہنچ چکا ہے۔ اسے کچھ دیر بعد ہی پابن جبین سے ملاقات کر کے بیجاپور پر حملے کے لیے لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

☆☆☆

بیجاپور کے قصر میں رات اتر آئی تھی۔ روشنی کے ہنڈے روشن ہو گئے تھے۔ کچھ دیر پہرے داروں کی آوازوں نے شور مچایا پھر خاموشی ہو گئی تھی۔ علی عادل اپنی خواب گاہ میں پہنچ چکا تھا لیکن خلاف معمول اداس تھا۔ چاند بی بی نے اس کی اداسی کو بھانپ لیا تھا۔ چاند بی بی نے پہل کی۔

''آپ کے چہرے کی اداسی بتا رہی ہے کہ کوئی بڑا واقعہ ہے جو رونما ہونے والا ہے۔''

''ایسے واقعات حکمرانوں کی زندگی میں آتے رہتے ہیں۔ پریشانی تو بشری کمزوری ہے۔''

''کیا ہمیں نہیں بتائیں گے کہ کیا بات ہے؟''

''پریشانی تنکناوری کی طرف سے ہے۔ مجھے خبریں پہنچی ہیں کہ وہ بیجاپور پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ پرتگالیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک بڑا لشکر تیار کر لیا ہے۔''

''اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھائے آپ فلکنڈہ پر حملہ کر دیں۔ اگر آپ نے اس وقت کوئی قدم نہیں اٹھایا تو آنے والے دور میں تنکناوری اور اس کے سالاروں کے حوصلے مزید بڑھ جائیں گے۔''

علی عادل شاہ نے لشکر کی تیاری میں دن رات ایک کر دیے اور بڑی شان و شوکت سے بیجاپور سے روانہ ہوا۔ جب وہ بیجاپور کے نزدیک پہنچا تو چندر کونی کا حاکم (علی عادل کا متعین کردہ) مصطفیٰ خاں اپنے لشکر اور ترکی امرا کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہاں سے عادل شاہی لشکر فلکنڈہ کی طرف روانہ ہوا۔

عادل شاہ کے روانہ ہونے کی اطلاع فلکنڈہ تک پہنچ چکی تھی۔ تنکناوری نے اپنے سالاروں اور امرا کا اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں پرتگالی پابن جبین بھی موجود تھا جو اپنا لشکر لے کر پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔

دونوں لشکروں کی موجودگی کے باوجود تنکناوری کا سپہ سالار وسواس راؤ سخت خوف زدہ تھا۔ یہ اس کا خوف ہی تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ اس نے یہ تجویز پیش کی۔
''ہمیں گلکنڈہ سے دور جا کر علی عادل شاہ سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ آپ عورتیں اور خزانہ لے کر کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں تاکہ اگر ہمیں عادل شاہ کے مقابلے میں ناکامی ہوتی ہے تو ہم بھی لشکر لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔ آپ محفوظ ہوں گے تو لشکر والوں کے حوصلے بلند رہیں گے۔ عادل شاہ کے لوٹنے کے لیے گلکنڈہ میں کوئی خزانہ نہیں ہوگا۔ کسی ممکنہ شکست کے بعد ہمیں رسد اور کمک کی ضرورت پڑے گی جو آپ کے ذریعے ہمیں ملتی رہے گی۔''
یہ عجیب سپہ سالار تھا جو عظیم لشکر کے باوجود فتح کے خواب دیکھنے کے بجائے یہ سوچ رہا تھا کہ شکست کے بعد اسے کیا کرنا ہے۔ یہ حکمران بھی عجیب تھے کہ اس کی تجاویز سے اتفاق کر رہے تھے۔
تنکناوری اتنا ڈرا ہوا تھا کہ وسواس راؤ کی تجویز سنتے ہی عورتوں، بچوں اور مال و دولت کو لے کر ایک مقام چندرکیری کی طرف فرار ہوگیا۔
وسواس راؤ اپنے اور پرتگالیوں کے لشکر کو لے کر گلکنڈہ سے نکلا اور ایک مناسب جگہ پر پڑاؤ کر لیا۔ ابھی بیجاپور کا لشکر نہیں پہنچا تھا اس لیے اسے موقع مل گیا کہ لشکر کی تقسیم کو آخری شکل دے دے۔
اس موقع پر یہ بھی ہوا کہ تمراج جسے تنکناوری کی طاقت کم کرنے کے لیے علی عادل نے اناکندی کا حاکم بنا دیا تھا وہ بھی وسواس راؤ کے ساتھ آکر شامل ہوگیا تھا۔
یہ اسی قسم کا اجتماع تھا جیسا کسی زمانے میں رام راج کے خلاف چار مسلمان طاقتوں نے متحد ہو کر کیا تھا اور رام راج کو شکست دی تھی۔ وسواس راؤ کو یقین تھا کہ اس جنگ میں علی عادل شاہ کو شکست ہوگی۔
علی عادل شاہ کے مخبر اسے ہندوؤں کی نقل و حرکت سے مسلسل باخبر کر رہے تھے چنانچہ اس نے بھی اس طرف چلنا شروع کیا جہاں وسواس راؤ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔
جنگ کا آغاز ہوا تو صاف نظر آرہا تھا کہ ہندو اپنی عددی اکثریت کی وجہ سے غالب آجائیں گے لیکن دونوں میں ایک فرق بھی تھا۔ علی عادل شاہ بذات خود جنگ میں حصہ لے رہا تھا۔ اس کی موجودگی اس کے لشکر کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ دوسری جانب تنکناوری کا میدان میں نہ ہونا اس کے لشکر پر مایوسی طاری کر رہا تھا۔ وسواس راؤ کو اور اس کے دیگر سالاروں کو یہ امید تھی کہ اگر شکست ہوئی تو وہ چندرکیری کے محفوظ مقام پر جا سکتے ہیں جہاں ان کا راجا زندہ سلامت ان کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہے۔ یہ امید ان کی کارکردگی پر برا اثر ڈال رہی تھی۔ وہ جان دینے کے لیے نہیں جان بچانے کے لیے لڑ رہے تھے۔
اس واضح فرق نے اپنا رنگ دکھایا۔ بیجاپور کا لشکر غالب آنے لگا اور پھر یہ غلبہ ہندوؤں کی شکست میں تبدیل ہوگیا۔ وسواس راؤ ہزاروں لشکریوں کو کٹوانے اور شکست قبول کرنے کے بعد بھاگ کھڑا ہوا۔
ان کا رخ دارالخلافہ گلکنڈہ کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ چندرکیری کی طرف بھاگ رہے تھے حالانکہ ان کے پاس یہ موقع تھا کہ وہ گلکنڈہ پہنچ کر قلعہ بند ہوتے اور شہر کی حفاظت کرتے۔
علی عادل نے ضروری نہیں سمجھا کہ وہ بھاگتے ہوئے لشکر کا تعاقب کرتا۔ اس نے سامان سمیٹا جو وسواس راؤ چھوڑ کر بھاگا تھا اور پھر گلکنڈہ کا رخ کیا۔
گلکنڈہ میں علی عادل کی مزاحمت کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔ شہر پر بہ آسانی قبضہ ہوگیا البتہ گلکنڈہ کا قلعہ دار حفاظت پر مامور دستوں کے ساتھ قلعہ بند ہوگیا تھا۔
علی عادل نے قلعے تک غلہ پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیے تھے اور اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ اہل قلعہ تنگ آکر خود باہر نکل آئیں۔

☆☆☆

وسواس راؤ شکست خوردہ لشکر کے ساتھ چندرکیری پہنچا تو قلعے کے دروازے کیا کھلے رانیوں کے بال کھل گئے۔ تنکناوری بھی خود کو کسی صحرا میں کھڑے اکیلے پیڑ کی طرح محسوس کرنے لگا۔ بیجانگر ہاتھ سے گیا تھا، گلکنڈہ بھی چلا گیا۔ کیا اب اسی قلعے میں ساری زندگی بسر کرنی ہوگی۔ کیا بیجاپور والے میری تلاش میں یہاں تک نہیں آجائیں گے؟
یہ وہ سوالات تھے جن میں وہ گھرا بیٹھا تھا۔ وسواس راؤ بار بار اس کے پاس آتا تھا لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔
تین دن اور تین رات تنکناوری کی یہی حالت رہی پھر اس کے سازشی ذہن نے ایک ترکیب نکال ہی لی۔ اس ترکیب کے سوجھتے ہی وہ اتنی زور سے چیخا کہ وسواس راؤ دوڑا ہوا اس کے پاس چلا آیا تھا۔
''وسواس راؤ، اچھا ہوا تم آگئے۔ میرے پاس ایک ایسی تجویز ہے کہ اگر اس پر عمل کرو تو بیجاپور کے لشکر کو گلکنڈہ سے نکال سکتے ہو۔''
''مہاراج، میں ایک بڑی جنگ کے بعد بھی انہیں نہ نکال سکا۔ آپ کے ذہن میں کیا تجویز ہے؟''

''جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے غور سے سنو۔ علی عادل کے لشکر میں برکی قبائل کے لوگ شامل ہیں۔ یہ لوگ چوری اور ڈاکازنی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا دین دھرم صرف دولت ہے۔ انہیں اگر خرید لیا جائے تو یہ علی عادل کو ایسا نقصان پہنچائیں گے کہ اسے محاصرہ اٹھانا پڑ جائے گا۔ ان کا سردار ہندیا ہتم نایک ہے۔ میں اس شخص سے واقف ہوں۔ نہایت لالچی اور دغاباز ہے۔ تم کچھ ایسے لوگ تیار کرلو جو میری دی ہوئی بھاری رقم ہندیا تک پہنچا دیں اور اس سے کہیں کہ وہ علی عادل کا ساتھ چھوڑ کر چلا جائے۔ دیگر برکی امرا کو بھی رقم پہنچا کر علیحدگی پر تیار کرلے اور جو کچھ وہ کرسکتا ہے، کرے۔''
''مہاراج، تجویز تو بہت اچھی ہے۔ میرے پاس کم از کم دو آدمی ایسے ہیں جو یہ کام آپ کی منشا کے موافق کرسکتے ہیں۔ آپ دھیرج رکھیں یہ کام ہو جائے گا۔''
وسواس راؤ نے بھاری رقم اور تحائف تنکناوری سے لے کر ان دونوں کے حوالے کر دیے۔ ایک مخصوص رقم انہیں بھی دے دی۔
ان دونوں نے دہقانوں کا روپ دھارا۔ گلکنڈہ کے قریب پہنچ کر قریب کے ایک دیہات سے غلہ خرید کر دو گاڑیوں پر لادا۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی رقم اور تحائف غلے کے ڈھیر میں چھپا دیے اور گلکنڈہ پہنچ گئے۔
''چندرکونی سے عادل شاہ لشکر کے لیے اناج آیا ہے۔ باقی گاڑیاں پیچھے آرہی ہیں ہم پہلے آگئے ہیں۔''
''کس کے حکم سے آئے ہو؟'' پہرے داروں نے پوچھا۔
''اپنے مالک مصطفیٰ خاں کے حکم سے اور کس کے حکم سے۔''
''تلاشی دو، کوئی ہتھیار وغیرہ تو ساتھ نہیں ہے؟''
''ہم تمہیں لڑنے والے لگتے ہیں؟ پھر بھی تلاشی لے لو۔ کہو تو گاڑیوں سے اناج بھی اتار دیں۔''
پہرے داروں کو ان کی سادگی پر ہنسی آگئی اور تلاشی لیے بغیر انہیں شہر کے اندر جانے دیا گیا۔ اندر پہنچتے ہی انہوں نے رقم وغیرہ نکال کر اپنی پگڑیوں میں رکھی۔ اتفاق سے اناج کی کئی گاڑیاں آئی کھڑی تھیں۔ انہوں نے گاڑیوں کو وہاں چھوڑا اور جو معلومات انہیں دی گئی تھیں ان کے مطابق اس طرف چل دیے۔
علی عادل شاہ نے شہر کے مختلف حصوں اور قلعے کو اپنے امرا کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ انہیں یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ برکی قبائل کے مورچے کس طرف ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہندیا نایک تک پہنچ گئے۔ اسے تنکناوری کا پیغام پہنچایا اور رقم اس کے حوالے کر دی۔
وہ دونوں گاڑیوں کے پاس آئے۔ دوسری گاڑیوں کے ساتھ ہی انہیں بھی خالی کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی گاڑیاں لیں اور باہر نکل آئے۔ کچھ دور جا کر گاڑیوں کو جنگل میں چھوڑا اور جس طرح پیدل آئے تھے اسی طرح چندرکیری پہنچ کر اپنی کامیابی کی اطلاع دے دی۔ بیش قیمت انعام کے وہ بھی مستحق تھے۔

☆☆☆

یہ رشوت اس لیے دی گئی تھی کہ ہندیا غداری کرے اور اپنے چار ہزار سپاہیوں کو لے کر الگ ہو جائے۔ اس نے بالکل یہی کیا۔ دولت کی چکاچوند نے اسے کچھ دیکھنے کے لائق چھوڑا ہی نہیں۔ دیکھا تو یہ کہ اسے کس راستے سے واپس جانا ہے۔ دوسرے دن چار دیگر برکی امرا نے بھی ہندیا کے اکسانے پر بادشاہ کی مخالفت کی اور اپنے پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ہندیا سے جا ملے۔
یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن ان لوگوں نے ایک کام اور کیا۔ یہ لوگ چوری اور ڈاکازنی میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے اپنے اس فن کا مظاہرہ اور چوری چکاری شروع کر دی۔ ان کی چوریوں سے لشکر بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ غلہ اور چارہ چرانے میں ان لوگوں نے بڑی مستعدی دکھائی اور عادل شاہی لشکر کو پریشان کر کے رکھ دیا۔
عادل شاہ کو محاصرہ کیے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ وہ اب قلعے پر قبضہ کرنے کے آخری مراحل میں تھا کہ یہ صورت پیش آگئی۔ اس صورت حال سے لشکر کے دیگر لوگوں میں بھی بددلی پھیلنے لگی تھی۔ اس نے اسی میں بہتری سمجھی کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔
وہ بیجاپور کے نزدیک پہنچا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ برکی امرا نے علم بغاوت بلند کر کے اپنے اپنے پرگنوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ تمام پرگنے بیجانگر کی سرحد پر واقع تھے۔ اس نے اپنے ایک امیر مرتضیٰ خاں آنجو کو ان پرگنوں کا جاگیردار مقرر کر دیا نیز اسے تین ہزار تیر انداز سواروں کے ساتھ برکیوں کی بغاوت کو کچلنے کا حکم دیا۔
مرتضیٰ خاں اور برکیوں کے درمیان خونریز جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ طرفین کے بے شمار سپاہی کام آئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے بیجاپور اور بیجانگر کے درمیان انگارے بچھا دیے گئے ہوں۔
برکیوں کی خوفناک جنگ کے باعث علی عادل شاہ کی فتوحات کا سلسلہ بھی رک گیا تھا۔ وہ خود تو ان جھڑپوں میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

شریک نہیں تھا لیکن ان باغیوں کے خوف سے وہ بیجاپور چھوڑ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اب سوچنے لگا تھا کہ اس نے برکیوں کے خلاف قدم اٹھا کر غلطی کی۔

اس موقع پر اس کے ایک امیر اور چندر کونی کے حاکم مصطفیٰ خاں کا پیغام اسے ملا۔

"اپنے لشکر کو چوروں کے مقابلے پر بھیجنا دانش مندی سے دور ہے۔ بہتر یہی ہے کہ باغیوں کو کسی بہانے سے بیجاپور میں طلب کیا جائے اور پھر ان کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔"

علی عادل شاہ کو یہ مشورہ پسند آیا لیکن سوال یہ تھا کہ باغیوں کو بیجاپور لے کر کون آئے؟ اس کے لیے اس نے راسو پنڈت کا انتخاب کیا جو ایک برہمن تھا اور نہایت چرب زبان تھا۔ علی عادل کو امید تھی کہ وہ ہندیا کو ضرور شیشے میں اتار لے گا۔

راسو پنڈت بادشاہ کی مہربانیوں کا سندیسا لے کر ہندیا نایک سے ملا اور اسے علی عادل شاہ کا پیغام پہنچا کر بیجاپور آنے پر مائل کیا۔

"علی عادل شاہ تمہاری بہادری سے بہت متاثر ہوا ہے۔ تم لوگوں کو عام معافی دے کر اپنی ملازمت میں رکھنے کا خواہاں ہے۔ اگر تم بیجاپور جا کر بادشاہ سے ملاقات کر دو تو کیا مضائقہ ہے۔"

ہندیا نایک بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ہوشیار بھی تھا۔ اس نے برہمن کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسے تو برہمن کی باتوں پر یقین آ گیا ہے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد بیجاپور آ جائے گا۔

برہمن کے چلے جانے کے بعد اس نے تمام سرداروں کی ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور ان کے سامنے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"جب سارا کرناٹک بادشاہ کے قبضے میں آنے والا تھا اور واقعات وحالات کے پیش نظر پورے یقین سے یہ کہا جاتا تھا کہ کرناٹک کی حکومت رام راج کے خاندان سے نکل کر علی عادل شاہ کو منتقل ہو جائے گی تو ہم نے اس وقت عادل شاہ کی مخالفت کی اور علم بغاوت بلند کیا۔ ہم نے بادشاہ کے راستے کا سنگ گراں بن کر اس کو اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے سے روکا ہے۔ بادشاہ کی نظر میں ہمارا یہ فعل ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اس لیے مجھے یقین نہیں ہے کہ بادشاہ ہمیں معاف کر دے گا۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ مسلمان ہمیں دھوکا دے کر بیجاپور لے جانا چاہتے ہیں اور پھر وہاں ہم کو قتل کر ڈالیں گے۔"

اس کے ساتھیوں کو اس کی رائے سے اختلاف تھا۔ انہوں نے ہندیا نایک کے برعکس یہ فیصلہ کیا کہ وہ بیجاپور جا کر علی عادل شاہ سے ملاقات کریں گے اور اس کی ملازمت اختیار کریں گے۔

ہندیا نایک گلکنڈہ چلا گیا اور وہاں تلنگاوری کی ملازمت اختیار کر لی جس نے چندر گیری سے گلکنڈہ آ کر حکومت سنبھال لی تھی۔

سب سے پہلے برکیوں کا سردار جوت رائے بیجاپور پہنچا۔ علی عادل شاہ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اسے خلعت ومنصب سے نوازا۔ یہ خبر چاروں طرف پھیلی تو تمام باغی یکے بعد دیگرے بیجاپور میں آنے لگے۔ جب تمام باغی بیجاپور میں جمع ہو گئے تو علی عادل شاہ کی آتش انتقام بھڑک اٹھی بلکہ منصوبہ یہی تھا۔ اس نے جوت رائے کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اندھا کروا دیا۔ باقی سرداروں کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر قتل کر دیا اور ان کی لاشوں کو سارے شہر میں پھرایا گیا۔ رفتہ رفتہ تمام باغی ختم ہو گئے۔

☆☆☆

امیر علی برید کے پاس دو نہایت حسین خواجہ سرا تھے جن کی شہرت علی عادل شاہ تک بھی پہنچی۔ اس کی جمال دوستی اور حسن پرستی ضرب المثل تھی۔ اسی جذبے سے مجبور ہو کر اسے شوق ہوا کہ وہ ان خواجہ سراؤں کو اپنے پاس بلائے۔

اس نے اپنا ایک ایلچی امیر برید کے پاس روانہ کیا اور اسے یہ پیغام بھجوایا۔

"تمہارے پاس دو نہایت حسین خواجہ سرا ہیں۔ مجھے ان کو دیکھنے اور اپنے پاس رکھنے کا اشتیاق ہوا ہے لہٰذا تمہیں چاہیے کہ ان دونوں کو فوراً میرے پاس روانہ کر دو۔"

ان خواجہ سراؤں کی خوب صورتی نے علی برید کو بھی ان کا والہ وشیدا بنا رکھا تھا۔ وہ کسی قیمت پر انہیں خود سے جدا کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا لہٰذا ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔

علی عادل شاہ کے تقاضے برابر پہنچ رہے تھے۔ تنگ آ کر علی عادل شاہ نے لکھ بھیجا کہ اگر اسے ان خواجہ سراؤں کو اس کے پاس نہیں بھیجا تو وہ اس پر حملہ کر دے گا۔ بات جب یہاں تک پہنچی تو علی برید ڈر گیا اور خواجہ سراؤں کو ان کی مرضی کے خلاف زبردستی بیجاپور بھیج دیا۔ ان خواجہ سراؤں کو اس طرح زبردستی بھیجا جانا سخت ناگوار گزرا تھا لیکن اپنے رویے سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

اسی رات جب ان میں سے ایک کو علی عادل شاہ نے اپنے حضور طلب کیا تو وہ زہر میں بجھا ہوا خنجر خلوت میں اپنے ساتھ لے گیا۔ علی عادل شاہ جیسے ہی اس کے قریب آیا۔ خواجہ سرا نے خنجر اس کے دل میں اتار دیا۔ علی عادل شاہ نے اسی وقت دم توڑ دیا۔ دونوں خواجہ سراؤں کو اس جرم میں قتل کر دیا گیا۔

☆☆☆

چاند بی بی کوئی اولادِ نرینہ عادل شاہ کو نہیں دے سکی تھی لہٰذا حکومت علی عادل شاہ کے بھتیجے ابراہیم بن طہماسپ کو منتقل ہوئی جو تاریخ میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کے لقب سے مشہور ہوا۔

ابراہیم کی عمر تخت نشینی کے وقت صرف دس سال تھی اس لیے اس کی تعلیم وتربیت کا بار چاند بی بی پر آیا اور اسی نے بار سلطنت بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

علی عادل شاہ اس سے کہا کرتا تھا کہ تم اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان خواتین میں سے ہو جنہوں نے تاریخ میں نمایاں کام انجام دیے ہیں۔

چاند بی بی اب اسی راہ پر چل رہی تھی۔ وہ امور سلطنت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی کہ کہیں خوشامدی امرا شہزادے کی کم عمری کا فائدہ اٹھا کر امور مملکت میں خلل پیدا نہ کریں۔ خاص طور پر کامل خاں دکنی پر اس کی نظر تھی جس نے شہزادے کا قرب حاصل کر لیا تھا اور اپنے اعتباری مقربین کو ابراہیم کے گرد مقرر کر دیا تھا۔

کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے لیکن چاند بی بی کی دور اندیش نظروں نے خطرے کو بھانپ لیا۔ کامل خاں کی آنکھوں میں اس نے اقتدار کا نشہ دیکھ لیا جو کسی بھی وقت سر چڑھ کر بول سکتا تھا۔

چاند بی بی کیا کر سکتی ہے یہ بھی کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا۔ ایک روز چار سو مسلح افراد ایک امیر کی قیادت میں سبز محل میں داخل ہوئے۔ یہ قصر بیجاپور کا ایک حصہ تھا۔

کامل خاں کو کسی نے بتایا کہ کشور خاں کی سربراہی میں مسلح افراد قلعے میں داخل ہوئے ہیں جو سبز محل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

(اس نام کے دو امیر تھے۔ ایک کشور خاں بہت پہلے قتل ہو چکا تھا۔ دوسرا یہ تھا جو کامل دکنی کو گرفتار کرنے آیا تھا)

کامل خاں کو خبر ہوئی تو وہ شاہی حرم سرا کی طرف بھاگا۔ اس کا خیال تھا کہ چاند بی بی اس کی حفاظت کرے گی لیکن اس کے چند وفاداروں نے بتایا کہ یہ سب کچھ چاند بی بی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ وہ وہیں سے واپس پلٹا۔ شاہی محل کے پیچھے کی دیوار پر چڑھا، نیچے پانی سے بھری ہوئی لبالب خندق تھی، اس میں کود گیا پھر تیرتا ہوا حصار شہر پر جا پہنچا۔ یہ حصار بارہ گز اونچا تھا۔ اس نے اپنی پگڑی، شال اور کمر بند کو ایک دوسرے سے باندھ کر ایک کمندی بنا لی اور اس کا ایک سرا دیوار کے کنگرے سے باندھ کر نیچے اتر گیا اور اسی بدحواسی کے عالم میں گھر تک پہنچ گیا۔ جبکہ کشور خاں کے آدمی اسے قلعے میں تلاش کر رہے تھے۔ ایک جماعت اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

کامل خاں کو اس کی خبر ہو گئی۔ اس نے تمام دولت اور نقد رقم سمیٹی اور سات آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ احمد نگر جانے کے لیے روانہ ہوا لیکن ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ کشور خاں کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور اسے قتل کر کے تمام اسباب لوٹ لیا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو اس واقعے کی تحقیق وتفتیش ہوتی لیکن یہ سب کچھ تو ہوا ہی چاند بی بی کے حکم سے تھا۔ کامل خاں دکنی کا خون رائگاں چلا گیا۔

اس قتل نے تمام امرا کو دہلا دیا اور کشور خاں کی ہیبت سب پر طاری ہو گئی۔ کشور خاں نے تمام امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چاند بی بی کے مشوروں سے اپنے فرائض انجام دینے لگا۔

بیجاپور میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے احمد نگر والے بے خبر نہیں تھے۔ انہوں نے اس بدنظمی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ بیجاپور میں یہ خبر پہنچی کہ مرتضیٰ نظام شاہ کا لشکر عادل شاہی سرحد کے بعض پرگنوں کو فتح کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ چاند بی بی نے فوراً کشور خاں کو طلب کیا اور اس حملے کو روکنے کے لیے بھیجا۔ کشور خاں نے دوسرے امرا کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک زبردست لشکر لے کر نظام شاہی فوج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ طرفین میں زبردست جنگ ہوئی اور بالآخر عادل شاہیوں کو فتح ملی۔

اس کامیابی نے کشور خاں کا مرتبہ بہت بڑھا دیا۔ چاند بی بی سے اس کی قربت اتنی بڑھ گئی کہ بعض امرا کو یہ شک ہونے لگا کہ چاند بی بی نے اس سے ناجائز تعلق قائم کر رکھا ہے۔ یہ تاثر اس لیے قائم ہوا کہ دن اور رات کی تخصیص کے بغیر جب اسے مشورے کی ضرورت پڑتی وہ کشور خاں کو بلا لیتی۔

بعض امرا نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ چاند بی بی کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جائے جس میں یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

درخواست کی جائے کہ کشور خاں کو معزول کر کے اس کی جگہ مصطفیٰ خاں کو مقرر کیا جائے۔

اس کی اطلاع کشور خاں کو بھی ہو گئی اور اس نے اس سازش کے پیچھے مصطفیٰ کا ہاتھ سمجھا۔ اس نے سوچا اس سے پہلے کہ مجھے معزول کیا جائے میں مصطفیٰ خاں کو راستے سے ہٹا دوں۔

اس نے ایک شاہی فرمان تیار کیا اور چاند بی بی سے دھوکے سے اس پر مہر لگوالی۔ چاند بی بی اس پر اتنا اعتبار کرنے لگی تھی کہ تحریر کو پڑھا تک نہیں۔ اس فرمان کے ساتھ کشور خاں نے اہل قلعہ کے نام یہ پیغام بھی بھیجا۔

''مصطفیٰ خاں نے اہل قلعہ کو قتل کر کے قلعہ نائکوں کے سپرد کر دینے کا ارادہ کیا ہے۔ اس وقت تمہارا یہ فرض ہے کہ شاہی فرمان پر عمل کرو اور مصطفیٰ خاں کو قتل کر دو۔''

شاہی فرمان کا سہارا لے کر کشور خاں نے مصطفیٰ خان کو قتل کروا دیا۔

چاند بی بی پر یہ راز بہت جلد کھل گیا کہ کشور خاں نے دھوکا دہی سے ایک تحریر پر مہر لگوائی تھی۔ وہ کشور خاں سے نفرت کرنے لگی۔ اس نے اب کشور خاں سے مشورے لینے بھی بند کر دیے تھے۔ اس کے اس رویے سے کشور خاں کو خطرہ رہنے لگا کہ وہ کسی وقت بھی اس کے خلاف قدم اٹھا سکتی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ان تمام حالات سے بے خبر تھا لہٰذا کشور خاں نے اس سے ملاقات کی اور نہایت معصومیت سے چاند بی بی کی شکایت اس سے کی۔

''حضور آپ کے علم میں آیا ہوگا کہ نظام شاہی لشکر بیجاپور کی سرحدوں تک آ گیا ہے۔''

''میں نے سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ آپ کی دلیری اور بہادری اور بروقت اقدام نے اس حملے کو ناکام بنا دیا تھا۔''

''حضور نے درست سنا لیکن ایسے حملوں کو ہم کب تک ناکام بناتے رہیں گے۔''

''کیا مطلب...... کیا مزید حملوں کا خطرہ ہے؟''

''چھوٹا منہ بڑی بات لیکن حقیقت یہ ہے کہ چاند بی بی جب تک بیجاپور میں ہیں اور ان کا حکم چلتا ہے یہ حملے ہوتے رہیں گے۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اور حضرت چاند بی بی کے قریب رہا ہوں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ وہ اپنے بھائی نظام مرتضیٰ کو بیجاپور کے رازوں سے واقف کرتی رہتی ہیں اور اسے عادل شاہی سرحد پر قبضہ کرنے کے لیے اکساتی رہتی ہیں۔ شاید چاہتی یہ ہیں کہ میکا اور سسرال ایک ہو جائے۔''

''کشور خاں، تم بہت بڑا الزام لگا رہے ہو۔''

''جانتا ہوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ اس گستاخی کے بدلے میں عتابِ شاہی کا شکار بھی ہو سکتا ہوں لیکن حقیقت یہی ہے۔''

''آپ کے نزدیک اس کا حل کیا ہے؟''

''میری تجویز ہے کہ حضرت چاند بی بی کو کچھ عرصہ کے لیے قلعہ ستارا میں قید کر دینا چاہیے۔''

ابراہیم عادل شاہ اپنی کم عمری کے سبب اس کی باتوں میں آ گیا اور مزید کسی تحقیق کے بغیر چاند بی بی کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔

چاند بی بی نے سنا تو خود کو شاہی حرم میں بند کر لیا۔ حرم کی عورتوں اور خواجہ سراؤں نے کہا۔ ''ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے چاند بی بی کو باہر نہیں جانے دیں گے۔''

کشور خاں اس کی گرفتاری کے لیے بے چین تھا۔ ڈر تھا کہ معاملہ ٹل نہ جائے۔ اس نے باہر سے ایسے خواجہ سرا اندر بھیجے جو چاند بی بی سے مانوس نہیں تھے۔ وہ مسلح ہو کر اندر گئے اور چاند بی بی کو زبردستی اٹھا کر شاہی محل سے باہر لے آئے۔ ایک پالکی میں بٹھایا اور قلعہ ستارا میں پہنچا دیا گیا۔

کشور خاں نے اپنی محسنہ کے ساتھ یہ سلوک کر کے اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھا اور پہلے سے زیادہ مغرور ہو کر دوسرے امرا پر حکم چلانے لگا جیسے وہی بادشاہ ہو۔

اس کے اس رویے نے امرا کو اس کے خلاف کر دیا۔ خاص طور پر اخلاص خاں نامی امیر اس کے خلاف جنگ کرنے تک کو تیار ہو گیا تھا۔

چاند بی بی کے حوالے سے اس نے جو حرکت کی تھی اس کے بعد عوام بھی اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ جب شہر میں نکلتا تو عام لوگ بلکہ عورتیں تک اسے لعنت ملامت کرتی تھیں۔ اسے مصطفیٰ خاں کا قاتل کہتی تھیں۔ یہ نعرے لگتے تھے۔

''یہی وہ نمک حرام ہے جس نے چاند بی بی کو قید میں رکھا ہوا ہے۔''

ان تمام جھگڑوں نے کشور خاں کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ بیجاپور چھوڑ دے۔ وہ چار سو سواروں اور بے شمار دولت کے ساتھ احمد نگر کی طرف گیا۔

وہ عجیب نادان شخص تھا۔ چاند بی بی پر ظلم ڈھا کر اس کے میکے جا رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اس کی پذیرائی ہوگی۔ یہ چاند بی بی کا میکا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس پر انکشاف ہوا کہ

یہاں کے لوگ بھی اسے ناپسند کرتے ہیں۔ یہاں کے حکمران کسی وقت بھی اس کے خلاف ہو سکتے تھے۔ اس نے یہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا۔ اب ایک ہی جگہ باقی رہ گئی تھی۔ وہ گولکنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ موت اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ کوئی شخص اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس نے مصطفیٰ خاں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اس پر حملہ کیا اور قتل کر دیا۔ اتنا بڑا امیر، سیکڑوں جنگوں کا سامنا کیا ہوگا، گیدڑ کی موت مر گیا۔

اس وقت اخلاص خاں بیجاپور سے باہر تھا۔ کشور خاں کے قتل کا سن کر وہ بیجاپور آیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اسے خلعتِ فاخرہ سے نوازا اور تمام ملکی امور اس کے سپرد کر دیے۔ اخلاص خاں نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ چاند بی بی کو رہا کروا کے شاہی محل میں لے آیا۔

بیجاپور میں امرا کی رسا کشی ایسی شروع ہوئی تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ اخلاص خاں نے کشور خاں کی جگہ لے لی تھی۔ چاند بی بی بھی اس سے بہت خوش تھی۔ اب اخلاص خاں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کا نشہ سوار ہو گیا۔ اسے یہ وہم ہونے لگا تھا کہ غیر ملکی امرا اس کے اقتدار کے لیے خطرہ ہیں۔ وہ ان امرا کا دشمن بن گیا۔ اقتدار تو اس کے ہاتھ میں تھا ہی، اس نے ایک ایک کر کے انہیں قتل کروانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے افضل خاں شیرازی اور راسو پنڈت کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس کے بعد ابوالقاسم اور شاہ مرتضیٰ خاں انجو اور بہت سوں کو بیجاپور سے نکال دیا۔

کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ اس کے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ ہر سیر کو سوا سیر ہوتا ہے۔ جس وقت اخلاص خاں تمام امرا کا صفایا کر رہا تھا، اسے ایک سالار عین الملک سے خطرہ محسوس ہوا۔ عین الملک پر ہاتھ ڈالنا بہت مشکل تھا۔ اخلاص خاں نے اسے ایک دعوت میں مدعو کیا۔ منصوبہ یہی تھا کہ اسے وہاں گرفتار کر لیا جائے گا لیکن داؤ الٹا پڑ گیا۔ عین الملک وقت سے پہلے باخبر ہو گیا اور اس نے اخلاص خاں کو چند ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا اور پابہ زنجیر کر کے ابراہیم عادل شاہ کے حضور لے جانے لگا لیکن اخلاص خاں کی جڑیں بہت گہری تھیں، شاہی غلاموں کی ایک جماعت سامنے آ گئی۔

عین الملک کو اس وقت تو اپنی جاگیر کی طرف بھاگنا پڑا لیکن جلد ہی اس نے بہت سے امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اخلاص خاں کے خلاف حرکت میں آ گیا۔ ایک بغاوت سی پھیل گئی۔

بیجاپور میں سخت انتشار پھیلا ہوا تھا۔ طوائف الملوکی کی کیفیت تھی۔ اس انتشار سے بہزاد ملک نے ایک مرتبہ پھر فائدہ اٹھایا۔ وہ شکست کھا کر عادل شاہی علاقے سے کچھ فاصلے پر مقیم تھا۔ وہ حرکت میں آیا اور بیجاپور کے قلعہ شاہ درگ پر حملہ آور ہو کر اس پر قبضہ کر لیا اور گلبرگہ کی طرف بڑھا۔ اب اس کی مدد کو قطب شاہ کی فوج بھی آ گئی تھی۔ دونوں نے مل کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرے کو چار مہینے گزر گئے تھے۔ بیجاپور سے کوئی مدد نہ آ سکی تھی لیکن قلعے کا حاکم کسی قیمت پر ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ محاصرے کی طوالت نے قطب شاہی لشکر کو بددل کر دیا۔ بہزاد ملک بھی دلبرداشتہ ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ بیجاپور میں اس وقت طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ ہر طرف انتشار پھیلا ہوا ہے لہٰذا اگر وہاں پہنچ کر ہم کوئی ہنگامہ برپا کر دیں تو بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔

ان لوگوں نے بیجاپور پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ پایہ تخت میں اس وقت صرف دو تین ہزار لشکر کے سوار موجود تھے۔ بادشاہ نے عین الملک وغیرہ کو بلا بھیجا۔

محاصرہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر افتاد یہ آئی کہ دشمن کے لشکر میں قحط پڑ گیا اور گلبرگہ کی طرح یہاں سے بھی محاصرہ اٹھا کر جانا پڑا۔

یہ ابراہیم عادل شاہ کی اقبال مندی تھی کہ دشمن کے چالیس ہزار سپاہیوں نے قلعہ بیجاپور کا محاصرہ کیا۔ ان کے مقابلے میں صرف دو تین ہزار سپاہی شہر میں تھے۔ اس کے باوجود ایک سال تک محاصرہ کرنا پڑا اور نامراد لوٹنا پڑا۔

یہ مصیبت ٹل گئی لیکن یہاں تو جنگ امرا کے درمیان تھی، کوئی دشمن سامنے نہیں تھا۔ اس مرتبہ اخلاص خاں اور ایک سالار دلاور خاں اپنے اپنے عروج کے حصول کے لیے آپس میں ٹکرا گئے۔ بیجاپور کے گلی کوچوں میں جنگ ہو رہی تھی اور بے بس ابراہیم کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان حالات میں چاند بی بی بھی دبک کر بیٹھ گئی تھی۔

کئی ہفتوں تک گلی کوچے مقتل بنے رہے۔ آخر دلاور خاں کی فتح ہوئی۔ اس نے اخلاص خاں کو گرفتار کر کے اس کی دونوں آنکھیں نکلوا دیں۔

ابراہیم عادل شاہ ابھی تعلیم و تربیت کے مرحلے میں تھا۔ یہ اس کی کم سنی ہی کا نتیجہ تھا کہ امرا اپنے کھیل کھیل رہے تھے۔ ان کے سامنے چاند بی بی کی چالیں بھی کمزور پڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

احمد نگر چاند بی بی کا میکا تھا اور احمد نگر کی حالت روز بہ روز بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ مرتضیٰ نظام عیش پرستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سلطنت کے کاموں سے جی اچاٹ ہوگیا تھا۔ اس کی اس غفلت اور بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ موقع پرستوں نے بڑے بڑے عہدے آپس میں تقسیم کرلیے۔

یہ حالت دیکھ کر مرتضیٰ نظام کے بیٹے یعنی چاند بی بی کے بھتیجے میراں حسین شاہ کے دل میں تخت پر بیٹھنے کا خیال آیا۔ امرا دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ کچھ میراں حسین شاہ کے حق میں تھے اور کچھ مرتضیٰ نظام کے ساتھ تھے۔ باپ بیٹوں کی اس جنگ میں دونوں گروہ اپنا اپنا الو سیدھا کررہے تھے۔

مرتضیٰ نظام اپنے بیٹے کو ٹھکانے لگانے کے لیے کئی مرتبہ کوششیں کرچکا تھا اور ناکام ہوا تھا۔ اس مرتبہ اس نے اپنے ایک بااعتماد سالار اسمٰعیل خاں کو میراں حسین کے قتل کے لیے مقرر کیا۔ یہ راز خفیہ نہ رہ سکا اور میرزا خاں تک پہنچ گیا۔ میرزا خاں، سالار قاسم بیگ کا دست راست تھا اور میراں حسین کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتا تھا۔ وہ از خود تو اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اپنا ایک قاصد بیجاپور دلاور خاں کے پاس بھیجا اور اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے اس کی مدد چاہی۔ میرزا خاں کا پیغام نظام شاہی بقا سے وابستہ تھا اس لیے اس نے اس شرط پر مدد کا وعدہ کرلیا کہ وہ ابراہیم عادل سے مشورہ کرے گا۔

اس معاملے کو چاند بی بی سے خفیہ رکھنا تھا لہٰذا اسے اس کی بھنک تک نہیں پڑنے دی گئی۔ صرف ابراہیم عادل کو ہمراز بنایا گیا۔ وہ دلاور خاں کی بات ٹالنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے اس معاملے میں اس لیے بھی دلچسپی ہوئی کہ اس کی بہن خدیجہ میراں حسین کی بیوی تھی۔ چاند بی بی سے چھپانا اس لیے ضروری تھا کہ مرتضیٰ نظام بہرحال اس کا بھائی تھا۔

ابراہیم عادل شاہ نے احمد نگر کا سفر اختیار کیا۔ وہ آہستہ خرامی سے سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا احمد نگر کے قریب پہنچا۔

میرزا خاں کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے احمد نگر کے امرا کو ہم خیال بنا کر بادشاہ سے تمام تعلقات منقطع کرلیے اور دولت آباد کی طرف روانہ ہوگیا جہاں میراں حسین شاہ قید و بند کی سختیاں جھیل رہا تھا۔

میرزا خاں نے شہزادے کو قید سے نکالا اور اپنے ساتھ لے کر احمد نگر روانہ ہوا۔ انتظامات سنبھالنے کے لیے شہر کی طرف روانہ ہوا اور احمد نگر سے پانچ کوس کے فاصلے پر ٹھہر گیا کہ اگر احمد نگر میں شورش برپا ہوئی تو وہ فوراً پہنچ جائے گا۔

شہزادہ میراں حسین اور میرزا خاں ننگی تلواریں لے کر تیس چالیس آدمیوں کے ساتھ قلعے میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد یہ لوگ اس عمارت میں گئے جہاں بادشاہ رہتا تھا۔ وہاں جتنے لوگ تھے سب کو قتل کردیا۔ بادشاہ ان دنوں سخت بیمار تھا اور اس وقت بھی بستر پر دراز تھا۔ میراں حسین شاہ آگے بڑھا اور تلوار بادشاہ کے پیٹ پر رکھ کر نہایت بے ادبی سے کہا۔

”جی چاہتا ہے یہ تلوار تیرے پیٹ میں اتنے زور سے گھونپ دوں کہ دوسری طرف نکل آئے۔“

بادشاہ حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”اے مردود! اے عاق شدہ بیٹے، تیرا باپ اب چند روز کا مہمان ہے۔ تو اگر اس پر رحم کرے تو ٹھیک ہے ورنہ جو تیرے جی میں آئے کرلے۔“

میراں شاہ کو پھر بھی رحم نہیں آیا۔ حکم دیا۔

”بادشاہ کو حمام میں لے جایا جائے۔ حمام کا دروازہ بند کرکے انتہائی تیز آگ روشن کی جائے، حمام کے تمام سوراخ بند کردیے جائیں اور اس تک پانی کی ایک بوند بھی نہ پہنچنے دی جائے۔“

اس طرح مرتضیٰ نظام شاہ ہلاک ہوگیا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی تک یہ خبر پہنچی تو اسے سخت افسوس ہوا۔ اس نے میراں شاہ سے ملاقات کا ارادہ ترک کرلیا اور یہ پیغام اس کی طرف بھیج کر بیجاپور کی طرف روانہ ہوگیا۔

”میں لشکر لے کر اس طرف اس مقصد سے آیا تھا کہ حکومت کی باگ ڈور تمہارے سپرد کردوں اور تمہارے باپ مرتضیٰ نظام شاہ کو کسی قلعے میں نظر بند کردوں تاکہ تم پورے اطمینان کے ساتھ امور سلطنت انجام دے سکو لیکن تم نے تو اس کی جان ہی لے لی اور وہ بھی شدید غیر انسانی اذیت دینے کے بعد۔ اب میں تم سے ملنا تمہارے جرم میں شریک ہونا سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس مظلوم کا خون رنگ لائے گا اور تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہوکر اپنے اعمال کی سزا پاؤ گے۔ خیر جو ہوا سو ہوا، میں تم سے اس وقت کوئی باز پرس کرنا نہیں چاہتا اور معاملے کو خدا پر چھوڑتا ہوں تاکہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں تمہارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔“

ابراہیم عادل شاہ نے جو کچھ کہا تھا، ایک سال بعد ہی پورا ہوگیا۔ خدا کے کام بھی نرالے ہوتے ہیں۔ وہی میرزا خاں جس نے بڑی تگ و دو کے بعد میراں شاہ کو تخت نشین کروایا تھا۔ اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس کے خلاف ہوگیا۔ ایک روز وہ کسی مشورے کے بہانے میراں شاہ کو قلعے میں لے گیا۔ اس نے اپنے ہم خیال لوگوں کو پہلے ہی قلعے میں پہنچادیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی میراں شاہ کو گرفتار کرلیا گیا۔

چاند بی بی کے والد حسین نظام شاہ کے دوسرے بیٹے برہان شاہ کا بیٹا اسمٰعیل شاہ اتفاق سے وہاں موجود تھا۔ اس کی عمر اس وقت نو سال تھی۔ نیا بادشاہ بنانے کے لیے اس سے بہتر شکار اور کون ہوسکتا تھا۔ اسے پکڑ کر تخت پر بٹھادیا گیا۔

برہان شاہ اپنے بھائی مرتضیٰ نظام کے خوف سے بھاگ کر اکبر بادشاہ کے پاس چلا گیا تھا اور اس وقت وہ وہیں تھا جب اس کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت پر بٹھادیا گیا۔

قلعے میں اسمٰعیل کی تخت نشینی ہورہی تھی۔ ایک معمولی درجے کے سالار جمال خاں کو جب معلوم ہوا تو چند دستے فوج کے لے کر قلعے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ قلعے کے دروازے بند تھے لہٰذا اس کے آدمیوں نے ہنگامہ اور شور شرابا شروع کردیا۔

میرزا خاں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے منادی کرنے والوں سے منادی کروادی۔

”میراں شاہ ہرگز بادشاہ بننے کے لائق نہیں تھا۔ میری غلطی تھی کہ میں نے اس کی مدد کی اور اسے بادشاہ بنایا۔ اب میں اسے معزول کرکے اپنے گناہوں کی تلافی کررہا ہوں۔ تم اس معاملے میں دخل مت دو۔ نیا بادشاہ اسمٰعیل بن برہان شاہ کو مقرر کیا گیا ہے۔ وہ بہت جلد تم سے ملاقات کرے گا۔“

جمال خاں اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے سارے شہر میں منادی کروادی۔

”میرزا خاں اور دوسرے امرا قلعے کے اندر جمع ہوگئے ہیں۔ ان لوگوں نے میراں حسین کو قید کرلیا ہے۔ جلدی اس کی مدد کو پہنچو ورنہ یاد رکھو دکن کے بیوی بچے لونڈی اور غلام ہوجائیں گے۔“

یہ سننا تھا کہ اہل دکن مسلح ہوکر قلعے کے سامنے پہنچ گئے۔

میرزا خاں کو اب بھی ہوش نہیں آیا۔ اس نے تکبر اور شقاوت قلبی کی چادر اوڑھی۔ اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ شخص آگے بڑھا اور میراں شاہ کا سر اس کے تن سے جدا کردیا۔

”اس کا سر برج کے اوپر لٹکا دو۔“ اس نے حکم دیا اور پھر خود بھی فصیل پر پہنچ گیا اور شہریوں سے مخاطب ہوا۔

”تم لوگ میراں حسین شاہ کے لیے شور کررہے تھے، اس کا سر دیکھ لو اور اسمٰعیل بن برہان شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلو۔ اس کی وفاداری کا عہد کرو اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔“

جب میراں شاہ زندہ ہی نہیں رہا تھا تو یہ لوگ کس کے لیے لڑتے۔ بعض دکنی امرا و عام لوگ واپس ہونے لگے تھے کہ جمال خاں نے انہیں للکارا۔

”جاتے کہاں ہو۔ بے شک! اب ہمارا بادشاہ اسمٰعیل بن برہان شاہ ہے لیکن میراں حسین شاہ کے قتل کا انتقام ہم پر فرض ہے۔ اس کے قاتلوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچنا چاہیے تاکہ ہم اسمٰعیل برہان کے عہد حکومت میں سر اٹھا کر جی سکیں۔ اگر ہم نے انہیں اس وقت چھوڑ دیا تو یہ بدبخت قاتل اسمٰعیل کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

لوگوں میں ایسا اشتعال پھیلا کہ بھوسے سے بھری گاڑیاں قلعے کے دروازے کے سامنے کھڑی کرکے انہیں آگ لگادی گئی۔ اس آگ نے دروازے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب کوئی اندر سے باہر نہیں آسکتا تھا۔

جب رات دو گھڑی کے قریب گزر گئی تو آگ کی شدت میں کچھ کمی آئی۔ جو امرا اندر تھے وہ ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے باہر نکلے لیکن سب کے سب مارے گئے۔ کچھ شہر میں کچھ مضافاتِ شہر میں۔ میرزا خاں کا کچھ پتا نہیں چلا کہ کس طرف گیا، زندہ ہے یا مارا گیا۔

اس حادثے کے چوتھے روز میرزا خان کو جنیر کے قریب گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتار کرنے والوں نے اسے جمال خاں کے سامنے لاکر پٹخ دیا۔ جمال خاں کے حکم سے پہلے تو اسے گدھے پر سوار کرکے گھمایا گیا اور بعد میں اسے قتل کردیا گیا۔

☆☆☆

حسین نظام شاہ کا بڑا بیٹا برہان نظام شاہ اکبرِ اعظم کے پاس دن گزار رہا تھا۔ جب جلال الدین اکبر نے اسمٰعیل نظام کی تخت نشینی کی خبر سنی تو اس نے برہان شاہ کو اس کی جاگیر سے بلوایا۔

”احمد نگر کے حقیقی وارث تم ہو۔ اس لیے یہ ملک میں تمہیں عطا کرتا ہوں۔ جاؤ اور اپنے بیٹے کو معزول کرکے

WWW.PAKSOCIETY.COM

عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لو۔"

"وہاں جمال خاں کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا ہے۔ مجھے اس سے جنگ کرنی ہوگی۔"

"اپنے ملک کو فتح کرنے کے لیے دہلی کی فوج کا جتنا حصہ چاہو لے جاسکتے ہو۔"

برہان بادشاہ کا ارادہ یہی تھا کہ وہ دہلی کی فوج اپنے ساتھ لے کر جائے گا لیکن بعد میں اس نے یہ رائے بدل دی اور اکبر بادشاہ سے عرض کیا۔

"اہلِ دکن جب شاہی لشکر میرے ساتھ دیکھیں گے تو وہ طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہوجائیں گے اور میرے ساتھ بری طرح پیش آئیں گے۔ اگر حضور کا حکم ہو تو میں اکیلا ہی دکن کی طرف جاؤں اور نرمی سے اہلِ دکن کو اپنا ہی خواہ بنا کر اپنے موروثی ملک پر قبضہ کروں۔"

"ہمیں تمہاری رائے سے اتفاق ہے۔ جس طرح چاہو اپنے ملک پر قبضہ کرو لیکن ایک مطالبہ ہمارا بھی ہے کہ جب تم اپنے ملک پر قبضہ کرلو تو پھر برار کا علاقہ ہمارے حوالے کردینا۔"

برہان شاہ کو اس سے اتفاق نہیں تھا لیکن مجبوراً اسے یہ شرط منظور کرنا پڑی۔

دکن کی سرحد کے قریب پرگنہ "ہنڈیا" اکبر نے اسے جاگیر میں دے دیا۔

برہان شاہ دکن کی طرف روانہ ہوا اور پرگنہ ہنڈیا میں قیام پذیر ہوکر اس نے نظام شاہی علاقوں کے زمینداروں اور سرداروں کے پاس خطوط روانہ کیے اور انہیں اپنی اطاعت کی ترغیب دی۔ ان زمینداروں کی جانب سے مثبت جوابات آئے۔

برار کے قرب وجوار کے پرگنوں کے جاگیر دار جہانگیر خاں حبشی جمال خاں کی مخالفت اور برہان شاہ کی حمایت میں نہایت سرگرم تھا۔ اس نے برہان شاہ کے پاس تحائف بھیجے اور اسے احمد نگر آنے کی دعوت دی۔

برہان شاہ کو اب پورا اطمینان تھا۔ اس نے گنتی کے چند سوار لیے اور برار میں داخل ہوگیا۔ جہانگیر خاں کو نہ جانے کیا سوجھی۔ یا تو خط لکھ کر بلایا تھا اب جنگ پر آمادہ ہوگیا۔ دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ برہان شاہ کو شکست ہوئی۔

برہان شاہ اپنا ایک امیر گنوا کر بہ حالِ تباہ ہنڈیا واپس آگیا۔

اب اسے خود یہ فیصلہ کرنا تھا کہ احمد نگر پر کس طرح قبضہ کیا جائے۔ احمد نگر کا کل انتظام جمال خاں کے ہاتھ میں تھا اور اس نے اتنی طاقت پکڑلی تھی کہ برہان شاہ کسی بیرونی مدد کے بغیر اس سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اکبر کی مدد کے لیے اس لیے تیار نہیں تھا کہ اہلِ دکن اس حرکت کو قطعی پسند نہیں کرتے۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ اسے ابراہیم عادل شاہ کا خیال آیا۔ وہ احمد نگر کی سیاست میں دخیل بھی تھا۔ اس کی یہاں رشتے داریاں بھی تھیں اور وہ جمال خان کے اقتدار کے خلاف بھی تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ حسین نظام شاہ کی مروّت سے اس کی مدد پر آمادہ ہوجائے گا۔ یہ خطوط جب ابراہیم کو ملے تو اس نے برار کے امرا کے نام خطوط تحریر کیے۔

"میں نے خداوند تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسا کرتے ہوئے اس بات کا تہیہ کیا ہے کہ احمد نگر کے تخت پر اسمٰعیل کے بجائے برہان نظام شاہ کو بٹھاؤں۔ اگرچہ ان دونوں میں باپ بیٹے کا رشتہ ہے لیکن اسمٰعیل شاہ کم سن ہے، دوسرے یہ کہ باپ کی موجودگی میں بیٹے کا تخت پر بیٹھنا کچھ عجیب سی بات ہے اس لیے تم سب پر لازم ہے کہ میری رائے کی مخالفت نہ کرنا اور برہان نظام شاہ کی وفاداری واطاعت کا دم بھرنا۔"

جمال خاں نے طے کیا کہ وہ اپنے لشکر کا ایک حصہ برہان سے مقابلے کے لیے بھیجے اور خود عادل شاہیوں سے مقابلے کے لیے روانہ ہو۔

جمال خاں نے بے پناہ دلیری کا ثبوت دیا۔ عادل شاہی لشکر کو شکست ہوئی لیکن دوسری جانب عجیب ماجرا ہوا۔ جو لشکر اس نے برہان شاہ کی طرف بھیجا تھا اس نے برہان شاہ کی اطاعت قبول کرلی۔ یہ خبر سنتے ہی جمال خاں برار کی طرف روانہ ہوا۔

عادل شاہ نے جمال خاں کا تعاقب کیا۔ جمال خاں نے راستے میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ وہ عادل شاہیوں سے چھپتا پھر رہا تھا۔ تنگ آکر جمال نے معرکۂ کارزار گرم کرنے کی ٹھانی۔ دونوں لشکروں میں زبردست لڑائی ہوئی۔ قریب تھا کہ جمال خاں کو فتح نصیب ہوتی کہ ایک گولی جمال خاں کے ماتھے پر لگی اور وہ گھوڑے سے گر پڑا، اس کے امیروں نے جمال خاں کو وہیں چھوڑا اور اسمٰعیل شاہ کو لے کر بھاگ گئے۔

برہان شاہ فراریوں کے تعاقب میں تھا۔ اسمٰعیل شاہ کو لے جانے والوں میں سے دو یاقوت خاں اور خداوند حبشی اس کے ہاتھ لگ گئے جنہیں اس نے فوراً قتل کردیا۔

ایک تیسرے شخص سہیل خواجہ سرا نے اسمٰعیل نظام کو ایک قصبے میں چھوڑا اور خود بیجاپور کی طرف بھاگ گیا۔

برہان شاہ کے امرا نے اسمٰعیل کو گرفتار کیا اور برہان شاہ کے پاس لے آئے۔ برہان شاہ اپنے بیٹے کو لے کر احمد نگر آیا۔ برہان شاہ کو اس تمام تگ ودو میں دو سال لگ گئے تھے۔

احمد نگر کے حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ بوڑھے برہان شاہ سے سنبھلتے۔ وہ مختلف الجھنوں میں گرفتار رہا۔ عادل شاہیوں سے جنگوں کا الگ سامنا رہا۔ ان پریشانیوں نے اسے بیمار ڈال دیا۔ اس بیماری نے ایسا طول کھینچا کہ اسے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ اس نے اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنا ولی عہد مقرر کرلیا اور عہد نامہ لکھ دیا کہ برہان نظام کے بعد ابراہیم احمد نگر کا حکمران ہوگا۔

اس اعلان نے احمد نگر میں ایک ہنگامہ کھڑا کردیا۔ احمد نگر میں اس وقت دو بڑے سالار تھے۔ ایک مرتضیٰ خاں دوسرا اخلاص خاں۔ مرتضیٰ برہان نظام کے بڑے بیٹے ابراہیم کے حق میں تھا جبکہ دوسرا اخلاص خاں چھوٹے بیٹے اسمٰعیل کی طرف داری کررہا تھا۔

خانہ جنگی کا دور پھر شروع ہوا۔ اخلاص خاں اور مرتضیٰ خاں کے درمیان ٹکراؤ ہوگیا۔ اخلاص خاں پسپا ہوکر پرندہ کی طرف بھاگ گیا۔

اس دوران برہان شاہ کا انتقال ہوگیا اور وصیت کے مطابق اس کا بڑا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوگیا۔ وصیت ہی کے مطابق میاں منجو دکنی کو وکیلِ سلطنت مقرر کردیا گیا۔

ابراہیم کے تخت پر بیٹھتے ہی اخلاص خاں بھی واپس آگیا اور اپنے فعل کی معافی مانگ لی۔

اب احمد نگر میں پھر سے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ میاں منجو کے ساتھ تھا، دوسرے گروہ نے اخلاص خاں کی اطاعت کا دم بھرا۔

حالات نے پلٹا کھایا۔ اخلاص خاں نے ایسے حالات پیدا کردیے کہ ابراہیم عادل شاہ احمد نگر پر حملہ آور ہونے پر مجبور ہوگیا۔

دونوں لشکروں میں ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک نیزہ سنسناتا ہوا احمد نگر کے بادشاہ ابراہیم نظام شاہ کے لگا اور وہ اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور گرتے ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

اس کے گرتے ہی میاں منجو اپنے لشکر سے نکلا اور اپنے مخلص ساتھیوں کے ساتھ احمد نگر پہنچ گیا۔ احمد نگر پہنچتے ہی اس نے نظام شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے احمد نام کے ایک لڑکے کو جس کی عمر بارہ سال تھی دولت آباد سے بلا کر تخت نشین کردیا اور ابراہیم نظام کے شیر خوار بیٹے کو جنیر کے ایک قلعے میں قید کردیا۔

ابراہیم نظام شاہ صرف چار مہینے حکمرانی کرسکا تھا۔

ابراہیم نظام شاہ کے اس شیر خوار بیٹے کا نام بہادر شاہ تھا۔ مورخین کے مطابق اس کی عمر صرف ایک سال سات ماہ تھی۔

چاند بی بی بیجاپور میں تھی۔ اس کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو اس نے اسے ابراہیم شاہ کے بیٹے بہادر شاہ کی حق تلفی سمجھا۔ اس کے خیال میں بہادر شاہ کو حکمران بننا چاہیے تھا۔ جب مرنے والے بادشاہ کا بیٹا موجود ہے تو کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ حکومت کرے۔ اس نے احمد نگر جانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ بہادر شاہ کو اس کا حق دلوا سکے۔ اس نے بیجاپور کے والی ابراہیم عادل شاہ کو شاہی حرم میں بلایا۔ وہ بادشاہ تھا لیکن چاند بی بی نے اسے اولاد کی طرح پالا تھا۔ وہ نہایت ادب سے حاضر ہوا۔

"میرے عزیز، اگر میں تم سے کوئی درخواست کروں تو اسے قبولیت کا شرف بخشو گے اور مجھ پر بھروسا کرکے یہ یقین کروگے کہ میں جو کچھ کروں گی بیجاپور اور احمد نگر کی بھلائی کے لیے کروں گی۔"

"مادرِ عزیز، اگر میں کسی پر بھروسا کرتا ہوں تو وہ آپ کی ذاتِ مقدسہ ہے۔ فرمائیے آپ کیا چاہتی ہیں۔ میرے بس میں نہ بھی ہوا تو میں پورا کروں گا۔"

"ہمیں احمد نگر جانے کی اجازت مرحمت فرمادیجیے۔"

"اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔ اطلاع کردی ہوتی، ویسے ہم پوچھنے کی جسارت ضرور کریں گے کہ بیجاپور میں آپ کو کیا تکلیف ہے جو آپ کو احمد نگر یاد آیا؟"

"وہاں کے حالات مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔ وہاں دور دراز کے کسی رشتے دار کو تخت پر بٹھادیا گیا ہے جبکہ مرنے والے بادشاہ کا بیٹا زندہ ہے۔ میں بہادر شاہ کو اس کا حق دلوانے جارہی ہوں۔"

"وہاں امرا کے درمیان چپقلش جاری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کسی مصیبت میں گھر جائیں۔"

"اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو آپ بیجاپور میں موجود ہیں۔ میرے ایک خط پر آپ میری مدد کو پہنچ جائیں گے۔"

"میں تو اب بھی حاضر ہوں۔ آپ کے ساتھ لشکر بھیج دوں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ابھی اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے چند محافظ ہی میرے ساتھ جائیں گے۔"

چاند بی بی احمد نگر پہنچی تو حالات اس کی توقع سے زیادہ ابتر تھے۔ احمد نگر دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک گروہ کی کمانداری میاں منجوی کر رہا تھا۔ یہ گروہ نئے بادشاہ احمد بن طاہر کے حق میں تھا۔ دوسرا گروہ جس کا سربراہ اخلاص خاں تھا، بہادر شاہ کو حکمران دیکھنا چاہتا تھا۔ میاں منجوی نے اس گروہ کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ بہادر شاہ ابھی شیر خوار ہے لیکن اس خاموشی میں ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔ چاند بی بی کے احمد نگر آنے کے بعد اس طوفان میں ہلچل پیدا ہوئی تھی کیونکہ اس نے پرزور مطالبہ کر دیا تھا کہ بہادر شاہ کو بادشاہ بنایا جائے۔

احمد نگر کی بدنصیبی اور چاند بی بی کی خوش نصیبی کہ انہی دنوں ایک خبر نے پورے احمد نگر میں ہلچل ڈال دی۔ یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ جس احمد شاہ کو احمد نگر کا حکمران بنایا گیا ہے، اس کا تعلق شاہی خاندان سے ہے ہی نہیں۔

اب امرا میں یہ بحث چھڑ گئی کہ احمد شاہ کا تعلق اگر شاہی خاندان سے نہیں تو وہ شخص ہے کون۔ تحقیق کی گئی تو اس کے شواہد مل گئے کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے نہیں۔

اگر یہ شاہی خاندان سے نہیں تو قلعے تک کیسے پہنچا؟ جہاں سے نکال کر اسے بادشاہ بنایا گیا۔

مزید تحقیق کی گئی۔ بوڑھے لوگوں کو بلایا گیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ کوئی آج کا قصہ نہیں ہے۔ حسین نظام شاہ کے چار بھائی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خدابندہ تھا۔ یہ چاروں بھائی اپنے بھائی حسین نظام کے خوف سے نکل بھاگے تھے اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔

جب مرتضیٰ نظام تخت پر بیٹھا تو ایک شخص جس کا نام طاہر تھا وہ احمد نگر آیا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ حسین نظام کے بھائی خدابندہ کا بیٹا ہے۔ مرتضیٰ نظام نے اس کی تصدیق کروائی تو وہ جھوٹا ثابت ہوا۔ مرتضیٰ نظام نے اسے قلعے میں نظر بند کر دیا تاکہ وہ وہیں مر کھپ جائے۔ طاہر کا دوران اسیری انتقال ہو گیا۔ اس نے ایک بیٹا یادگار چھوڑا۔ یہی لڑکا وہ طاہر ہے جسے میاں منجوی نے تخت پر بٹھا دیا ہے۔

اس خبر کی تصدیق ہوتے ہی چاند بی بی نے اخلاص خاں سے رابطہ کیا اور اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اخلاص خاں اور دوسرے حبشی امیروں نے بھی چاند بی بی سے وفاداری کا عہد کیا اور میاں منجوی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ میاں منجوی نے احمد شاہ کو برج کے اوپر بٹھایا اور چترِ شاہی اس کے سر پر سایہ فگن کر دیا اور اپنے ایک سالار محمد میاں حسن کو سات سو سواروں کے ساتھ حبشیوں کے مقابلے پر بھیجا۔ دونوں گروہوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ اسی دوران میں توپ کا ایک گولہ احمد شاہ کے چتر کو لگا۔ میاں حسن نے جب یہ دیکھا کہ لشکر میں انتشار پیدا ہو گیا ہے اور حبشیوں کا پلہ بھاری ہے تو وہ میدان جنگ سے فرار ہو کر قلعے میں واپس آ گیا۔ حبشیوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور اہلِ قلعہ کی آمد و رفت کے راستے مسدود کر دیے۔

چاند بی بی کی ذہانت نے اس وقت بڑا کام دکھایا۔ اس نے اخلاص خاں کو بلایا اور اسے نہایت صائب مشورہ دیا جو وقت کی ضرورت بھی تھا۔

"آہنگ خاں اور حبشی خاں برہان شاہ کے زمانے سے قلعہ دولت آباد میں قید ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ انہیں رہا کروا کے احمد نگر بلا لیا جائے۔ یہ دونوں امیر ہمارے احسان مند ہو کر ہمارا ساتھ دیں گے جس سے ہماری قوت میں اضافہ ہو گا۔ دوسرا قدم آپ یہ اٹھائیں کہ قلعہ جوند سے بہادر شاہ کو یہاں بلا لیں اور اس کی تخت نشینی کا اعلان کر دیں۔"

اخلاص خاں نے آہنگ خاں اور حبشی خاں کو تو بلا لیا لیکن قلعہ جوند کے حاکم نے میاں منجوی کی اجازت کے بغیر بہادر شاہ کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

حبشی امیروں نے اس ناکامی کو دیکھتے ہوئے ایک اور چال چلی اور ایک مجہول النسب لڑکے کو نظام شاہی خاندان کا فرد ظاہر کر کے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور ملک میں اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔

ایک مملکت کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے تھے مگر یہاں تھے۔

میاں منجوی میں اب مقابلے کی سکت نہیں تھی اور یہ صورت حال اس کے لیے ناقابل برداشت بھی تھی۔ اس افراتفری میں اس سے ایک نادان فیصلہ ہو گیا۔ اس نے اکبر بادشاہ کے بیٹے شہزادہ مراد کے نام ایک خط لکھا اور اسے احمد نگر آنے کی دعوت دے دی۔ شہزادہ مراد اس وقت گجرات میں تھا اور اپنے باپ سے دکن فتح کرنے کی اجازت حاصل کر چکا تھا۔

یہ خط ابھی گجرات پہنچا بھی نہیں تھا کہ حالات میاں منجوی کے حق میں چلے گئے۔ حبشی امیروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ عہدوں اور منصبوں کے لیے آپس میں لڑنے لگے۔ دکنی امیران نا اتفاقیوں سے تنگ آ کر میاں منجوی سے مل گئے۔

یہ غیبی طاقت تھی جو میاں منجوی کو نصیب ہو گئی تھی۔ وہ ان امیروں اور ان کے لشکر کو لے کر قلعے سے باہر نکلا اور حبشیوں پر ٹوٹ پڑا۔ حبشیوں کو شکست ہوئی۔ میاں منجوی نے دشمن کے بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔

یہ بازی اس کے حق میں چلی جائے گی، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنا مقصد پورا کر چکا تھا لیکن یہ سوچ کر ہاتھ مل رہا تھا کہ وہ شہزادہ مراد کو احمد نگر آنے کی دعوت دے چکا ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے نجات حاصل کی جائے کہ شہزادہ مراد مغلوں، افغانوں اور راجپوتوں کا لشکر لے کر احمد نگر پہنچ گیا۔ اس سیلاب کو روکنے کی کوئی تدبیر میاں منجوی کے پاس نہیں تھی۔

چاند بی بی نے میاں منجوی کا ساتھ نہیں دیا لہٰذا منجوی نے اسے قلعے ہی میں چھوڑا اور خود لشکر کی فراہمی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ چاند بی بی اب قلعے میں تھی اور حالات کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ مغلوں کا خطرہ سامنے تھا اور قلعے کے محافظ انصار خاں پر اسے بھروسا نہیں تھا۔ اسے ڈر ہوا کہ کہیں وہ قلعہ مغلوں کے حوالے نہ کر دے۔ اگر قلعے کی حفاظت وہ خود کرے تو بیجاپور سے مدد آنے تک وہ قلعے کی مدافعت کر سکتی ہے۔ سوال یہ تھا کہ انصار خاں کی موجودگی میں وہ یہ کام اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی تھی کیونکہ انصار خاں میاں منجوی کا آدمی تھا۔ وہ چاند بی بی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ چاند بی بی کو یقین ہو گیا کہ انصار خاں کو ٹھکانے لگائے بغیر وہ قلعے کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی۔

انصار خاں کے قتل کے لیے اسے کسی مضبوط ہاتھ کی ضرورت تھی۔ ابھی ایک دن پہلے مرتضیٰ نظام کے دودھ شریک بھائی کا بیٹا محمد خاں اس کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے محمد خاں کی بہادری سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ خیر، یہ کام اب بھی ہو سکتا تھا، اس نے محمد خاں کو بلوا لیا۔

"میری عزیز بہن، میں کل ہی تو ہو کر گیا ہوں۔ خیریت تو ہے، ایسا کیا کام آن پڑا کہ آج پھر یہ سعادت مجھے ملی کہ آپ سے مل رہا ہوں۔"

"محمد خاں، ایک ایسا کام آن پڑا ہے جس کے لیے تم سے بہتر آدمی مجھے مل نہیں سکتا۔"

"اگر آپ نے مجھ پر اعتبار کیا ہے تو آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ آپ مجھے کام بتائیے۔" محمد خاں نے کہا اور چاند بی بی نے اسے سرگوشی میں پوری بات سمجھا دی۔

محمد خاں کے تعلقات انصار خاں سے بھی نہایت خوشگوار تھے، وہ اسی وقت اٹھا اور انصار خاں کے پاس بے محابا چلا گیا۔ اس وقت انصار خاں اکیلا تھا۔ محمد خاں نے اسے باتوں میں الجھایا اور پھر موقع دیکھ کر خنجر اس کے سینے میں اتار دیا۔

چاند بی بی کو جونہی خبر ملی اس نے بہادر شاہ بن ابراہیم کا غائبانہ خطبہ پڑھوایا اور قلعے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

شہزادہ مراد ایک زبردست لشکر کے ساتھ احمد نگر میں داخل ہوا اور ایک جگہ پڑاؤ ڈال لیا۔

اس وقت نہ شہر میں اخلاص خاں تھا نہ آہنگ خاں۔ اس نے دونوں امیروں کو لکھا کہ احمد نگر کی حفاظت کے لیے پہنچ جاؤ۔ اخلاص خاں دولت آباد میں تھا اور آہنگ خاں عادل شاہی سرحد کے قریب تھا۔ دونوں نے احمد نگر کی طرف جست لگائی۔ اخلاص خاں قریب تھا لہٰذا وہ اپنے دس ہزار کے لشکر کے ساتھ پہلے پہنچ گیا۔ دشمن کی فوج نے پانچ ہزار کا لشکر آگے بھیجا کہ اخلاص خاں کا راستہ روکیں ان دونوں کا مقابلہ ہوا لیکن پانچ ہزار کا لشکر دس ہزار پر غالب آ گیا اور اخلاص خاں کو شکست ہو گئی۔ آہنگ خاں پہنچا تو اسے بھی شکست کا سامنا ہوا۔

چاند بی بی کی طرف سے ابراہیم عادل شاہ کو مسلسل خط ملتے رہے تھے کہ وہ اس کی مدد کو پہنچے بالآخر ابراہیم نے چاند بی بی کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور اپنے ایک سالار سہیل خاں کو جس کی بہادری ضرب المثل تھی پچیس ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ ادھر محمد علی قطب شاہ کی طرف سے بھی امداد پہنچ گئی۔

دکنی فوجوں کے جمع ہونے کی اطلاع جب مغلوں تک پہنچی تو مغلوں نے نقب کھودنے، بارود بچھانے اور حصار کی دیوار مسمار کرنے کا کام تیز کر دیا۔

مشاق کاریگروں نے شہزادہ مراد کے پڑاؤ سے لے کر حصار تک پانچ نقبیں تیار کیں اور حصار کی دیوار کھوکھلی کر دی اور ان نقبوں کو بارود سے بھر دیا گیا۔

جب یہ کام مکمل ہو گیا تو شہزادہ مراد نے نقبوں میں آگ لگانے کا حکم دیا۔ قلعے کی دیوار کو آگ لگی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اڑ گئی۔

قلعے میں ہر طرف کہرام مچ گیا لیکن چاند بی بی کے حواس بحال تھے۔ اس نے پردے کو بالائے طاق رکھا۔ مردانہ لباس پہنا، گھوڑے پر سوار ہوئی۔ ہتھیاروں سے لیس اس جگہ پہنچ گئی جہاں دیوار گری تھی۔ اس نے حکم دیا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مغلوں پر توپوں کے گولے داغے جائیں۔ اس حملے کی آڑ میں جس جگہ شگاف پڑا تھا اسے بھی مستحکم کیا جاتا رہا۔ تمام کاموں کی نگرانی چاند بی بی کررہی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوکر ادھر ادھر لشکر کے کمانداروں کے علاوہ عام لشکریوں کا بھی جائزہ لیتی رہی اور ان کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔

یہ چاند بی بی کی دلیری اور بہادری کا نتیجہ تھا کہ مغل دن کے دو بجے سے شام تک جنگ کرتے رہے لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ شگاف کے ذریعے اندر آنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ شہزادہ مراد اور دیگر امرا اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ احمد نگر پر ہیبت ناک اندھیرا طاری تھا۔ مستعد کاریگر حصار کے شگاف پر کرتے رہے۔

چاند بی بی نے اسی رات دکن کے ان سرداروں کے نام خطوط روانہ کیے جو سہیل خاں کے ساتھ احمد نگر کے لیے روانہ ہوچکے تھے اور راستے میں تھے۔ ان خطوں میں اس نے دشمن کے غلبے، اہل قلعہ کی کمزوری اور غلے کی گرانی وغیرہ سے آگاہ کیا تھا۔

جو شخص ان خطوں کو لے کر روانہ ہوا تھا اسے قلعے سے نکلتے ہی گرفتار کرلیا گیا لیکن اسے آگے جانے سے نہیں روکا گیا بلکہ بعض مغل سرداروں نے سہیل خاں کے نام اس مضمون کا خط لکھا۔

”ہم ایک عرصے سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں تاکہ یہ ہنگامہ ختم ہو۔ جہاں تک ہوسکے جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔“

مغلوں نے یہ خط بھی اسی شخص کے حوالے کیا اور وہ چاند بی بی کے خطوں کے ساتھ اس خط کو بھی لے کر روانہ ہوا۔

مغلوں کے لشکر میں رات بھر چاند بی بی کی شجاعت و دلیری کی تعریفیں ہوتی رہی تھیں۔ اسی روز سے چاند بی بی چاند سلطان کے لقب سے یاد کی جانے لگی۔

چاند بی بی کا قاصد جیسے ہی سالار سہیل خاں کے پاس پہنچا اور وہ خطوط اسے دکھائے، وہ فوراً نکل کھڑا ہوا اور منزلیں طے کرتا ہوا احمد نگر کی طرف بڑھنے لگا۔

مغلوں کے لشکر میں قحط کے آثار پیدا ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ایسے میں انہوں نے یہ سنا کہ سہیل خاں بس پہنچا ہی چاہتا ہے۔ مغلوں نے اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ چاند بی بی سے اس شرط پر صلح کرلی جائے کہ برار کا علاقہ مغلوں کو دے دیا جائے اور باقی تمام ملک پر بہ دستور نظام شاہیوں کا قبضہ رہے۔

چاند بی بی نے مغلوں کی شکستہ حالی دیکھ کر پہلے تو انکار کیا لیکن جلد ہی یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ موجودہ حالات میں جنگ مناسب نہیں کیونکہ طویل محاصرے نے اہل قلعہ کو بھی مصائب میں مبتلا کردیا تھا۔

چاند بی بی نے صلح کرلی۔ شہزادہ مراد برار کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس کے جانے کے دو تین روز بعد سہیل خان پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ میاں منجوی بھی تھا۔ کشمکش پھر شروع ہوگئی۔ میاں منجوی نے چاہا کہ حسب سابق احمد شاہ بن طاہر کو احمد نگر کے تخت پر بٹھادے لیکن اب موسم تبدیل ہوگیا تھا۔ آہنگ خاں کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر چیز اس کی گرفت میں تھی۔ چاند بی بی بھی اس سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے احمد شاہ کو قلعے سے باہر نکال دیا اور میاں منجوی کو قلعے میں داخل ہونے سے روک دیا۔

چاند بی بی نے اپنے چند آدمیوں کو قلعہ جوند کی طرف بھیجا اور قلعہ جوند کے حاکم کو حکم دیا کہ بہادر شاہ کو محافظ دستوں کے ہمراہ احمد نگر بھیج دیا جائے۔

اس سے پہلے قلعہ جوند کے حاکم نے میاں منجوی کے حکم کے بغیر بہادر شاہ کو رہا کرنے سے انکار کردیا تھا لیکن اب کی بات اور تھی۔ آہنگ خاں کا دبدبہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور چاند بی بی کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ انکار نہ کرسکا۔

کم سن بہادر شاہ محافظوں کی گود میں کچھ سوتا کچھ جاگتا احمد نگر تک پہنچ گیا اور قلعے میں پہنچا دیا گیا۔ اسی دن بہادر شاہ کی رسم تخت نشینی ادا کی گئی اور اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری ہوا۔

میاں منجوی اس تخت نشینی کے خلاف تھا۔ چاند بی بی اس خطرے سے پہلے ہی آگاہ تھی اور والی بیجاپور ابراہیم سے مدد کی درخواست کرچکی تھی جس کے جواب میں ابراہیم عادل شاہ کا عریضہ میاں منجوی کے نام پہنچا۔

”اس فتنہ انگیز زمانے میں جنگ و جدل کا ارادہ کرنا ملک کی تباہی کا راستہ ہموار کرنے کے مترادف ہے۔ تم سب معاملات کو فی الحال اٹھا رکھو اور جلد از جلد بیجاپور پہنچو تاکہ باہمی غور و فکر اور تحقیق حال کے بعد کوئی قدم اٹھایا جائے۔“

یہ پیغام کوئی قاصد لے کر نہیں آیا تھا بلکہ ابراہیم کے مشہور امیر مرتضیٰ خاں دکنی کی نگرانی میں چار ہزار سوار بھی احمد نگر پہنچے تھے۔

میاں منجوی اس پیغام کو ٹال نہیں سکا اور شاہی حکم کی تعمیل میں سابق بادشاہ احمد شاہ بن طاہر کو ساتھ لے کر بیجاپور پہنچ گیا۔

یہاں پہنچ کر جو گفتگو ہوئی اس کے بعد ابراہیم عادل کو یقین آگیا کہ احمد شاہ کا تعلق شاہی نسل سے نہیں ہے اس کے باوجود ابراہیم نے فساد کی آگ دبانے اور میاں منجوی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میاں منجوی کی تعریف کی۔

”میاں منجوی، میں آپ کی خدمات کا قائل ہوں۔ آپ کی بہادری سے بھی واقف ہوں۔ اس کے باوجود اگر احمد نگر میں آپ کی قدر نہیں ہوئی تو میرا دربار حاضر ہے۔ احمد نگر کے مفاد کی خاطر آپ میرے پاس چلے آیئے۔“

ابراہیم عادل نے اسے اور اس کے بیٹے میاں حسین کو اپنے امرا کی صف میں شامل کرلیا اور انہیں جاگیروں سے نوازا۔ احمد نگر کے معزول ہونے والے بادشاہ کو بھی اپنے امرا میں شامل کرلیا اور اسے بھی ایک جاگیر عطا کی۔

☆☆☆

چاند بی بی کی کوششوں سے بہادر شاہ احمد نگر کے تخت پر جلوہ افروز ہوگیا۔

محمد خاں چونکہ چاند بی بی کے بہت کام آیا تھا۔ چاند بی بی کے حکم پر اسی نے انصار خاں کو قتل کیا تھا اور چاند بی بی کے اقتدار کے لیے راہ ہموار کی تھی لہٰذا بہادر شاہ کے بادشاہ بنتے ہی محمد خاں کو پیشوائی کا منصب عطا کیا گیا۔

اسے چونکہ چاند بی بی کی حمایت حاصل تھی اسی لیے وہ بے خوف تھا۔ اس نے اپنے رشتے داروں اور بہی خواہوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ ان کی قوت میں مسلسل اضافہ کرتا رہا اور پھر ان کی مدد سے اپنی قوت میں اضافہ کرکے خود مختارانہ انداز سے کام کرنے لگا۔

ایک سال کی مختصر مدت میں اس نے اتنی قوت پکڑ لی کہ آہنگ خاں اور شمشیر خاں جیسے نامی گرامی امرا کو نظر بند کرلیا۔ جب اتنے طاقت ور امرا کا یہ حال ہوا تو دوسرے کس گنتی میں تھے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے منظر سے غائب ہوگئے۔ کچھ نے احمد نگر ہی میں روپوشی اختیار کرلی اور کچھ احمد نگر سے بھاگ گئے۔

چاند بی بی نے ایک مرتبہ پھر اپنی سسرال بیجاپور کی طرف قاصد دوڑائے اور عادل شاہ سے امداد کی طالب ہوئی۔

”اس پرآشوب زمانے میں جبکہ ایک طاقت ور دشمن ہماری بربادی کے لیے مستعد ہے، ہمارے ملک کے امرا عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ روز کوئی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ برار ہاتھ سے چلا گیا۔ اگر اب بھی آپ نے توجہ نہ فرمائی اور ان بد طینت امرا کی سرزنش نہ کی تو ملک کا باقی حصہ بھی مغلوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ مغلوں کے قدم جمے تو پھر بیجاپور کی بھی خیر نہیں۔“

ابراہیم عادل شاہ نے ایک مرتبہ پھر اپنے لشکر کو حرکت دی۔ اس کا سالار سہیل خاں احمد نگر آیا اور چاند بی بی کے حکم کے مطابق قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ محمد خاں قلعے میں پناہ گزیں ہوگیا۔ پورے چار مہینے کے محاصرے کے بعد محمد خاں کو گرفتار کرلیا گیا۔

آہنگ خاں کے اقتدار کا سورج ایک مرتبہ پھر چمکا۔ چاند بی بی نے اس کی نظر بندی ختم کی اور محمد خاں کی جگہ آہنگ خاں کو منصب پیشوائی عطا ہوا۔

چاند بی بی نے یہ سوچ کر آہنگ خاں کو اعزاز عطا کیا تھا کہ وہ اس کا وفادار ہے لیکن آہنگ خاں غالباً یہ سوچ کر کہ اس کی نظر بندی میں چاند بی بی کا ہاتھ تھا، اس سے دشمنی پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے طے کرلیا کہ بادشاہ کو اپنے قبضے میں کرکے چاند بی بی کو کسی قلعے میں نظر بند کردے گا۔ اس طرح وہ تمام سیاہ و سفید کا مالک ہوجائے گا۔

چاند بی بی کو اس کے ارادے کی اطلاع ہوگئی۔ اس نے آہنگ خاں کو قلعے میں آنے جانے سے روک دیا اور حکم دیا کہ وہ قلعے سے باہر دیوان داری کیا کرے۔

آہنگ خاں کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہوسکتی تھی لیکن وہ چاند بی بی کی طاقت سے بھی واقف تھا۔ اس نے اس وقت تو حکم کی تعمیل کی لیکن تیاری میں لگا رہا اور موقع دیکھ کر سرکشی پر اتر آیا اور قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

عادل شاہ نے اپنے امیروں کو احمد نگر بھیج کر اس خانہ جنگی کو ختم کروانے کی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آہنگ خاں کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

مغلوں کا سالار خانِ خاناں شہزادہ مراد کی ناراضی کے سبب دکن سے جاچکا تھا۔ دریائے گنگا زوروں پر تھا۔ آہنگ خاں کے تجربے نے اسے بتایا کہ اگر اس وقت قصبہ بیٹر پر لشکر کشی کی جائے تو شہزادہ اس شہر کی حفاظت کے لیے نہ آسکے گا۔ موقع اچھا ہے، قصبہ بیٹر کو مغلوں سے خالی کروالیا جائے۔

آہنگ خان بیٹر کی طرف روانہ ہوگیا۔ بیٹر کے حاکم نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا اور قلعہ بند ہوگیا۔ آہنگ خاں نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

شہزادہ مراد، آہنگ خاں کے کارنامے سن رہا تھا لیکن کثرت شراب نوشی نے اس کی صحت کو بری طرح پامال کردیا تھا۔ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا اور پھر اس کا انتقال ہوگیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ خبر اکبر آباد پہنچی تو اکبر نے اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ دانیال کو دکن کی جانب روانہ کیا اور پھر خود بھی کچھ سوچ کر اکبر آباد سے دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ غیر معمولی بات تھی کہ اکبر اعظم بذات خود دکن کی طرف جا رہا تھا۔

دراصل دانیال کے نکلتے ہی اکبر کو یہ اطلاعات پہنچی تھیں کہ چاند بی بی اور آہنگ خاں کے درمیان ٹھن گئی ہے۔ اس نے اس موقع کا فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔

دکن پہنچتے ہی اس نے شہزادہ دانیال اور پچھلے سالار خانِ خاناں کو احمد نگر کی طرف روانہ کر دیا۔

آہنگ خاں قلعہ بٹیر کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ پندرہ ہزار سواروں کا لشکر اس کے ساتھ تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ شہزادہ دانیال، خان خاناں کے ساتھ احمد نگر کے لیے روانہ ہوا ہے اور وہ یقیناً قلعہ بٹیر کی طرف سے گزرے گا تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور اپنے سازوسامان کو آگ لگا کر جبیر کی طرف چلا گیا۔

آہنگ خاں نے اپنی جان بچانے کے لیے احمد نگر کو داؤ پر لگا دیا۔ اسے چاہیے تھا کہ احمد نگر جا کر چاند بی بی کے ہاتھ مضبوط کرتا یا مغلوں کی راہ روکتا۔ اس نے میدان خالی کر دیا۔

مغلوں کی راہ روکنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ شہزادہ دانیال کسی مزاحمت کے بغیر احمد نگر پہنچ گیا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرہ اتنا سخت تھا کہ چاند بی بی کوئی قاصد کسی طرف نہیں دوڑا سکتی تھی۔ وہ شاہی حرم سرا کی بلند و بالا دیواروں کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور قلعے کی دیواروں کو پار کر گیا۔ یہ پرندہ قلعے کے باہر جا سکتا ہے لیکن وہ نہیں جا سکتی۔ حالات نے اسے کتنا حقیر بنا دیا ہے۔ جس گھر میں نااتفاقیاں ہوں ان گھروں کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ بے بسی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

مغل فوجیں نقب کھود رہی تھیں۔ آوازیں چاند بی بی کے کانوں تک آ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں قلعہ فتح ہو جائے گا اور کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔

اس نے اپنے ایک سالار جنید خاں خواجہ سرا کو بلایا۔

”آہنگ خاں اور دوسرے امیروں کی سرکشی کا نتیجہ ہے کہ اکبر بادشاہ بذات خود دکن کی طرف آیا ہے۔ ظاہر ہے چند دنوں میں قلعہ فتح ہو جائے گا۔“

”چاند سلطان، جو ہوا سو ہوا، اس کا غم کرنا بے کار ہے۔ آپ تو یہ فرمائیں کہ اس وقت کیا کیا جائے۔ آپ جو فرمائیں گی اسی پر عمل ہو جائے گا۔“

”میری رائے تو یہ ہے کہ ہمیں قلعہ شہزادہ دانیال کے سپرد کر کے اپنی جان بچانی چاہیے اور خود جبیر پہنچ کر خداوند تعالیٰ کی مدد کا انتظار کریں۔“

جنید خاں نے مصلحت سے کام نہیں لیا۔ وہ فوراً حرم سرا سے باہر آیا اور تمام اہل قلعہ کو جمع کر کے بلند آواز سے پکارا۔

”چاند بی بی نے اکبری امرا سے ساز باز کر لی ہے اور قلعہ شہزادہ دانیال کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ مجھے یہی بتانے کو بلایا تھا۔ اب آپ بتائیں آپ کیا کہتے ہیں؟“

اہل قلعہ یہ سنتے ہی اشتعال میں آ گئے اور ہلا بول کر حرم سرا میں داخل ہو گئے۔

چاند بی بی اس وقت تک مردانہ لباس زیب تن کر کے جبیر جانے کی تیار کر چکی تھی کہ بلوائی سر پر پہنچ گئے۔ اس نے ہتھیار ابھی باندھے بھی نہیں تھے کہ مقابلہ کرتی۔ بلوائیوں نے بڑی بے رحمی سے اسے قتل کر دیا۔

نقب میں بھری بارود نے قلعے کی دیواریں گرا دیں۔ مغلوں نے اندر داخل ہو کر تمام دکنیوں کو گرفتار کر لیا۔ شہزادہ دانیال نے جواہرات اور خزانے پر قبضہ کر لیا اور قلعے کو اپنے امیروں کے حوالے کر کے بہادر شاہ کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس برہان پور چلا گیا۔

بہادر شاہ کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔

اسی دوران مغلوں نے قلعہ اسیر بھی فتح کر لیا۔ اکبر نے خاندیش اور دکن کے علاقے شہزادے دانیال کے حوالے کیے اور خود آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

چاند بی بی نے مسلمان ریاستوں کے درمیان مصالحت کی راہیں نکالی تھیں لیکن آپس کی نااتفاقیوں نے اسے مجبور کر دیا اور وہ احمد نگر کو نہ بچا سکی۔

جن کو بچانے کے لیے نکلی تھی انہی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ... محمد قاسم فرشتہ۔ طبقات اکبری... خواجہ نظام الدین احمد۔
منتخب التواریخ... عبدالقادر بدیوانی۔ آئینہ حقیقت نما... اکبر شاہ خاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اتفاقات

مریم کے خان

کہتے ہیں کہ اتفاق میں برکت ہوتی ہے مگر... اتفاقات میں برکت جب زیادہ ہوجائے تو رحمت بھی ہوسکتی ہے اور زحمت بھی... پھر ایسی صورتِ حال میں کچھ ایسے واقعات جنم لیتے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا اور اس کے پاس تو پہلے ہی کچھ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ وہ اس قدر مضبوط منصوبہ بندی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ خفیہ دروازے خود بہ خود کھلتے جارہے تھے... بالآخر اسے وہ چور دروازہ بھی مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی یہ اور بات کہ بے شمار اتفاقات میں گھر کر اسے کئی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا... مگر یہ سب تو اس کھیل کا حصہ تھا جسے وہ دھیرے دھیرے کھیل رہا تھا۔

قدم قدم پر نئے تجربات......ایک سراغ رساں کی مشکلات کا احوال

کائل ایڈ کر دروازے کے سامنے رکا تو اس کے چہرے پر وحشت کے تاثرات تھے لیکن اس نے کچھ دیر رک کر اپنے تاثرات پر قابو پایا اور اس دوران میں آس پاس دیکھتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ نارمل نظر آ رہا ہے تو اس نے کال بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد نیلا نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”کائل کیا بات ہے، کوئی مسئلہ ہے؟“

وہ زبردستی مسکرایا اور اندر آ گیا۔ ”نہیں تو... مائل

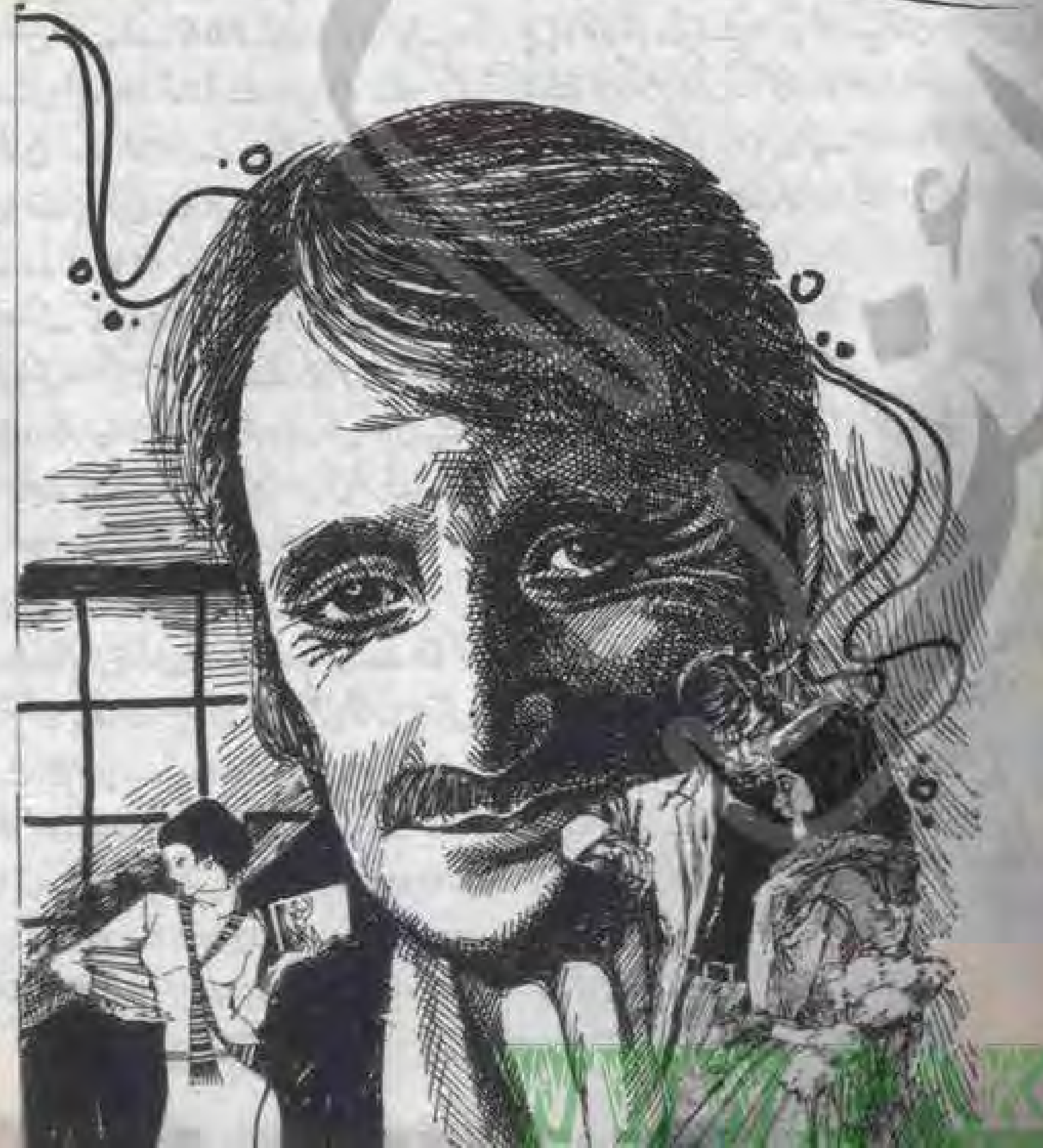

کہاں ہے؟"

"سو رہا ہے۔" نیلا نے کہا، وہ سوئیٹر پہنے ہوئے تیار کھڑی تھی۔ آج اس کی جاب کا پہلا دن تھا۔ "میں نے اسے فیڈ کرا دیا ہے وہ اب چھ گھنٹے تک سکون سے رہے گا پھر تم اسے فیڈر دے دینا میں نے تیار کر دیا ہے۔ اگر پیمپر خراب کرے تو اسے بدل دینا۔"

"تم فکر مت کرو میں سب دیکھ لوں گا۔" کائل نے اضطراری انداز میں کہا تو نیلا نے اسے غور سے دیکھا۔

"سب ٹھیک ہے نا؟"

ان کی شادی کو صرف ڈیڑھ سال ہوا تھا، جیسے ہی وہ ہائی اسکول سے فارغ ہوئے انہوں نے شادی کر لی تھی یہ سوچے بغیر کہ ان کا کوئی کیریئر نہیں ہے اور گزارا کیسے ہوگا۔ اب ان کا سات مہینے کا بیٹا تھا اور کائل بے روزگار تھا۔ جمع پونجی ختم ہونے کے قریب تھی۔ اسی لیے نیلا جاب پر مجبور ہوئی تھی۔ کائل نے اسے یقین دلایا کہ سب ٹھیک ہے۔ نیلا کو دیر ہو رہی تھی اور اس کے پاس سوال جواب کا وقت نہیں تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے کائل کی جان نہ چھوڑتی۔

☆☆☆

چند دن پہلے بلفاسٹ آنے والے ولیم کا خیال تھا کہ اب بلفاسٹ بدل گیا تھا۔ یہ بائیس سال پہلے 1985ء کے بلفاسٹ سے بالکل مختلف تھا۔ 1985ء کا بلفاسٹ خوف و دہشت کی فضا میں لپٹا ہوا تھا۔ آئے دن دھماکے، مسلح جھڑپیں اور فوج کے محاصرے یہاں کی خصوصیت تھے۔ ولیم کو ان سب چیزوں سے بہت خوف آتا تھا اور اسی لیے وہ بلفاسٹ سے امریکا شکاگو چلا گیا۔ وہاں اس کا کزن موڈی تھا۔ وہ اینٹیک شاپ چلا رہا تھا۔ اور یہ ان کا خاندانی کام تھا اور خود ولیم بھی یہی کام کرتا تھا۔ اس نے کچھ عرصے موڈی کے ساتھ کام کیا اور پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ دس سال پہلے موڈی واپس آئرلینڈ چلا گیا۔ دو ہفتے پہلے اس کی طرف سے ولیم کو کال ملی۔ موڈی یورپ ٹور پر جا رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ولیم آکر اس کی غیر موجودگی میں اس کی شاپ سنبھال لے۔ اتفاق سے ولیم ان دنوں فارغ تھا۔ اس نے شکاگو میں اپنا بزنس ختم کر دیا تھا اور اسپتال میں داخل تھا۔ اسپتال سے فارغ ہوتے ہی اس نے ٹکٹ لیا اور روانہ ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ واپس نہیں جائے گا۔

موڈی اس کے آنے سے پہلے چلا گیا تھا۔ وہ دکان اور اس کے اوپر بنے چھوٹے سے فلیٹ کی چابیاں اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ بارھویں اسٹریٹ پر واقع دکان اینٹیک شاپ بھی تھی اور پرانے سامان کی خرید و فروخت کا مرکز بھی۔ یہاں آتے ہی ولیم کا واسطہ سب سے پہلے ایک خانہ بدوش بوڑھے گیزل سے پڑا۔ وہ ہمہ وقت نشے میں رہتا تھا اور اس کا اصرار تھا کہ اس کے پاس ایک بہترین صوفہ سیٹ تھا۔ وہ بہت کم قیمت میں دینے پر آمادہ تھا لیکن ولیم نے اسے بتا دیا کہ فی الحال وہ کسی قسم کی خریداری کا مجاز نہیں ہے کیونکہ یہ شاپ اس کے کزن کی تھی اور وہ یورپ گیا ہوا تھا۔ مگر گیزل ہر روز صبح سویرے آن موجود ہوتا تھا۔ ولیم اس سے بیزار تھا۔ دوسرا فرد جس سے ولیم بالکل بیزار نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ سے بلفاسٹ ولیم کو زیادہ رنگین لگنے لگا تھا وہ شہد رنگ بالوں اور اسی رنگ کی آنکھوں والی رینا تھی۔ رینا کا برابر میں بیوٹی سیلون تھا مگر فی الحال بیوٹی سیلون مرمت اور رنگ روغن کی وجہ سے بند تھا۔ رینا خود بھی اس مرمت میں حصہ لے رہی تھی۔ ایک معمولی سے حادثے سے شروع ہونے والی ملاقات گزشتہ رات ڈنر تک پہنچ گئی تھی۔ ڈنر کے بعد انہوں نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی اور اس کے بعد جب ولیم کو ہوش آیا تو وہ رینا کے فلیٹ میں اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ ولیم کا ارادہ ہرگز تعلقات کو اتنی جلدی بیڈ روم تک لے جانے کا نہیں تھا مگر رینا بہت خوش تھی۔ اس نے ولیم کے بازو پر زخم کے مندمل ہو جانے والے نشان کے بارے میں پوچھا تو ولیم نے اسے واضح جواب نہیں دیا تھا۔ ایک شاندار ناشتے اور گرم جوش رخصتی کے بعد وہ شاپ پر پہنچا تو اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہاں ایک بڑا سا تھری سیٹر لیدر صوفہ دکان کے عین سامنے رکھا ہوا تھا اور اس پر دس پاؤنڈ کی پرچی لگی تھی۔

☆☆☆

پولیس چیف برون اسمتھ ناشتے کی میز پر بھنی ہوئی کلیجی کھا رہا تھا۔ اس کی بیوی کلیجی بہت اچھی بناتی تھی۔ برون کا خیال تھا کہ دنیا میں انسان کھانے پینے آتا ہے اور یہ کھانا پینا اپنی مرضی کا ہونا چاہیے۔ وہ اپنے اس خیال پر پوری طرح عمل کرتا تھا۔ ساٹھ سال کی عمر میں وہ ڈٹ کر کھاتا اور پیتا تھا۔ اس کے نوجوان بیٹے ایرون کا خیال مختلف تھا۔ وہ نوجوانی میں بہت احتیاط کرتا تھا اور اسے بھی احتیاط کی تلقین کرتا تھا اس وجہ سے دونوں باپ بیٹے کی کم بنتی تھی۔ دو سال پہلے ایرون بھی پولیس میں آ گیا تھا اور اب برون کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ وہ تیار ہو کر نیچے آیا اور باپ کا ناشتا دیکھ کر اس نے خوشدلی سے کہا۔ "ہارٹ اٹیک کی تیاری ہو رہی ہے۔"

"بکومت۔" برون غرایا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"آج ویک اینڈ ہے اور مجھے خانہ بدوش بچوں کو سیر کرانی ہے۔" ایرون نے یاد دلایا تو برون نے برا سا منہ بنایا۔ اس کے خیال میں پولیس کے پاس پہلے ہی کام کم نہیں تھے اور اب ان پر کمیونٹی سروس کا بوجھ بھی لاد دیا گیا تھا۔ برون کے پاس کئی کیس تھے اور وہ ان میں سے کسی پر بھی صحیح توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ بھاری جسامت اور چڑھی ہوئی تیوریوں والا پولیس مین تھا۔ مگر اس کی ذہانت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا ورنہ وہ پولیس چیف کے عہدے تک کیسے پہنچتا۔

☆☆☆

پہاڑ کی بلندی سے نیچے پھیلا ہوا بلفاسٹ کا خاموش اور پرسکون شہر اور بھی خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ ہلکی سی دھند تھی۔ گیزل اپنے دو لڑکوں کے ساتھ بیئر نوشی میں مصروف تھا کہ پولیس وین نمودار ہوئی اور ان تینوں نے پھرتی سے بیئر کی بوتلیں نزدیکی ڈرم میں جلتی آگ میں ڈال دیں۔ یہ یورپ سے اسمگل ہو کر آئی بیئر تھی۔ اگر ان کے پاس سے یہ بیئر برآمد ہو جاتی تو جج انہیں کم سے کم چھ مہینے کے لیے جیل بھیجتا۔ وین رکی تو ایک سفری ٹریلر سے ماما کرسٹی نمودار ہوئی، اس نے گرم جوشی سے ایرون کا استقبال کیا اور اپنی بلند، پاٹ دار آواز میں بچوں کو پکارنے لگی۔ وہ بھاری جسامت والی معصوم شکل عورت تھی۔ اس کی آواز پر بچے دوڑے آئے تھے اور وہ وین میں لد گئے ان میں سے بیشتر اس کے نواسی نواسے اور پوتی پوتے تھے۔ ایرون نے ایک نظر گیزل اور اس کے لڑکوں کو دیکھا اور پوچھا۔

"اب یہ گڑبڑ تو نہیں کر رہے؟"

"میں نے اس بڈھے کو بالکل سیدھا کر دیا ہے۔" ماما کرسٹی نے فخر سے کہا۔ "تم اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہو اب یہ کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوگا۔"

ایرون نے وین کی طرف دیکھا۔ "سارے بچے آ گئے ہیں؟"

ماما کرسٹی نے جائزہ لیا اور بولی۔ "ویگ اور ریگ نہیں ہیں، یہ دونوں حرامزادے کہیں کھیل رہے ہوں گے۔"

ویگ اور ریگ بھائی تھے۔ ایرون انہیں اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ وہ انہیں بھگت چکا تھا۔ "وقت نہیں ہے کیونکہ مجھے دفتر بھی جانا ہے۔"

"تم جاؤ میں انہیں دیکھتی ہوں۔" ماما کرسٹی نے کہا تو وہ وین کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

نیلا کے جاتے ہی کائل نے دروازے سے جھانکا اور سڑک پر اخبار میں منہ چھپائے کھڑے مارش کو اشارہ کیا تو وہ دوڑا آیا۔ وہ بیس سال کا چھوٹے قد کا اور پریشان چہرے والا لڑکا تھا عمر میں کائل سے ایک دو برس چھوٹا ہی ہوگا۔ اس نے اندر آتے ہی کہا۔ "اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"سائمن کے حکم پر عمل۔" کائل نے کہا۔

مارش کا چہرہ مزید پریشان ہو گیا تھا۔ "اس کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"ہاں لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔"

"میرے پاس ہے۔" کائل نے کہا اور اسے مکان کے تہ خانے میں لایا۔ یہ مکان نیلا کا تھا اور اسے وراثت میں ملا تھا۔ یہاں ایک پرانے لکڑی کے صندوق میں ایک رائفل اور ایک عدد پستول تھا، یہ نیلا کے باپ کی نشانی تھے وہ حریت پسند تھا اور پولیس کے ساتھ جھڑپ میں مارا گیا تھا جب نیلا صرف بارہ سال کی تھی۔ رائفل اور پستول بہترین حالت میں تھے اور ان کی گولیاں بھی موجود تھیں۔ کائل نے رائفل نکال کر چیک کی اور پھر اسے لوڈ کیا۔ پستول میں میگزین لگایا۔ پستول مارش کے حوالے کر کے اس نے رائفل ایک کپڑے میں لپیٹ کر بغل میں دبالی۔ "بس چلو۔"

وہ اوپر آئے تو مارش کو ننھے مائل کا خیال آیا۔ "اس کا کیا کرنا ہے؟"

کائل نے سوچا اور بولا۔ "اسے ساتھ لیے چلتے ہیں۔"

مارش اچھل پڑا۔ "تمہارا دماغ درست ہے، اس کام پر بچے کو ساتھ لے جا رہے ہو؟"

"ہاں، اس سے کوئی ہم پر شک نہیں کرے گا۔" کائل نے کہا۔ "اس کی واکر میں رائفل بھی چھپ جائے گی۔"

مارش متفق نہیں تھا لیکن ایک تو باس کائل تھا اور دوسرے بچہ اس کا تھا۔ چند منٹ بعد وہ سوتے ہوئے مائل کو واکر میں لے جا رہے تھے، واکر کے نچلے حصے میں مائل کی فیڈر اور اضافی پیمپر کے ساتھ کپڑے میں لپٹی رائفل بھی تھی۔ وہ تیرھویں اسٹریٹ پر آئے، مطلوبہ جگہ سے ایک بلاک دور کائل نے واکر روک دی اور مارش سے کہا۔ "تم یہاں اس کے پاس رکو میں کام نمٹا کر آتا ہوں اور اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو مائل کو لے کر چلے جانا، میرا انتظار مت کرنا۔"

مارش کی حالت سے لگ رہا تھا اسے فرار کے لیے کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بہ وقت ضرورت دوڑ لگانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔ کائل رائفل کپڑے سمیت بغل میں دبائے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

سائمن بولیور بلفاسٹ کا جانا پہچانا نام تھا۔ نوے کی دہائی میں وہ دہشت پسند سرگرمیوں میں ملوث رہا تھا اور اسے سات سال جیل میں گزارنا پڑے تھے۔ رہائی کے بعد اس نے اپنی سرگرمیوں کا رخ نفع بخش کاموں کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ کئی جوئے خانوں کا مالک تھا۔ منشیات فروخت کرتا تھا اور اس کے آدمی شراب خانوں اور نائٹ کلبس سے بھتا وصول کرتے تھے۔ مگر ان دنوں وہ مشکل میں تھا۔ اول اس کے ایک حریف کارل فجر نے اس کے خلاف کچھ ایسے ثبوت حاصل کر لیے تھے جو اسے دوبارہ سات آٹھ برس کے لیے جیل بھیج سکتے تھے اور دوسرے پولیس چیف برون اسمتھ اس کے پیچھے پڑ گیا تھا، اس نے سائمن کے سارے کیس اپنے پاس منگوا لیے تھے اور اس سے دوبار ملاقات کر چکا تھا۔ سائمن کسی صورت اب دوبارہ جیل جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے پولیس چیف کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی فجر کی تھی بلکہ اس کے پاس موجود ثبوتوں کی تھی۔ فجر بھی جوئے خانوں کا مالک تھا اور وہ بکی بھی تھا لیکن سارے کام بہت ہاتھ پاؤں بچا کر اور قانون سے الجھے بغیر کرتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ سائمن بولیور جیل چلا جائے تا کہ وہ جوئے کے بزنس کا بلاشرکت غیرے مالک بن جائے۔

☆☆☆

ولیم حیران پریشان کھڑا تھا کہ اس صوفے کا کیا کرے۔ اس نے تقریباً سارا فٹ پاتھ گھیر لیا تھا اور آتے جاتے لوگوں نے ولیم کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔ اتنے میں رینا آ گئی اس نے صوفے کا معائنہ کیا۔ ”یہ ہاتھی تم نے خرید لیا ہے؟“

”نہیں، ایک جپسی خانہ بدوش زبردستی میرے سر مار گیا ہے۔“ ولیم نے صوفے کے ساتھ لگی پرچی کی طرف اشارہ کیا۔

”ان سے ہوشیار رہنا ایک نمبر کے چور ہوتے ہیں۔“ رینا نے کہا۔ ”اب کیا یہ یہیں پڑا رہے گا؟“

”میں سوچ رہا ہوں اسے اندر لے جاؤں وہ تو رکھ کر چلا گیا ہے اور اب پتا نہیں کب آئے۔ لیکن اسے اٹھانا بھی عذاب ہوگا۔“

”میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔“ رینا نے خلوص سے کہا۔ پہلے انہوں نے شاپ کے اندر کا سامان ہٹا کر جگہ بنائی اور پھر دونوں مل کر اس بھاری بھرکم صوفے کو اندر لے آئے۔ اس کام میں ان کا حشر ہو گیا تھا اور دونوں ہی ایک ساتھ صوفے پر گر گئے۔ رینا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”بہت بھاری ہے۔“

”ہاں، لیکن آرام دہ بھی ہے۔“

”اس لحاظ سے دس پاؤنڈز میں برا نہیں ہے؟“

”مسئلہ اس کے سائز کا ہے پھر موڈی کی طرف سے مجھے خریداری کی اجازت نہیں ہے، میں صرف فروخت کر سکتا ہوں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر میرے پاس جگہ ہوتی تو میں خرید لیتی۔“

”ابھی تک تمہاری دکان پر کام کرنے والے نہیں آئے؟“

”آج مجھے کچھ کام ہے دوسروں کا کام مکمل ہو گیا ہے بس دو دن میں سیلون دوبارہ کھول لوں گی۔“

”یہ تو اچھا ہوگا۔“ ولیم بولا۔

”تم کب تک ہو یہاں؟“

”جب تک موڈی نہیں آتا۔“

رینا اداس ہو گئی تھی۔ ”تم واپس چلے جاؤ گے۔“

”نہیں، میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ موڈی کے آنے کے بعد اپنا کام دیکھوں گا یا شاید جاب کر لوں گا۔“

”سچ۔“ رینا خوش ہو گئی۔

”ہاں، وہاں سے میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں اور اب بلفاسٹ بھی بدل گیا ہے، اس کا امن وسکون دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی بلفاسٹ ہے جہاں ایک دن بھی سکون سے نہیں گزرتا تھا۔“

”ہاں، اب سب ٹھیک ہے۔“

ولیم نے سرد آہ بھری۔ ”اب شکاگو میں یہ ماحول ہو گیا۔ وہاں آئے دن ڈکیتیاں ہوتی ہیں اور آدمی گلیوں میں بھی آرام سے نہیں چل پھر سکتا۔ گینگسٹر دندناتے پھرتے ہیں۔“

”تب تم واپس آ جاؤ۔“ رینا نے جلدی سے کہا۔

ولیم نے اس کی طرف دیکھا۔ ”شاید آنا ہی پڑے۔“

رینا شرما گئی اور کھڑی ہو گئی۔ ”اچھا میں چلتی ہوں۔“

ولیم اسے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔ واپس آ کر اس نے صوفے کا معائنہ کیا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔

☆☆☆

کارل فجر کا بکی آفس تیرھویں اسٹریٹ پر تھا لیکن

اس کے آس پاس دکانیں نہیں تھیں اس لیے یہاں سناٹا تھا۔ دفتر کے باہر صرف ایک کھڑکی تھی جو داؤ لگانے والوں کے لیے تھی۔ اس کے ساتھ ایک دروازہ تھا۔ کائل نے آس پاس دیکھا اور جیب سے ایک نقاب نکال کر چہرے پر چڑھا لی اس میں آنکھوں کی جگہ کاٹ دی گئی تھی۔ عجلت میں نقاب ٹھیک سے نہیں بیٹھی تھی اور اسے ایک آنکھ سے ٹھیک نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے درست کرتا اچانک دروازہ کھلا اور سامنے ایک بوڑھا دکھائی دیا۔ اپنے سامنے ایک نقاب پوش کو دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتا کائل نے جلدی سے رائفل نکالی اور اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اب وقت نہیں تھا کہ وہ نقاب ٹھیک کرتا۔ اس نے ایک آنکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”خبردار! باقی سب کہاں ہیں؟“

”اندر... اندر۔“ بوڑھا مشکل سے بولا، اس کی حالت رائفل کو دیکھ کر خراب ہو گئی تھی۔ کائل اسے دھکیل کر اندر لایا جہاں تین عورتیں بیٹھی ہوئی بکنگ کا حساب کتاب کر رہی تھیں۔ دفتر ابھی بند تھا۔ کائل نے ان کو بھی خبردار کیا کہ کسی غلط حرکت کے نتیجے میں وہ ماری جائیں گی۔ بوڑھا منیجر اور یہ عورتیں کارکن تھیں۔ کائل نے بوڑھے سے کہا۔ ”رقم کہاں ہے؟“

عورتوں نے جلدی سے میزوں کی درازوں سے رقم نکال کر اس کے سامنے ڈال دی۔ لیکن یہ مشکل سے چند ہزار پاؤنڈز کی رقم تھی۔ کائل نے اسے اٹھا کر شانے سے لٹکے لیدر بیگ میں ٹھونسا اور غرا کر بولا۔ ”باقی رقم کہاں ہے، سیف کہاں ہے جلدی کرو۔“

بوڑھے کی جان پر بنی تھی اس لیے وہ اسے اپنے دفتر والے حصے میں لایا اور کانپتے ہاتھوں سے چھوٹا سا سیف کھول دیا۔ ”یہ لو لیکن اس میں بھی زیادہ رقم نہیں ہے۔“

واقعی سیف میں بھی بس اتنی رقم تھی جتنی عورتوں نے دی تھی لیکن کائل نے رقم کے ساتھ اندر موجود دو عدد مجلد رجسٹر اور ایک سیاہ کور والی ڈائری بھی اٹھا لی تھی۔ بوڑھے منیجر نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”یہ کیوں لے جا رہے ہو یہ تمہارے کام کی نہیں ہے۔“

”بکو مت۔“ کائل نے کہا اور باہر کی طرف لپکا۔ دروازے پر رک کر اس نے اعلان کیا۔ ”اگر کسی نے ایک منٹ سے پہلے باہر آنے کی کوشش کی تو اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔“

وہ تیزی سے باہر آیا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ جب سامنے سے آنے والی ایک بوڑھی عورت نے اسے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا اور اپنے چھوٹے سے کتے سمیت واپس بھاگی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے نہ صرف نقاب پہنا ہوا تھا بلکہ رائفل بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے جلدی سے نقاب اتار کر ایک طرف پھینکا۔ رائفل کا کپڑا دفتر میں ہی گر گیا تھا اس نے اپنا کوٹ اتار کر رائفل اس میں لپیٹ دی۔ وہ سڑک عبور کر رہا تھا کہ کارل فجر کے بکی آفس کے سامنے ایک کار رکی اور اس میں سے دو مسٹنڈے نما افراد اترے۔ اسی اثنا میں بوڑھا منیجر بھی نکل آیا تھا۔ وہ ان دونوں کو کچھ بتانے لگا۔ اس کی بات سنتے ہی انہوں نے آس پاس دیکھا اور جیسے ہی ان کی نظر کائل پر پڑی وہ بھڑک کر بھاگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے پیچھے آئے تھے۔ یہ پتلی سی گلی تھی اور اس میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ جیسے ہی دونوں مسٹنڈے گلی کے سرے پر نمودار ہوئے اور انہوں نے ہتھیار نکالے، کائل بلاتکلف دائیں طرف موجود ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔

سیڑھیوں والی جگہ سے گزر کر وہ ایک ہال میں داخل ہوا تو بدبو اور شور نے اس کا استقبال کیا تھا۔ یہاں مچھلی اور دوسری سمندری حیات کی دکانوں پر فروخت سے قبل صفائی اور پیکنگ کی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے ہال سے باہر جانے والے دوسرے دروازے کی طرف بڑھا مگر مصیبت یہ تھی کہ راستے میں بے شمار لوگ حائل تھے اور تقریباً سب کے پاس کاٹنے پیٹنے والے خطرناک اوزار تھے۔ کائل کو ان سے بھی بچنا تھا ایسے ہی ایک شخص سے بچنے کی کوشش میں وہ ٹکرایا تو رائفل کوٹ سمیت نیچے گری اور کوٹ سے نکل گئی۔ آدمی نے رائفل دیکھی۔ کائل نے جلدی سے اٹھا کر اسے دوبارہ کوٹ میں چھپایا اور بھاگا۔ آدمی عقب سے چلا چلا کر اس کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کا شور تو شاید ہی کسی نے سنا ہو لیکن کائل کے فرار نے سب کو متوجہ کر لیا۔ دو تین افراد نے اس کے راستے میں آنے کی کوشش کی تو اس نے انہیں دھکا دیا۔ جب باقی بھی راستے میں آئے تو اس نے مجبوراً رائفل نکال لی اور اس کے بل پر دوسروں کو دھمکاتا ہوا آگے بڑھا۔ اسی دوران میں اس کا تعاقب کرنے والے بھی ہال میں گھس آئے تھے۔ انہوں نے کائل کو رکنے کا حکم دیا مگر وہ ان کا حکم سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دو مزید مسلح افراد کی موجودگی نے وہاں موجود لوگوں میں سنسنی پھیلا دی اور متوقع گولیوں سے بچنے کے لیے لوگ میزوں کے نیچے گھس گئے۔ کائل دروازے سے نکل رہا تھا کہ ایک چھرا گھومتا ہوا آیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور دروازے میں پیوست ہو گیا۔ وہ کائل کے چہرے کے پاس سے گزرا تھا۔ چھرا ایک آدمی نے مارا تھا جو مچھلی صاف کر رہا تھا۔

باہر آتے ہی کائل نے اس طرف دوڑ لگائی جہاں مارش ننھے مائل سمیت موجود تھا۔ جب مارش نے کائل کو اس طرح بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس نے مائل کی واکر وہیں چھوڑی اور خود مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ کائل اسے آواز دیتا رہ گیا تھا۔ بارھویں اسٹریٹ زیادہ کمرشل تھی اور یہاں لوگ آ جا رہے تھے۔ ایک مسلح شخص کو یوں دوڑتے دیکھ کر وہاں سنسنی پھیل گئی۔ ایک پولیس والا نمودار ہوا اور اس نے سیٹی بجائی۔ کائل رکا نہیں تھا۔ وہ بھاگتا ہوا واکر تک آیا۔ اس نے جلدی سے رائفل اس کے نیچے رکھی اور واکر لے کر بھاگنے لگا۔ مگر اس دوران میں سامنے سے ایک پولیس کار نمودار ہوئی۔ یقیناً پولیس تک اس ہنگامے کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ عقب سے پیدل پولیس والا اور دونوں مسٹنڈے بھی دوڑے آ رہے تھے۔ کائل کے پاس ایک ہی راستہ تھا، وہ آنے والے پہلے دروازے میں واکر سمیت گھس گیا تھا۔

☆☆☆

برون اسمتھ دفتر میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس کے ماتحت کرس نے اس کے کمرے میں جھانک کر اطلاع دی۔ "بارھویں اور تیرھویں اسٹریٹ سے گڑبڑ کی اطلاعات آ رہی ہیں۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"شاید دہشت گردی کا معاملہ ہے کم سے کم تین مسلح افراد کو دیکھا گیا ہے، ان میں سے ایک بارھویں اسٹریٹ پر موجود ایک اینٹیک شاپ میں گھس گیا ہے، وہ رائفل سے مسلح ہے اور اس نے ایک واکر بھی تھام رکھی تھی۔ وہاں موجود پولیس کا خیال ہے کہ واکر میں بچے کے بجائے مزید اسلحہ یا کوئی بم بھی ہو سکتا ہے۔"

معاملہ بہ ظاہر گمبھیر تھا لیکن برون سکون سے اٹھا اور اس نے پہلے ریڈیو پر وہاں موجود پولیس سے رابطہ کیا اور ان سے تازہ ترین صورت حال جاننے لگا۔ دو مسلح افراد پولیس کے قابو میں آ گئے تھے اور ان کے پاس سے پستول برآمد ہوئے تھے۔ لیکن تیسرا فرد بہ دستور اینٹیک شاپ میں موجود تھا اور فی الحال شاپ میں کوئی سرگرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ چار عدد پولیس والوں نے شاپ کو گھیر لیا تھا لیکن وہاں باقاعدہ ایمرجنسی اسکواڈ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

برون نے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے خود جائے وقوع پر جانے کا سوچا اور جیکٹ اٹھاتے ہوئے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اینٹیک شاپ میں سرگرمی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ولیم اور رینا دونوں ہاتھ اوپر کیے ساکت کھڑے تھے، انہیں خدشہ تھا کہ انہوں نے حرکت بھی کی تو یہ بدحواس اور بوکھلایا ہوا شخص انہیں شوٹ کر دے گا۔ رینا دس منٹ بعد ہی واپس لوٹ آئی تھی۔ اس کا دل نہیں لگ رہا تھا بلکہ اسے لگ رہا تھا کہ اب اس کا دل کسی چیز میں نہیں لگے گا مگر اس وقت وہ پچھتا رہی تھی کہ وہ یہاں کیوں آئی۔ وہ شخص واکر سمیت اچانک نازل ہوا اور رائفل نکال کر انہیں ہینڈز اپ کرا لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے تمام روشنیاں بند کیں۔ شیشے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور کھڑکی کا ونڈو بلائنڈ گرا دیا تھا۔ اس وقت وہ باہر جھانک رہا تھا اور جمع ہونے والے پولیس والوں کو دیکھ رہا تھا۔

"مسٹر تم کیا چاہتے ہو؟" اچانک رینا نے پوچھا تو کائل یوں اچھلا کہ رائفل اس کے ہاتھ سے گر گئی اس نے جلدی سے رائفل اٹھائی اور پاؤں پٹخ کر سرگوشی میں بولا۔

"چپ... چپ، باہر پولیس آ گئی ہے۔"

"نہیں۔" ولیم کراہا۔ اس کے کیم شحیم وجود کے مقابلے میں رائفل بدست کائل چھوٹے قد اور دبلے جسم کا مالک تھا لیکن وہ رائفل سے مسلح تھا اور اگر وہ مسلح نہ ہوتا تب بھی ولیم کسی سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اب تک ان کی توجہ واکر کی طرف نہیں گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ واکر میں کوئی بچہ ہو گا اس لیے جب مائل نے ہلکی سی ٹھنکتی ہوئی آواز نکالی تو اس بار وہ تینوں ہی اچھل پڑے۔ رینا بولی۔

"اس میں بچہ ہے؟"

"تم کسی کا بچہ چرا لائے ہو؟" ولیم نے بے یقینی سے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" کائل بولا۔ "یہ میرا بچہ ہے... اے خاتون تم دیکھو اسے... کیا مسئلہ ہے؟" اس نے رینا کو اشارہ کیا۔

رینا کو بچے دیکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس نے ایک بار شادی کی تھی لیکن وہ ماں نہیں بنی تھی۔ بادلِ ناخواستہ وہ آگے آئی اور اس نے جھک کر مائل کے منہ سے کپڑا ہٹایا۔ وہ چوسنے کے انداز میں ہونٹ سکیڑ رہا تھا اور آنکھیں میچ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے اسے بھوک لگ رہی ہے۔"

"نیلا نے تو چھ گھنٹے بعد..." کائل بولتے بولتے رک گیا۔ "اسے فیڈر دے دو، نیچے رکھی ہے۔"

فیڈر واکر کے نیچے خانے میں رکھی تھی۔ رینا نے اسے کور سے نکالا اور ہلا کر مائل کے منہ میں دے دیا۔ وہ خود سے پکڑ کر فیڈر پینے لگا۔ رینا نے سکون کا سانس لیا کہ اسے بچے کو اٹھانا اور بہلانا نہیں پڑا۔ اگر یہ اسی شخص کا بچہ تھا تو یقیناً ماں پر گیا تھا۔ ورنہ وہ اتنا پر سکون نہ ہوتا۔ کائل نے ایک بار پھر باہر کا جائزہ لیا اور ان سے بولا۔ "مجھے تم لوگوں سے کوئی مطلب نہیں ہے لیکن باہر پولیس نے محاصرہ کر لیا ہے اور میں باہر گیا تو مارا جاؤں گا۔"

"پولیس اندر آ جائے گی۔" ولیم جلدی سے بولا۔ "اس لیے بہتر ہے تم خود گرفتاری دے دو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" کائل نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ "یاد رکھو اگر پولیس اندر آئی تو میرے ساتھ تم دونوں بھی مارے جاؤ گے۔"

"آرام سے۔" رینا نے گھبرا کر کہا۔ "ہمارا کیا قصور ہے؟"

"تم پولیس کو اندر آنے سے روکو گے، اسے بتاؤ گے کہ اگر پولیس کی طرف سے کوئی ایکشن لیا گیا تو یہاں بہت خون خرابا ہو گا۔"

"پلیز ایسی باتیں مت کرو۔" ولیم بولا۔ "تم بھول رہے ہو یہاں تمہارا بچہ بھی ہے۔"

کائل چونکا۔ "یہاں کوئی اور بھی ہے؟"

"نہیں ہم دونوں ہیں بس۔" ولیم نے جواب دیا۔

"جھوٹ مت بولو میں نے کسی کی آواز سنی ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے مجھے بھی لگا جیسے کوئی بچہ بولا ہو۔" رینا نے اس کی تائید کی۔

"بچہ تو بس یہ ہے۔" ولیم نے مائل کی طرف دیکھا۔

"نہیں بچے کے بولنے کی آواز آئی تھی۔" کائل نے کہا اور اشارے سے ان دونوں کو خاموش رہنے کو کہا۔ سب کان لگا کر سن رہے تھے اور اس بار ولیم نے بھی محسوس کیا کہ آس پاس بچے آپس میں سرگوشی میں بات کر رہے تھے اور پھر انہیں جاننے میں دیر نہیں لگی کہ آوازیں اس بڑے سے صوفے سے آ رہی تھیں۔ کائل تیز لہجے میں بولا۔ "اس میں کوئی ہے تم نے کسی کو چھپایا ہے۔" اس نے رائفل کا رخ ولیم کی طرف کر دیا۔ وہ وحشت زدہ ہو گیا۔

"نہیں، خدا کی قسم... میں نے نہیں چھپایا۔"

"صوفے میں جو بھی ہے فوراً باہر آ جائے ورنہ میں گولی مار دوں گا۔"

اچانک صوفے کا وسطی حصہ کسی بکس کے ڈھکن کی طرح کھل گیا اور اس میں سے دو لڑکے ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئے۔ وہ رو رہے تھے۔ ایک نے روتے روتے کہا۔ "پلیز، ہمیں مت مارنا۔"

☆☆☆

مارش اندھا دھند بھاگا تھا اس لیے بروقت نکل گیا۔ ادھر وہ بارھویں اسٹریٹ سے نکلا اور ادھر پولیس کار وہاں داخل ہوئی تھی لیکن جیسے ہی وہ ایک گلی میں داخل ہوا وہاں موجود دو افراد نے اسے دبوچ لیا اور سر پر غلاف چڑھا کر وہیں کھڑی گاڑی کے پچھلے حصے میں ٹھونس دیا۔ ایک نے اس کے سر سے پستول کی نال لگائی اور دھمکی دی۔ "اگر خاموش رہے تو زندہ رہو گے ورنہ تمہاری لاش باس کے سامنے پیش کر دیں گے۔"

مارش کسی باس کے سامنے اپنی لاش کی حاضری نہیں چاہتا تھا اس لیے دم سادھ کر پڑا رہا۔ دس منٹ بعد ان دونوں نے اسے گاڑی سے اتارا اور کھینچ کر لے جانے لگے بالآخر اس کے سر سے غلاف اتارا گیا تو اس نے خود کو سائمن کے سامنے پایا۔ سائمن کے تاثرات دیکھ کر اس کا خون خشک ہو گیا۔ وہ میز کے دوسری طرف دونوں پاؤں میز پر رکھے بیٹھا تھا اور سر پر کاؤ بوائے ہیٹ پہن رکھا تھا۔ "میری چیزیں کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔" مارش نے جلدی سے کہا۔ "کائل گیا تھا پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی اور مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔"

"تم اسے چھوڑ کر بھاگ نکلے۔" سائمن نے دونوں پاؤں نیچے کیے اور سیدھا بیٹھ گیا۔ "تمہیں پتا ہے وہاں کیا ہوا ہے؟"

"میں کیسے جان سکتا ہوں؟"

سائمن نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے دیکھو۔"

ٹی وی رپورٹرز بھی بارھویں اسٹریٹ پر پہنچ گئے تھے اور وہ دکان دکھائی جا رہی تھی جس میں واکر والا دہشت گرد گھسا ہوا تھا۔ قیاس آرائیاں جاری تھیں کہ واکر میں بہت بڑا بم تھا۔ پولیس آ گئی تھی اور آس پاس رہنے والوں کو ان کے گھروں سے نکال رہی تھی۔ دو مسلح افراد کی گرفتاری کی خبر بھی تھی۔ سائمن نے سوالیہ نظروں سے مارش کی طرف دیکھا۔ "اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

مارش صرف اتنا جانتا تھا کہ کائل فج کے نکی آفس میں گھسا تھا اور وہ اسے بارھویں اسٹریٹ پر اپنے بچے کے ساتھ چھوڑ گیا تھا، اس کے بعد اس نے کائل کو ہراساں اور لرزاں آتے دیکھا تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ سائمن دنگ رہ گیا۔ "وہ اس کام کے لیے اپنے بچے کو ساتھ لے گیا تھا؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہاں۔" مارش نے سادگی سے کہا۔"وہ اسے کہاں چھوڑتا اس کی بیوی نوکری پر گئی تھی۔"

"میرے خدا!" سائمن نے سر پر ہاتھ مارا۔"میں نے کن احمقوں کے سپرد یہ کام کیا تھا۔"

"ہم نے تم سے کہا تھا ہم اس قابل نہیں ہیں۔تم نے زبردستی یہ کام ہمارے سپرد کیا تھا۔"

"بکومت، تم دونوں میرے مقروض ہو اور میں نے ترس کھا کر تمہیں قرض کے بدلے یہ کام دیا۔"

"باس یہ دیکھنا ذرا۔" سائمن کے ایک گرگے نے اسے ٹی وی کی طرف متوجہ کیا۔اب ٹی وی پر بلجر کی آفس کے منیجر کو دکھایا جارہا تھا جو رپورٹرز کو بتا رہا تھا کہ مسلح نقاب پوش ڈاکو دفتر سے تمام رقم اور سیف میں رکھی کاروباری دستاویزات بھی لے گیا تھا۔"

سائمن اچھل پڑا۔"وہ اسی کے پاس ہے۔"

اس کا اشارہ کائل کی طرف تھا۔لیکن کائل ایک اینٹیک شاپ میں تھا جس کا پولیس نے چاروں طرف سے محاصرہ کر رکھا تھا۔سائمن نے صورت حال پر غور کیا تو فکر مند ہوگیا۔اگر پولیس کائل کو قابو کرلیتی تو اس کے پاس موجود چیزیں بھی پولیس کے ہاتھ لگ جاتیں اور یہ سائمن کے حق میں نہ ہوتا۔اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔"ہمیں بہرصورت پولیس سے پہلے کائل تک پہنچنا ہے۔"

مگر کیسے پہنچنا ہے اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

برون اسمتھ جب بارھویں اسٹریٹ پر پہنچا تو مزید دو پولیس کاریں اور چھ عدد پولیس والے وہاں پہنچ گئے تھے۔انہوں نے یوں دکان کا محاصرہ کر رکھا تھا کہ برون کو پرانا دور یاد آ گیا، جب پولیس اور فوج کو آئے دن اسی طرح مکانوں اور دکانوں کے محاصرے کرنا پڑتے تھے۔برون آئرش تھا لیکن وہ سلطنت برطانیہ کے ملازم اور وفادار تھے۔اس لیے دل پر جبر کرکے اسے اور دوسرے بہت سارے آئرش باشندوں کو وہ سب کرنا پڑا تھا جو وہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔بہرحال اب دور بدل گیا تھا اور مذاکرات کے ذریعے آئرش قوم بتدریج اپنی آزادی کی طرف بڑھ رہی تھی۔کئی برس سے بلفاسٹ میں کوئی بڑا واقعہ پیش نہیں آیا تھا بلکہ جرائم کی صورت حال خاصی بہتر ہوئی تھی اور اسٹریٹ کرائمز میں بھی خاصی کمی آگئی تھی۔پولیس نے آس پاس کے سارے مکانات اور دکانیں خالی کرالی تھیں۔برون نے وہاں موجود پولیس کے ذمے دار سے بریفنگ لی اور اندر موجود افراد سے رابطے کا فیصلہ کیا۔کچھ دیر میں اس اینٹیک شاپ میں لگے فون کا نمبر برون کے پاس آگیا تھا۔اس نے اپنے موبائل سے کال ملائی۔اسی لمحے اس نے سڑک پر ایک بکتر بند گاڑی نمودار ہوتے دیکھی جس پر ایس اے ایس لکھا تھا۔اس کے پیچھے ایسی ہی دو بکتر بند گاڑیاں اور بھی تھیں۔بکتر بند رکیں اور ان سے مخصوص وردیوں اور نقاب میں چھپے ایس اے ایس کے ارکان نکل کر پوزیشن سنبھالنے لگے تھے۔برون نے کال ملتوی کی اور پہلی بکتر بند گاڑی سے اترنے والے میجر کی طرف بڑھا۔اس نے برہمی سے کہا۔"میجر یہ کیا مسخرا پن ہے؟"

"میجر اسکاٹ برین سر، مجھے وزارت داخلہ کی طرف سے تمہاری مدد کرنے کا حکم ملا ہے۔" میجر نے اٹینشن ہوکر کہا تو برون مزید چراغ پا ہوگیا۔

"کس... نے وزارت داخلہ سے مدد مانگی ہے۔یہ ایک پولیس آپریشن ہے۔"

"سر، خدشہ ہے کہ اندر موجود شخص بہت ماہر تربیت یافتہ اور مہلک اسلحے سے لیس ہے اس لیے یہ ایس اے ایس کا کیس بھی ہے۔"

برون نے پہلے پولیس کی خاص زبان میں بات کرنے کا سوچا مگر پھر اس نے وقت کی کمی کا احساس کرتے ہوئے سلیس زبان میں میجر اسکاٹ کو فوری طور پر وہاں سے دفع ہوجانے کا حکم دیا۔وہ پلٹ کر واپس آیا اور دوبارہ اینٹیک شاپ کا نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

یہ ویگ اور ریگ تھے۔ویگ بڑا تھا اس کی عمر دس سال تھی اور ریگ آٹھ سال کا تھا۔کائل نے صوفے کے خلا میں جھانکا اور رائفل کا رخ ولیم کی طرف کردیا۔"تم نے ان کو یہاں چھپایا ہوا تھا۔"

"نہیں، میں قسم کھاتا ہوں۔" وہ بولا۔"میں نہیں جانتا کہ یہ یہاں کیسے آئے؟"

رینا بھی صوفے کے خالی خانے کا معائنہ کررہی تھی۔اس نے کہا۔"مجھے تو یہ مشکوک لگ رہا ہے۔"

ولیم چونکا۔"وہ کیسے؟"

"دیکھو یہ خانہ باقاعدہ بنایا ہوا ہے اور اس میں ان بچوں کو چھپایا ہوا تھا۔میرا خیال ہے گیزل جرائم پیشہ آدمی ہے اور یہ بچے اس کے آلۂ کار ہیں۔"

"ہم بے گناہ ہیں۔" ویگ اور ریگ نے ہم آواز ہوکر کہا۔

"جھوٹ مت بولو اگر تم بے گناہ ہو تو اس میں کیسے آئے؟"

"یہ صوفہ باہر رکھا تھا ہم اس میں گھس گئے۔" ویگ نے معصومیت سے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو، تم چور ہو۔" اس بار کائل نے بھی کہا۔دونوں بچے شور کرنے لگے۔اسی لمحے دکان میں موجود فون کی بیل بجی۔سب چونک اٹھے۔کائل نے ولیم کی طرف دیکھا۔

"یہ کس کا فون ہے؟"

"سنے بغیر میں کیسے بتا سکتا ہوں؟"

کائل سوچ میں پڑ گیا اس دوران میں بیل بند ہوگئی۔بچے خوف زدہ تھے اور ساتھ ہی ان لوگوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلانے کی کوشش کررہے تھے۔کائل کو ان کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں تھا صرف چھپانے پر اعتراض تھا۔بہرحال اسے دو یرغمالی اور مل گئے تھے۔اسے امید تھی کہ اتنے افراد کی موجودگی میں پولیس ریڈ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔اس نے مائل کو دیکھا وہ فیڈر پی کر دوبارہ سو گیا تھا۔کائل نے واکر دھکیل کر شاپ کے اندر والے حصے میں کی اور تب اس نے وہاں دو دروازے دیکھے۔وہ پھر سے ہیجان زدہ ہوگیا اور ولیم سے کہا۔"تم مسلسل مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو، ان دروازوں کے پیچھے کیا ہے؟"

"میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔" اس بار ولیم بھی کو غصہ آ گیا تھا۔"اور تم خود پر قابو رکھو۔"

"میرے سوال کا جواب دو؟" کائل کا لہجہ دھیما ہوگیا۔

"یہ اسٹور ہے اور یہ واش روم ہے۔" ولیم نے اشارے سے کہا۔

"مجھے پی آرہی ہے۔" ویگ بولا۔

"مجھے بھی۔" ریگ نے اس کا ساتھ دیا۔

"چپ کرکے بیٹھو۔" کائل نے انہیں ڈانٹا اور ولیم سے کہا۔"دونوں دروازے کھول کر دکھاؤ۔"

ولیم نے پہلے اسٹور کا دروازہ کھولا اور فوراً ہی سامنے تک بھری اشیا باہر گرنے لگیں۔ولیم نے بہ مشکل انہیں دوبارہ اندر کرکے دروازہ بند کیا اور پھر باتھ روم کا دروازہ کھول کر دکھایا۔کائل مطمئن ہوگیا۔اسی لمحے فون کی بیل دوبارہ بجی۔کائل نے بچوں اور رینا کو صوفے پر بیٹھنے کا حکم دیا اور ولیم کے ہمراہ فون کے پاس آیا۔اس نے کال ریسیو کرنے کا اشارہ کیا۔ولیم نے ہچکچاتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔"ہیلو۔"

"میں پولیس چیف برون اسمتھ بات کررہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"یس مسٹر پولیس چیف؟" ولیم نے خشک گلے کے ساتھ پوچھا۔

"میں تمہاری دکان میں موجود مسلح شخص سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ولیم نے ماؤتھ پیس ہتھیلی سے دبا کر کائل تک پولیس چیف کی فرمائش پہنچائی۔کائل نے نفی میں سر ہلایا۔"میں اس سے بات نہیں کروں گا اس سے کہو اپنے آدمی دکان سے دور ہٹالے اور کسی ریڈ کا مت سوچے یہاں میرے پاس چار یرغمالی ہیں۔"

ولیم نے بادلِ ناخواستہ اس کی بات دُہرائی۔"پلیز پولیس کوئی غلط حرکت نہ کرے۔"

"پولیس کبھی غلط حرکت نہیں کرتی۔" برون غرایا "اسے کہو کہ ہم مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔"

کائل نے پھر انکار کیا۔"میں بات نہیں کروں گا، اس سے بولو پولیس کو پیچھے ہٹالے۔"

ولیم نے بات دہرائی اور کائل نے فوراً کریڈل دبا کر کال کاٹ دی اور ریسیور نیچے رکھ کر فون انگیج کردیا۔ولیم نے کہا۔"تم اس سے بات تو کرکے دیکھتے۔"

"میں ابھی کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔" کائل پریشانی سے بولا۔"میں سوچنا چاہتا ہوں۔"

ولیم بھی صوفے پر بیٹھ گیا۔کائل ان کے سامنے اضطراری کیفیت میں ٹہل رہا تھا۔رینا اور ولیم دل ہی دل میں دعا کررہے تھے کہ خون خرابے کی نوبت نہ آئے۔ویگ اور ریگ بھی سہمے ہوئے تھے لیکن معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہورہا تھا۔ویگ نے آہستہ سے رینا سے کہا۔"پلیز میم اب مجھ سے برداشت نہیں ہورہا میں یہیں پی کردوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔" ولیم بولا۔"میں یہاں کوئی گند نہیں چاہتا۔" اس نے کائل کی طرف دیکھا۔"اسے باتھ روم جانے کی اجازت دو۔"

کائل نے سوچا اور سر ہلایا۔"ٹھیک ہے لیکن سب باتھ روم چلیں گے۔"

رینا نے بدک کر کہا۔"سب کیوں...؟"

"میں کسی کو یہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" کائل نے نفی میں سر ہلایا اور رائفل سے اشارہ کیا۔"سب چلو..."

وہ لائن بنا کر مختصر سے باتھ روم میں داخل ہوئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ریگ نے اصرار کیا کہ پہلے وہ پی کرے گا لیکن ویگ نے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے کموڈ پر قبضہ جمالیا۔

رینا کراہی۔ ”میرے خدا۔“

ویگ کے بعد ریگ فارغ ہوا اور وہ باہر آئے۔ اب انہیں دوسرا مسئلہ لاحق ہو گیا۔ ریگ نے کہا۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”مجھے بھی۔“

”چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔“ کائل نے غرا کر کہا، اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اتنی دیر سے سوچ رہا تھا اور اب تک اس کی سمجھ میں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں آیا تھا۔ باہر پولیس کی تعداد خاصی زیادہ ہو گئی تھی اور ایک دو بار اسے ایس اے ایس کے وردی پوش افراد بھی نظر آئے تھے۔ اندر سے وہ سخت خوفزدہ تھا۔ اس نے آج تک کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ بس جوا کھیلنے کا شوقین تھا اور اسی وجہ سے اس حال کو پہنچا تھا۔ وہ اور مارش، سائمن کے تین ہزار پاؤنڈز کے مقروض ہو گئے تھے۔ سائمن اپنے مقروضوں کو ایک خاص حد سے زیادہ مہلت نہیں دیتا تھا۔ جو قرض ادا نہیں کرتا تھا اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جب سائمن نے قرض کی ادائیگی کے بدلے ان کے ذمے یہ کام لگایا تو انہیں ماننا پڑا تھا۔ اس نے اپنا کام کامیابی سے کر لیا تھا لیکن اب وہ اس دکان میں ٹریپ تھا اور باہر پولیس موجود تھی جو کسی صورت اسے یہاں سے جانے نہ دیتی۔ وہ ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ولیم اور رینا صوفے پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بیٹھے تھے۔ بچے کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ ولیم نے ان کی طرف دیکھا۔

”تمہارے ماں باپ کو معلوم ہے کہ تم کہاں ہو؟“

ویگ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں... ہم چپکے سے شہر چلے آئے تھے۔“

رینا نے اصرار کیا۔ ”یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں یہ چور ہیں اور اس بڈھے گیزل کے ساتھی ہیں اسی نے انہیں یہاں چھپایا ہوگا۔“

”ہم چور نہیں ہیں۔“ ویگ نے احتجاج کیا۔

”خدا کے لیے سب چپ ہو جائیں۔“ کائل نے دہاڑ کر کہا۔

☆☆☆

برون کے پاس کچھ دلچسپ معلومات آئی تھیں۔ اول اس دکان کا مالک موڈی ایک مشکوک شخص تھا اور اس پر شبہ تھا کہ وہ اینٹیک کی آڑ میں چوری کے مال کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ پولیس اس کے خلاف تحقیق کر رہی تھی کہ وہ غائب ہو گیا۔ اب اس کا امریکا سے آیا کزن یہ شاپ دیکھ رہا تھا۔ لیکن دکان میں اس کے علاوہ تین افراد اور کون تھے پولیس اس سے بے خبر تھی۔ برون نے ایس اے ایس کے دستے کو اسٹینڈ بائی پر رکھ لیا تھا لیکن انہیں حکم دیا تھا کہ فی الحال وہ اس جگہ سے دور رہیں۔ شام قریب تھی اور پہلی فون کال کے بعد اس کا ہائی جیکر سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پولیس کا خصوصی دستہ اور مواصلاتی وین آ گئی تھی۔ برون وہیں تھا کہ ایرون آ گیا۔ برون کا موڈ اسے دیکھ کر خراب ہو گیا۔ ”تم یہاں...؟“

”چیف سرجیسی ماما کرٹی نے شکایت کی ہے کہ اس کے دو پوتے صبح سے غائب ہیں، جب میں اس کے بچوں کو لینے گیا تب بھی وہ وہاں نہیں تھے۔“

برون کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔ ”تمہارا دماغ درست ہے میں اس مسئلے سے نمٹوں یا ان ٹھگوں کی اولاد کو تلاش کروں۔“

”یہ کام میں دیکھ رہا ہوں۔“ ایرون نے شانے اچکائے۔ ”اسی سلسلے میں شہر کا چکر لگا رہا ہوں، یہاں سے گزرا تو آپ کے پاس آ گیا۔ میرے لائق کوئی خدمت؟“

”یہی کہ مہربانی کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔“ برون نے زہریلے لہجے میں کہا تو ایرون مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اسی دوران میں دو پولیس اسنائپر دکان کے سامنے ایک بلند مکان کی چھت پر مورچہ جما چکے تھے اور وہاں سے رائفل سمیت دکان کی طرف نگران تھے۔ برون کی طرف سے آرڈر ملنے پر وہ کسی کو بھی شوٹ کرنے کے لیے تیار تھے۔ خصوصی دستے کے اراکین کوشش کر کے دکان کے پیچھے موجود گلی تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے اور وہاں مورچہ جما لیا تھا۔ اس طرف ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جس سے صرف کوئی بلی گزر سکتی تھی۔ وزارت داخلہ کی طرف سے اسے کال آئی تھی کہ وہ ایس اے ایس کا تعاون حاصل کرے لیکن برون نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جو کرے گا خود کرے گا، ایس اے ایس کی مدد نہیں لے گا۔

☆☆☆

کائل سوچوں میں اور وہ دونوں ایک دوسرے میں گم تھے اس لیے انہیں کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ بچے غائب تھے۔ پہلے رینا چونکی۔ ”یہ دونوں کہاں ہیں؟“

کائل چوکنا ہو گیا۔ ”بچے کہاں گئے؟“

”ہمیں کیا معلوم؟“ ولیم نے خفگی سے کہا۔ وہ سوچ

رہا تھا کہ کاش اس وقت وہاں صرف وہ اور رینا ہوتے۔ کائل آس پاس دیکھ رہا تھا اور جب اس نے ایک پرانا فلاور اسٹینڈ گرایا تو ولیم کھڑا ہو گیا۔ ”پلیز یہ سب قیمتی سامان ہے، میں بچوں کو دیکھتا ہوں۔“

بچے اس کے ایک کونے میں رکھے منی فریج کے سامنے موجود تھے اور اس میں سے پنیر اور ٹھنڈے دودھ سے استفادہ کرنے میں مصروف تھے۔ ولیم تیزی سے جھپٹا، اس نے ویگ سے دودھ کی بوتل اور ریگ سے پنیر بار چھینی۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔“ ریگ نے منہ بسورا تو کائل کو ترس آ گیا۔ اس نے حکم دیا۔

”انہیں کھانے پینے دو۔“

مجبوراً ولیم نے انہیں دودھ کی بوتل اور پنیر بار واپس کر دی۔ اس نے کائل سے کہا۔ ”تم نے سوچا کہ اب کیا کرنا ہے؟ ہم ساری عمر تو اس دکان میں نہیں رہ سکتے جب کہ تمہارے ساتھ ایک بچہ بھی ہے اور اسے مسائل بھی ہو سکتے ہیں۔“

مائل خاصی دیر سے خاموش تھا۔ دودھ پی کر وہ مزے سے سو رہا تھا اور اسے قطعی خبر نہیں تھی کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے؟ لیکن ادھر ولیم کے منہ سے اس کے بارے میں الفاظ نکلے اور ادھر وہ آوازیں نکالنے لگا۔ کائل لپک کر اس کے پاس آیا۔ اس نے جھک کر پیار سے بیٹے کو دیکھا اور پھر رینا سے پوچھا۔ ”اسے بھوک کیوں لگ رہی ہے، اس نے ابھی تو پوری بوتل پی ہے؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ وہ بھنّا کر بولی۔ ”مجھے بچوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

ولیم بھی واکر کے پاس آیا تو اسے بو محسوس ہوئی۔ ”میرا خیال ہے اس نے اپنا پیمپر خراب کر لیا ہے۔“

”یعنی اب پیمپر تبدیل کرانا ہوگا۔“ کائل فکرمند ہو گیا۔ ”مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”مجھے بھی نہیں ہے۔“ ولیم نے جلدی سے کہا۔

کائل نے رینا کی طرف دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں بھی نہیں کر سکتی۔“

لیکن جب کائل نے رائفل کا رخ اس کی طرف کیا تو اسے کرتے ہی بنی تھی۔ اسے بھی تجربہ نہیں تھا، اس دوران میں بڑی بدبو پھیلی اور جب رینا نے گندا پیمپر باتھ روم کے روشن دان سے باہر پھینکا تب کہیں جا کر ان سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ مائل پیمپر تبدیل کرانے کے بعد دوبارہ پرسکون ہو گیا تھا۔ ویگ اور ریگ اس کے پاس آ گئے تھے۔ ولیم نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ ”تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا۔“

”کیا پولیس والے مجھے جانے دیں گے؟“ کائل نے سوال کیا۔

ولیم نے سوچا تو اسے یہ کام ناممکن لگا۔ بھلا پولیس اپنے سامنے ایک قانون شکن کو جانے کی اجازت کیسے دے سکتی تھی۔ لیکن اس نے یہ بات کہی نہیں۔ ”بات کرنے میں کیا حرج ہے اگر تم ہمیں چھوڑنے کا وعدہ کرو تو ممکن ہے پولیس تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت دیدے۔“

کائل مضطرب ضرور تھا لیکن بیوقوف نہیں تھا۔ جو بات ولیم نے محسوس کی تھی وہ پہلے ہی جان چکا تھا۔ پولیس کسی صورت اسے جانے کی اجازت نہیں دے گی۔ برطانوی حکومت ہائی جیکرز کے معاملے میں بہت سخت تھی اور ان کے مطالبات تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اگر وہ گرفتاری دیتا تو اس پر مسلح ڈکیتی کا مقدمہ چلتا اور اسے کم سے کم دس برس کے لیے جیل بھیج دیا جاتا۔ اس کی بیوی بچہ اکیلے رہ جاتے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کوئی ملازمت تلاش کرے اور نیلا کو جاب سے چھٹکارا مل جائے تاکہ وہ سکون سے اپنے گھر اور بچے کو دیکھے۔ لیکن اب یہ سب ناممکن لگ رہا تھا۔ ولیم غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”سنو، کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“

کائل ایک قدیم وکٹورین انداز کی مہاگنی کی بنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ ”شاید کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔ میں شروع سے بدنصیب رہا ہوں۔“

رینا واکر کے پاس تھی اس نے دور سے کہا۔ ”یہ پھر باتھ روم جانے کا کہہ رہے ہیں۔“

”ان سے کہو جہنم میں جائیں۔“ کائل نے جواب دیا۔

ولیم نے اشارے سے رینا کو کہا کہ وہ خود اس مسئلے کو دیکھے۔

”تمہاری فیملی...؟“

”میں نے صرف ماں کو دیکھا۔ میرے باپ نے اس سے شادی کی اور دو مہینے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ علیحدگی کے بعد ماں کو پتا چلا کہ میں اس کے پیٹ میں تھا۔ اس نے میرے باپ کو تلاش کرنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ امریکا جا چکا ہے۔“

اتنی سی بات سن کر ولیم کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا، اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”تمہاری ماں کا نام... ایلزبتھ تھا؟“

کائل چونکا۔ ”تم کیسے جانتے ہو؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اپنے باپ کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"صرف اتنا کہ اس کا نام ولیم ایڈگر تھا۔ وہ ماں سے لڑ کر الگ ہوا تھا اس لیے اپنی تصویریں تک ساتھ لے گیا تھا لیکن تم ماں کو کیسے جانتے ہو؟"

"میرا نام ولیم ایڈگر ہے۔" ولیم نے بڑی مشکل سے کہا۔

کائل کچھ دیر احمقوں کے سے انداز میں اسے دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ پھر اس نے ولیم کو گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور فرش پر گرا دیا۔ وہ چلا کر بولا۔ "تم گھٹیا شخص... میری تباہی کے ذمے دار۔" اس نے رائفل کی نال ولیم کے سر سے لگا دی تھی۔

ولیم مارے خوف کے ساکت ہو گیا۔ "پلیز... پلیز میری بات سنو... اس میں میرا کیا قصور ہے جب میں اور ایلزبتھ الگ ہوئے تو ہمیں تمہارا پتا ہی نہیں تھا۔"

شور سن کر باتھ روم کے باہر موجود رینا دوڑی آئی اور صورت حال دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی۔ "اے یہ کیا کر رہے ہو، رائفل ہٹاؤ کہیں چل نہ جائے۔"

مگر کائل کا اشتعال ختم نہیں ہوا۔ اس نے رینا سے کہا۔ "تم اس معاملے میں دخل نہ دو، یہ میرا باپ ہے جو اس وقت مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔"

"میں قسم کھاتا ہوں، مجھے معلوم نہیں تھا۔"

رینا دنگ رہ گئی اور پھر اس کا صدمے سے برا حال ہو گیا۔ اس نے بے یقینی سے ولیم کی طرف دیکھا۔ "تم شادی شدہ ہو؟"

"تھا۔" اس نے تصحیح کی۔ "دو مہینے بعد ہم میں علیحدگی ہو گئی تھی۔"

"اس شخص کی وجہ سے میرا بچپن محرومیوں کے ساتھ گزرا۔ ماں نوکری کر کے مجھے پالتی رہی۔" کائل نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اگر تم اس سے شادی کرنے کا سوچ رہی ہو تو بہتر ہے فوراً یہ سوچ ترک کر دو۔"

مگر رینا اس کی بات سننے کے بجائے کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ ولیم سے تعلق کے بعد اس نے ایک بار بھی اس سے اس کی خانگی زندگی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ ولیم ماضی میں شادی شدہ نکل آیا تھا لیکن یہ اتنی اہم بات نہیں تھی، اس نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ "تم نے امریکا میں بھی شادی کی تھی؟"

ولیم ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔ "آئی ایم سوری مجھے بتانے کا موقع نہیں ملا میں شادی شدہ ہوں لیکن یہ شادی بھی ختم سمجھو۔ میں اب واپس بھی نہیں جا سکتا۔"

"کیوں؟" کائل نے پوچھا۔

"میں نے جس سے شادی کی تھی بعد میں وہ شکاگو کے ایک مافیا باس کی بیٹی نکلی اور میں پھنس گیا۔ وہ پاگل ہے اس نے مجھے دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر میں نے اسے چھوڑنے کا سوچا بھی تو وہ مجھے قتل کر دے گی۔ ایک مہینے پہلے اس نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر میرے بازو میں چاقو اتار دیا تھا۔ میری نس کٹ گئی تھی اور میں مرتے مرتے بچا تھا۔ اسپتال سے نکلتے ہی میں نے ٹکٹ لیا اور یہاں چلا آیا۔"

"تم اسی قابل ہو؟" کائل اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "خیر اس عورت نے تمہیں چھوڑ دیا لیکن..."

کائل کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ باتھ روم سے بچوں کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سب اس طرف لپکے۔

☆☆☆

باتھ روم کے روشن دان سے پھینکا گیا پیمپر ایک پولیس مین پر گرا تھا اور اس کی فوری اطلاع برون کو دی گئی۔ اس نے پیمپر طلب کیا اور دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ کسی چھوٹے بچے کا ہے جو ابھی دودھ پیتا ہے لیکن اس سے بدبو سخت آ رہی تھی اس لیے وہ زیادہ دیر معائنہ نہیں کر سکا تھا۔ البتہ اس پیمپر نے ایک نیا انکشاف کیا تھا کہ وہاں کوئی بم یا مہلک اسلحہ نہیں بلکہ سچ مچ بچہ تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ دہشت گرد نے بچہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟ یہ بھی اسے اتفاق سے مل گیا تھا یا وہ کہیں سے لا رہا تھا۔ پیمپر کو ایک شہادت کے طور پر پلاسٹک کی تھیلی میں بند کیا تو برون اور دوسرے لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔ ابھی آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ دکان کے عقب میں موجود خصوصی پولیس والوں نے دوبارہ کال کی۔

"سر، یہاں روشن دان سے ایک بچے کا سر نکلا ہوا ہے اور ایسا لگ رہا ہے وہ پھنس گیا ہے۔"

"بچے کا سر... اسے باہر نہیں نکالا جا سکتا؟"

"نہیں سر، اس صورت میں صرف اس کا سر باہر آئے گا دھڑ اندر رہ جائے گا۔"

پیچھے جانے کے لیے خاصا طویل چکر لگا کر جانا پڑتا تھا۔ جب برون وہاں پہنچا تو اندر سے بچے کا سر واپس نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پولیس والے خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ برون بھی تماشا دیکھنے والوں میں شامل ہو گیا۔ البتہ اسے بچے کے نقوش اور اس کی زبان دیکھ کر کچھ خیال آنے لگا مگر یہ خیال فوری طور پر اس کے شعور میں نہیں آیا تھا۔ بچے نے روشن دان کی دو سلاخوں کے درمیان سے سر نکال تو لیا تھا لیکن وہ واپس نہیں جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس مسئلے کا حل ولیم نے نکالا۔ کائل اتنا بے چین تھا کہ نتیجے کی پروا کیے بغیر ویگ کو واپس کھینچ لینا چاہتا تھا لیکن ولیم نے اسے روک لیا۔ وہ بچوں کا شور سن کر آئے تو باتھ روم میں یہ صورت حال تھی کہ ویگ ڈبلیو سی کے فلیش ٹینک پر چڑھا ہوا تھا اور اس کا سر روشن دان سے باہر تھا۔ ریگ اسے ٹانگ سے پکڑ کر واپس کھینچ رہا تھا لیکن سر بری طرح پھنس گیا تھا۔ بوکھلائے ہوئے کائل نے ویگ کی ٹانگ پکڑ کر کھینچنا چاہا تو ولیم نے اسے روک دیا۔ "یہ کیا کر رہے ہو، اسے نقصان ہو گا۔"

"پھر کیا کریں؟" کائل بولا، اسے خدشہ تھا کہ کہیں پولیس والے اندر نہ گھس آئیں۔

"ایک منٹ۔" ولیم نے صابن اچھی طرح گیلا کیا اور کموڈ پر پاؤں رکھ کر اسے ویگ کی گردن اور سر پر اچھی طرح ملا۔ یہ کام بڑا مشکل تھا کیونکہ روشن دان میں جگہ نہیں تھی۔ پھر اس نے زور لگا کر کھینچا تو ویگ کسی قدر مشکل کے ساتھ اندر آ گیا۔ ولیم نے اسے نیچے اتارا اور رینا نے تولیا گیلا کر کے اسے صاف کیا۔ کائل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان دونوں کی مرمت لگا دے مگر اس نے صرف دھمکانے پر اکتفا کیا۔ "اب تم دونوں نے کوئی حرکت کی تو میں اسی باتھ روم میں الٹا لٹکا دوں گا۔"

دونوں بھائیوں پر بس اتنا اثر ہوا تھا کہ واپس آنے کے بعد وہ پانچ منٹ تک سکون سے بیٹھے تھے اور اس کے بعد دوبارہ دکان میں گھومنا پھرنا اور چیزوں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ ولیم نے اب توجہ نہیں دی تھی کیونکہ اس کی توجہ اہم ترین مسئلے کی طرف تھی کہ کس طرح کائل کو ہتھیار ڈالنے اور خود کو پولیس کے حوالے کرنے پر مجبور کیا جائے۔ مگر پہلے اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ کائل اس طرح رائفل بدست کیا کر رہا تھا۔ اسے کائل کا موڈ بھی ٹھیک کرنا تھا کیونکہ وہ اب تک اس سے خفا نظر آ رہا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ "کائل گن کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی بلکہ یہ مزید مسئلے پیدا کرتی ہے۔ دیکھو آئرش قوم نے کتنے عرصے بندوق اٹھا کر رکھی لیکن بالآخر مسئلہ مذاکرات سے حل ہوا۔ میں بھی اسی وجہ سے یہاں سے گیا تھا اور میری بدقسمتی کہ وہاں جا کر بھی میرا واسطہ گن سے پڑا تھا۔"

"تم کیا چاہتے ہو کہ میں ہتھیار ڈال دوں، خود کو پولیس کے حوالے کر دوں؟" کائل نے چڑ کر کہا۔ اس نے اپنا چرمی بیگ اتار کر کاؤنٹر پر رکھ دیا مگر رائفل ہاتھ میں رکھی تھی۔

"بالآخر یہی کرنا پڑے گا۔" ولیم نے نرمی سے کہا۔

"نہیں، میں جیل نہیں جاؤں گا۔" اس نے انکار کیا۔

"دیکھو اگر تم بات کرو اور ہتھیار ڈالنے کے بدلے رعایت طلب کرو تو جج بھی تم سے نرم سلوک کرے گا۔"

کائل ہچکچایا۔ "جج مجھ سے نرم سلوک نہیں کرے گا۔ میں ایک بار پہلے بھی چند مہینے کی سزا کاٹ چکا ہوں، مجھے جوا کھیلنے پر سزا ہوئی تھی۔"

کائل کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ہتھیار نہ ڈالنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

☆☆☆

برون کے سامنے صورت حال واضح ہوتی جا رہی تھی۔ روشن دان والے واقعے سے اسے پتا چل گیا تھا کہ اندر دو بچے، ایک عورت اور دو مرد تھے کیونکہ پولیس نے خصوصی مائک کی مدد سے اس واقعے کی ریکارڈنگ کر لی تھی اور ان میں پانچ افراد کی آوازیں واضح تھیں۔ ایک پولیس والے نے سر پھنسانے والے بچے کی تصویریں بھی لی تھیں۔ ایک شیر خوار بچہ تھا یوں اندر مسلح فرد سمیت چھ افراد موجود تھے۔ یہ خاصی تعداد تھی۔ خاص طور سے تین بچوں کی موجودگی نے برون کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ واپس آنے کے بعد مسلسل کال کر رہا تھا۔ مگر اینٹیک شاپ کا فون انگیج جا رہا تھا۔ فون کمپنی کا کہنا تھا کہ لائن ٹھیک ہے ریسیور کریڈل سے ہٹا کر رکھا ہوا ہے۔ برون کو ایسی صورت حال میں میگا فون کے استعمال سے چڑ آتی تھی جب سننے والے سیکڑوں میں ہوتے تھے اور وہ مجرموں کے سامنے پولیس کی بے بسی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے تھے۔ مگر اب مجبوری تھی، اس نے میگا فون کی آواز کم کی اور دکان کے پاس چلا آیا۔

"پولیس چیف برون اسمتھ دکان کے اندر موجود لوگوں سے مخاطب ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ دکان میں کم سے کم تین بچے موجود ہیں۔ میری مسلح شخص سے درخواست ہے کہ وہ بچوں کو چھوڑ دے اور مہربانی کر کے ریسیور فون پر رکھ دے تاکہ رابطے میں آسانی ہو۔ اگر تم لوگوں کو کوئی چیز درکار ہے تو وہ مہیا کی جا سکتی ہے۔"

برون ہر پانچ منٹ کے وقفے کے بعد یہی بات دہرانے لگا تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

پولیس چیف کی آواز سنتے ہی کائل کی حالت میں تغیر آیا تھا۔ اس نے دوبارہ رائفل ان لوگوں پر تان لی اور درشت لہجے میں بولا۔ ”اندر چلو۔“

”آرام سے... آرام سے۔“ ولیم نے کہا۔

”پولیس ریڈ کرنے والی ہے۔“ کائل کا لہجہ وحشت زدہ تھا۔ ”میں زندہ گرفتاری نہیں دوں گا۔“

ولیم نے اسے سمجھانا چاہا مگر کائل سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ انہیں رائفل کے زور پر دھکیل کر باتھ روم تک لایا۔ اس نے مائل کا واکر بھی ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”اب یہاں بیٹھو۔ اگر کوئی باہر نکلا تو میں اسے شوٹ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

رینا سہمی ہوئی تھی، دروازہ بند ہوتے ہی اس نے کہا۔ ”یہ سچ مچ تمہارا بیٹا ہے۔“

”ننانوے فیصد ایسا ہی لگتا ہے کیونکہ اتنے اتفاقات کا امکان صرف ایک فیصد ہو سکتا ہے۔“

”مجھے لگ رہا ہے یہ نفسیاتی مریض بن گیا ہے۔“

”ہم میں سے ہر شخص نفسیاتی مریض ہے بس ظاہر نہیں کرتا ہے۔“ ولیم نے اپنی دوسری بیوی کو یاد کر کے کہا کہ جب اس نے جینٹ سے شادی کی تھی تو وہ کہیں سے نفسیاتی مریض نہیں لگتی تھی۔ یہ تو شادی کے بعد پتا چلا کہ نہ صرف وہ نفسیاتی مریض ہے بلکہ اس کا باپ مافیا باس ہے۔

”نہیں، مجھے تشویش ہے۔“ رینا نے اصرار کیا۔ ”اس نے اس طرح ہمیں کیوں بند کیا؟ وہ ہمیں بند کر کے کیا کرنا چاہتا ہے؟“

ولیم سوچنے پر مجبور ہو گیا، اس دوران میں باہر سے پولیس چیف مستقل مزاجی سے اپنا اعلان دہرا رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا، رینا نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ ”کیا کر رہے ہو، اس نے کیا کہا تھا؟“

”تم فکر مت کرو وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔“ ولیم نے کہا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ وہ ذرا آگے آیا تو کائل فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھا دکھائی دیا اور مزید آگے آیا تو وہ اچھل پڑا پھر وہ تیزی سے جھپٹا اور اس نے کائل سے رائفل چھیننے کی کوشش کی جس کی نال اس کے حلق سے لگی تھی اور وہ ٹریگر دبانے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ ولیم رائفل پر ہاتھ مارتا، کائل نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا لیکن یہ فائر کا نہیں بلکہ رائفل فرش پر گرنے کا دھماکا تھا گولی چلی نہیں تھی۔ دھکے سے کائل بھی لڑھک گیا۔ وہ پھر اٹھا لیکن اس بار ولیم نے اسے دبوچ لیا۔ ”یہ کیا کر رہے تھے تم؟“

”مجھے مر جانے دو۔“ کائل مچلتے ہوئے بولا مگر ولیم نے اسے صوفے پر دھکیل دیا اور رائفل اٹھا کر اسے ان لوڈ کر دیا۔ کائل اب ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔ ولیم اس کے برابر میں آ بیٹھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے بیٹے کو کس طرح تسلی دے۔ بالآخر اس نے کائل کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”خودکشی بھی اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔“

کائل گلوگیر لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس مر جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”کائل۔“ ولیم نے نرمی سے کہا۔ ”تم مجھے پوری بات بتاؤ یہ کیا چکر ہے اور تم اس میں کیسے آئے؟ ممکن ہے میں تمہیں کوئی مناسب مشورہ دے سکوں۔ بے شک میں تم سے بے خبر تھا لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدلے گی کہ تم میرے بیٹے ہو۔“

کائل نے سوچا اور پھر دھیمی آواز میں بولنے لگا، اس نے کچھ نہیں چھپایا ولیم کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ جب وہ چپ ہوا تو ان دونوں نے دیکھا، وہ وہاں اکیلے نہیں تھے بلکہ رینا اور دونوں بچے بھی تھے۔ رینا کے ساتھ مائل کی واکر بھی تھی۔ ولیم کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر پڑے چرمی بیگ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اس میں اس مجرم سائمن کے خلاف ثبوت ہیں؟“

”ہاں۔“ کائل نے سر ہلایا۔ ”اگر یہ ثبوت پولیس کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ اسے لمبے عرصے کے لیے جیل بھیج دے گی۔“

ولیم اچھل پڑا۔ ”تب ہم پولیس سے بارگیننگ کر سکتے ہیں۔“

”ہم؟“ کائل نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”وہ کیسے؟“

”بس تم دیکھتے جاؤ اور سب مجھ پر چھوڑ دو۔“

”پولیس مجھے نہیں چھوڑے گی۔“

”پلیز۔“ ولیم نے التجا کی۔ ”میرے بیٹے، ایک بار مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو۔“

رینا نے بھی کائل کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ کسی وقت تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔“

کائل سوچ رہا تھا اور وہ اسے پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اس نے اثبات میں سر ہلایا تو سب ولیم اور رینا سمیت خوش ہو گئے تھے۔

☆☆☆

اندھیرا چھاتے ہی سڑک کی روشنیاں جل اٹھی تھیں لیکن برون نے اسے ناکافی سمجھتے ہوئے سرچ لائٹس آن کرا لیں، اب پوری سڑک دن کی طرح روشن تھی۔ البتہ اینٹیک شاپ کے اندر ہلکی سی روشنی تھی۔ اس نے بچے کی تصاویر تمام پولیس اسٹیشن کو بھیج دی تھیں کہ اگر اس کے بارے میں کہیں سے کوئی رپورٹ آئی تو اسے بتایا جائے۔ اسے امید تھی کہ بچوں کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی ہو گی۔ تصویر بھیجنے کے ایک گھنٹے بعد ہی ایرون نے اس سے رابطہ کیا۔ ”ڈیڈ، یہ وہی لڑکا ہے جس کی تصویر بھیجی ہے۔“

برون چونکا۔ ”تم اسے جانتے ہو؟“

”یس ڈیڈ۔ یہ غائب ہونے والے دو خانہ بدوش بچوں میں سے ایک ہے اس کا نام ویگ ہے اور اس کا چھوٹا بھائی ریگ ہے۔ ان کی دادی ماما کرسٹی ہر دس منٹ بعد مجھے کال کر رہی ہے۔“

”میرا خیال ہے دوسرا بچہ بھی اسی شاپ میں ہے۔“ برون بولا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اسے بچے کے نقوش کیوں عجیب لگ رہے تھے، وہ خانہ بدوش بچہ تھا۔

”میں آ رہا ہوں۔“ ایرون نے کہا اور کال کاٹ دی۔

رات ہو چکی تھی اور اس واقعے کے آغاز کے مشکل سے آدھے گھنٹے بعد ٹی وی میڈیا وہاں آ گیا تھا اور دکان کے دائیں بائیں تیس گز کی دوری پر انہوں نے اپنے کیمرے جما رکھے تھے۔ وہ اس واقعے کو براہ راست نشر کر رہے تھے۔

برون نے ان کو خبردار کیا تھا کہ اگر وہ تیس گز کی حد کے اندر آئے تو انہیں پولیس کے معاملات میں مداخلت پر گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایرون سے بات کر کے اس نے دوبارہ میگا فون سنبھالا اور اس بار کسی قدر سخت لہجے میں اپنی وارننگ دہرائی۔ آخر میں اس نے اضافہ کیا۔ ”اندر موجود افراد کی خاموشی بچوں کی سلامتی کے بارے میں شکوک پیدا کر رہی ہے۔ اگر دس منٹ کے اندر بات نہیں کی گئی تو پولیس بچوں کی حفاظت کے لیے دوسرے آپشن پر غور کرے گی۔“

☆☆☆

”پولیس ریڈ کرنے والی ہے۔“ کائل نے گھبرا کر کہا۔

”تم فکر مت کرو، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“ ولیم نے اسے تسلی دی۔ ”میں پولیس چیف سے بات کرنے جا رہا ہوں۔“

”تم کیا کہو گے؟“

”تمہیں بتانے کا وقت نہیں ہے میں باہر جا کر جو کہوں گا وہ تم سن لو گے۔“ ولیم نے کہا اور اپنی جیکٹ اتار کر

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

بدلتے موسم کی تحیر انگیزیاں
جولائی 2013ء کے شمارے کی فرحت انگیزیاں

ابتدائی سوغات ● عقل کی فراوانی میں وحشت کی انتہاؤں کو چھوتی کہانی کے اسرار و رموز... سمیرا یعقوب کے قلم کی جولانیاں۔
گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ
جواری ● احمد اقبال کے شہر بار قلم سے ایک اور ناقابل فراموش تہلکہ خیز سلسلے کا آغاز
مغرب کے نرالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب اور ماحول کی عکاسی اور محبت کی پرُزور ناقابل فراموش کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● مغرب ہو یا مشرق ہر مسلم ہی گرداب میں پھنسے نظر آتے ہیں... لیکن پس منظر میں عالمی پیمانے پر کی گئی سازشوں کے انکشافات کاشف زبیر کے انداز بیاں میں
دوسری کہانی ● محبت کے جذبے وقت کے ساتھ بہتے ضرور ہیں... مگر ختم نہیں ہو جاتے... محبت کے اسرار اور نفرتوں کے الاؤ میں دہکتی داستان... احمد اقبال کی تحریر

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے ذرا سا دروازہ کھولا اور چلا کر بولا۔ ”میں اس دکان کا ذمے دار ولیم ایڈگر ہوں میں پولیس چیف سے بات کرنے کے لیے باہر آنا چاہتا ہوں۔“

”تم آسکتے ہو۔“ برون اسمتھ نے کہا۔ ”تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

ولیم دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے باہر نکلا۔ برون اسمتھ جس نے اب بلٹ پروف جیکٹ پہن لی تھی، وہ آگے آیا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

”کائل اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ اس نے اصل میں ایک مجرم سائمن بولیور کے کہنے پر کارل فچر نامی بکی کے دفتر میں ڈاکا ڈالا اور اس کی تجوری میں اس مجرم کے خلاف محفوظ ثبوت نکال لایا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر پولیس اس کے خلاف ہلکا مقدمہ بنائے اور اسے وعدہ معاف گواہ بنالے تو وہ مجرم کے خلاف ثبوت سمیت خود کو پولیس کے حوالے کردے گا۔“

برون اسمتھ خوش ہوگیا تھا، وہ عرصے سے سائمن بولیور کے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن اسے اب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”یہ اچھی بات ہے میں چند منٹ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ کیا تم لوگوں کو کھانے پینے یا کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟“

”نہیں شکریہ، بس یہ معاملہ جلد از جلد نمٹا دیا جائے۔“

ولیم اندر آیا تو کائل موبائل فون پر بات کر رہا تھا۔ ”میں اسی شاپ میں ہوں... مائل میرے پاس ہے... ولیم پولیس سے بات کرآیا ہے، میں خود کو پولیس کے حوالے کردوں گا... پلیز تم رومت، بس یہاں آجاؤ اور مائل کو دیکھو۔“ اس نے موبائل بند کرکے ولیم کو بتایا۔ ”نیلا کی کال تھی، وہ جاب سے آئی ہے۔ مائل اور مجھے غائب پاکر اس نے کال کی۔ میں نے اسے سب سچ سچ بتادیا ہے۔ اب وہ یہاں آرہی ہے۔“

”میں نے پولیس چیف سے بات کرلی ہے امید ہے وہ مان جائے گا۔“

☆☆☆

سائمن اور اس کے آدمی ٹی وی پر ولیم اور پولیس چیف کی گفتگو سن رہے تھے اور جب ولیم نے کائل کی طرف سے پیشکش کی تو سائمن اچھل پڑا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ”اس سے پہلے کہ وہ ثبوت پولیس کے حوالے کرے، ہمیں سب کچھ اپنے قبضے میں کرنا ہوگا۔“

یہ سن کر اس کے ساتھیوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ ایک نے ہمت کرکے کہا۔ ”باس یہ ممکن نہیں ہے وہاں پولیس اور ایس اے ایس دونوں موجود ہیں۔“

یہ خیال سائمن کو بھی آیا تھا وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، ہم کائل کو اپنے قبضے میں نہیں کرسکتے لیکن اسے ثبوت سمیت دنیا سے مٹا تو سکتے ہیں۔“

”ہاں یہ ہوسکتا ہے۔“ سائمن کا نائب خوش ہوگیا۔ ”ہمارے پاس آر پی جی گرینیڈ ہے۔ یہ سب تباہ کردے گا۔“

”تب چلو۔“ سائمن نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔

☆☆☆

ماما کرسٹی اور نیلا ایک ساتھ وہاں پہنچی تھیں۔ برون ماما کرسٹی کو جانتا تھا لیکن نیلا سے واقف نہیں تھا۔ ”تم کون ہو اور کیسے کہہ سکتی ہو کہ شاپ میں موجود بچہ تمہارا ہے؟“

”کیونکہ مسلح شخص کائل میرا شوہر ہے اور وہ بچے کے ساتھ ہے۔ پلیز مجھے اس سے بات کرنے دو میں اپنا بچہ واپس چاہتی ہوں۔“

برون نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے تم میرے ساتھ چلو لیکن کوئی حرکت نہیں کروگی اور شاپ کے اندر بھی نہیں جاؤگی چاہے کائل تمہارا بچہ واپس کرتا ہے یا نہیں۔ تمہیں میری شرط منظور ہے؟“

”ہاں منظور ہے۔“ نیلا نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کائل ایسی کوئی حرکت کرے گا، وہ بہت پریشان تھا۔“

”تم فکر مت کرو میں نے اعلیٰ حکام سے بات کی ہے اگر کائل نے خود کو پولیس کے حوالے کردیا اور ہم سے تعاون کیا تو اسے معمولی سی سزا ہوگی یا عدالت اسے معاف کردے گی۔“

”سچ؟“ نیلا خوش ہوگئی۔

”بالکل، بشرطیکہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کردے۔“

”میں اسے راضی کرلوں گی۔“

برون نے نیلا کو بھی بلٹ پروف جیکٹ پہنائی اور اسے لے کر اینٹیک شاپ کی طرف بڑھا۔ اس نے میگا فون پر کہا۔ ”کائل، تمہاری بیوی تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“

برون نے میگا فون نیلا کے حوالے کردیا وہ کانپتی آواز میں بولی۔ ”کائل پلیز مائل کو باہر بھیج دو اور خود کو پولیس کے حوالے کردو۔ یہ میری التجا ہے، اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو...“ وہ کہتے ہوئے رو پڑی۔ برون نے اس سے میگا فون لے لیا۔

”کائل میں نے اعلیٰ حکام سے بات کی ہے اور وہ تمہارے کیس پر ہمدردی سے غور کر رہے ہیں۔ مجھے امید

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے تمہارا مطالبہ مان لیا جائے گا اگر تم بچوں کو باہر بھیج دو تو اس سے بہت اچھا اثر ہوگا۔"

چند منٹ بعد ولیم دروازے پر آیا اور اس نے کہا۔ "میں بچوں کو باہر لا رہا ہوں۔"

دکان کا دروازہ کھلا اور ولیم واکر سمیت نمودار ہوا۔ ویگ اور ریگ اس کے ساتھ تھے۔ ولیم دکان سے ذرا آگے آیا اور واکر چھوڑ کر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ نیلا بے تاب ہو گئی تھی مگر برون نے اسے روکا اور اس کے اشارے پر دو پولیس والے آگے بڑھے، انہوں نے واکر اور بچوں کو اپنی حفاظت میں لیا اور تیزی سے واپس آگئے۔ مائل کو دیکھتے ہی نیلا نے اسے اٹھا کر سینے سے بھینچ لیا اس نے نم آنکھوں سے برون کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اسے پولیس ٹرک میں لے آیا جو فی الحال اس کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ بچے کو پانے کے بعد اب نیلا کو کائل کی فکر تھی، وہ بار بار برون سے پوچھ رہی تھی کہ اسے کچھ کہا تو نہیں جائے گا۔ برون اسے تسلی دے رہا تھا کہ معاملات خوش اسلوبی سے آگے بڑھ رہے تھے اور امید تھی کہ جلد اسے اختیار مل جائے گا۔ وہ کائل کو ضمانت دے سکے گا۔

باہر ایرون، ماما کرسٹی، ویگ اور ریگ کے ساتھ تھا۔ ماما دونوں کی مرمت لگا رہی تھی۔ وہ سخت غصے میں تھی اور جب ایک پولیس والے نے اس تشدد پر اعتراض کیا تو اس نے پولیس والے کو بھی سخت سنائی تھیں۔ وہ کھسیا کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ ماما کرسٹی بچوں کو لے جانا چاہتی تھی لیکن ایرون نے اسے روکا۔ "ماما ابھی ان سے کچھ پوچھ گچھ کی جائے گی۔"

ماما کرسٹی فکر مند ہو گئی۔ "پوچھ گچھ کیسی؟"

"یہی کہ یہ دکان میں کیسے پہنچے اور وہاں کیا ہوتا رہا ہے۔"

"یہ بچے ہیں، ان کے بیان کی کیا اہمیت ہوگی؟"

"عدالت میں نہیں ہوگی لیکن ہمیں ان سے معلومات تو ملیں گی۔ ابھی معاملہ حل نہیں ہوا ہے اندر مسلح فرد کائل دو یرغمالیوں کے ساتھ ہے۔"

ایرون نے ماما کرسٹی اور بچوں کو نزدیکی کیفے بھجوا دیا جو پولیس والوں سے بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

سائمن اپنے دو خاص آدمیوں سمیت اینٹیک شاپ سے کوئی دو سو گز دور ایک عمارت کی چھت پر موجود تھا۔ جس زمانے میں وہ آئرش حریت پسندوں میں شامل تھا تو اس نے تحریک کا خاصا اسلحہ خرد برد کیا تھا، اس میں جنگی نوعیت کا اسلحہ بھی شامل تھا۔ یہ آر پی جی گرینیڈ اس وقت کی نشانی تھا جو اس نے کسی آڑے وقت کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور آج اس کے استعمال کا وقت آگیا تھا۔ اس کے پاس دو راکٹ اور ایک لانچر تھا۔ یہ ساز و سامان ایک عشرے سے زیادہ پرانا تھا لیکن اسے امید تھی کہ اب بھی کارآمد ہوگا۔ سائمن نے دوربین سے نیچے کا جائزہ لیا۔ اس وقت دکان سے بچے باہر آچکے تھے اور پولیس نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا، سائمن اس پر خوش تھا۔

"یہ اچھا ہوا اگر بچے مارے جاتے تو برا ہوتا۔ پولیس زیادہ سرگرمی سے پیچھے پڑ جاتی۔"

"وہ تو اب بھی پڑے گی۔" سائمن کے نائب نے دبی زبان میں کہا۔ "آئرلینڈ میں آج برسوں بعد پھر آر پی جی گرینیڈ استعمال ہوگا۔"

سائمن مسکرایا۔ "آج برسوں پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔"

اس نے کہتے ہوئے گرینیڈ لانچر میں لگایا اور اسے شانے سے لگاتے ہوئے فائر کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

بچوں کے جانے کے بعد کائل اب پرسکون تھا اور اس کا ہیجان خاصی حد تک کم ہو گیا تھا۔ رینا اسے تسلی دے رہی تھی کہ پولیس چیف برون اسمتھ ایک اچھا آدمی ہے اور وہ اپنے وعدے کا پاس کرے گا۔ ولیم نے یہ کام کیا کہ اس کی رائفل کے سارے کارتوس لے کر باتھ روم کے کموڈ میں بہا دیے تھے۔ اب رائفل خالی تھی۔ اگر برون اسمتھ اپنا وعدہ پورا نہ کر پاتا تب بھی کیس ہلکا بنتا۔ اس کے بعد ولیم نے کائل کا بیگ اٹھایا اور دروازے تک آیا۔ اس نے برون اسمتھ کو آواز دی۔ "مسٹر پولیس چیف، میں باہر آ رہا ہوں۔ میں ثبوت اور دوسری چیزیں جو کائل نے فجر کلی کے آفس سے حاصل کی تھیں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں یقین آجائے۔"

"آجاؤ۔" برون اسمتھ نے اجازت دی۔ ولیم باہر آیا۔ برون مخصوص فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ ولیم نے بیگ اس کی طرف بڑھایا۔

"اس میں سب کچھ ہے جو کائل نے فجر کلی کے دفتر سے لیا تھا، رقم بھی ہے۔"

برون نے بیگ لے کر اس میں جھانکا۔ بیگ میں رقم کی گڈیاں اور ساتھ میں دو عدد مجلد رجسٹرڈ تھے۔ اس نے ایک رجسٹر نکال کر اس کا معائنہ کیا تو یہ اکاؤنٹس لیجر ثابت ہوا۔ دوسرا لیجر بھی ایسا ہی نکلا۔ اس نے دونوں لیجرز زمین پر دے مارے اور برہمی سے بولا۔ "یہ کیا بکواس ہے، تم بے وقوف بنا رہے ہو مجھے، وہ ثبوت کہاں ہیں؟"

ولیم گھبرا گیا۔ "میں نہیں جانتا... کائل کا کہنا ہے وہ اسی میں ہے۔ ایک سیاہ رنگ کی ڈائری تھی۔"

"اس میں کوئی ڈائری..." برون کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ کوئی چیز زن سے ان دونوں کے درمیان سے گزری اور رینا کے بیوٹی سیلون کا شیشہ توڑتی اندر جا گھسی تھی۔ فوراً ہی اندر سے آگ کا ایک بہت بڑا گولہ برآمد ہوا۔ برون اور ولیم اچھل کر دور جا گرے تھے اور چاروں طرف ملبے اور جلتے ٹکڑوں کی بارش ہو رہی تھی۔ نزدیک موجود پولیس والے بھی اس سے متاثر ہوئے تھے۔ البتہ جو دور تھے وہ حرکت میں آگئے تھے۔ ایس اے ایس کا دستہ بھی مستعد ہو گیا تھا اور اس جگہ کا تعین کیا جا رہا تھا جہاں سے راکٹ فائر ہوا تھا۔ دس منٹ کے اندر سائمن اور اس کے ساتھی فرار کی کوشش کرتے ہوئے پکڑے جا چکے تھے۔ نشانہ خطا ہونے کے بعد انہوں نے دوسرا گرینیڈ استعمال کرنے کے بجائے فرار کا فیصلہ کیا تھا۔ بدحواسی میں ان کی گاڑی ایک فائر ہائیڈرنٹ سے جا ٹکرائی تھی اور اس سے بلند ہونے والے پانی کے فوارے نے پولیس کی رہنمائی کی تھی۔

برون اور ولیم بچ گئے تھے، گرنے سے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ ولیم کھانستا ہوا اٹھا تھا کہ اسے رینا اور کائل کا خیال آیا وہ لڑکھڑاتا ہوا اینٹیک شاپ کی طرف بڑھا تھا کہ اندر سے رینا اور کائل ایک دوسرے کو سہارا دیے نکلے۔ دھماکے نے اینٹیک شاپ کو بھی تباہ کر دیا تھا۔ ولیم ان کی طرف بڑھا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ "تم دونوں ٹھیک ہو؟"

کائل کے بازو سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ رینا کا ماتھا بھی زخمی تھا۔ پولیس آگے آئی اور اس نے کائل کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ولیم نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ "تم فکر مت کرو، ہم تمہارے ساتھ ہیں اور جب تک تم رہا ہو کر نہیں آجاتے میں نیلا اور مائل کا خیال رکھوں گا۔"

برون کے حواس بحال ہو گئے تھے۔ آدھے گھنٹے میں صورت حال واضح ہو گئی تھی اور کئی گھنٹے کے صبر آزما مراحل کے بعد بالآخر ڈراپ سین ہو گیا تھا جس میں اگرچہ ایک آر پی جی گرینیڈ فائر ہوا تھا لیکن خوش قسمتی سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ مگر برون کے خیال میں ابھی مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ ولیم نے اس سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ ولیم کے پاس آیا تو ماما کرسٹی اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ اس نے بچوں کا خیال رکھا۔ برون نے کہا۔ "وہ ثبوت کہاں ہے، ہم نے سائمن کو گرفتار کر لیا ہے۔ اگرچہ آر پی جی راکٹ حملے کے الزام میں بھی اسے عمر قید کی سزا ہوگی لیکن وہ ثبوت مل جائیں تو ہم اس کے پورے ریکٹ کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔"

"میں یقین دلاتا ہوں کہ ہم میں سے کسی نے اس بیگ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"ممکن ہے وہ ڈائری دکان میں کہیں ہو۔" برون نے خیال ظاہر کیا تو ماما کرسٹی چونکی۔

"کیسی ڈائری؟"

ولیم نے اسے بتایا کہ وہ کس ڈائری کی بات کر رہے تھے۔ ماما کرسٹی نے کہا۔ "ایک منٹ، میرے ساتھ آؤ۔"

وہ انہیں لے کر ایک طرف بیٹھے چپس کھاتے ویگ اور ریگ کے پاس آئی اور سخت لہجے میں بولی۔ "اس سے پہلے کہ میں تمہاری کھال اتار کر ہاتھ میں پکڑاؤں، شرافت سے سیاہ ڈائری میرے حوالے کر دو۔"

ویگ نے نہایت شرافت سے اپنی شرٹ کے نیچے سے سیاہ ڈائری نکال کر ماما کرسٹی کے حوالے کر دی۔ ولیم گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے ڈائری برون کے حوالے کی اور ماما کرسٹی کو بتایا کہ گیزل نامی جپسی بوڑھا ان بچوں کو کس طرح چوری میں استعمال کر رہا تھا۔ گیزل، ماما کرسٹی کا بھائی تھا اور یہ جان کر اس کا غصے سے برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "اس بڈھے سے تو میں نمٹوں گی، اس کا دماغ درست نہ کیا تو میرا نام کرسٹی نہیں ہے۔"

برون اور ولیم کو یقین تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

☆☆☆

دو مہینے بعد کائل کو عدالت سے رہا کیا گیا تو ولیم، رینا، نیلا اور مائل عدالت میں موجود تھے۔ اس کے ہاتھ سے ہتھکڑی کھلی تو سب اس سے لپٹ گئے تھے۔ کائل نے ولیم کے گلے لگ کر کہا۔ "تھینک یو پاپا۔"

"مائی سن۔" ولیم نے اس کا شانہ تھپکا۔ "مجھے یقین ہے اب تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گے۔"

موڈی واپس آیا تھا اور جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ یہاں کیا ہوا تھا تو وہ اینٹیک شاپ اونے پونے ولیم کے ہاتھ فروخت کر کے غائب ہو گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ پولیس اسے بھی شامل تفتیش نہ کر لے۔ رینا نے اپنا بیوٹی سیلون از سر نو تعمیر کرا لیا تھا، اسے انشورنس سے رقم مل گئی تھی اور اب نیلا بھی اس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ ولیم نے کائل کے لیے سوچا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لے گا۔ وہ اور رینا شادی کا فیصلہ کر چکے تھے بس کائل کے رہا ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے یقین تھا آنے والا وقت سب کے لیے اچھا ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

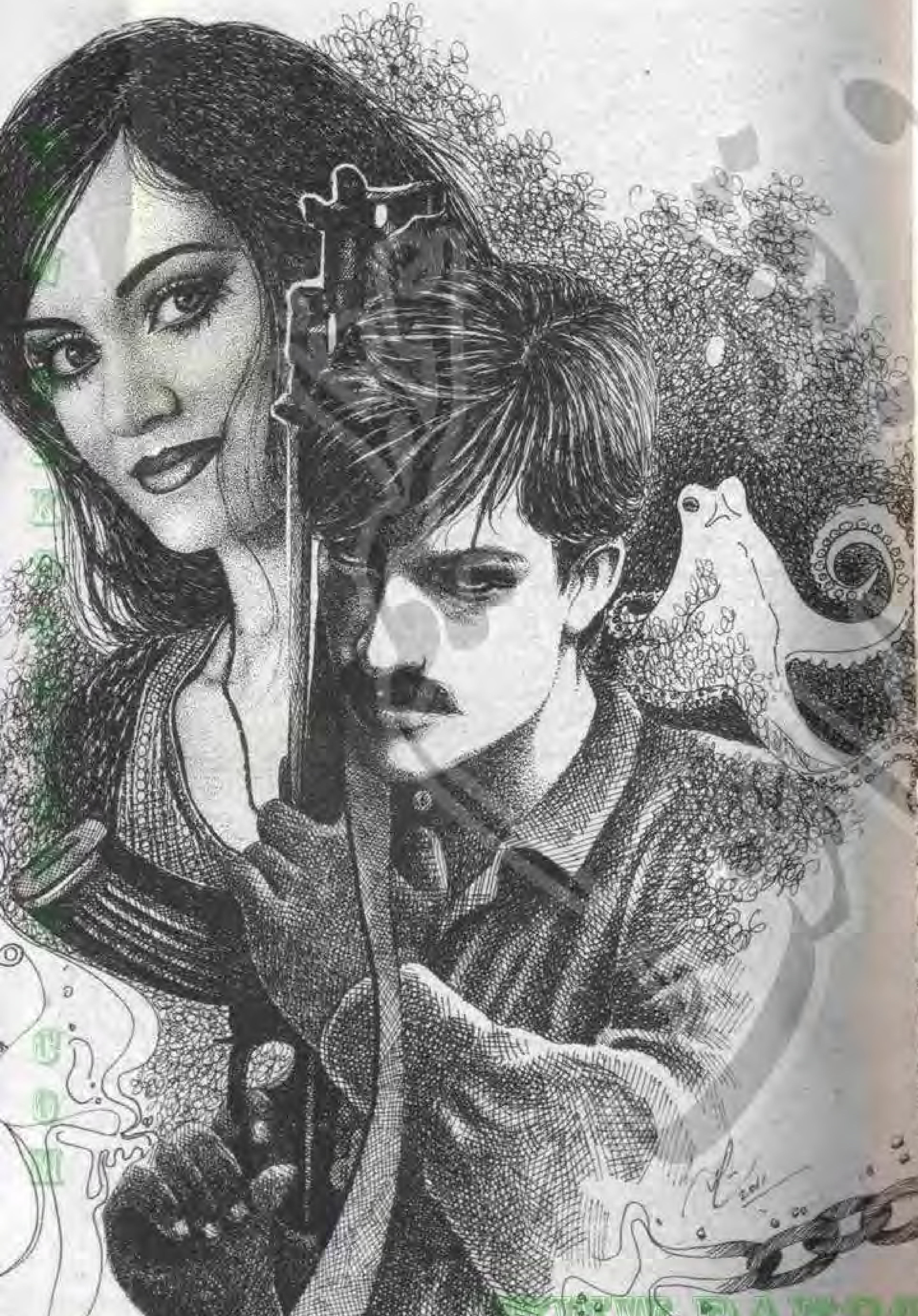

قسط نمبر :25

کشکول

انوار صدیقی

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی بیگ بھی جھکنے نہیں دی تھی، اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی جبکہ لیاقت حسین نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے باپ کی مخالفت کی اور ماں کی دعائیں لے کر فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پر تاب بھوش برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں اور پریشانیوں میں گھر گیا۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے ٹیکسی لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے وہ محفوظ رہتا ہے اسی دوران ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سر فہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعے میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج بھی بہ ظاہر شیخ حامد کا دوست بن کر اسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے علم میں لے آتا حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر روحانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ”بلیک ٹائیگر“ کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کے حوالے سے خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا بیٹا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ نگار بو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی جاتی ہے۔ لیاقت حسین فرحین کو اس کے ایک رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے مگر امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور اورنگ زیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی سعی میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے۔ شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگ زیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگ زیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے۔ لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دیں۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنگا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگ زیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی تابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگ زیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگ زیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران

پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے بچارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کی آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگ زیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنگا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف دشتو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں کو اس کی ماں نے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا۔ شیخ حامد کے خلاف برسر پیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنگا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب دشتو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیر سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہو جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں، میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد تھا لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بہ دستور ایک معما بنی ہوئی تھی جبکہ اورنگ زیب اپنے موقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج و اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور اسے آکٹوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ پھنکوا دیا، جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے غنڈوں نے تباہ کر دیا۔ دشتو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگ زیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے نگینے نے اس کی رہنمائی اور حفاظت کی اور پرتاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زندہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ فرحین کے اغوا کے لیے آئے ہوئے دشمنوں کو لیاقت حسین نے جہنم واصل کیا فرحین تھوڑی زخمی ہوئی اسے اسپتال داخل کرا دیا گیا جہاں ایک جعلی میل نرس نے اسے زہر آلود انجکشن لگانے کی کوشش کی جو لیاقت حسین نے اپنی ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کی نشاندہی کی بدولت ناکام بنا دی۔ دشتو ملٹری انٹیلی جنس کی قید سے فرار ہو گیا۔ میڈم روبی کی سیکریٹری ثریا کو تنبیہ کے طور پر اغوا کر کے دھمکی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اورنگ زیب اور سراج ایک نئے کردار سکندر علی شاہ کی فائل حاصل کر کے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ہیں جس کی بیوی نگینہ شہلا ورما کے بیوٹی پارلر میں جاتی رہی ہے اور شہلا ورما اور جوان نوجوان لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ دوسری جانب جگا اور لوچن شیخ حامد کی کوٹھی کو دھماکوں سے تباہ کر دیتے ہیں۔ آئی جی کا استعفیٰ منظور نہیں ہو رہا تھا اسے ”کوبرا“ کے نام سے ایک کال موصول ہوئی جس میں اسے دھمکی دی گئی کہ وہ لیاقت حسین کا معاملہ حل کرے یا اورنگ زیب کا تبادلہ کر دے بصورت دیگر اسے اور اس کی مرحومہ بیوی کو خفیہ تصاویر کے ذریعے اخبارات میں بدنام کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وہ جو پہلے اورنگ زیب کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا چکا تھا اس کا تبادلہ منظور کر لیا اور اورنگ زیب اس کی مجبوری بھانپ گیا لیکن بظاہر دونوں کے درمیان تلخی قائم ہو گئی۔ دشتو کو افضل خان کے ذریعے پکڑ لیا گیا۔ اورنگ زیب نے اپنی جگہ سراج کو تعینات کر کے سکندر علی شاہ کی فائل اس کے حوالے کی جس میں انسپکٹر رانا حمید نے اس کے متعلق تفصیلات جمع کی تھیں۔ اورنگ زیب کی رہائش گاہ جسے وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا تباہ کر دیا گیا۔ بینا نامی لڑکی کے اغوا کو ناکام بنا کر ملٹری ایجنسی نے مفید معلومات حاصل کیں۔ سکندر علی شاہ کو ”شکرہ“ کے نام سے کال موصول ہوئی جس میں اس ناکامی کے بعد محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا۔ سکندر کے ڈیرے پر ایک لڑکی ماروی لائی گئی۔ جسے رات کی تاریکی میں جنونی عمل سے گزارا گیا۔ اورنگ زیب، سراج اور کرنل احتشام مل کر آکٹوپس کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں اورنگ زیب بینا سے پوچھ گچھ کرتا ہے کرنل احتشام دشتو سے تفتیش کر رہا ہے دوسری جانب شیخ حامد آئی جی کو کوبرا اور سکندر علی شاہ کو شکرہ کے نام سے بلیک میلنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ سکندر علی شاہ ماروی کے ساتھ سلوک کی انکوائری کراتا ہے اسی دوران اسے اطلاع دی جاتی ہے کہ شہلا ورما کے بیوٹی پارلر میں توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جو لی ماضی کے جن راستوں اور نشیب و فراز سے گزر کر شہلا ورما تک پہنچا تھا وہی اس کے معلم تھے۔ وہ قبل از وقت خطروں کی بو سونگھ لینے کا عادی تھا لیکن مستقبل کا لکھا اسے بھی نہیں معلوم تھا، البتہ خدشات کے پیش نظر عقلی گھوڑے دوڑانا ایک عام آدمی کی طرح اس کا بھی حق تھا۔ اس تقابل میں وہ ایسی ہی سچویشن سے دوچار تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ پہلا اتفاق تھا جب اسے پولیس کے کسی ڈی ایس پی نے اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔ وہ حکم کے مطابق ٹھیک ساڑھے نو بجے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کے اس دفتر پر پہنچ گیا جہاں اس سے قبل ایس پی اورنگ زیب تعینات تھا۔ جونی ان دونوں پولیس افسران کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ بیوٹی پارلر سے روانہ ہوتے وقت شیلا ورما نے جہاں اسے یہ کہا تھا "کسی بات کی پروانہ کرنا" وہاں یہ بھی باور کرادیا تھا کہ وہ ان دونوں سے محتاط رہ کر گفتگو کرے۔ خود جونی بھی ان دونوں کے بارے میں خاصی معلومات رکھتا تھا۔ وہ اس بات کے حق میں بھی نہیں تھا کہ بیوٹی پارلر پر ہونے والے حادثے کی اطلاع پولیس کو دی جائے لیکن شیلا ورما نے کسی کے اشارے پر ہی باقاعدہ شکایت کرادی تھی۔

جونی نے سراج کے آفس پہنچ کر ایک سپاہی سے اپنی آمد کی اطلاع کرانی چاہی تھی۔

"ڈپٹی صاحب ابھی نہیں آیا۔" سپاہی نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ "انتظار کرو......"

"مجھے ساڑھے نو بجے آنے کا حکم ملا تھا۔"

"بولا نا...... انتظار کرو......" اس بار پولیس والے نے جونی کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا۔ جونی خاموشی سے ورانڈے میں پڑی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں بیوٹی پارلر پر ہونے والے ہنگامے کا خیال ابھرنے لگا۔

شام ٹھیک پانچ بجے اس کی آنکھ معمول کے مطابق کھل گئی تھی۔ حسب دستور اس نے بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے ذریعے باہر جھانکا تھا۔ پارلر کے سامنے روزمرہ کی طرح نئے ماڈل کی قیمتی گاڑیاں پارک تھیں۔ وہ شانے اچکا کر اٹیچ باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ پر پانی کا چھینٹا ڈال کر اس نے لباس تبدیل کیا پھر وہ اپنا پسندیدہ پرفیوم اپنے لباس پر اسپرے کررہا تھا جب اس کے کانوں میں ایک نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ جونی لپک کر دوبارہ کھڑکی کے قریب آگیا۔ پارلر سے سہمی ہوئی عورتیں اور لڑکیاں نکل نکل کر اپنی گاڑیوں میں بیٹھ رہی تھیں۔ جونی خطرے کی بو سونگھ کر باہر جانے کے راستے کی جانب لپکا پھر یکے بعد دیگرے دو فائر ہونے کی آواز سن کر وہ محتاط ہوگیا، دوبارہ پلٹ کر وہ کھڑکی کے قریب آیا۔

باہر سڑک پر ایک وین پارلر کے عین سامنے کھڑی تھی۔ وین کے قریب ایک آدمی منہ پر ڈھاٹا باندھے رائفل لیے موجود تھا۔ فائرنگ کی آواز سن لینے کے بعد ہی نیچے بھگدڑ بھی مچی تھی۔ سامنے شاپنگ سینٹر کی دکانوں کے شٹر بھی گرالیے گئے تھے۔ پارلر کے اندر سے کسی کے چیخ چیخ کر باتیں کرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ قیمتی شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار بھی گواہ تھی کہ پارلر میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

جونی کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں غور کررہا تھا جب دو افراد شیلا ورما کو گھسیٹتے ہوئے پارلر سے باہر نکال لائے، دونوں کے ہاتھ میں پستول موجود تھے۔

"یہ...... یہ تمہارے لیے پہلی وارننگ ہے میڈم شیلا!" ایک شخص دبنگ آواز میں شیلا ورما کو نفرت سے گھورتے ہوئے بولا۔ "آج ہم نے صرف تمہارے پارلر کا نقشہ تبدیل کیا ہے۔ دوسری بار آئے تو تمہاری بیوٹی میں بھی تبدیلی ہوسکتی ہے۔ کاروبار جاری رکھنا ہے تو ہر ماہ ہماری مطلوبہ رقم تیار رکھنا۔ ہم انکار سننے کے عادی نہیں ہیں۔"

شیلا ورما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے میک اپ کا پھیکا رنگ اور ہونٹوں کی پھیلی لپ اسٹک بھی گواہی دے رہی تھی کہ دھمکی دینے والوں نے اس کے ساتھ بھی تفریحاً کچھ چھیڑ خانی ضرور کی ہوگی۔ وہ خاموش تھی لیکن اس کی آنکھوں کی سرخی اس بات کی غمازی بھی کررہی تھی کہ وہ ان کے جانے کے بعد طوفان اٹھانے سے بھی باز نہیں آئے گی۔ جونی بھی جانتا تھا کہ جو کاروبار وہ کررہی تھی اس میں اس کے ہاتھ بہت دور دراز تک پھیلے ہوئے تھے۔

"ہماری وارننگ کا خیال رکھنا بے بی!" دوسرے آدمی نے شیلا ورما کو مسکرا کر آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "ماہانہ ادائیگی کے علاوہ ہم کبھی کبھی تمہیں ذاتی خدمت کرنے کے کام بھی لاتے رہیں گے۔"

پھر وہ دونوں وین میں بیٹھ کر چلے گئے۔ جونی پہلی فرصت میں دوبارہ نیچے کی طرف لپکا۔ اس نے آنے والوں کے چہروں کو نظر میں رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ جانتا تھا کہ انہوں نے میک اپ کا سہارا لینے کے بعد ہی واردات کی ہوگی۔ وہ تیزی سے نیچے پہنچا تو شیلا ورما وہاں نہیں تھی۔ فوری طور پر اس نے پارلر کے اندر کا نقشہ دیکھا۔ آنے والوں نے سب کچھ درہم برہم کردیا تھا۔ دس منٹ بعد جونی شیلا ورما کے پاس اس کے اپارٹمنٹ میں تھا جہاں وہ کسی چوٹ کھائی ہوئی زخمی شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ جونی کو سامنے دیکھ کر وہ رک گئی۔

"تم کہاں تھے؟"

"میں سو رہا تھا...... جب آنکھ کھلی تو سیدھا نیچے گیا لیکن......" جونی نے بڑی خوبصورت اداکاری کرتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ سب کچھ اچانک کیسے ہوگیا؟ بات کیا ہوئی تھی جو......"

"ڈونٹ وری......" شیلا ورما نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "میں ان...... کو چھوڑوں گی نہیں۔"

"کیا تم ان کو......"

"میں نہیں جانتی کہ وہ سن آف دی بچ (Son of the Bitch) کون تھے لیکن اب پولیس ان کو ان کی قبروں سے بھی ڈھونڈ نکالنے کا کام انجام دے گی۔"

"ریلیکس......" جونی نے شیلا کے قریب جاکر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔ "ان کے آنے کا کوئی مقصد بھی ضرور ہوگا۔"

"ہاں۔ وہ...... ایک لاکھ روپے ماہانہ کے بھتے کی ڈیمانڈ کررہے تھے۔"

"تم نے کیا سوچا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آنے والوں کے خلاف کیا کروگی۔" جونی نے سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ "اگر ان سے واقف ہو تو پولیس کے پاس جانے سے پہلے مجھے بتادو...... وہ جو بھی ہوئے جونی انہیں پالتو کتوں کی طرح گلے میں زنجیریں پہنا کر تمہارے قدموں تک گھسیٹ لائے گا۔"

"تھینکس جونی......" شیلا نے جونی کو گلے لگا کر جذباتی انداز میں کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ تم شیلا کے لیے اپنی جان بھی قربان کرسکتے ہو لیکن...... میں نے تمہیں بہت کچھ کھو کر پایا تھا۔ اب پاکر کھونے کی غلطی نہیں کروں گی۔"

کچھ دیر وہ جذباتی باتیں کرتی رہی پھر وہ فون کے قریب گئی تو جونی نے اس کے ارادے کو بھانپ کر دریافت کیا۔ "کس کو کال کررہی ہو......؟"

"سکندر علی شاہ کو۔"

"اوہ......" جونی نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا تم سکندر علی شاہ کو جانتی ہو؟"

"نہیں...... لیکن میں اسے جو حوالہ دوں گی اس کے بعد وہ میری مدد کرنے سے انکار بھی نہیں کرے گا۔"

"سوچ لو...... وہ پیری مریدی کرنے والا بندہ ہے۔"

"جانتی ہوں...... وہ مردوں کو مرید کرتا ہے مگر خود خوبصورت عورتوں کا مرید ہے۔ تم نگینہ کو کیوں فراموش کررہے ہو۔" شیلا ورما کے لہجے میں کاٹ تھی۔ "دنیا کا ہر مرد خوبصورت عورتوں کا مرید ہوتا ہے۔"

نگینہ کا حوالہ درمیان میں آجانے کے بعد جونی نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ اس کے بعد ہی ہوا جو شیلا ورما نے کہا تھا۔ سکندر علی شاہ نے مختلف حوالوں کے بعد شیلا ورما کی نہ صرف رام کہانی سن لی بلکہ اسی نے شیلا ورما کی طرف سے پولیس کو بیوٹی پارلر پر ہونے والے حملے اور اس کی تفتیش کی خاطر فون بھی کرادیا تھا۔ جونی بھی اس وقت بلائے جانے کے بعد سراج کے دفتر تک آگیا تھا لیکن اس کے ذہن میں مستقبل کا حال بتانے والی مس ڈکسن کا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ "جتنی جلدی ممکن ہو شیلا ورما کی دنیا سے نکل کر کہیں دور چلے جاؤ۔ کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی رسائی بھی ممکن نہ ہو۔"

جونی اپنے خیالوں میں گم تھا جب ورانڈے میں موجود سپاہی نے اسے بتایا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آگئے ہیں اور اسے بلایا گیا ہے۔ جونی دھڑکتے دل سے اٹھا پھر خود کو سنبھالتا اس کمرے میں داخل ہوا جہاں سراج اس کا منتظر تھا۔ اس نے جونی کو سر سے پاؤں تک ایک نظر ٹٹولا پھر اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ خود سامنے رکھی فائل کے اوراق الٹنے پلٹنے لگا۔ پانچ سات منٹ کمرے میں مکمل خاموشی رہی پھر سراج نے فائل بند کرنے کے بعد ہی جونی کو مخاطب کیا۔

"بیوٹی پارلر میں ہونے والی توڑ پھوڑ کے سلسلے میں ہمیں اوپر سے یہی ہدایت ملی ہے کہ اس کے ذمے داروں کو پہلی فرصت میں گرفتار کرکے سخت سزا دی جائے۔ میں نے تمہیں اسی سلسلے میں طلب کیا ہے...... کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ لوگ کون تھے؟"

"جی نہیں......" جونی نے سادگی سے جواب دیا۔ "میں اس وقت اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ جب مس ورما نے مجھے بلایا تو مجرم جاچکے تھے لیکن مس ورما توڑ پھوڑ کے وقت پارلر ہی میں موجود تھیں۔"

"مس ورما کا بیان ہے کہ وہ بھی ان سے واقف نہیں ہیں۔ یہ بھی شبہ ہے کہ آنے والے اپنی اصل شکل میں نہیں تھے۔ ایسی صورت میں فوری طور پر کسی کی گرفتاری بھی ممکن نہیں لیکن فنگر پرنٹس کی رپورٹ آجانے کے بعد ہوسکتا ہے کہ کوئی سراغ ہاتھ آجائے۔"

جونی نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم وہاں کیا کام کرتے ہو......؟"

"پارلر کی وین کا ڈرائیور ہوں سر......" جونی نے انکساری سے جواب دیا۔ "مس ورما کی گاڑی چلانے کی خدمت بھی انجام دیتا ہوں۔"

"مس ورما نے بھی یہی بتایا ہے۔ یہ بھی خاص طور پر کہا ہے کہ تم اس کے سب سے زیادہ وفادار اور قابل اعتماد ورکر ہو۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ان کی مہربانی ہے سر۔“
”کب سے ملازم ہو؟“
”لگ بھگ تین سال سے۔“ جونی نے مختصر جواب دیا۔
”گڈ۔“ سراج نے اس بار قدرے بے تکلفی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم ہماری مدد کر سکو۔“
”آپ کی تابعداری سے بھی انکار نہیں کروں گا سر۔“
”گڈ...... مس ورما سے کہنا کہ کسی وقت میں ان سے بھی ملاقات کرلوں گا۔“
”ٹھیک ہے جناب۔“
”کیا پینا پسند کرو گے...... چائے یا کولڈ ڈرنک۔“ سراج نے دوستانہ انداز میں جونی سے دریافت کیا۔
”آپ نے اس قابل سمجھا یہی میرے لیے بہت ہے سر۔“ جونی نے کسمسا کر جواب دیا۔
”تم کو اس وقت بلانے کا ایک ہی مقصد تھا۔“ سراج نے مسکرا کر کہا۔ ”تم چونکہ مس ورما کے خاص آدمی ہو اس لیے ان کو یقین دلا دینا کہ ہم ان کی رپورٹ کے سلسلے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیں گے۔“
”میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“
”تم...... اب جا سکتے ہو۔ ضرورت ہوئی تو دوبارہ تکلیف دوں گا۔“
جونی خاموشی سے اٹھا اور سر جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔ سراج کے ہونٹوں پر اس کے جانے کے بعد بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھری تھی۔

☆☆☆

تینوں زخمیوں کو جو وکیل فراہم کیا گیا تھا اسی کی درخواست پر ان کو چیمبر میں طلب کیا گیا تھا۔
عدالت کے روبرو پیش ہونے کی خاطر انہیں پولیس کے دو دو کارندوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے کمرے تک پہنچایا تھا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔
چیمبر میں لیاقت حسین بھی تھا۔ حوالات کی پولیس اسے ہتھکڑی پہنا کر لائی تھی۔ تینوں زخمیوں کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر جو زخمی مسکراہٹ ابھری اسے وہاں موجود سب ہی افراد نے دیکھا تھا۔
”تم یہاں کوئی حماقت کا ثبوت نہیں دو گے۔“ متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او نے مدھم آواز میں لیاقت سے کہا۔
”آپ فکر مت کرو صاحب۔ مجھے قانون کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔ میں کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا۔“
”ایک بات اور بتا دوں۔“ ایس ایچ او نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”باہر سیٹھ عثمان اور ان کی بیگم بھی موجود ہیں۔“
لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں پھر تینوں زخمیوں پر مرکوز ہو گئیں جو بے حد کسمپرسی کی حالت سے دوچار تھے۔
مجسٹریٹ چیمبر میں داخل ہوا تو سب سنبھل گئے۔ تینوں زخمیوں کا باری باری بیان ہوا۔ تینوں نے ایک ہی بات کہی تھی کہ اگر لیاقت حسین پہل نہ کرتا تو وہ بھی اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کرتے۔
”تم تینوں کو لیاقت حسین سے کیا دشمنی ہے؟“ سرکاری وکیل نے دریافت کیا۔
”بات دشمنی کی نہیں۔ اس حکم کی ہے جو ہمیں دیا گیا تھا۔“ ایک زخمی نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہمیں اس کام کے عوض معقول رقم بھی پیشگی مل گئی تھی۔“
”اوہ...... گویا تم اقرار کر رہے ہو کہ تم تینوں اجرتی قاتل ہو۔“
”آپ کی جو مرضی آئے سمجھ لیں۔“
”ون منٹ......“ مجسٹریٹ نے سرکاری وکیل سے کہا پھر اس نے براہ راست زخمیوں سے سوال کیا۔ ”لیاقت حسین کو مارنے یا زخمی کرنے کا حکم تمہیں کس نے دیا تھا؟“
”ہم اسے نہیں جانتے۔“
”رقم کس نے ادا کی تھی؟“ مجسٹریٹ کی کشادہ پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”اسی کا نام اور پتا بتا دو۔“
”وہ بھی پہلی بار سامنے آیا تھا۔“ زخمیوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میک اپ میں ہو۔“
”نان سنس!“ مجسٹریٹ جھلا کر بولا پھر اس کے اشارے پر سرکاری وکیل نے زخمیوں سے سوال کیا۔
”کیا تم لوگ اس سے پہلے بھی واردات کرتے رہے ہو؟“
”ہم نے لیاقت حسین کے بارے میں اقبال جرم کر لیا ہے جناب۔ آپ گڑے مردے کیوں اکھاڑنے کی کوشش......“
”یہ عدالت ہے۔“ مجسٹریٹ نے میز پر ہاتھ مار کر زخمیوں کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”جو پوچھا جائے صرف اس کا جواب دو۔“
”کیا لیاقت حسین سے پہلے بھی تم کسی نامعلوم شخص کے کہنے پر منہ مانگی اجرت حاصل کرنے کے بعد واردات کرتے رہے ہو؟“ سرکاری وکیل نے اپنا سوال دہرایا۔
”ہاں......“ ایک زخمی نے مختصر جواب دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کتنی وارداتیں کر چکے ہو؟"

"ہمیں یاد نہیں۔ حساب کتاب رکھنا ہمارے پیشے کے لوگوں کی عادت نہیں ہوتی۔"

"کبھی پہلے بھی گرفتار ہو چکے ہو؟"

"جی نہیں۔ یہ پہلا اتفاق ہے۔" زخمی شانے اچکا کر بے پروائی سے بولا۔

"بہر حال۔ تم اقرار کرتے ہو کہ اگر لیاقت حسین تم پر حملہ کرنے میں پہل نہ کرتا تو تم اس پر قاتلانہ حملہ کرنے سے گریز نہ کرتے۔"

"جی ہاں۔" زخمیوں نے باری باری ایک ہی بات کہی۔ "اقبال جرم کے بعد ہم ایک درخواست اس عدالت سے بھی کریں گے...... ہمیں جیل میں بھی دوسرے قیدیوں سے الگ تھلگ رکھا جائے ورنہ ہماری موت یقینی ہے۔"

"وہاٹ......" مجسٹریٹ نے تینوں کو تیز نظروں سے گھورا۔ "تمہیں جیل میں کس بات کا خطرہ ہے؟"

"جس نے ہمیں خریدا تھا وہ اور اس کے کارندے اپنے پیچھے کوئی ثبوت یا کسی شہادت کا نشان چھوڑنے کے عادی نہیں ہیں۔ اگر اتنے شاطر نہ ہوتے تو ہم جو موت کے دہانے پہ کھڑے ہیں ان کو ننگا کرنے سے دریغ بھی نہ کرتے۔ وہ اگر اناڑی ہوتے تو قانون کا ہاتھ بھی ان کے گریبان تک پہنچ چکا ہوتا۔"

ایک لمحے کو چیمبر میں مکمل سکوت طاری ہو گیا، لیاقت حسین کے ہونٹوں پر بھی جیسے پپڑی جم گئی۔ زخمیوں نے جو بیان دیا وہ اس کے لیے غیر متعلقہ ہونے کے باوجود قابل غور تھا۔ مجسٹریٹ کی نظریں بھی بار بار زخمیوں کے چہروں پر منڈلا رہی تھیں پھر اس کی آواز ابھری۔

"میں تم لوگوں کی پوزیشن کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں لیکن آخر کب تک تم اصل مجرم کی نظروں سے روپوش رہو گے؟ موجودہ کیس کی سزا بھگتنے کے بعد باہر آؤ گے تو پھر نادیدہ قاتلوں کے ہاتھ تمہاری بوٹیاں ادھیڑ ڈالیں گے۔"

زخمیوں کے ہونٹوں پر ایک پھیکا سا تبسم ابھر کر نڈھال ہو گیا۔ ایک نے شانے اچکا کر مجسٹریٹ کو طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کسی سائے یا پرچھائیں کو ہتھکڑی پہنانا قانون کے اختیار میں بھی نہیں ہوتا۔"

"تم خود کسی شبہے کا اظہار کر دو۔ اصل مجرم تک پہنچنا پولیس کا کام ہوگا۔" مجسٹریٹ نے انہیں اکسانے کی کوشش کی۔

"شبہ......" ایک زخمی نے کراہ کر جواب دیا۔ "ہمیں کسی ایسی ہی بڑی مچھلی پر شبہ ہے جس کے طاقتور ہاتھ حکومت کی جڑوں سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ قانون ان پر ہاتھ ڈالنے کی......"

"شٹ اپ......" مجسٹریٹ نے جھلا کر کہا پھر اس نے لیاقت حسین کی طرف دیکھا۔ "تم اپنے سابقہ بیان میں کہہ چکے ہو کہ تم نے محض شبہے کی وجہ سے آتشیں اسلحہ استعمال کیا تھا۔"

"یاد ہے صاحب اور۔ اب بھی میں اپنا بیان نہیں بدلوں گا۔" لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"شبہے کی کیا وجہ تھی؟"

"میں اس کی تفصیلی وجہ بھی پچھلے بیان میں بتا چکا ہوں۔" لیاقت حسین نے کھل کر کہا۔ "کسی سنسان سڑک پر تین چار افراد ہاتھ میں اسلحہ لیے ایک تنہا آدمی کو گھیریں تو اس کا وہی مطلب ہوتا ہے جو میری عقل میں آیا تھا۔ اس سے پیشتر بھی ان کتوں کو گھیر کر موت کے حوالے کر دیا تھا جنہوں نے میری عزت پر ڈاکا ڈالنے کی غلطی کی تھی۔"

"میں تمہاری فائل تفصیل سے پڑھ چکا ہوں لیکن جو لوگ تمہارے دشمن ہیں، ان کی دشمنی کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی۔ تمہیں بھی کسی نہ کسی پر شبہ ہوگا۔"

"غم تو اس بات کا ہے صاحب کہ وہ بزدلوں کی طرح چھپ کر وار کرتا ہے۔ ایک بار کھل کر سامنے آجائے تو میں قبر تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے بعد پھانسی کا پھندا خود اپنے ہاتھوں سے گلے میں ڈالنے سے بھی نہیں ہچکچاؤں گا۔"

مجسٹریٹ نے لیاقت حسین کے چہرے کے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا پھر اس کے اشارے پر سوائے متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کے باقی سب لوگ باہر چلے گئے۔

"آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ زخمی افراد جان بوجھ کر زبان کھولنے سے گریز کر رہے ہیں؟ لیاقت حسین کا بار بار ایک ہی بیان پر قائم رہنا بھی کیا اس بات کی نشاندہی نہیں کرتا کہ کہیں نہ کہیں ایسی کوئی وجہ ہے جو ابھی تک پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آئی؟"

"میں بھی ابھی تک اصل معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکا سر۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "جہاں تک میری ذاتی تفتیش کا تعلق ہے تو میں یہی کہوں گا کہ لیاقت حسین نے جو کارروائی کی وہ سیلف ڈیفنس ہی تھی۔"

"میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ زخمیوں کے اقرار جرم کے بعد لیاقت حسین کو باعزت طور پر رہا کرنا بھی قانون

کی ذمے داری ہے جسے پورا کرنے سے میں دریغ نہیں کروں گا لیکن...... ایک بات قابل غور ہے۔" مجسٹریٹ نے کچھ توقف سے بات جاری رکھی "وہ کون سے بااثر لوگ ہیں جو ہر قیمت پر صرف ایک بات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ لیاقت حسین کو رہا نہ کیا جائے۔"

"سر......" ایس ایچ او نے چونک کر مجسٹریٹ کو دیکھا۔ "کیا آپ کو بھی اپروچ کیا گیا ہے؟"

"یہ بات میں آپ کو آف دی ریکارڈ بتا رہا ہوں۔ فی الحال اس کا ذکر بھی کسی اور سے نہ کیجیے گا۔"

پھر ایس ایچ او کی موجودگی ہی میں زخمیوں کا تحریری بیان حاصل کرنے کے بعد مجسٹریٹ نے لیاقت حسین کو باعزت طور پر رہا کرنے کا مختصر فیصلہ بھی سنا دیا تھا لیکن......

دوسری صبح اسے اس کی خواب گاہ میں مردہ حالت میں پایا گیا۔ پولیس سرجن نے اس کی موت کا سبب سانپ کا زہر قرار دیا تھا۔

ہوم منسٹر کے آفس میں اس وقت آئی جی، ڈی آئی جی، ایس پی اورنگزیب، ڈی ایس پی سراج کے علاوہ بندرگاہ کے علاقے کا ایس ایچ او بھی موجود تھا۔ پولیس سرجن کی وہ عارضی رپورٹ بھی ہوم منسٹر کے سامنے رکھی تھی جس میں مجسٹریٹ کی موت کی وجہ درج تھی۔

اس وقت جو ہنگامی میٹنگ کال کی گئی تھی وہ بھی مجسٹریٹ کی پراسرار موت سے متعلق تھی۔

"مرحوم کی بیوہ نے جو بیان دیا ہے وہ ہم سب کے لیے قابل غور ہے۔" ہوم منسٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "مرحوم کل جس وقت گھر پہنچا اس وقت خلاف فطرت، بہت سنجیدہ تھا۔ بیوہ نے اس کا سبب دریافت کیا تو مرحوم نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اب ہمارے تمام ذمے دار اور بڑے بڑے عہدوں پر تعینات افسران نے بھی اپنی شخصیتوں پر فار سیل (For Sale) کی تختی لگا رکھی ہے۔ بیوی نے وضاحت چاہی تو مرحوم بات کو ٹال گیا اور اب۔ اس وقت ہم اسی سلسلے میں ایک چھت کے نیچے جمع ہیں۔" کمرے میں ایک لمحے خاموشی رہی پھر ہوم منسٹر نے براہ راست آئی جی کو مخاطب کیا۔ "کیا آپ کو مرحوم کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے؟"

"جی ہاں۔ صبح کے اخبار میں بھی یہ خبر موجود تھی لیکن......"

"اب لیکن کے آگے ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔" ہوم منسٹر نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "مجرم گرفتار بھی ہو گئے تو مرنے والا واپس نہیں آسکتا۔ ہم سب پھر روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہو جائیں گے۔ کاغذات کی خانہ پری کر کے انہیں بھی داخل دفتر کر دیا جائے گا۔ مرنے والے کے پس ماندگان بھی رو پیٹ کر صبر کر لیں گے۔"

کمرے میں دوبارہ سکوت طاری ہو گیا۔ ہوم منسٹر نے دوسری بار ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔

"میری رپورٹ کے مطابق آپ کی موجودگی میں مرحوم نے کیس اپنے چیمبر میں نمٹایا تھا۔"

"یس سر۔" ایس ایچ او نے اقرار کیا پھر اس نے تمام تفصیل سنانے کے بعد دبی زبان میں کہا۔ "آخر میں چیمبر میں میرے اور مرحوم کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس وقت...... لیاقت حسین کی رہائی کا مختصر فیصلہ لکھنے سے قبل دبی زبان میں یہ بھی کہا تھا کہ کچھ بااثر لوگ مرحوم پر اس بات کا پریشر ڈال رہے تھے کہ لیاقت حسین کو رہا نہ کیا جائے۔"

"آئی سی۔" ہوم منسٹر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "لیاقت حسین کا نام میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ کون ہے یہ شخص؟"

"لیاقت حسین ہمارے ایک صنعتکار سیٹھ عثمان کا ڈرائیور ہے۔" ڈی آئی جی نے جواب دینے میں پہل کی۔ "میری ذاتی رپورٹ کے مطابق وہ بے حد کھرا، ایماندار اور وفادار ملازم ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات اس کے لیے مشہور ہے جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مسٹر اورنگ زیب اور ڈی ایس پی سراج کو کچھ موقعوں پر اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔"

ہوم منسٹر نے ڈی آئی جی کی بات سن کر اورنگ زیب کی سمت دیکھا۔

"آپ کیا کہنا پسند کریں گے۔"

"فی الحال میں مختصراً یہی عرض کروں گا کہ کوئی روحانی قوت ہے جو لیاقت حسین کو قبل از وقت خطروں سے آگاہ کر دیتی ہے۔ دو موقعوں پر مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ میں نے لیاقت حسین سے بھی دریافت کیا تھا لیکن وہ ایسی کیفیت میں جو کچھ زبان سے کہتا ہے یا کر گزرتا ہے وہ بعد میں اسے بھی یاد نہیں رہتا۔"

"انٹرسٹنگ!" ہوم منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے ڈی آئی جی سے سوال کیا۔ "مرحوم مجسٹریٹ کے روبرو اس کا کیا کیس تھا؟"

جواب میں ڈی آئی جی کے علاوہ علاقے کے ایس

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایچ او نے بھی شروع سے آخر تک کی تمام تفصیل دُہرا دی۔

"بہرحال...... یہ بات طے ہے کہ کوئی مرحوم پر لیاقت حسین کو باعزت طور پر رہا نہ کرنے کا دباؤ ڈال رہا تھا۔ کون ہوسکتا ہے وہ؟"

ہوم منسٹر نے باری باری دفتر میں موجود تمام افراد پر نظر ڈالی۔ سب خاموش رہے تو ہوم منسٹر نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ "جن زخمیوں کو لاک اپ کیا گیا ہے، ان کا کیا کہنا ہے؟"

"انہوں نے اقرار جرم کرلیا ہے سر، سرکاری وکیل اور میری موجودگی میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا پھانسی کا پھندا ان کے لیے زیادہ پرسکون موت ہوگی ورنہ ان کو خریدنے والے جس انجام سے دوچار کریں گے وہ پھانسی کے پھندے سے زیادہ اذیتناک ہوگا۔"

"مسٹر اورنگ زیب۔" ہوم منسٹر نے ایک بار پھر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ "آپ کی کارکردگی اور مرکز کی طرف سے جو رپورٹس میرے علم میں ہیں۔ ان کی روشنی میں، میں آپ سے ایک سوال کروں گا...... مرحوم مجسٹریٹ کی پراسرار موت کے سلسلے میں ہم پریس کو کیا جواب دیں گے؟"

"پریس کے قلم پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا سر...... وہ تفتیشی افسروں کی حتمی رائے معلوم کرنے کے باوجود زندوں کے مردہ ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ دیتے ہیں۔" اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "موجودہ حالات کی روشنی میں پولیس کو پریس سے زیادہ اپنی کارکردگی کا گراف بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں سر جوڑ کر کام کرنا ہوگا۔ دوسروں کے اختیارات میں دخل انداز ہونے والے ایسے افسران پر نظر رکھنی ہوگی جنہیں قانون کی پاسداری سے زیادہ اپنی عزت بچانے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔"

اورنگ زیب کی کھری گفتگو سن کر آئی جی اپنی نشست پر کسمسایا، ہوم منسٹر کی پلکیں بھی تیز تیز جھپکنے لگیں۔ اس نے کچھ توقف سے کہا۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ لیاقت حسین کے سلسلے میں مجسٹریٹ پر کس نے دباؤ ڈالا تھا؟"

"سوری سر...... میں اس ضمن میں زبان کھولنے سے قاصر ہوں۔ محض شبہے کی بنا پر کسی کے اجلے دامن پر کیچڑ اچھالنا میرے اصول کے خلاف ہے لیکن یہاں اکثر معاملات میں اوپر کی مداخلت ہمیں ایسے لوگوں کے سامنے بھی سر جھکانے پر مجبور کردیتی ہے جو انتہائی گھناؤنے کردار کے مالک ہوتے ہیں۔"

ہوم منسٹر کی نظریں اورنگ زیب کے چہرے پر منڈلاتی رہیں۔ اورنگ زیب کی کھری کھری باتوں نے خود سراج کو بھی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"مسٹر اورنگزیب......" ہوم منسٹر نے طویل خاموشی کے بعد نپے تلے لہجے میں زبان کھولی۔ "میں اس میٹنگ کے بعد آپ سے علیحدگی میں ملنا پسند کروں گا۔"

"میں آپ کے حکم سے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں سر لیکن میں علیحدگی میں بھی کچھ مصلحتوں کی بنا پر زبان نہیں کھول سکتا۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔"

آئی جی اور ڈی آئی جی کے علاوہ اورنگ زیب کا جواب سن کر خود ہوم منسٹر کے چہرے پر بھی اپنی کرسی کی اہمیت کا احساس نمایاں ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے مسکرا کر کہا۔

"آفیشل گفتگو نہ سہی لیکن آپ میرے ساتھ کچھ وقت گزاریں گے۔"

"ایز یو وش سر!"

"موجودہ کیس میں مجھے آپ کی ذاتی فائنڈنگس چوبیس گھنٹوں کے اندر درکار ہوگی۔" اس بار ہوم منسٹر نے ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔ "ٹاپ سیکریٹ اور کانفیڈینشل رپورٹ جو صرف میری ذات تک محدود رہے گی۔"

"رائٹ سر۔" ڈی آئی جی کے پاس انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"ایک بات اور بھی حیرت انگیز ہے۔" آئی جی نے دبی زبان میں کہا۔ "اگر فاضل مجسٹریٹ پر کسی نے دباؤ ڈالا تھا تو اسے کم از کم یہ بات اپنے افسران کو بتا دینی چاہیے تھی۔ خود مرنے والے نے اپنی بیوہ سے بھی کھل کر کچھ نہیں کہا۔"

"ایک اہم سوال اور بھی ہے۔" ہوم منسٹر نے کہا۔ "واردات کرنے والا اس قدر خاموشی سے آیا اور اپنا کام کرکے فرار ہوگیا کہ گھر میں موجود دو بیٹیوں اور بیٹے کو بھی کان و کان خبر نہ ہوسکی۔ مکان کا داخلی دروازہ بھی صبح اندر سے بند ہی ملا تھا۔ اس کے علاوہ گھر میں داخل ہونے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔"

"ماہر نقب لگانے والے کنکریٹ کی دیوار میں خلا پیدا کرنے میں بھی ماہر ہوتے ہیں سر۔" اورنگزیب نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "تالوں کو ایک مخصوص تار کے ذریعے بہ آسانی کھولا اور بند کیا جاسکتا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد میٹنگ برخاست ہوگئی تو اورنگزیب کے سوا تمام افسران واپس چلے گئے۔ سراج کو

باہر گاڑی میں بیٹھ کر اورنگزیب کا انتظار کرنا پڑا۔

اورنگزیب نے سب کی موجودگی میں ہوم منسٹر سے کھل کر جو باتیں کی تھیں اس کے بعد سراج ذاتی طور پر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی مخصوص پروگرام بھی ضرور ہوگا ورنہ برملا افسران کے بارے میں وہ ہمیشہ کھل کر بات کرنے سے پرہیز ہی کرنے کا عادی تھا۔ وہ مخصوص پروگرام کیا تھا؟ اس کے بارے میں سراج ذہنی جمناسٹک میں مشغول تھا جب بیس منٹ بعد اورنگزیب بھی آگیا۔

"ہوم منسٹر سے بند کمرے میں ملاقات کا تجربہ کیسا رہا؟" سراج نے راستے میں دریافت کیا۔

"خلاف توقع ماحول خوشگوار ہی رہا ورنہ تم شاید واقف نہیں ہو کہ ہوم منسٹر کے ذاتی تعلقات بھی مرکزی حکومت کے اہم ذمے داروں تک ہیں۔" اورنگزیب نے کہا۔ "میرے بارے میں ہوم منسٹر کو کرنل احتشام نے پہلے ہی بریفنگ کردی تھی اس لیے ملاقات خوشگوار ماحول ہی میں ہوئی۔"

"آج آپ نے میٹنگ کے دوران ذمے دار افسروں پر جو تنقید کی وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آسکی۔"

"اس لیے کہ تم صرف پولیس آفیسر ہو۔" اورنگزیب نے بے تکلفی سے کہا۔ "سانپ اور سیڑھی کا کھیل بچے بھی کھیل لیتے ہیں مگر جو ماہر ہوتے ہیں وہ پانسا پھینکنے میں بھی پوری مہارت رکھتے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم جونی کو کیوں بھول رہے ہو؟ اگر میں تمہیں قبل از وقت ٹھنڈا رہنے کی تاکید نہ کرتا تو کیا تم اسے برداشت کرسکتے تھے؟"

"جونی تو پہلے ہی سے بھیگی بلی بن کر میرے سامنے پیش ہوا تھا لیکن شیلا ورما......" سراج نے تلملا کر جواب دیا۔ "اگر آپ کا خیال نہ ہوتا تو شاید میں نتائج کی پروا کیے بغیر اسے بھون کر رکھ دیتا۔"

"اوہ...... گویا تم اس سے بھی ملاقات کرچکے ہو۔" اورنگزیب نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"آپ ہی کے اشارے پر ملنے گیا تھا۔" سراج نے بدستور الجھ کر کہا۔ "پارلر کی آڑ میں جو کاروبار ہو رہا ہے وہ آپ کے علم میں بھی ہے۔ ملاقات کے وقت وہ جس طرح اٹھلا اٹھلا کر مجھے اپنی اہمیت کا احساس دلا رہی تھی اسے میں نے کس طرح برداشت کیا؟ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔"

"اس کے اور قریب ہونے کی کوشش کرو۔"

اورنگزیب نے سنجیدگی سے کہا پھر فوراً ہی مسکرا کر بولا۔ "الماس کی فکر نہ کرنا...... میں اسے سمجھا دوں گا۔"

"آپ شیلا ورما کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟"

"وہ سیڑھی ہے سراج صاحب۔ اس سے گزر کر شاید ہم سانپ تک بھی پہنچ جائیں گے۔" اورنگزیب نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

"کیا مطلب......" سراج چونکا۔ "کیا آپ کے آکٹوپس کا کوئی سرا شیلا ورما سے بھی ملتا ہے؟"

"بلاواسطہ نہیں تو بالواسطہ اس کے امکانات بھی ہوسکتے ہیں۔"

"درمیان میں کوئی گنجائش سکندر علی شاہ کی بھی نکلتی ہوگی؟" سراج نے کریدنے کی کوشش کی۔

"اتنی جلدی کوئی آخری نتیجہ قائم کرنے کی کوشش مت کرو۔" اورنگزیب نے کہا۔ "حالات جس تیزی سے کروٹیں بدل رہے ہیں اس میں یہ بھی امکان ہے کہ شبنم اغوا ہوجائے۔"

"یہ شبنم اچانک درمیان میں کس طرح آگئی؟" سراج نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وشنو آکٹوپس کا اہم مہرہ تھا جسے افضل خان نے دوبارہ کرنل احتشام تک پہنچا دیا۔" اورنگزیب نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "ہوسکتا ہے کہ افضل خان کو قابو کرنے کے لیے شبنم کو ہدف بنایا جائے۔ میں ایک امکانی بات کر رہا ہوں مگر یہ طے ہے کہ آکٹوپس اینٹ کا جواب پتھر سے ضرور دے گا۔"

"کیا آپ مجھے کھل کر نہیں بتا سکتے کہ آپ کے ذہن میں کیا شبہات جنم لے رہے ہیں یا ہمیں کس راستے پر قدم بڑھانا ہے؟" سراج نے شکوہ کیا۔ "آپ کو کیا اب بھی میری ذات پر اعتماد......"

"ڈونٹ بی سنٹی مینٹل (Dont be Sentimental)" اورنگزیب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ "کچھ دنوں اور انتظار کرلو۔ ابھی میں بھی محض امکانات کو ترتیب دے رہا ہوں۔"

جواب میں سراج نے اورنگزیب کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھا پھر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا جب اورنگزیب نے اپنا موبائل آن کرلیا۔ "ہیلو......" اس نے مختصراً کہا۔

"منیجر بول رہا ہوں سر۔ ایک ضروری اطلاع دینی ہے۔"

"سن رہا ہوں۔"

"کچھ دنوں قبل ماروی نام کی ایک لڑکی فارم ہاؤس

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑ گئی تھی۔ اس کے دوسرے دن شاہ جی بھی وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے ملازموں کو ماروی کے بارے میں سخت سست کہا۔ تھا، سب ہی خائف تھے۔ میری اطلاع کے مطابق ماروی پر کسی ملازم نے ہاتھ صاف کر دیا تھا جس نے شاہ جی کا پارہ چڑھا دیا اس لیے......"

"فضول تفصیل نہیں۔" اورنگزیب نے اسے ٹوکا۔ "کام کی بات کیا ہے؟"

"شاہ جی کے آنے کے بعد رات کسی وقت فارم ہاؤس کے ایک چوکیدار نے خودکشی کرلی۔ اس نے ایک تحریر بھی چھوڑی تھی جس میں لڑکی کو بے آبرو کرنے کا اعتراف بھی تھا۔ چوکیدار کی خودکشی کی اطلاع پولیس کو نہیں دی گئی۔ اس کو خاموشی سے دفنا دیا گیا۔ اب فارم ہاؤس کے تمام ملازموں نے زبان پر تالے ڈال رکھے ہیں۔"

"کام کی کیا بات ہے اس میں؟"

"سر...... میرا خیال ہے کہ ماروی کے پاس کوئی نہ کوئی کام کی بات بھی ضرور ہوگی۔"

"سمجھ گیا۔" اورنگزیب نے اس بار سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "اس کا پتا ہے تمہارے پاس؟"

"جی سر......"

پھر دوسری جانب سے جو پتا بتایا گیا اسے ذہن میں محفوظ کرنے کے بعد اورنگزیب نے موبائل آف کر دیا۔

"کس کا فون تھا؟" سراج نے پوچھا۔

"تھا ایک مخبر۔ اس نے ایک کام کی اطلاع دی ہے۔ تم ایسا کرو مجھے کمرشل مارکیٹ کے قریب چھوڑ دو۔ باقی گفتگو رات کو ہوگی۔"

سراج نے محض شکایتی نظروں سے اورنگزیب کو دیکھا پھر اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد وہ دفتر چلا گیا۔

☆☆☆

سیٹھ عثمان جیل کسٹڈی سے لیاقت حسین کو لے کر سیدھے گھر ہی آئے تھے، راحیلہ بیگم دروازے پر موجود تھیں۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم باعزت طور پر رہائی پا کر واپس آگئے۔"

"یہ سب آپ لوگوں کی دعائیں ہیں بیگم صاحب۔" لیاقت حسین نے جواب دیا، اس کی نظریں فرحین کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں، راحیلہ بیگم نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

"فرحین ہوتی تو وہ بھی بہت خوش ہوتی۔ اندر آجاؤ، میں فون پر اسے اطلاع دیتی ہوں۔"

"وہ...... وہ کہاں چلی گئی؟" لیاقت حسین نے اندر آکر بیٹھتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔ سیٹھ عثمان بیوی کا مقصد سمجھ کر دروازے ہی سے سیدھے آفس چلے گئے تھے۔

"تم دونوں کے ساتھ پے در پے جو حادثات پیش آرہے تھے اس نے فرحین کو خوفزدہ کر دیا تھا، اب تمہارے نہ ہونے سے وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ یہاں رہتی تو اس کی طبیعت اور خراب ہو جاتی اس لیے میں نے اسے گاؤں بھیج دیا۔ وہ آخری وقت یہیں رکنے کی ضد کر رہی تھی۔" راحیلہ بیگم نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ "تم بیٹھو۔ میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔"

"مجھے اس وقت خواہش نہیں ہے بیگم صاحب۔" لیاقت حسین نے کہا، فرحین کے چلے جانے کا سن کر اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔

"پریشان مت ہو۔" راحیلہ بیگم نے کہا۔ "تم گھر جا کر نہا دھو کر تازہ دم ہو لو پھر ہفتہ دس دن کے لیے تم بھی فرحین کے پاس چلے جانا۔ عثمان کا بھی یہی مشورہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" لیاقت حسین دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کر دوسرے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں فرحین کا خیال مچل رہا تھا۔ انیکسی میں داخل ہو کر وہ سامنے بچھے پلنگ پر لیٹ گیا، آنکھیں بند کر کے فرحین کے تصور میں گم تھا جب یکلخت اسے خیال آیا کہ انیکسی کا دروازہ کیوں کھلا ہوا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو ایک آواز اس کے وجود کے سناٹوں میں گونجی۔

"تجھے کیا فرحین سے زیادہ کھلے دروازے کی فکر ہے۔"

لیاقت حسین کے دل کی دھڑکنیں ایک پل کو تھم گئیں، اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ فرحین اس کے سامنے کھڑی مجسم انتظار نظر آرہی تھی پھر اس نے لیاقت حسین کو پہل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا، خود ہی بھاگ کر اس کے کشادہ سینے میں سما گئی، جواب میں لیاقت حسین کے مردانہ بازوؤں کا شکنجہ بھی تنگ ہونے لگا۔ فرحین کو اچانک اس طرح سامنے دیکھ کر وہ بھی دیوانہ ہو گیا تھا، اسے خود اپنے پاگل پن پر ہنسی آگئی۔ حالات نے اتنا الجھا رکھا تھا کہ وہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ فرحین اس کو قید میں چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ راحیلہ بیگم نے جو کچھ کہا اس میں یقیناً فرحین کی شرارت کا بھی دخل رہا ہوگا۔ لیاقت حسین نے سرشاری کے عالم میں بازوؤں کا حلقہ مزید تنگ کیا تو فرحین کسمسا کر بولی۔

"میرا دم گھٹ رہا ہے لیاقت اور...... ادھر دروازے

کے سامنے بھی کوئی کھڑا ہے۔"

لیاقت حسین نے فرحین کو چھوڑ کر دروازے کی سمت دیکھا پھر فرحین کی ہنسی کی آواز سن کر ہی اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ فرحین نے بڑی خوبصورتی سے کھلے دروازے کا بہانہ کر کے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا تو فرحین اپنی جگہ کھڑی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لیاقت حسین قدم بڑھاتا اس کے قریب گیا تو فرحین بے اختیار اس کے سینے سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

"یہ...... یہ کیا ہو گیا تجھے؟" لیاقت حسین نے اس کو ہاتھوں میں سمیٹ کر اس کے چہرہ دیکھا جو آنسوؤں سے تر تھا۔ "اب کس بات پر رو رہی ہے؟"

"یہ خوشی کے آنسو ہیں لیاقت۔ تو نہیں سمجھے گا۔" خوشی اور غم کے ملے جلے احساس میں گندھی فرحین کی آواز اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھری۔ "اگر...... اگر خدانہ کرے تجھے سزا ہو جاتی تو میں زندہ نہ رہتی۔"

"پھر...... تیرے بنا میں کیا کرتا؟" لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

"تو۔ تو مرد ہے۔" فرحین نے منہ بنا کر کہا۔ "چالیسویں تک منہ بنائے رہتا پھر میری جگہ کسی دوسری کو لے آتا۔"

"اور اگر کبھی میں تجھ سے پہلے......"

"ایسی بات دوبارہ منہ سے نہ نکالنا لیاقت۔" فرحین جذباتی ہو کر دوبارہ شوہر سے لپٹ گئی۔ "تیری بات اور ہے لیکن عورت۔ اگر اس میں کھوٹ نہ ہو تو وہ ایک مرد کے بعد کسی دوسرے کا خیال کرنا بھی گناہ سمجھتی ہے۔"

لیاقت حسین فرحین کو بازوؤں میں بھر کر بستر پر لے آیا۔ اس کی پیشانی پر لہراتے بالوں کی ایک لٹ کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ "میں بھی تیرا دیوانہ تھا فرحین جو بابا کی حویلی چھوڑ کر ادھر آگیا تھا۔ صرف ماں کی دعائیں میرے ساتھ تھیں۔"

"جانتی ہوں اور...... آج اسی ماں کی قسم کھا کر تجھے ایک وعدہ بھی کرنا ہوگا۔"

"کیسا وعدہ؟" لیاقت اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔

"دوبارہ کبھی تو جذباتی ہو کر لوگوں پر گولیاں نہیں برسائے گا۔"

"وہ میرے دشمن تھے لیاقت کا جان...... اگر میں انہیں ڈھیل دیتا تو پھر وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑتے۔"

"اور اس دن تجھے کیا ہو گیا تھا جب تو نے ادھر بنگلے میں تین چار آدمیوں کو مار دیا تھا۔" اس بار فرحین نے لیاقت حسین کو چھیڑنے کی خاطر سوال کیا۔

"ہاں...... اس دن مجھ سے غلطی ہو گیا تھا۔" لیاقت حسین نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔ "وہ تجھے اٹھا کر لے جاتے تو میں چالیس روز تیرا غم منانے کے بعد دوسری......"

"مم...... میں تیرا خون کر دوں گی لیاقت۔" فرحین تڑپ اٹھی۔ "تو نے میری زندگی میں ایسا سوچا بھی کیوں؟"

"چل پھر کوئی اور بات کرتے ہیں۔" لیاقت حسین نے فرحین کو دوبارہ بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"تو...... تو ہمیشہ اپنی مرضی چلاتا ہے۔" فرحین نے دیدہ و دانستہ مزاحمت کی پھر وہ بھی لیاقت حسین کے وجود میں گم ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

پرتاب بھوشن کی نگاہیں قریب بیٹھی پجارن چکوری پر منڈلا رہی تھیں لیکن اس کے ذہن میں لیاقت حسین کا نام کسی کانٹے کی طرح رہ رہ کر چبھ رہا تھا۔

لیاقت حسین سے پہلے اسے کسی کام میں اتنے پاپڑ نہیں بیلنے پڑے تھے۔ وہ کالی کا کھرا پجاری تھا۔ دیوی کو راضی کرنے کی خاطر اس نے کئی جاپ کر رکھے تھے۔ اس نے پرتاب بھوشن کو سچا سیوک جان کر نراش بھی نہیں کیا۔ پرتاب نے جو چاہا وہ دیوی کی نادیدہ شکتی نے پورا کر دیا۔ اسی ایک وشواس نے پرتاب بھوشن کو قدآور کر رکھا تھا لیکن لیاقت حسین کسی ہڈی کی طرح اس کے گلے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ کوئی پرچھائیں تھی جو ہر بار لیاقت حسین کو اس کے جنتر منتر سے بچا لیتی تھی۔

مندر سے چلتے وقت وہ بڑے پجاری مدن چند سے بھی ملا تھا۔ مدن چند نے بھی آنکھیں بند کر کے بہت دیر اندھیروں میں کھوجنے کے بعد یہی کہا تھا کہ۔ "میرا کہا مانو تو تم اس مسئلے کا پیچھا چھوڑ دو۔ درگا دیوی نے یہی اشارہ دیا ہے کہ وہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو چھایا اس کی سہائتا کر رہی ہے تم اس کا توڑ نہیں کر پاؤ گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدھو پجارن کی طرح تم بھی کام آجاؤ۔"

لیاقت حسین کے تصور کے ساتھ مدن چند کے کہے ہوئے جملے بھی اس کے وجود میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے اس کے ساتھ ہی بیتی باتیں بھی یاد آرہی تھیں۔

"تم...... کس وچار میں گم ہو مہاراج۔" کمسن پجارن چکوری نے اس کی نگاہوں کی تپش سے بچنے کی خاطر پوچھا۔ "دو روز سے تم نے بھوجن بھی نہیں چکھا۔ کیول پانی پی کر دن بتا رہے ہو۔ بڑے پجاری نے کہا تھا کہ تمہاری

WWW.PAKSOCIETY.COM

شکتی اپرم پار ہے۔ پھر، تمہیں کیا پتا آن پڑی ہے؟''

''تیرا من اس ویرانے میں نہیں لگتا تو واپس پلٹ جا۔'' پرتاب بھوشن نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ''ہم زیادہ دور بھی نہیں آئے ہیں اور ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ایک بار فیصلہ کرلے۔''

''تم غلط سمجھے مہاراج۔'' چکوری نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا خیال رکھنے کے کارن ہی ساتھ آئی ہوں تو آدھے راستے سے کیسے پلٹ سکتی ہوں۔تم میری باتوں سے ناراض ہوتے ہو تو پھر زبان پر تالے بھی ڈال لوں گی۔''

''نہیں۔'' پرتاب نے اس کے گالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تیری باتیں مجھے بری نہیں لگتیں لیکن کسی پجاری کو گیان دھیان کرتے سمے اپنے من کو مارنا پڑتا ہے۔ابھی تو ان باتوں کو نہیں سمجھے گی۔''

''تمہارے ساتھ رہوں گی تو آہستہ آہستہ سمجھنے لگوں گی مہاراج۔تم نے بھی یہی کہا تھا کہ منش کو کچھ پانے کے کارن کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔''

''میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا...... تو میری سیوا کرتی رہی تو تجھے بھی کندن بنادوں گا۔''

''میں دیوی درشن کی بھی پیاسی ہوں مہاراج۔'' چکوری نے معصومیت سے پرتاب کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر کہا۔ ''ایک بار مجھے بھی دیوی کے درشن کرادو۔ پھر سارا جیون تمہارے چرنوں میں بتادوں گی۔''

''دھیرج رکھ میری بلبل!'' پرتاب بھوشن نے اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر کہا۔ ''دیوی درشن کے علاوہ اور بھی بہت سی گر کی باتیں تجھے سکھادوں گا۔ پر ایک بات دھیان میں رکھنا، اگر تو نے کبھی میرے ساتھ دھوکا کیا تو......''

''میں وچن دیتی ہوں مہاراج۔'' چکوری نے اس بار بھی معصومیت سے جواب دیا۔ ''تمہارے چرنوں کی دھول بن کر رہوں گی۔ من میلا ہوتا تو پھر تمہارا ہاتھ کیوں تھامتی۔ ادھر مندر میں بہت سارے ہٹے کٹے پجاری تھے جو مجھے دانہ ڈالنے کی آس لگائے بیٹھے تھے، میں اگر ہونٹوں پر مسکان سجالیتی تو سب میرے چرنوں میں لوٹ پوٹ ہوجاتے۔''

پرتاب بھوشن اس کا جواب سن کر چونکا۔ اس نے چکوری کو کھنگالنے کی خاطر سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ ''مدن چند نے بھی تجھے دانہ ڈالنے کی کوشش کی تھی؟''

''چھوڑو مہاراج۔ اب میں تمہارے ساتھ آگئی تو بیتی باتوں کو کھوجنے سے کیا فائدہ؟''

''کھیلی کودی جان پڑتی ہے؟'' پرتاب بھوشن نے اس کے شانوں پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا تو چکوری نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو مہاراج؟ کیا تمہیں بھی کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں۔ چھیڑنے اور آنکھیں سینکنے کی بات اور ہے لیکن سب سے پہلے تم ہی نے میرے شریر کو ہاتھ لگایا ہے۔''

''تیری طرح تیری باتیں بھی سوندھی سوندھی لگتی ہیں۔'' پرتاب بھوشن نے اس کو پوری طرح دبوچ کر کہا۔ ''میں تیری زبان سے سننا چاہتا تھا۔ تو کیا ہے، میرے سوا اور کون جان سکتا ہے۔ تیری سیوا کے بدلے میں بھی تجھے بہت کچھ دان کردوں گا۔''

''تم ایسے ہی ہنستے بولتے رہا کرو مہاراج۔ اپنے دھیانوں میں گم ہوجاتے ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''ابھی تو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکے گی۔'' پرتاب بھوشن کے ذہن میں پھر لیاقت حسین کا تصور کلبلایا تو اس نے چکوری سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''دیوی کو راضی کرنے کے کارن مجھے منڈل میں بیٹھ کر جنتر منتر پڑھنے ہوتے ہیں تو دیوی کے سوا کوئی اور سامنے نہیں ہوتا۔ پجاری کا دھیان ایک ذرا ڈگمگا جائے تو پھر دیوی بھی نظریں پھیر لیتی ہے۔''

''مدن چند نے تو کہا تھا کہ تم مہان شکتی کے مالک ہو پھر...... اب کیا پتا آن پڑی ہے جو تم پھر دھونی رما کر بیٹھنے کا سوچ رہے ہو؟''

''ہے ایک پاپی جو بار بار میرا راستہ کاٹ دیتا ہے۔ اسے قابو کرنے کے کارن مجھے ایک بار پھر دیوی کا آشیرواد لینا ہوگا۔'' پرتاب بھوشن نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''اسے نشٹ کردوں تو پھر چین سے بیٹھوں گا۔''

''کون ہے وہ...... مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''ہے ایک مُسلا......'' پرتاب بھوشن بل کھا کر بولا۔ ''اس نے میرے ایک منتر کا انجانے میں توڑ کردیا تھا۔ مجھے وشواس تھا کہ دیوی کی کرپا سے میں نے اسے پھونک بھی ماری تو وہ جل بھن کر راکھ ہوجائے گا پرنتو ایسا نہیں ہوا۔ ہے کوئی چھایا جو بار بار اس کے آڑے آجاتی ہے۔ میں نے سوگند اٹھائی ہے کہ جب تک اسے نیچا نہ دکھادوں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

''کیا میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتی؟'' چکوری نے سوالیہ نظروں سے پرتاب بھوشن کو دیکھا۔

''نہیں......'' پرتاب بھوشن کے ذہن میں

مدھو پجارن کے جل کر راکھ ہونے کا دھیان ابھرا تو اس کے اندر سانپ لوٹنے لگے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ''وہ تیرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مُسلا ہے اس لیے کسی ناری کا جادو بھی اس پر نہیں چلتا۔''

''مجھے ایک موقع تو دو مہاراج۔ تمہارے اشارے پر میں کسی بات سے انکار نہیں کروں گی۔''

''زیادہ چنتا مت کر!'' پرتاب بھوشن نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔ ''مجھے کسی شبھ گھڑی کا انتظار ہے۔ وہ نظر آجائے تو میں پھر دیوی کے جاپ میں مگن ہوجاؤں گا۔ اس بات کا وشواس بھی ہے کہ دیوی مجھے نراش نہیں کرے گی۔''

''میں بھی تمہاری کامیابی کے لیے بھگوان سے یہی پرارتھنا کروں گی۔''

پرتاب بھوشن نے چکوری کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اس کی نظریں پھر چکوری کے خدوخال پر بھوکے گدھ کی طرح منڈلانے لگیں۔ وہ لیاقت حسین کے تصور سے وقتی طور پر نجات حاصل کرکے کمسن پجارن کے کندن جیسے دمکتے شریر سے چھیڑخانی پر غور کررہا تھا لیکن وہ پوری طرح مائل نہ ہوسکا۔

لیاقت حسین کا خیال کسی کن کھجورے کی طرح اس کے وجود میں ڈنک مارتا رہا۔

✎ ✎ ✎

دارا رستم علی اس وقت ٹینس کھیلنے میں مگن تھا۔ روشا میجر عاطف اور کلب کے دوسرے ممبروں کے ساتھ لان میں ایک میز پر بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ اس کی نظریں بار بار شوہر کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

''تم اس وقت شاید پوری طرح ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو۔'' روشا کی دوست مسز خانزادہ نے اسے چھیڑا۔

''میں تمہاری بات سے انکار نہیں کروں گی۔'' روشانے شوخی سے جواب دیا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں جرمن ہوں اور جرمن خاتون کے لیے ایک عام کہاوت مشہور ہے کہ وہ دنیا کی تمام خواتین سے زیادہ بہتر بیوی ثابت ہوتی ہے۔''

''یہ بات میں پہلے بھی تمہاری زبان سے سن چکی ہوں لیکن یہ جرمنی نہیں ہے۔''

''جانتی ہوں لیکن فطرت مقامات کی تبدیلی سے بھی نہیں بدلتی۔'' روشا کا جواب سن کر مسز خانزادہ لاجواب ہوگئی۔

''موسم کے اعتبار سے اگر اس وقت کولڈ کافی منگالی جائے تو......''

''ایسی باتیں پوچھنے کے بجائے نیکی کما لینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' میز پر موجود ایک ممبر نے بے تکلفی سے میجر عاطف کا جملہ اچک لیا۔

''روشا سے اور دریافت کرلیں۔'' مسز خانزادہ نے مسکرا کر کہا۔ ''جرمن خاتون کیا دارا کے بغیر کافی پی لیں گی؟''

میز پر موجود سب افراد مسکرادیے پھر کافی پینے کے دوران میں میجر عاطف نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''میرا خیال ہے آج میچ کا فیصلہ مکمل پانچ سیٹ کے بعد ہی ہوسکے گا۔''

''جیتے گا کون؟''

''شہزادو......'' مسز شہزادو نے روشا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''جیت اور ہار کھیل کا حصہ ہوتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔'' روشانے بے تکلفی سے ایک خوبصورت جواب دیا۔ ''جو ہارنے سے کتراتے ہیں وہ جیت کر بھی مطمئن نہیں ہوتے۔''

''میرا خیال ہے کہ آج روشا سے جیتنا مشکل ہے اس لیے شوہروں کا موضوع چھوڑ کر کوئی اور بات کی جائے۔'' میجر عاطف نے کہا تو سب ہی مسکرادیے پھر وہ کافی کے دوران ہنس بول رہے تھے جب روشا کے موبائل پر سگنل موصول ہوئے۔

''ہیلو......'' اس نے موبائل آن کرکے نرم لہجے میں کہا۔ روشن اسکرین پر نظر آنے والا نمبر رستم علی آغا خانی کی لیڈی سیکریٹری کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔

''مسٹر دارا اس وقت کہاں ہیں؟''

''ٹینس کھیل رہے ہیں۔ تم ہولڈ کرو، میں......''

''نہیں......'' دوسری جانب سے بات کاٹ کر کہا گیا۔ ''آپ مسٹر دارا کو اطلاع دیے بغیر ہی گھر آجائیں...... باس نے مجھے یہی ہدایت دی ہے۔''

''کوئی خاص بات!'' روشانے سنجیدگی سے سوال کیا۔ ''سب خیریت تو ہے؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن باس آپ دونوں کو علیحدہ علیحدہ کوئی سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔ ڈرائیور اور گاڑی کلب کے باہر موجود ہے آپ کے لیے بس یہی پیغام ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' روشانے موبائل آف کردیا۔ اس کے ذہن میں سرپرائز کے حوالے سے کئی خیالات ابھرے پھر اس نے ذہن پر زیادہ زور بھی نہیں دیا۔ جانے کے ارادے سے اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا تو میجر عاطف نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پوچھا۔ ''اچانک کہاں جارہی ہیں۔ کس کی کال تھی؟''
''قادران لا کی سیکریٹری کی۔ مجھے فوری گھر بلایا ہے، کوئی سرپرائز ہے ہم دونوں کے لیے لیکن علیحدہ علیحدہ۔'' روشانے مسکرا کر جواب دیا۔ ''باہر گاڑی بھی موجود ہے۔ دارا کا میچ ختم ہو تو اسے بھی بتادیں۔''
''میں چلوں آپ کے ساتھ؟'' میجر عاطف نے پیشکش کی۔ ''چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔''
''میں دارا کی گاڑی نہیں لے جارہی۔'' روشانے وضاحت کی۔ ''قادران لا نے گاڑی اور ڈرائیور بھی بھیجا ہے۔''
روشا کلب سے باہر نکلی تو اسے رستم علی آغا خانی کے دفتر میں استعمال کی جانے والی گاڑی بھی نظر آگئی۔ ڈرائیور نے روشا کو دیکھتے ہی نیچے اتر کر سلام کیا۔ وہ قدم بڑھاتی گاڑی کے قریب گئی۔ ایک پل کے لیے اسے ڈرائیور کی ایک معمولی سی غفلت کا احساس تو ضرور ہوا تھا، اس نے صرف سلام پر اکتفا کیا تھا، پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنا بھول گیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی سُتا سُتا نظر آرہا تھا۔ ''ممکن ہے کام کی زیادتی کا سبب ہو۔'' روشانے دل ہی دل میں خیال کیا پھر دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہی اسے ڈرائیور کی غفلت اور چہرے پر نظر آنے والی تھکن کا سبب بھی اس وقت معلوم ہوا جب وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ واپس نیچے اتر سکتی۔
اس کے نشست پر بیٹھتے ہی دوسری جانب کا دروازہ کھول کر ایک شخص بڑی پھرتی سے اندر آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ ''شور مچانے یا کسی حماقت کا سوچنا بھی مت ورنہ میں تمہیں اوپر پارسل کرنے میں ہچکچاؤں گا نہیں۔'' بولنے والا جو کچھ کہہ رہا تھا وہ کر گزرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ اس کے لب و لہجے سے بھی سفاکی ٹپک رہی تھی۔
روشا کے کوئی جواب دینے سے پیشتر ایک اور نووارد ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی روشا کو جن نظروں سے گھورا تھا اس میں کسی شرافت کے آثار دور دور تک موجود نہیں تھے۔ ڈرائیور کو شاید وہ پہلے ہی کوئی موثر ڈوز دے چکے تھے۔ وہ اگلی نشست پر بیٹھنے والے کے بعد ہی بڑی تیزی سے گاڑی گھماتا ہوا باہر سڑک پر آگیا۔
''تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' روشانے سچویشن کو پوری طرح سمجھنے کے بعد برابر بیٹھے شخص کی طرف دیکھا۔
''کچھ بھی نہیں۔'' وہ شانے اچکا کر بولا۔ ''صرف اتنا تعاون درکار ہے کہ تم چپ چاپ بیٹھی رہو۔ ہمیں تم کو ایک مخصوص جگہ تک زندہ سلامت پہنچانے کا کام سونپا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ جانیں اور ان کا کام۔''
روشانے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ خاموش بیٹھی خود کو آنے والے حالات سے مقابلے کے لیے تیار کرتی رہی مگر اتنا سمجھ گئی تھی کہ جن لوگوں نے رستم علی آغا خانی کی لیڈی سیکریٹری اور ڈرائیور کو پوری طرح اپنے اشاروں پر چلنے کی خاطر مجبور کردیا تھا وہ اس کے ساتھ کسی ڈنر پر بیٹھے انتظار نہیں کررہے ہوں گے۔ یہ بات بھی زیرِ غور تھی کہ اس کی آنکھوں پر کوئی پٹی بھی نہیں باندھی گئی تھی۔ وہ جن راستوں سے گزر رہی تھی ان کو پوری توجہ سے ذہن نشین کررہی تھی۔ بعد میں اس کی نشاندہی بھی پولیس کو کرسکتی تھی پھر اس وقت اسے مزید تعجب ہوا جب گاڑی سول لائنز ایریا کے ایک ایسے بنگلے کے احاطے میں روکی گئی جس کے باہر پولیس کے ریٹائرڈ ڈی آئی جی علیم احمد کے نام کی تختی لگی تھی۔
گاڑی سے اتار کر روشا کو خوبصورت بنگلے کے ایک بیڈ روم تک پہنچا دیا گیا۔ جو دو افراد اسے لے کر آئے تھے وہ باہر ہی سے رخصت کردیے گئے۔ ان کی جگہ دو اور آدمیوں نے لے لی تھی۔ صورت شکل سے وہ بہ ظاہر مہذب ہی نظر آرہے تھے۔ بیڈ روم میں پہنچ کر روشانے ایک بار پھر حالات کا جائزہ لیا۔ ریٹائرڈ آئی جی علیم احمد کے بارے میں اس کی معلومات زیادہ نہیں تھیں لیکن اتنا ضرور سن رکھا تھا کہ وہ ایماندار اور نڈر آفیسر ہونے کے علاوہ مذہبی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔
خوابگاہ میں اس وقت روشا کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ دونوں افراد اسے وہاں پہنچا کر دروازہ باہر سے بند کرکے چلے گئے تھے۔ اچانک روشا کو اپنے موبائل کا خیال آیا۔ ابھی تک کسی نے اس کی جامہ تلاشی نہیں لی تھی، ایسی صورت میں اس کے وجود میں امید کی ایک کرن پھوٹی، وہ کم از کم دارا کو حالات سے مختصراً آگاہ کرسکتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی روشانے اپنا موبائل نکالا لیکن پھر اس کے ارادوں پر اوس پڑ گئی۔ کسی کی کرخت آواز اس کے کانوں کے عقب سے ابھری۔ ''ایسی کوئی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا جو تمہاری موت کا سبب بن جائے۔''
روشانے پلٹ کر دیکھا۔ وہ درمیانہ قد اور ادھیڑ عمر کا شخص تھا لیکن قابلِ رشک صحت کا مالک بھی تھا، اس کی آنکھوں کی چمک کسی زہریلے ناگ سے زیادہ خطرناک لگ رہی تھی۔ جسم پر بہ ظاہر ایک لائٹ براؤن کلر کا لمبا نائٹ گاؤن ہی نظر آرہا تھا۔
''کون ہو تم اور...... مجھے یہاں کس مقصد سے لایا گیا

ہے؟'' روشانے بے جگری سے سوال کیا۔
''باسٹرڈ رستم علی آغا خانی کی سیکریٹری نے تم سے یہی کہا تھا کہ تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' جواب زہریلے انداز میں دیا گیا۔ ''رہا میرا نام تو پولیس کے شکاری کتوں نے میرے بہت سے نام رکھ لیے ہیں۔ آکٹوپس، کاکروچ، کوبرا، شکرہ وغیرہ۔''
''تت...... تت...... تم شیخ حامد ہو؟'' روشا کے سر سے پاؤں تک خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ ایک لمحے میں اس کا سارا سکون اور خود اعتمادی کا عزم ریزہ ریزہ ہوگیا۔ وہ پھٹی پھٹی خوفزدہ نظروں سے اسے گھورنے لگی۔
''گھبراؤ مت......'' سامنے کھڑے شخص نے عجیب انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''تم یہاں کیوں لائی گئی ہو صرف اس ایک بات کو ذہن نشین کرلو۔ میں نے تمہارے باسٹرڈ قادر ان لا کی چھت کے نیچے اس کی بلیو پرنٹ تیار کرائی تھی۔ یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ وہ ہمیشہ پالتو کتوں کی طرح دم ہلاتا رہے گا۔ تمہاری ملازمہ گلابو نے میرے آدمیوں کی رہنمائی کی تھی لیکن...... رستم علی نے میری بات نہیں مانی۔ میں نے اسے ایک موقع اور دے کر حکم دیا تھا کہ وہ ایس پی اورنگزیب سے دور رہے۔ ایک لفافہ بھی تھا جس میں اس کے بیڈ روم کی کچھ تصویریں تھیں۔ تمہارے باسٹرڈ قادران لا نے میجر عاطف کو اعتماد میں لے کر میری وارننگ کا پیغام اورنگزیب تک پہنچا دیا اور اب...... اب شاید دارا خود تمہاری ویسی ہی بلیو پرنٹ دیکھ کر خودکشی کرلے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی میجر عاطف کا کمزور سہارا تلاش کرے۔'' وہ ایک لمحہ توقف کے بعد روشا کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے انتہائی بے پروائی سے بولا۔ ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم دونوں سوسائڈ کرلو۔ دوسری صورت میں مجھے ایک موقع پھر تمہارے باسٹرڈ قادران لا کو دینا پڑے گا۔''
''تم میرے سلسلے میں کامیاب نہیں ہوسکو گے۔'' روشانے بکھرے ہوئے ذہن اور اعتماد کو کسی قدر سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''میں مرجاؤں گی لیکن تمہیں قریب نہیں آنے دوں گی۔''
''یہی جملہ لیڈی سیکریٹری نے بھی کہا تھا لیکن اب وہ بھی ہمارے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوگئی ہے۔''
روشا جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کمرے میں موجود شخص نے تالی بجائی۔ اس کے بعد دو مرد اور ایک عورت سامنے آگئے۔ دونوں مرد روشا کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے، عورت جس نے اپنا ہاتھ پشت پر کر رکھا تھا

یاد رکھنے والی باتیں

✂ جس نے نماز ترک کی، وہ جنت کا راستہ بھول گیا۔
✂ جو اذان سن کے بے پروا ہوجاتا ہے، نماز کی ادائیگی کے لیے روانہ نہیں ہوتا۔ دوزخ میں اس کی چیخ پکار پر اللہ بھی بے پروا ہوجائے گا کیونکہ وہ بے پروا، بے نیاز ہے۔
✂ جس طرح ہم نمک کو چینی نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح بے نمازی کو مسلمان کہنا بھی غلط ہے۔
✂ مومن اور کافر کے درمیان نماز فرق ہے۔
✂ پانچ نمازوں کے بدلے میں پچاس نمازوں کا ثواب ملتا ہے، جس نے پانچ نمازیں ترک کیں، گویا پچاس نمازوں کا ثواب گنوادیا۔
✂ انسان، انسان کو تحفہ دے تو وہ خوش ہوتا ہے، معراج کی رات کا یہ تحفہ پاکر انسان خوش نہ ہو تو اس کی بدذوقی کی انتہا نہیں۔
✂ بے نمازی مسلمان اور غیر مذہب میں کیا فرق ہوا جو دونوں جہنم میں جائیں گے۔
✂ قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔
✂ بے نمازی کی قبر دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بن جاتی ہے۔ اب بے نمازی کو خود وقت کا اندازہ لگالینا چاہیے کہ جب اسے لحد میں بند کردیا جائے گا تو وہ حشر کے دن تک جلتا رہے گا۔ پھر اسے لحد سے نکال کے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ کیا فائدہ ایسی سستی کا کہ ہم نماز ترک کرکے ایک بڑے عذاب میں مبتلا ہوجائیں۔
✂ بے نمازی کے دو بڑے نقصان ہیں۔ ایک تو وہ جنت سے محروم ہوا۔ دوسرا اسے دوزخ ملی۔
✂ ہندو کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ ہندو کے گھر میں پیدا ہوا۔ پھر بھی باقاعدگی سے وہ مندر جاتا ہے۔ مسلمان کی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا۔ بدنصیبی یہ ہے کہ مسلمان ہوکر مسجد سے دور رہتا ہے۔
✂ عقلمند وہ ہے جو اس چند روزہ زندگی پر آخرت کی ہمیشہ والی زندگی کو ترجیح دے۔ بے وقوف وہ ہے جو آخرت کی خوش کن زندگی پر اس چند روزہ زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔
✂ حشر کے میدان میں انسان ہی انسان ہوں گے۔ کوئی جانور نہ ہوگا کیونکہ حساب انسانوں کا ہونا ہے، جانوروں کا نہیں۔

مرسلہ: بشیر احمد بھٹی، بہاول پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

عقب میں چلی گئی۔ گاؤن میں ملبوس شخص نے روشنا سے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''تم نے ابھی تک شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔ میں بتاتا ہوں، یہ خوبصورت کوٹھی ریٹائرڈ ڈی آئی جی علیم احمد کی ہے۔ وہ بھی بکنے اور سر جھکانے کا عادی نہیں تھا۔ جب تک ڈیوٹی پر رہا اس کی گردن کڑی کمان کی طرح اکڑی رہی۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی اس کے تیور نہیں بدلے مگر اب...... اب اس کی لاش اسٹور روم میں پڑی ہے۔ صبح پولیس کے ماہرین بھی نہیں جان سکیں گے کہ اس نے خودکشی کیوں کی؟ مرنے کے لیے بیڈروم کے بجائے اسٹور روم کا انتخاب کیوں کیا؟''

روشنا کے اندر خوف کا احساس سر اٹھانے لگا۔ اس نے دوبارہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ اس قدر اچانک اور برق رفتاری سے ہوا کہ اسے بچاؤ کا موقع بھی نہ ملا۔ دائیں بائیں کھڑے آدمیوں نے بڑی تیزی سے اس کے ہاتھ جکڑ لیے تھے پھر پشت پر سے اپنی گردن کے جوڑ میں کسی سوئی کی چبھن کا احساس ہوا۔ اس کے بعد وہ بہ مشکل دو منٹ تک زور آزمائی کرنے کے بعد اس طرح پرسکون ہوگئی جیسے دشمنوں کے درمیان نہیں، دوستوں کے بیچ موجود ہو۔ ڈریسنگ گاؤن والے کے اشارے پر وہ تینوں خاموشی سے دوبارہ کمرے سے چلے گئے۔

''ہم تمہارے دوست ہیں روشنا۔'' ڈریسنگ گاؤن والے نے اس کے قریب آکر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''مل بانٹ کر کھانا میری پرانی عادت ہے۔ اچھا شکاری وہی ہے جو شکار کا کچھ حصہ اپنے شکاری کتوں کے آگے بھی ڈال دے۔''

''کک...... کک...... کیا...... آ آ'' روشنا نے ڈوبتے ذہن کو سنبھالتے ہوئے خوابیدہ سے لہجے میں کہا۔ ''تت...... تم کک...... کیا...... بک...... بک...... سس...... سس......''

''آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں اپنی بانہوں میں لے کر سلا دوں۔'' ڈریسنگ گاؤن والے نے روشنا کو اپنی مضبوط بانہوں میں لے لیا۔ پھر بیڈ تک پہنچتے پہنچتے روشنا شعوری طور پر بھی خوابوں کی دنیا میں گم ہو کر رہ گئی۔ اسے اپنا ادھورا جملہ مکمل کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔

⁂

تھریسا اس وقت بھی گھٹی گھٹی محسوس ہو رہی تھی جب میڈم نے دوپہر کے کھانے کے بعد اسے اپنی خواب گاہ میں بلایا تھا، اغوا اور رہائی کے بعد سے اس کے اعصاب ابھی تک پوری طرح اپنی ڈگر پر نہیں آسکے تھے۔ ایک ہی جھٹکے نے اس کی خوداعتمادی کو بڑی شدید ٹھیس پہنچائی تھی۔

میڈم روبی نے حسب دستور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی پھر سنجیدگی سے کہا۔

''لوچن کی طرف سے ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی؟''

''پولیس کے اعلیٰ دماغ بھی وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔'' تھریسا نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ابھی تک وہ بھی چور اور سپاہی والا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ہنی مون بیوٹی پارلر پر حملہ کیا گیا وہ بھی پولیس والوں کے لیے دردسر بن رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میڈم نے چونک کر وضاحت چاہی ''شیلا ورما کے پارلر کا ذکر درمیان میں کیسے آگیا؟''

''لوچن سے میں نے کل اس بات کا تقاضا کیا تھا کہ وہ ہمارے مطلوبہ آدمی کو جلد از جلد ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے۔ اسی نے جواب میں شیلا ورما کا حوالہ بھی دیا تھا۔ اس بات کا شبہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ سکندر علی شاہ اس کا آلۂ کار ہو جس کی ہمیں تلاش ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔ سکندر علی شاہ اور شیخ حامد کے درمیان کیا تعلق ہوسکتا ہے؟''

''میں نے بھی لوچن سے یہی سوال کیا تھا۔ جواب میں اس نے ایک ہی جواز پیش کیا...... بڑے اور دوراندیش مجرم ہمیشہ ایسے آدمیوں کو ٹریس کرتے ہیں، پولیس جن پر آسانی سے ہاتھ نہ ڈال سکے۔'' تھریسا نے کسمسا کر بات جاری رکھی۔ ''سکندر علی شاہ کو جہاں شہر کے معززین میں شمار کیا جاتا ہے کچھ لوگ نگینہ کے سلسلے میں اس پر انگلیاں بھی اٹھاتے ہیں جو شادی سے قبل جمیلہ کی حیثیت سے جھونپڑیوں میں پلی بڑھی تھی۔ اب محلوں میں عیش کر رہی ہے۔''

''لوچن کا نگینہ یا جمیلہ کی ذات سے کیا تعلق ہے؟'' میڈم نے الجھ کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔''

''ہوسکتا ہے لیکن یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ لوچن نے معاہدہ بڑھانے سے انکار کرتے وقت اس بات کا عہد بھی کیا تھا کہ جب تک وہ ہمارے مطلوبہ آدمی کو قبر تک نہیں پہنچا دیتا۔ سکون سے نہیں بیٹھے گا۔'' تھریسا نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے دو ساتھی بھی شیخ حامد ہی کے شکاری کتوں نے ہلاک کیے تھے۔''

''یہ سب سوچنا ہمارا دردسر نہیں ہے۔'' میڈم نے بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔ ''اس بات کو بھی ذہن میں رکھو کہ معاہدے کی مدت ختم ہو جانے کے بعد وہ ہمارے حکم کا پابند نہیں رہے گا۔''

''آئی۔ سی'' تھریسا نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ ''میں لوچن کو دوبارہ کال کرتی ہوں۔''

کال ملانے کے ساتھ ہی اس نے موبائل کا لاؤڈ اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔ دوسری جانب سے کال ریسیو ہونے کے بعد تھریسا کا لب و لہجہ بھی حسب سابق حیرت انگیز طور پر بدل گیا۔

''تم نے سکندر علی شاہ کا ریفرنس دینے کے بعد اب کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ کل ہمارے درمیان......''

''مجھے سب یاد ہے لیکن میں بھی تمہاری طرح اپنے اصولوں کی پابند ہوں۔'' تھریسا نے بات کاٹ کر گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''معاہدہ ختم ہونے کے بعد میں تمہارے کنٹیکٹ نمبر بھی اپنے پاس رکھنا گوارا نہیں کروں گی۔''

''اسی ریفرنس سے ایک بات میری بھی سن لیں۔'' جواب میں لوچن کی آواز ابھری ''ہاشم اور ڈوما سے بھی میرا کوئی بلڈ ریلیشن نہیں تھا، پہلی بار ایک دوسرے سے ہمارا تعارف بھی حسب ذیل ہوا تھا۔ ہم پیشہ ہونے کے اعتبار سے ہمارے درمیان ایک دوسرے سے ایک تعلق بھی قائم ہوگیا تھا۔ اب وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کل میری غفلت میں چلائی گئی ایک اندھی گولی میرے وجود کو بھی ختم کرسکتی ہے۔ ایسی صورت میں اپنے ساتھیوں کا انتقام لیے بغیر میں بھی یہاں سے جانا پسند نہیں کروں گا۔ معاہدے کی رقم سے زیادہ مجھے بھی اپنے اصولوں پر قدم اٹھانا لازم ہے۔''

''گڈ......'' تھریسا نے اسے سراہا پھر نرم لہجے میں بولی۔ ''میں نے بھی تم لوگوں کی خدمات کچھ سمجھ کر ہی حاصل کی تھیں۔ اس وقت کال کا مقصد یہی دریافت کرنا تھا کہ اصل آدمی کے انڈر گراؤنڈ ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے تم کون سا شارٹ کٹ اختیار کرو گے؟''

''میرے تجربے نے فی الحال دو کو فوکس (Focus) کیا ہے۔ نمبر ون سکندر علی شاہ۔ نمبر ٹو ڈرٹی شیلا ورما۔'' سنجیدگی سے جواب ملا۔ ''پارلر کے ہنگامے نے ایک کو ٹارگٹ کرلیا۔ وہ بھی کوئی دل جلا ہوگا۔ اب سکندر علی شاہ کو چھیڑنا بھی ضروری ہے۔ زخمی ہونے کے بعد جنگلی جانور بھی اپنے شیلٹر (Shelter) کی طرف جاتا ہے۔ اگر سکندر علی شاہ کا تعلق بھی موسٹ وانٹڈ (Most Wanted) سے ہوا تو مصری شکل بھی آسان ہو جائے گی۔''

مہکتی کلیاں

☆ پیسا کہتا ہے، مجھے حاصل کرو اور سب کو بھلا دو، وقت کہتا ہے، میرے پیچھے چلو باقی سب کو چھوڑ دو، مستقبل کہتا ہے میرے لیے کوشش کرو باقی سب کو بھلا دو لیکن میرا اللہ تعالیٰ صرف اتنا کہتا ہے کہ مجھے یاد کرو میں سب کچھ تیرے قدموں میں ڈال دوں گا۔

☆ عروج اور زوال زندگی کا حصہ ہیں کیونکہ جب آپ عروج پر ہوتے ہیں تو آپ کے دوستوں کو پتا چلتا ہے اور جب آپ زوال پر ہوتے ہیں تو آپ کو پتا چلتا ہے کہ آپ کے دوست کون ہیں؟

☆ زندگی کے حسین لمحات واپس نہیں آتے لیکن اچھے لوگوں سے تعلقات اور ان سے وابستہ اچھی یادیں ہمیشہ ہمارے دل میں زندہ رہتی ہیں۔

☆ کوئی پیار کرنے والا اگر دکھ دے اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آجائیں تو اس یقین کے ساتھ آنسو صاف کرلینا کہ اس پل میں وہ تم سے کہیں زیادہ رویا ہوگا۔

☆ کسی سے روز مل کے باتیں کرنا دوستی نہیں بلکہ کسی سے بچھڑ کر یاد رکھنا دوستی ہے۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل بہاولپور

''تم نے کل نگینہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ اسے کس خانے میں فٹ کرو گے؟''

''وہ بھی ایک اہم کڑی ہے۔ سکندر علی شاہ چاہتا تو دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی ٹشو پیپر کی طرح ہاتھ صاف کرنے کے بعد ڈسٹ بن میں ڈال دیتا۔ شادی کرنے پر ممکن ہے اسے کسی خاص مجبوری کی وجہ سے آمادہ ہونا پڑا ہو۔''

''یو آر رائٹ!'' تھریسا نے بہ دستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اگر ضرورت محسوس کرو تو تم ایس پی اورنگزیب سے بھی میرا حوالہ دے کر مدد لے سکتے ہو۔''

''وہ ایک کھرا پولیس آفیسر ہے لیکن...... پولیس والوں کے ساتھ دوستی بڑھانا ہمارے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کے اصول کے خلاف ہے۔''

''ایز یو وش......'' تھریسا نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا تو میڈم نے کچھ سوچ کر کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''سمندر کی کوئی لہر سر کے اوپر کچھ دیر مسلط رہے تو اچھے اچھے پیراک بھی بوکھلا جاتے ہیں لیکن ان کا حوصلہ کبھی پست نہیں ہوتا۔ اچھا تیراک وہی ہے جو لہروں کے منہ زور تھپیڑوں کو برداشت کر کے ساحل تک پہنچنے کی کوشش سے باز نہیں آتا۔ بیچ منجدھار میں حوصلہ ہار دینے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کل جو تمہارے ساتھ ہوا وہ...... اس سے پہلے میرے اوپر بھی گزر چکا ہے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔''

تھریسا نے میڈم روبی کے جملے میں چھپے ہمدردی اور اپنایت کے جذبوں کو محسوس کیا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر بے اختیار اس کے گلے لگ گئی۔

⁂

اورنگزیب دو گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا تھا۔ خلاف توقع وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں غرق تھا جب الماس نے بھاپ اڑاتا ہوا کافی کا کپ اس کے سامنے رکھا تھا۔

''سراج کہاں ہے؟'' اس نے الماس سے دریافت کیا۔

''ان کا کوئی دوست لندن سے واپس آ رہا ہے، آدھے گھنٹے قبل ایئرپورٹ کا کہہ کر گئے ہیں۔ میں ابھی انہیں اطلاع دیتی ہوں۔''

''نہیں۔ میں کچھ دیر اوپر جا کر آرام کروں گا۔'' اورنگزیب نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''کچھ ضروری باتوں پر غور بھی کرنا ہے۔''

''مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے'' الماس نے اس کی سنجیدگی دور کرنے کی خاطر بڑی اپنایت سے کہا۔ ''آپ نے مجھے بہن بھی بنایا ہے پھر بھی غیریت سے کام لیتے ہیں۔''

''خیریت۔ تمہیں میری غیریت کا اندازہ کس بات سے ہوا؟''

''نیچے بھی مہمانوں کا کمرا خالی ہے۔ آپ وہاں بھی رہ سکتے ہیں۔'' الماس نے قدرے جذباتی انداز اختیار کیا۔ ''میں سراج سے بھی کئی بار اصرار کر چکی ہوں لیکن......''

''وہ خود نہیں چاہتا کہ میں نیچے رہوں۔'' اورنگزیب نے بھی الماس کو خوش کرنے کی خاطر مصنوعی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''تم بہن ہو اس لیے تمہیں احساس ہوتا ہے مگر سراج......''

''میں اب آپ کی باتیں سمجھنے لگی ہوں۔ سراج تو خود مجھ سے بارہا کہہ چکے ہیں کہ آپ سے نیچے آنے کا اصرار کروں۔'' الماس نے سنجیدگی سے کہا۔

''فی الحال مجھے اوپر ہی رہنے دو۔ وہاں مجھے تنہائی میں سکون سے بہت ساری باتوں پر غور کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔''

پھر کافی ختم کرنے کے بعد وہ اوپر چلا گیا، دو گھنٹے آرام اور غسل کرنے کے بعد نیچے آیا تو سراج بھی الماس کے ساتھ ہی لاؤنج میں موجود تھا۔ الماس کچھ دیر بعد کچن کی طرف چلی گئی تو سراج نے پوچھا۔

''کسی مخبر کی اطلاع کے بعد آپ کمرشل ایریا کس کام سے گئے تھے؟''

''آج میں نے ماروی نامی ایک لڑکی سے بڑی تفصیلی ملاقات کی ہے۔ وہ آخری لڑکی تھی جو مخبر کی اطلاع کے مطابق فارم ہاؤس گئی تھی، ایک رات گزارنے کے بعد واپس بھی آ گئی۔'' اورنگزیب نے سکندر علی شاہ کے دوسرے دن فارم ہاؤس جانے اور چوکیدار کی موت تک کی باتیں بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اہم بات یہ ہے کہ چوکیدار نے خودکشی کیوں کی؟ اس کی لاش کو پولیس کے علم میں لائے بغیر کیوں دفن کیا گیا؟ اس کے علاوہ بھی دو اور دو چار کرنے کی خاطر بہت سارے اہم اشارے میرے ذہن میں کلبلا رہے ہیں۔''

''کیا ماروی ان باتوں سے واقف نہیں ہے یا جان بوجھ کر......''

''ماروی کی بکنگ کسی اور لڑکی نے کی تھی جس کا نام وہ میرے اصرار کے باوجود زبان تک لانے سے گریز کرتی رہی۔ کوئی خوف ہے جو اس نے زبان نہیں کھولی۔ میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا البتہ فوری طور پر میں نے دو سادہ لباس والوں کو ماروی کی حفاظت پر مامور کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سکندر علی شاہ کو میرے وہاں جانے کی اطلاع بھی مل چکی ہو۔''

''سکندر علی شاہ کے بارے میں ماروی نے کیا کہا؟'' سراج نے زہرخند سے پوچھا ''کیا وہ بھی مریدوں کی صف میں شامل ہو گئی ہے۔''

''دلچسپ بات تو یہ ہے کہ سکندر علی شاہ اس رات فارم ہاؤس نہیں گیا تھا۔''

''اوہ...... سراج نے چونک کر سوال کیا۔ ''کیا فارم ہاؤس کے چوکیدار کی خودکشی کا تعلق ماروی سے بھی ہوسکتا ہے؟''

''یہی سب سے اہم نکتہ ہے۔'' اورنگزیب نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا...... ''بہرحال اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اب سکندر علی شاہ ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔''

''آپ پھر بھی براہ راست اس پر ہاتھ ڈالنے سے گریز ہی کریں گے۔'' سراج نے پہلو بدل کر اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''یو آر، رائٹ! میں نے سکندر علی شاہ کو ابھی پہلا زینہ قرار دیا ہے۔ اس بات کا یقین بعد کے حالات پر منحصر ہے کہ اس کا کوئی لنک آکٹوپس سے بھی ہوسکتا ہے۔''

''ایک بات میں بھی آپ کی اجازت سے کہنا چاہوں گا۔'' سراج نے کسمسا کر کہا ''کنول کا اغوا، اس کی ماں کی موت پھر کرنل احتشام کے سامنے جانے سے پہلے اس کا پریس کو بھی یہ بیان دینا کہ شیخ حامد زندہ ہے۔ کہیں ان تمام باتوں کے باوجود اس بات میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ آپ کا آکٹوپس زندہ ہے۔''

''جب سب نے اس کے غرق ہو جانے کا یقین کر لیا تھا اس وقت بھی میں نے یہی کہا تھا کہ جب تک اس کی لاش کو نہ دیکھ لوں گا اس کی موت کا یقین کبھی نہ کروں گا۔''

''آپ کے اسی یقین کی روشنی میں یہ کہنے کی اجازت چاہی تھی کہ اگر آکٹوپس زندہ ہے تو ہمارے درمیان کہیں نہ کہیں تو ضرور چھپا ہوگا۔'' سراج نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''کیا فارم ہاؤس اس کے لیے بہترین پناہ گاہ نہیں ہوسکتی؟''

''فی الحال میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ایک بات کا شبہ ضرور ہے۔ کسی نہ کسی زاویے سے سکندر علی شاہ اور آکٹوپس کا لنک بھی ہوسکتا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' سراج نے پہلو بدل کر سوال کیا۔ ''کیا کوئی لنک ہونے کے باوجود سکندر علی شاہ کسی اعتبار سے آکٹوپس کے کام آ رہا ہے؟''

''ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اور تمہارے شبہ کرنے سے پہلے بھی فارم ہاؤس پر میری نظر تھی مگر ایک بار پھر بڑے اعتماد سے کہوں گا کہ سکندر علی شاہ براہ راست آکٹوپس سے واقف نہیں ہے۔''

''اس اعتماد کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی۔''

''تم نے شاید سکندر علی شاہ والی فائل کو کبھی غور سے نہیں پڑھا۔ جس شخص کی وجہ سے آج وہ اس مقام پر ہے خود وہ بھی اس سے ناواقف ہی ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آکٹوپس ہی وہ گمنام شخص رہا ہوگا؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔'' اورنگزیب نے کہا۔ ''آکٹوپس کے بارے میں مستند کتابوں میں یہی درج ہے کہ وہ آٹھ ہاتھ رکھتا ہے جس کے ڈنک اتنے زہریلے ہوتے ہیں جو شکار کو اس کی جسامت کا لحاظ کیے بغیر غفلت سے دوچار کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی شہرت کے جرائم پیشہ افراد اپنے خفیہ ٹھکانوں کا اہتمام بھی قبل از وقت سوچی سمجھی اسکیم سے ضرور کر لیتے ہیں۔ ڈان کی حیثیت رکھنے والے میک اپ کے فن میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ ان کی شریک حیات بھی ان کو شناخت نہیں کر پاتیں۔''

سراج اور اورنگزیب کے درمیان ماروی اور آکٹوپس کا ذکر جاری تھا جب فون کی گھنٹی بجی، کال سراج نے ریسیو کی تھی پھر اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

''کیا خبر ہے؟'' اورنگزیب نے پوچھا۔

''ہمارے سابقہ ڈی آئی جی علیم احمد کی لاش ان کے بنگلے کے اسٹور روم سے ملی ہے۔ علاقے کے تھانا انچارج کا فون تھا۔ وہ کسی گمنام آدمی کے فون کے بعد ہی وہاں پہنچا ہے۔''

''سیڈ نیوز۔'' اورنگزیب بھی سراج کے ساتھ ہی جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

⁂

شبنم بالکونی میں ایزی چیئر پر بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی جب افضل خان بھی اس کے قریب آ گیا۔ کچھ دیر قبل شام کی چائے دونوں نے ساتھ پی تھی پھر افضل خان اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ آج تم کچھ اداس اداس سی ہو۔'' افضل خان نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ''کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں۔'' شبنم نے بجھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''آج ہی کے دن میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔''

''ہیپی برتھ ڈے۔'' افضل خان نے بے تکلفی سے کہا پھر وہ باہر جانے کی خاطر پلٹا تھا لیکن شبنم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

''تمہاری سالگرہ منا کر مجھے خوشی ہوگی۔ نیچے سے ہو کر ابھی آتا ہوں۔''

''نہیں۔'' شبنم کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ ''آج کا دن میرے لیے بے حد اذیت ناک ہوتا ہے۔ جب ماں زندہ تھی تو وہ بڑے ارمانوں اور دھوم دھام سے سالگرہ مناتی تھی لیکن......''

''اوہ......'' افضل خان نے اس بار کچھ توقف سے کہا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری اداسی کا سبب لیکن کاش تم

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اس وقت بھی مجھے اپنا سمجھا ہوتا جب ہم ایک ساتھ کام کرتے تھے۔"

"جو فرض میرے ذمے تھا اسے میں خود ادا کرنا چاہتی تھی پھر چاہے انجام کچھ بھی ہوتا لیکن مجھے کوئی مناسب موقع نہیں ملا۔"

"اب یہ ذمے داری مجھے سونپ دو۔ میں اس کی ادائیگی سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

"جانتی ہوں لیکن اب وقت اور حالات نے اسے بھی انڈر گراؤنڈ رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں وہ زیادہ محتاط اور خطرناک ہو گیا ہے۔ میڈم کو بھی اس سے اپنا قرض چکتا کرنا ہے۔ پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کے ذمے دار افسران بھی اس کی تلاش میں ہیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"تمہارے اداس رہنے سے کیا وہ سامنے آجائے گا؟" افضل خان نے اتنی جھلاہٹ سے یہ جملہ ادا کیا کہ شبنم کو ہنسی آگئی۔

"اب مسکرادی ہو تو کچھ میرے بارے میں بھی غور کرو۔" افضل خان نے شوخی سے کہا۔ "ایک ہی الگنی پر ہم دونوں کب تک دور دور لٹکے رہیں گے؟"

"سراج صاحب سے پوچھ لو۔ میں تمہارے ساتھ کورٹ تک جانے سے انکار نہیں کروں گی۔"

افضل خان نے کرسی کھسکا کر اس کے کچھ اور قریب کرلی لیکن اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ موبائل اسکرین روشن ہونے کے بعد جو نمبر نظر آیا اسے دیکھ کر اس نے موبائل آن کرنے میں دیر نہیں کی، سنجیدگی سے پوچھا۔

"کوئی تازہ خبر؟"

"آپ کو جس کی تلاش تھی آج وہ خود چل کر بنگالی پاڑے میں آگیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک رات یہیں رہے، یہ بھی ممکن ہے گھنٹا دو گھنٹا گزار کر واپس چلا جائے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کیا وہ کسی خاص کام سے آیا ہے؟"

"سندر بن کے دیس سے جھرنا نام کی ایک تازہ مچھلی آئی ہے۔ جو اسے بھگا کر لایا ہے وہ بھی جبرو کا پرانا واقف ہے۔"

"سمجھ گیا۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر پہنچ رہا ہوں، تم دور سے اشارہ کر دینا۔ باقی کام کرنا میرا ذاتی مسئلہ ہے۔"

"کوئی نشانی بھی بتادیں۔" دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ اصلی حلیے میں نہیں ہوں گے۔"

"جینز اور بلیک کلر کی ٹی شرٹ۔ ہاتھ میں لائٹ گرے رنگ کا رومال بھی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں گلی کے سامنے ہی انتظار کروں گا۔ کچھ فاصلے سے آپ کو مطلوبہ جگہ کا اشارہ کر کے نکل جاؤں گا۔"

افضل خان موبائل بند کر کے اٹھنے لگا تو شبنم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ کس کا فون تھا؟"

"تمہاری ایک فرمائش پوری کرنی ہے۔ اگر وہ ہاتھ سے نکل گیا تو ہماری شادی بھی کھٹائی میں پڑ جائے گی۔"

"جبرو......؟" شبنم نے نفرت سے کہا۔

"ہاں...... پریشان مت ہو، میں جلدی لوٹ آؤں گا۔"

"کیا سزا دو گے اسے؟"

"جو تم کہو......" افضل خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"اسے جان سے نہ مارنا لیکن...... اس بات کا احساس ضرور دلا دینا کہ اب میں تنہا نہیں ہوں۔ تم بھی میرے وجود کا ایک حصہ ہو۔"

افضل خان نے شبنم کے دونوں ہاتھ بڑی اپنائیت سے تھام لیے۔ چند لمحے وہ دل کی دھڑکنیں شمار کرتا رہا پھر شوخی سے بولا۔ "اجازت ہو تو بنگالی پاڑے سے کوئی قاضی بھی پکڑ لاؤں۔"

شبنم نے مسکرا کر پلکیں جھکالیں۔ افضل خان غسل خانے میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد باہر نکلا، ریڈی میڈ میک اپ نے اس کا حلیہ بھی تبدیل کر دیا تھا۔ شبنم دروازے تک اس کے ساتھ گئی۔

"سراج صاحب نے کہا تھا کہ کچھ لوگ ہماری نگرانی پر بھی مامور ہیں۔ ان کے سائے سے بھی محتاط رہنا۔"

"ڈونٹ وری۔" افضل خان کا لب و لہجہ بنگالیوں جیسا ہو گیا۔ "تم ایک دم پھکر مت کرو۔ ہم ادھر ادھر کا بھی کھیال رکھے گا۔"

حسب پروگرام وہ ٹھیک پندرہ بیس منٹ میں بنگالی پاڑے پہنچ گیا۔ مطلوبہ آدمی اسے گلی کے سامنے ہی نظر آگیا۔ افضل خان کو دیکھ کر وہ اندر جانے والے تنگ اور ناہموار کچے راستوں پر چل پڑا۔ وہ کچی گلیاں ایسی بھول بھلیاں تھیں جہاں کوئی اجنبی پہلی بار بھٹک جاتا تو واپس آنے کا راستہ نہیں تلاش کرسکتا تھا۔

تقریباً چار منٹ بعد آگے جانے والے نے رک کر سگریٹ جلائی۔ بجھی ہوئی تیلی کو اس نے داہنے ہاتھ والے کچے پکے مکان کی طرف اچھالا پھر کش لگاتا آگے نکل گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

افضل خان کے لیے وہ اشارہ کافی تھا۔ وہ بھی مطلوبہ مکان کے سامنے جا کر رکا، جیب سے کنگھی نکال کر اس نے بال درست کیے۔ اس دوران میں اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ گلی ویران پڑی ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی جانب والے مکان کے دروازے پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے دستک دی، چند لمحوں بعد کسی نے اندر سے پوچھا ”کون ہے؟“

جواب میں افضل خان نے کچھ کہنے کے بجائے کھنکارنے پر اکتفا کیا۔ یہ ٹرمپ کارڈ بھی کام آ گیا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ سامنے جبرو ہی دھوتی باندھے کھڑا تھا لیکن اس کو پھر سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ افضل خان نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پتلی گردن پر اپنی گرفت مضبوط کی پھر دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔ دروازہ بند کرنے میں بھی اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”تت...... تت...... تم......“ جبرو نے کوئی سوال کرنا چاہا لیکن افضل خان اسے گھسیٹ کر کمرے کے اندر لے گیا جہاں ایک لڑکی نے حالات کو بھانپ کر اپنے اوپر چادر کھینچ لی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی خوف ہی خوف نظر آ رہا تھا۔

”نہیں جبرو...... اس وقت زبان کھولنے کی حماقت نہ کرنا ورنہ تو جانتا ہے کہ میں شکار کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔“ افضل خان نے اس کا گریبان تھام کر انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

”پر...... مم...... میرا قصور کیا ہے؟“

”اسلم ڈنکا یاد ہے تجھے؟ تو اس کے پاس کسی لڑکی کو لے کر گیا تھا۔“ افضل خان نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

”تم شاید شبنم کی بات کر رہے ہو۔“ جبرو نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”وہ بگ باس کا حکم تھا اور۔ تم نے بھی اس کے اشارے پر چلنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔“

”مانتا ہوں لیکن تو نے اسلم ڈنکا کے ساتھ جو کھیل کھیلنے کی کوشش کی تھی اس کا حکم تجھے کس نے دیا تھا؟“

”اوہ۔ اب سمجھا۔“ جبرو نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”ماسٹر مجید بتا رہا تھا کہ آج کل تم دونوں ساتھ ہی...... اوغ...... غو......“

جبرو جملہ پورا کرنے کے بجائے بلبلانے لگا...... افضل خان نے سیدھے گھٹنے کو ذرا خم دے کر اس کے پیٹ اور رانوں کے بیچ اتنی نپی تلی ضرب لگائی تھی کہ جبرو خود کو سنبھالتے سنبھالتے زمین پر بیٹھ گیا۔ افضل خان نے دوسری ٹھوکر اس کے چہرے پر ماری تو ناک سے خون ابل پڑا۔ جبرو کے ہاتھ ناک کی طرف گئے تو افضل خان نے دوبارہ اس کے جسم کے نازک حصے پر بھرپور ٹھوکر ماری۔ جبرو کی سانس اکھڑنے لگی۔ وہ کچے فرش پر ٹانگیں جوڑے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

”میں پھر کسی وقت تیری خیریت دریافت کرنے آؤں گا حرام کے بچ!“ افضل خان نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔ ”اپنی گندی زبان پر دوبارہ شبنم کا نام لانے کی غلطی نہ کرنا ورنہ تیری بوٹیاں بھی کتوں کے آگے پڑی ہوں گی۔“

جبرو بدستور تڑپتا رہا۔ افضل خان نے ایک اچٹتی نظر چادر میں سمٹی سہمی لڑکی پر ڈالی پھر تیز تیز قدم اٹھاتا دروازے سے باہر نکل گیا۔

٭٭٭

ہوش آنے کے بعد ڈرائیور نے خود کو اسٹیئرنگ پر ہی پایا تھا۔ غنودگی کی کیفیت اس پر اس وقت بھی طاری تھی لیکن برابر والی سیٹ پر لیڈی سیکریٹری کو اس نے جس حالت میں دیکھا اس نے اس کی ساری غنودگی پل بھر میں دور کر دی۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں گٹھری بنی نظر آ رہی تھی۔ لیڈی سیکریٹری کو اس حالت میں دیکھنے کے بعد اس کی نظریں کسی خیال سے پشت والی سیٹ پر پڑیں جس کے بعد رہی سہی غنودگی بھی جاتی رہی۔ چھوٹی مالکن بھی بکھری پڑی تھیں۔ سیٹ کے درمیان ان کا ہینڈ بیگ بھی پڑا تھا۔

ڈرائیور نے سنبھل کر دائیں بائیں دیکھا، آس پاس کوئی موجود نہیں تھا، بیرونی پھاٹک بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں گاڑی اسٹارٹ کی۔ بنگلے سے باہر نکلتے نکلتے اس نے گھر جانے کے بجائے اس اسپتال کا رخ کیا جہاں رستم علی آغا خانی کا ڈرائیور ہونے کی حیثیت سے اسے بھی جانا پہچانا جاتا تھا۔ یہی واقفیت اور حوالہ اس کے کام آ گیا۔ روشنا کو فوری طور پر وی آئی پی روم میں لے جایا گیا، سیکریٹری کے لیے بھی اسٹریچر آ گیا۔ اسپتال کا عملہ اس کو لے گیا تو ڈرائیور نے سب سے پہلے جیب ٹٹولی، اغوا کرنے والوں نے اس کا موبائل شاید بعد میں واپس کر دیا تھا۔ فوری طور پر اس نے دارا سیٹھ کے نمبر ڈائل کیے۔ دو مرتبہ کی مایوسی کے بعد تیسری بار کال مل گئی۔

”تم...... کہاں ہو اور......“

”میں ادھر اسپتال میں ہوں صاحب۔“ ڈرائیور نے اپنا فرض پورا کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم وہیں انتظار کرو۔“

پندرہ منٹ بعد دارا بھی اسپتال پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے

سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھا بڑے ڈاکٹر کے پاس پہنچا جو راہداری ہی میں مل گیا تھا۔

”روشنا کی کیا پوزیشن ہے؟ سب ٹھیک تو ہے؟“

”میں لیڈی ڈاکٹر کو اندر چھوڑ آیا ہوں۔“ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اس کے معائنے کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔ فی الحال روشنا بیہوشی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ ہوش میں آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ جنرل کنڈیشن کسی خطرے سے باہر ہی ہے۔ مگر یہ سب اچانک کیسے ہوا؟ رستم علی صاحب کی لیڈی سیکریٹری بھی بے ہوشی کی حالت میں یہاں آئی ہے۔“

دارا ڈاکٹر کے سوال کے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا، اس کی یہ مشکل اس لیڈی ڈاکٹر نے آسان کر دی جو روشنا کے کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ ڈاکٹر قدم بڑھاتا لیڈی ڈاکٹر کے قریب چلا گیا۔ کچھ دیر وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ دارا دور کھڑا ہونٹ چباتا رہا۔

کلب میں میجر عاطف سے روشنا کے جانے کی اطلاع پا کر وہ سیدھا گھر پہنچا تھا۔ اس کے بعد اسے اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ روشنا اور لیڈی سیکریٹری کسی خطرے سے دوچار ہوں گی اور اب۔ وہ دور کھڑا اسپتال کے بڑے ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ گھر سے چلتے وقت اس نے سب کو زبان بند رکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔

”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ بڑے ڈاکٹر نے لیڈی ڈاکٹر سے گفتگو کرنے کے بعد دارا کے قریب آ کر کہا پھر وہ اسی فلور کے اس وی آئی پی روم میں چلے گئے جو روشنا کے نام پر بک کیا گیا تھا۔

”کیا رپورٹ ہے ڈاکٹر۔“ دارا نے اکیلے میں دوبارہ بے چینی کا اظہار کیا۔ ”لیڈی ڈاکٹر کے معائنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”مسٹر رستم علی کی لیڈی سیکریٹری کو بھی......“ ڈاکٹر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا، ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ”اغوا کرنے والوں کی نیت اچھی نہیں تھی۔“

”اوہ!“ دارا ہونٹ چبانے لگا۔ کچھ دیر سوچتا رہا کہ دشمن کون ہو سکتا ہے پھر اس نے دوبارہ ڈاکٹر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”روشنا کی کیفیت اب کیسی ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا لگے گا۔ اس کے علاوہ میں آپ کو ایک مشورہ اور دوں گا۔“ ڈاکٹر نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”روشنا کو ہوش میں آنے کے بعد آپ کے سوا کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ آپ کا اس کے ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔ مینٹل شاک کے بعد مریض کو ہوش آئے تو اس کا ذہن پھر گزری ہوئی بات میں الجھ جاتا ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے؟ جو کچھ میں نے بتایا ہے اس کا ذکر بھی......“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ دارا نے خود کو کنٹرول کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ روشنا کو ایک نظر دیکھنے کے بعد باہر نکلا تو ڈرائیور ہینڈ بیگ لیے کھڑا تھا۔

”اس میں چھوٹی مالکن کی ضرورت کی چیزیں بھی رہتی ہیں اس لیے میں اوپر لے آیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ دارا نے بیگ لے کر ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ”کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تم......“

”میں نے آپ لوگوں کا نمک کھایا ہے صاحب پھر...... نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں؟“

”کیا تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟“

”نہیں مالک۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سب اجرتی بدمعاش تھے، کوٹھی تک پہچانے کے بعد وہ واپس چلے گئے تھے۔“ ڈرائیور نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”ایک بات اور بھی مالک، وہ جس کوٹھی میں لے گئے تھے وہ بھی ریٹائرڈ ڈی آئی جی علیم احمد صاحب کی تھی۔ گیٹ پر جو تختی لگی تھی اس پر یہی لکھا تھا۔“

”تم نیچے ٹھہرو۔ میں کسی وقت تمہیں دوبارہ کال کروں گا۔“

ڈرائیور چلا گیا تو دارا دوبارہ وی آئی پی روم کے اندر آ گیا۔ اس نے روشنا کے ہینڈ بیگ کو کھول کر دیکھا تو اس کی رگوں میں دوڑتا خون کھولنے لگا۔ ڈاکٹر نے لیڈی ڈاکٹر کے حوالے سے جس بات کا دبی زبان میں اظہار کیا تھا اس کا ثبوت ہینڈ بیگ میں پڑا ویڈیو کیسٹ بھی ہو سکتا تھا جس پر...... گفٹ فار رستم علی، کی ٹائپ شدہ چٹ کے علاوہ آکٹوپس، کا علامتی نشان بھی نظر آ رہا تھا۔

دارا نے ہینڈ بیگ بند کر کے الماری میں رکھا پھر وہ کسی زخمی درندے کی طرح ٹہلنے لگا، اس کی نظریں بار بار روشنا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ دس پندرہ منٹ وہ اپنے وجود میں اٹھنے والے طوفان کو برداشت کرتا رہا پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر ایس پی اورنگزیب کے نمبر ملائے۔ تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کی گئی تو دارا نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”میں دارا رستم علی بول رہا ہوں۔ آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”آفیشل ڈیوٹی پر ہوں۔“ اورنگزیب نے سنجیدگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے سوال کیا۔ ''تمہیں اس وقت میری کیا ضرورت پیش آگئی؟''

''ہے کچھ کام جو فون پر نہیں بتا سکتا......''

''اس وقت کہاں سے بات کر رہے ہو؟''

''ڈونٹ وری...... میں دوبارہ کال کرلوں گا۔'' دارا نے جواب دینے کے ساتھ ہی لائن ڈس کنیکٹ کردی۔

روشنا کے قریب بیٹھ کر وہ اس کی کیفیت پر غور کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے جسم میں حرکت شروع ہو رہی تھی، دارا نے اس کے قریب ہو کر آہستہ سے پوچھا۔ ''اب کیسی ہو۔ کیسا فیل کر رہی ہو؟'' روشنا نے کوئی جواب نہیں دیا غالباً پوری طرح اس کے اوسان بحال نہیں ہوئے تھے۔ دارا پھر ہونٹ چبانے لگا۔ آکٹوپس کے حوالے سے اس کے ذہن میں کچھ بھولی بسری باتیں بھی ابھر رہی تھیں جب اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوگئی۔ نظر آنے والے نمبر اس کے لیے نئے تھے پھر بھی اس نے موبائل آن کر کے پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں نے روشنا کی خیریت دریافت کرنے کی خاطر فون کیا تھا...... اب کیسی ہے؟''

''ابھی تک پوری طرح ہوش نہیں آیا۔'' دارا نے روانی میں جواب دیا پھر سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آپ کون بول رہے ہیں؟''

''اپنا ہمدرد ہی سمجھو۔'' سپاٹ لہجے میں جواب ملا۔ ''ایک دوستانہ مشورہ بھی دے رہا ہوں...... روشنا کے ساتھ ساتھ تم بھی ہوش میں آجانا۔ وہ غلطی نہ کرنا جو تمہارا باپ کر چکا تھا۔ میجر عاطف اور ایس پی اورنگزیب مل کر بھی میری گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔''

''تم......'' دارا تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا، اس کی رگوں میں جوان خون بھی جوش مارنے لگا۔ حقارت سے بولا۔ ''اگر مرد کے بچے ہو تو سامنے آکر بات کرو۔''

''میری مردانگی کا ثبوت تمہاری بیوی کے بیگ میں پڑے ویڈیو کیسٹ میں بھی مل جائے گا۔ وہ میرے شکاری کتے تھے۔ ان کی درندگی دیکھ کر تم میری طاقت کا اندازہ بھی لگا لینا۔ وش یو گڈ لک...... سن آف بچ۔''

دوسری جانب سے رابطہ ختم کردیا گیا۔ دارا کے پاس ہونٹ چبانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، وہ پھر زخمی درندے کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا جب بڑا ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ اندر آگیا۔ روشنا کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے دارا سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب یہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہوش میں آجائیں گی لیکن میں نے جو مشورہ دیا ہے اسے یا[د] رکھیے گا۔ ایسی کیفیت میں مریض کو ہمدردی اور محبت کی شد[ید] ضرورت ہوتی ہے۔ مریضہ کو ہوش میں آنے کے بعد ایک [دو] روز تک تنہا نہ چھوڑیے گا، یہ بھی بطور احتیاط کہہ رہا ہوں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر۔ روشنا کو اس وقت ذہ[نی] سکون کی ضرورت بھی ہوگی۔ میں ہر طرح خیال رکھوں گا۔''

ڈاکٹر چلا گیا۔ دارا کے ذہن میں آکٹوپس پھ[ر] کلبلانے لگا، تقریباً پینتالیس منٹ بعد روشنا کے جسم کو حرکت ہوئی، اس نے دو ایک بار گردن ادھر ادھر ہلائی پھر اس طرح ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ[تے] دیکھتے جاگی ہو، دارا تیزی سے اس کے قریب آگیا۔

''تم...... میں کہاں ہوں؟'' روشنا نے مدھم لہجے میں کہا پھر اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں، اس کی پلکوں کے درمیان سے نکلنے والے آنسو کے قطرے اور چہرے پر کرب کے نمایاں ہونے والے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ ہوش میں آچکی ہے۔

''حوصلے سے کام لو ڈارلنگ۔ دارا کل بھی تمہارا تھا آج بھی تمہارا پرستار ہے۔''

''سچ کہہ رہے ہو۔'' روشنا کی آواز بھرا گئی، وہ مجس[م] کرب نظر آرہی تھی۔

''کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟'' دارا اس کی پیشانی چومنے کے بعد بڑی محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''اگر محبت ہے تو کہیں سے تھوڑا سا زہر لا دو، میں...... میں اب کسی کو منہ دکھانے......''

''ریلیکس روشنا۔ پلیز ریلیکس!'' دارا نے اسے دیوانوں کی طرح اپنے سینے میں چھپا لیا۔ ''تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی بے بس ہی رہتا۔ میرے اندر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی تو کیا تم اپنے دارا سے نظریں پھیر لیتیں؟''

روشنا سسکیاں بھرتی رہی، دارا اس کی دلجوئی کرتا رہا۔ ماحول کو بدلنے کی خاطر اس نے نرس کو کال کیا۔ پھر دارا کے کہنے پر وہ بڑے ڈاکٹر کو بلا لائی۔ دارا نے روشنا کو بیڈ سے سہارا دے کر اس کا سر دو تکیوں پر ٹکا دیا۔ بیڈ کو سرہانے سے اونچا کردیا۔ روشنا اس سے نظریں ملانے کے بجائے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی جب ڈاکٹر بھی آگیا۔ اس نے روشنا کی نبض دیکھی پھر مسکرا کر بولا۔ ''آپ کو جو بے ہوشی کا انجکشن دیا گیا تھا اس کا اثر بڑی حد تک زائل ہو چکا ہے۔ چوبیس گھنٹوں کے بعد آپ گھر بھی جا سکتی ہیں۔ پھر

شکر ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو کڈنیپ کیا تھا وہ صرف جیولری اور کیش لے کر بھاگ گئے۔''

''اور کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟'' دارا نے ڈاکٹر سے پوچھا، وہ ڈاکٹر کی کہی ہوئی بات سمجھ کر روشنا کو بھی یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے ڈاکٹر کو اس کی وقتی گمشدگی کے بارے میں کیا بتایا تھا! ڈاکٹر کچھ دیر بعد چلا گیا تو روشنا نے پہلی بار دارا کو ایسی نظروں سے دیکھا جس میں بے شمار سوالات مچل رہے تھے۔

''کیا تمہیں دارا کی محبت پر اب بھی یقین نہیں ہے؟'' دارا نے اس کے ہاتھ تھام کر بڑی اپنائیت سے سوال کیا۔ جواب میں روشنا دارا کی نظروں کی گہرائیوں میں دور تک کچھ تلاش کرتی رہی پھر بے اختیار اس کے گلے لگ کر دوبارہ سسکنے لگی۔

دارا نے اپنی محبت کا یقین دلانے کی خاطر اپنے ہاتھوں کا حلقہ اور تنگ کرلیا۔ اس وقت بھی اس کے وجود میں آکٹوپس کے زہریلے ڈنک چبھ رہے تھے جب روشنا نے خود پر کسی حد تک قابو پاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

''تمہاری بات اور ہے دارا مگر...... میں لیڈی سیکریٹری اور ڈرائیور کو کس طرح فیس کرسکوں گی؟''

''ڈاکٹر کا مشورہ ہے کہ تم کو کچھ دنوں کے لیے باہر لے جاؤں۔'' دارا نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''وہاں ہمارے آفس میں بھی کام بڑھ رہا ہے، میں ڈیڈ سے کہہ کر وہاں سیٹل ہو جانے کی بات بھی کرلوں گا۔''

''نہیں......'' روشنا نے دارا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں ڈیڈ اور ممی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ وہاں ان کے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔ وہ بھی ہماری کمی ضرور محسوس کریں گے۔''

''روشنا۔ یو آر گریٹ!'' دارا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی عقیدت سے کہا۔

''گریٹ میں نہیں ہوں۔ تم ہو جو تم نے مجھے......''

''پلیز...... اب یہ بات دوبارہ زبان پر نہ لانا۔'' دارا نے اسے اپنے کشادہ سینے کی گہرائیوں میں چھپا لیا پھر بولا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ میں ڈرائیور اور لیڈی سیکریٹری کو باہر بھیج دوں۔''

''صرف ڈرائیور کو...... لیڈی سیکریٹری کو دفتر تک محدود کردو۔ وہ بھی میری ہی وجہ سے حالات کا شکار ہوئی تھی۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے۔'' روشنا نے بڑی صداقت سے جواب دیا۔

''جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا لیکن پلیز، اب صرف آرام کرو۔ ریلیکس مائی ڈیئر۔''

''صرف ایک بات اور کہنا چاہوں گی۔''

''وہ کیا......؟''

''مجھے...... یہ یقین تھا کہ تم مجھے مظلوم سمجھ کر معاف کردو گے۔'' روشنا کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

''یو آر گریٹ۔ مائی لو۔'' دارا نے اسے پھر اپنے وجود میں چھپا لیا، دل کی دھڑکنوں میں جہاں سچائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

☆☆☆

وشنو کو کرنل احتشام کے حکم کے مطابق ایک لمحے بھی سونے کا موقع نہیں دیا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اسے ملٹری کی زبان میں فل ڈوز بھی مل رہی تھی۔ مختلف آلات کے ذریعے اسے اذیتیں دینے میں بھی کوئی رعایت نہیں کی گئی تھی مگر وشنو نے اپنی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے شاید اس لیے کہ اس کے واحد جواب ''تم جس کے بارے میں مجھے ادھیڑ رہے ہو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' نے کرنل احتشام اور اس کے کارندوں کو مطمئن نہیں کیا تھا۔ ٹارچ کرنے والوں کا سرغنہ ہر بار اس کو اپنی زبان میں یہی سمجھاتا تھا۔

''کتوں کی طرح بار بار ایک ہی آواز میں بھونکنا چھوڑ دے۔ جو سچ ہے وہ اگل دے ورنہ اسی کمرے سے تیری رام رام ست بھی ہو جائے گی۔''

وشنو اس کی بات سن کر مسکرا دیتا۔ سرغنہ کے اشارے پر پھر وشنو کی دھنائی شروع ہو جاتی۔ اس وقت بھی وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا تھا جب تشدد کرنے والوں کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ اسے اب اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے ڈوز کتنی دیر تک ملتی ہے۔

وشنو سخت جان تھا لیکن جو لوگ اسے ٹارچ کر رہے تھے وہ بھی تجربہ کار تھے۔ ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ جلد از جلد کرنل کی نگاہوں میں سرخرو ہوسکیں۔ اس کوشش میں وشنو کے برداشت کی ہمت بھی آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر ایک دو روز اور اس پر جبر و تشدد ہوا تو قوت برداشت کے ساتھ وہ خود بھی دم توڑ جائے گا۔ اس کا ذہن ہر وقت فرار کے راستوں کی ہر ممکن تدبیر پر غور کرتا رہتا لیکن ابھی تک اسے ایک پل کے لیے بھی تنہائی کا موقع نہیں ملا تھا۔ رات اور دن کا تصور بھی مٹ چکا تھا۔ کمرے میں ہر وقت ہائی پاور کی روشنی اس کے اور نیند کے درمیان حائل رہتی۔ رات کی ڈیوٹی پر مامور جلاد بھی اس کو ایک پل کے لیے آنکھ موندنے کا موقع نہیں دیتا۔ اس کے فوجی جوتے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک شدید ٹھوکر ہی اتنی شدید ہوتی تھی کہ نیند کا جھونکا بھی اب وشنو کے قریب آنے سے روٹھ گیا تھا۔

ٹارچر روم میں تشدد اور برداشت کی آنکھ مچولی جاری تھی جب دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی کسی کے قدموں کی آہٹ بھی ابھری۔ تشدد کرنے والوں کے ہاتھ بھی اس آہٹ کی آواز پر مشینی انداز میں رک گئے تھے۔ وشنو نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر دروازے کی سمت دیکھا۔ دروازے پر کرنل احتشام ڈاکٹر کے نائب کے ساتھ موجود تھا۔ کرنل کی شعلہ اگلتی نظریں وشنو پر مرکوز تھیں۔

''اب اس باسٹرڈ کا کیا جواب ہے؟'' اس نے ٹارچر کرنے والوں کے سرغنہ کو مخاطب کیا۔

''سر...... میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایک دو روز اور فل ڈوز کا سلسلہ جاری رکھنا پڑے گا۔ اس کے بعد اس کی زبان فرفر چلے گی۔''

''تم ......'' کرنل نے ہونٹ چباتے ہوئے براہ راست وشنو کو مخاطب کیا۔ ''تم اب کیا کہو گے؟''

''پرانے راگ کے ساتھ ایک بات اور تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔'' وشنو نے زہرخند سے جواب دیا۔ ''تم ملٹری انٹیلی جنس کے بڑے ہو...... جب تم اس کی کھوج ابھی تک نہیں پا سکے تو میں کیا سیوا کر سکتا ہوں۔''

''اس نے تمہیں پناہ دی تھی۔ تم اس کے خاص آدمی ہو۔ اس لیے یہ جانتے ہو گے کہ وہ کس بھٹ میں چھپا بیٹھا ہے۔''

''تمہاری مرضی۔ جو چاہے سوچ لو۔''

''یو...... ڈرٹی ڈاگ۔'' کرنل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ''کیا تم اپنا گندا منہ کھول کر سچ نہیں بولو گے۔''

وشنو نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن دوسرے ہی لمحے کرنل کے سیدھے ہاتھ کو جنبش ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی جو ٹھوکر اچانک وشنو کے منہ پر لگی وہ اتنی شدید تھی کہ اس کے ہونٹوں سے خون ابلنے لگا۔

''تمہارے جسم اور روح کا رشتہ ختم ہونے تک ہم تمہیں دوبارہ کھلی ہوا میں نہیں جانے دیں گے۔'' کرنل نے گرج کر کہا۔ ''سانس بند ہو گئی تو یہ آخری چانس بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

وشنو نے جواب میں کرنل کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا تھا جیسے وہ زبان کھول دے گا، ہمت کر کے وہ دیوار کے ساتھ بیٹھ بھی گیا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوئیں پھر سر کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی ننگے فرش پر ڈھلک گیا، اس طرح بکھر گیا جیسے اس میں جان باقی نہ رہی ہو۔ کرنل نے قریب کھڑے ہوئے نائب ڈاکٹر سے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''اس کی نبض ٹٹولو۔''

جواب میں نائب ڈاکٹر وشنو کے قریب جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ خاصی دیر تک وہ وشنو کے ہاتھ اور پاؤں کے مختلف حصوں پر نبض کی رفتار ٹٹولتا رہا پھر اس نے گلے میں لٹکے ہوئے آلے سے مدد لی لیکن آتی جاتی سانسوں کا کوئی سراغ نہ تلاش کر سکا۔ دل کی دھڑکنیں بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو رہی تھیں۔

''کیا ہوا......؟'' کرنل کی آواز کمرے کے سکوت کو توڑتی ہوئی ابھری۔

''اس کی سانس مکمل طور پر بند ہو رہی ہے۔ دل کی رفتار بھی نارمل سے کم ہوتی جا رہی ہے۔'' نائب ڈاکٹر نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ''دو گھنٹے بعد دوبارہ دیکھنا پڑے گا۔'' پھر......

دو گھنٹے بعد جب کرنل احتشام کو وشنو کے سانس بند ہو جانے کی رپورٹ بھی مل گئی تو اس نے اپنے ماتحت کو بلا کر ضروری مشورہ کیا۔ ''تم کیا رائے دو گے؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے خاموشی سے کسی ہندو تنظیم کے حوالے کر دیا جائے۔'' ماتحت نے کہا۔ ''ایک واقف کار ہے میرا جو مرنے والے کی چتا کو آگ بھی لگا دے گا۔ دوسری شکل میں ہمیں انٹرپول والوں کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ لاش کو ٹھکانے لگانے کا کام ہمارے لیے طور مناسب نہیں ہو گا۔''

''کیا تمہارا واقف کار قابل اعتماد ہے؟''

''یس......'' ماتحت نے جواب دیا۔ ''ایک بار جل کر راکھ ہو گئی تو وہ بھی زبان کھولنے کی پوزیشن میں نہیں رہے گا۔''

کرنل نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک وہ بھی وشنو کی حیثیت پر غور کرتا رہا پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''آئی۔ ایگری ود یو۔''

اسی رات کرنل کے ماتحت نے وشنو کو ہندو تنظیم کے اس ادارے تک پہنچا دیا جو مرنے والوں کا کریا کرم کرتی تھی۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

چکنی مچھلی

ش م جمیل

جہاں عقل انتہا کو پہنچتی ہے وہی کہیں بے وقوفی بھی تاک لگائے بیٹھی ہوتی ہے۔ جیسے ہی ذہانت سے کوئی چوک ہوئی، ویسے ہی غلطیوں نے دائرہ تنگ کردیا... اس کی ہوشیاری بھی ایک ذرا سی نادانی سے مات کھا گئی۔ وہ جو اب تک چکنی مچھلی کے مانند قانون کے ہاتھوں سے پھسلتا آیا تھا ایک مضبوط جال میں ایسا پھنسا کہ تمام ہوشیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔

پردیس میں جرائم کی تفتیش اور مجرم کی بھاگ دوڑ کا عجب احوال

ہاروے کی چال دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بلا مقصد تاریک گلیوں میں آوارہ گردی کر رہا ہو۔ چال سے نہ عجلت ظاہر ہوتی تھی نہ سستی جیسے پرسکون سمندر کی کوئی لہر خراماں خراماں ساحل کی طرف رواں دواں ہو...... شکل وصورت سے وہ تیس سال کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔ مضبوط توانا بدن جو حرکت کے لیے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ اس کے جسم پر کئی سال پرانے فیشن کا سوٹ تھا۔ سر پر ہیٹ اور پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ٹھنسا ہوا تھا۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے سے گزرتے ہوئے اس کے چہرے پر روشنی پڑی جس سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ ایک عمارت کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ اس کے صدر دروازے کے سامنے رک گیا جیسے اچانک کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ایک لمحے بعد اس نے بلند آواز میں خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ فلیٹ سے باہر نکلا تھا؟''

"نہیں، وہ ایک بار بھی نہیں آیا۔" عمارت کے صدر دروازے پر چھائی ہوئی تاریکی نے جواب دیا۔

ہاروے کو تاریکی سے جواب ملنے کی توقع تھی اس لیے جب اس نے ایک مردانہ آواز سنی تو اسے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ اس نے گلی کے دوسری طرف واقع ایک پرانی عمارت کی طرف پرخیال نظروں سے دیکھا جس کی تمام کھڑکیاں روشن تھیں۔ اس کی نظروں سے اس بات کا تعین نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ کس کھڑکی جانب دیکھ رہا ہے۔

"عمارت کا کوئی دوسرا دروازہ؟"

"پیٹر اس کی نگرانی کررہا ہے۔ ہم آخر کب تک اس طرح اس کی نگرانی کرتے رہیں گے؟ آپ کو اس سلسلے میں کوئی حکم ملا ہے؟"

"نگرانی ختم ہمیں اوپر چلنا ہے، پیٹر کو ساتھ لے لو۔"

دفعتاً سیاہی کا ایک ٹکڑا تاریکی سے جدا ہوکر دروازے سے باہر نکل آیا اور ہاروے کی طرف تاریکی سے جدا ہوکر دروازے سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتا تھا۔ "کھڑے کھڑے میری ٹانگیں اکڑ گئی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے، میں نے کافی عرصے یہ کام کیا ہے۔ شکر کرو آج کی رات خاصی گرم ہے۔"

وہ سڑک عبور کرکے مطلوبہ عمارت میں داخل ہوئے، ہاروے کا ساتھی عمارت کے عقبی دروازے کی طرف چلا گیا تاکہ پیٹر کو بلاسکے جو دوسری طرف نگرانی کررہا تھا۔ لفٹ کے اندر اسٹول پر نوجوان لڑکا اونگھ رہا تھا۔ ہاروے کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر اس نے ایک لمبی سی جمائی لی اور بولا۔ "جی فرمائیے؟"

"کولین کب سے اس عمارت میں مقیم ہے؟" ہاروے نے سوال کیا۔

"کولین؟ اوہ..... تقریباً دو سال سے۔"

"وہ اپنے اپارٹمنٹ میں موجود ہے؟"

"یس سر، تھرڈ فلور۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کا انتظار کررہا ہوں۔"

ایک منٹ بعد اس کے دونوں ساتھی آگئے۔ وہ لفٹ میں سوار ہوکر تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ ہاروے نے ایک فلیٹ کے دروازے پر نصب اطلاعی گھنٹی کا سفید بٹن دبایا۔ اندر کہیں گھنٹی زور سے بجی۔ اس کے ساتھیوں نے کوٹ کے بٹن کھول لیے تاکہ ہنگامی صورت حال میں وہ فوراً بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال سکیں۔

اندر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر دروازہ جھجک انداز میں کھل گیا۔ ان کے سامنے ایک مرد شب خواب کے لباس میں کھڑا تھا۔ وہ اپنے دروازے پر تین اجنبیوں کو دیکھ کر نہ تو پریشان ہوا، نہ ہی اس نے تعجب کا اظہار کیا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے بے خوفی مشتہر ہو رہی تھی۔ ہاروے نے دو انگلیوں سے ہیٹ کا کنارہ چھوتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ "ہمارا تعلق پولیس ہیڈ کوارٹر سے ہے مسٹر کولین۔"

اس پر بھی کولین نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے دروازے کو پورا کھول دیا۔ "آپ لوگ اندر تشریف لانا چاہتے ہیں یا یہیں کھڑے کھڑے گفتگو کرنی ہے؟"

"ہم تم سے ہیڈ کوارٹر میں گفتگو کریں گے لیکن اس سے پہلے کچھ دیر اندر بیٹھیں گے۔"

"ضرور، تشریف لائیے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

ہال سے گزرتے ہوئے وہ نشست گاہ میں داخل ہوئے جہاں ایک سستا سا ریڈیو میز پر رکھا ہوا تھا اور دھیمی آواز میں موسیقی نشر ہورہی تھی۔ ریڈیو کے قریب ایک آرام دہ کرسی پر اخبار پڑا تھا جس پر پنسل رکھی ہوئی تھی۔ اخبار کا صفحہ اوپر تھا اس پر معما چھپا ہوا تھا جس کے آدھے سے زیادہ خانے پر کیے جاچکے تھے۔ میز کے کنارے پر ایش ٹرے رکھی تھی جس میں ایک جلتی ہوئی سگریٹ سے مرغولے کھاتا دھواں اٹھ رہا تھا۔ کولین نے سگریٹ اٹھا کر کئی کش لیے۔

"بیٹھ جاؤ کولین۔" ہاروے نے کہا اور وہ کرسی پر رکھا ہوا اخبار ہٹا کر بیٹھ گیا۔ معمے پر نظر پڑتے ہی اس نے پنسل سنبھالی اور بڑے انہماک سے خالی جگہ پر ایک حرف لکھنے لگا۔ پھر پنسل جیب میں ڈال کر اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"مجھے ڈر تھا کہ آپ لوگوں سے گفتگو کے دوران کہیں میں یہ لفظ نہ بھول جاؤں۔" کولین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ہاتھ سر کے پیچھے لے گیا۔ پیٹر اس دوران فلیٹ کی سیر کررہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ نشست گاہ میں داخل ہوا۔

"مل گیا؟" ہاروے نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

ہاروے، کولین کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "تمہارے پاس ریوالور ہے؟"

"ہاں ہے۔ کولین نے جواب دیا۔"

"کہاں ہے؟"

"اس سے کہو کہ وہ کپڑوں کی الماری میں سب سے نچلے خانے کو دیکھے، ریوالور سویٹر کے نیچے رکھا ہے۔"

پیٹر پلٹ کر خواب گاہ کی طرف جانے لگا۔ چند لمحے توقف کے بعد کولین نے ہاروے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس اس کا اجازت نامہ بھی ہے لیکن تمہیں شاید اجازت نامے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے تمہیں یہ جان کر افسوس ہو کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ پراعتماد انداز میں مسکرانے لگا۔

"تم نے حال ہی میں اسے چلایا ہے؟"

"بالکل چلایا ہے۔" کولین نے بہ دستور ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

پیٹر نشست گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے ریوالور کی نال کو سونگھا پھر احتیاط سے اس کا چیمبر کھولا۔ "گولی کم ہے۔" اس نے گولیوں کا خانہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اعشاریہ اڑتیس بور کا وینار آٹومیٹک" اس نے سر اٹھا کر کولین کی طرف دیکھا۔ "تم نے آخری بار کب اس ریوالور سے گولی چلائی تھی؟"

"گزشتہ شب۔" اس نے بے پروا انداز میں جواب دیا۔ "مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ ہیڈ کوارٹر لے جاکر میری انگلیوں پر نائٹریٹ سے تجربہ کرکے یہ معلوم کرلوگے کہ میں نے گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران گولی چلائی تھی۔"

"اور وہ گولی تم نے لومبارڈ کے جسم پر چلائی تھی، ٹھیک ہے؟"

"غلط۔" کولین نے بہ دستور پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اس الزام پر اس نے پلکیں بھی نہیں جھپکائیں۔ "وہ گولی میں نے یہاں فرش پر چلائی تھی۔" اس کے ہونٹوں کے گوشے کسی مسکراہٹ کا پتا دے رہے تھے۔

"تمہیں خود پر بڑا اعتماد ہے، کیوں؟ ہر غلط سوال کا صحیح جواب پہلے سے تیار ہے۔"

کولین نے بےپروائی سے کاندھے اچکائے۔ "میں اپنی معلومات کی روشنی میں بالکل صحیح صحیح جواب دینے کی کوشش کررہا ہوں۔ پولیس سے تعاون کرنا ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔"

"ہمیں کیا وہ سب کچھ معلوم ہے جس کا ہمیں علم ہونا چاہیے۔"

"تب ہمارے درمیان اختلاف رائے کا ہونا ممکن نہیں۔"

کولین نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

ہاروے کا دوسرا ساتھی جو نا تجربہ کار تھا۔ کولین کے دام میں پھنس گیا اور وہ سوال پوچھ بیٹھا جس کا وہ خواہش مند تھا۔

"اگر تم نے فرش پر گولی چلائی تھی تو اس کا نشان کہاں ہے؟"

ہاروے کو علم تھا کہ کولین جیسا ذہین شخص ایسے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتا جس کا پول فوراً ہی کھل سکتا ہو۔ اس نے ضرور ایسا انتظام کررکھا ہوگا کہ اپنے دعوے کو ثابت کرسکے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہ سوال گول کرگیا تھا۔

"وہ ادھر تم غالیچہ دیکھ رہے ہو؟ اسے ایک طرف ہٹا کر دیکھو فرش لکڑی کا ہے اور اگر تم چاقو استعمال کرنے کی زحمت کرو تو فرش میں پیوست گولی بھی نکال لوگے۔"

گولی چوبی فرش میں پیوست تھی جو باہر نکال لی گئی۔ ہاروے کو ایسے مجرم بالکل پسند نہیں تھے جو اس قدر سکون اور اعتماد کا مظاہرہ کرسکتے ہوں۔ کولین جیسے آہنی اعصاب اور ٹھنڈے دماغ کے مجرم سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر بے گناہ شہری بھی گھبرا جاتے ہیں اور اگر ان پر قتل جیسے بھیانک جرم کا الزام عائد کیا جائے تو وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتے ہیں لیکن کولین نے جس ردعمل کا اظہار کیا تھا وہ بالکل مختلف تھا۔

"لباس تبدیل کرو اور فوراً ہمارے ساتھ چلو۔" ہاروے نے خشک لہجے میں کہا۔

"کیا میں خود کو زیر حراست تصور کروں؟" کولین نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا اور لباس تبدیل کرنے لگا۔

"فی الحال اسے حراست کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یوں سمجھ لو کہ آج رات تم ہمارے مہمان رہوگے۔"

"اور وہاں مار مار کر میری چمڑی ادھیڑی جائے گی تاکہ میں ایسے جرم کا اقرار کرلوں جو میں نے نہیں کیا؟"

"اگر تم نے اصرار کیا تو تمہاری فرمائش ضرور پوری کی جائے گی۔" ہاروے نے بھیانک لہجے میں کہا۔ وہ فلیٹ مقفل کرکے باہر آگئے۔ کولین کے دونوں جانب سادہ لباس سراغ رساں تھے۔ لفٹ بوائے دوسری صبح ہونے والی ریس کے فارم پڑھ رہا تھا۔

نیچے جاتے ہوئے کولین نے پرمزاح لہجے میں لفٹ بوائے سے کہا۔ "یہ بتاؤ آرچی، میں دو سال سے تمہیں ریس دوڑنے والے گھوڑوں کی سوانح حیات پڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، کبھی تم گھڑ دوڑ میں جیتے بھی ہو؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''یہ شخص ہمیں بتانا چاہتا ہے کہ اس صورت حال سے اسے ذرا بھی تشویش نہیں۔'' ہاروے نے سوچا۔

''نہیں جناب، ابھی نہیں۔'' لفٹ بوائے نے منہ لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

لفٹ رکنے پر ہاروے کے دونوں ساتھی کولین کے ساتھ باہر نکل گئے لیکن وہ اندر ہی رک گیا۔ ''پچھلی رات اس بلڈنگ میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی تھی؟'' اس نے لفٹ بوائے سے سوال کیا۔

''جی ہاں، مسٹر کولین کا پستول چل گیا تھا۔''

''کس وقت؟''

''رات تقریباً ایک بجے۔ دوسری منزل والوں نے مجھ سے کہا کہ اوپر گولی چلی ہے۔ کہیں کوئی زخمی تو نہیں ہوگیا۔ تو میں نے مسٹر کولین کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی لیکن وہ بالکل ٹھیک تھے۔ بس ذرا خوف زدہ تھے۔ کہنے لگے آر چی آج میں بال بال بچا ہوں۔ دوبارہ پستول کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا تو میں نے غالیچہ گولی والی جگہ پر ڈال دیا کہ مالک مکان کو پتا نہ چل سکے۔''

''جب تم اس کے فلیٹ میں داخل ہوئے تو ریوالور کہاں تھا؟''

''فرش پر پڑا تھا۔ مسٹر کولین خوفزدہ ہو گئے تھے اور پستول ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔''

ہاروے امید کر رہا تھا کہ لفٹ بوائے نے ریوالور کولین کے ہاتھ میں دیکھا ہوگا جس سے اس کے خوفزدہ ہونے کی قلعی کھل جائے گی لیکن اب اسے احساس ہوا کہ کولین اس کی توقعات سے کہیں بڑھ کر ذہین نکلا۔ وہ لفٹ سے باہر نکل آیا۔

''کیا مسٹر کولین کسی مشکل میں پھنس گئے ہیں؟'' لفٹ بوائے نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ہم اس کے اعزاز میں ایک عشائیہ دے رہے ہیں۔'' ہاروے نے جلے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور عمارت سے باہر نکل آیا۔ جوں جوں وہ اس معاملے پر غور کرتا تھا۔ اس کی ناپسندیدگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے گورکھ دھندے کے ٹکڑے علیحدہ کر کے انہیں بڑی احتیاط سے ایسی جگہوں پر چھپا دیا ہو کہ کوئی دوسرا آدمی انہیں تلاش کرلے تو فوراً ہی دستیاب ہوجائیں اور تمام ٹکڑے آسانی کے ساتھ بالکل صحیح جگہ دوبارہ جوڑ دیے جائیں تاکہ اس شخص کولین کی ترتیب دی ہوئی صورت حال سمجھنے میں ذرا بھی وقت نہ ہو۔ نہ ہی وہ کوئی

غلطی کر پائے۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اپنے سا[illegible] کے قریب پہنچ گیا اور پھر وہ میکس کے ذریعے متعلقہ [illegible] پہنچ گئے۔ انہوں نے کولین پر کوئی دفعہ عائد نہیں کی [illegible] کی جامہ تلاشی لے کر اسے ایک کمرے میں بند کر دیا۔

ہاروے نے کولین کے فلیٹ سے برآمد ہونے [illegible] ریوالور اور فرش میں سے نکالی ہوئی گولی اپنے کیپٹن [illegible] سامنے پیش کر دی جوان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

''تم اسے لے آئے ہو؟''

''جی ہاں، اس کا کہنا ہے کہ گزشتہ شب وہ [illegible] اپنے ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ اچانک گولی [illegible] جو کہ فرش میں پیوست ہوگئی۔ یہ رات ایک بجے کا واقعہ [illegible]''

کیپٹن کو یہ صورت حال قطعاً پسند نہیں آئی۔ ''[illegible] نے ہمارے پیرافن ٹیسٹ کا راستہ بند کر دیا۔ کیوں ٹھیک [illegible] ناں؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے اس نے اپنے ریوالو[ر] [illegible] لومبارڈ کو قتل کیا پھر گھر جا کر اس نے ریوالور میں مزید [illegible] گولی ڈالی اور نال کا رخ فرش کی طرف کر کے دوسری [illegible] چلائی تاکہ جب ہم بارود کے ذرات کا پتا چلانے کے [illegible] اس کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ لیں تو وہ کہہ سکے کہ یہ [illegible] اتفاقیہ گولی چلنے والے کے ہیں۔ ان کا لومبارڈ کے [illegible] کوئی تعلق نہیں۔ یہ دونوں چیزیں تجربہ گاہ میں بھیج [illegible]''

کیپٹن دراز قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس [illegible] سفید ہو چلے تھے لیکن بھویں بالکل سیاہ تھیں۔

''انہوں نے لومبارڈ کے جسم سے نکلنے والی گو[لی کے] بارے میں رپورٹ دے دی ہے؟''

''نہیں، لیکن کچھ دیر میں آجانی چاہیے۔''

''جب تک تجربہ گاہ سے رپورٹ آئے، ہم ا[س سے] کچھ سوالات پوچھ لیں کیپٹن۔''

وہ جب کمرے میں داخل ہوئے تو کولین [illegible] انداز میں سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر اڑا [رہا تھا]۔ ہاروے نے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں میں د[با] سگریٹ کھینچ لی۔ ''اٹھو، ادھر بیٹھو۔'' اس نے دوسری [کرسی کی] طرف اشارہ کیا۔ کولین نے کسی ردعمل کا اظہ[ار نہیں] کیا اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا جس کے اوپر شیڈ د[ار بلب] لٹک رہا تھا۔ ہاروے نے وہ بلب روشن کر دیا او[ر کرسی] انتہائی تیز دودھیا روشنی میں نہا گیا جس کا دائرہ کرسی [تک] محدود تھا۔ اس نے کمرے میں روشن پہلا بلب [بجھا دیا] اور کمرے کا بقیہ حصہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

کیپٹن نے گھسے پٹے جملے سے پوچھ گچھ کا آغاز [کیا]

یہ جاننا چاہتے ہیں کہ گزشتہ شب تمہاری کیا مصروفیات تھیں؟''

''میں رات نو بجے اپنے فلیٹ سے نکلا۔'' کولین نے جواب دیا۔ ''اور ٹہلتا ہوا اورنل اسٹریٹ تک گیا جس کے کونے پر سگار فروخت کرنے والے کی دکان ہے۔ وہاں سے میں نے ایک فون کیا۔''

تاریکی میں کیپٹن کی شہادت والی انگلی روشنی کے دائرے میں داخل ہوئی۔ ''تم نے کسے فون کیا؟''

''ایڈ منڈ لومبارڈ کو۔''

انہیں اس بے جھجک اعتراف کی ذرا بھی توقع نہیں تھی۔ کیپٹن کا اگلا سوال ادائیگی کی حسرت لیے خاموش ہوگیا۔ سوالوں کی بوچھاڑ میں خلاف معمول ایک چھوٹا سا وقفہ پیدا ہوگیا۔ ''بولتے رہو۔'' کیپٹن نے جھلا کر کہا۔

''وہ گھر پر نہیں تھا۔ میں سگار کی دکان سے باہر ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا اور پھر دوبارہ لومبارڈ کو فون کیا۔ اس مرتبہ وہ مل گیا۔ میں نے کہا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے معلوم تھا کہ میں کیوں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اسے تو علم تھا لیکن ہم نہیں جانتے۔''

''وہ ایک ادارے کے لیے کام کرتا ہے جو گھڑدوڑ کے شوقین لوگوں کی شرطیں قبول کرتا ہے۔ لیکن لومبارڈ دیانت دار نہیں تھا۔ وہ تجربہ کار تھا، اسے معلوم تھا کہ کس دوڑ میں کون سے گھوڑے بالکل نہیں جیت سکتے۔ جب کوئی ایسے گھوڑے پر شرط لگاتا تھا تو وہ ان شرطوں کو اپنے ادارے سے چھپا کر داؤ پر لگی ہوئی رقم خود ہی ہضم کرلیا کرتا تھا اور وہ گھوڑے جیتتے بھی نہیں تھے۔ اگر اتفاق سے کوئی گھوڑا جیت گیا تھا تو وہ شرط لگانے والے کو جیت کی رقم اپنی جیب سے ادا کر دیتا تھا۔ اس نے یہ حرکت کچھ زیادہ ہی شروع کر دی تھی۔ میں نے ایک گھوڑے پر بیس اور ایک کے بھاؤ سے سو ڈالرز کی شرط لگائی۔ لومبارڈ نے میری رقم جیب میں رکھ لی لیکن اتفاق سے وہ گھوڑا جیت گیا۔ اس کے پاس مجھے ادا کرنے کے لیے دو ہزار ڈالرز نہیں تھے اور اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ جب اس کے ادارے کو میرے توسط سے اس کی بددیانتی کا علم ہوگا تو اس کی ملازمت ختم ہونے کے ساتھ اسے ہضم کی ہوئی رقوم کا حساب بھی دینا پڑے گا۔ اس لیے وہ ملازمت چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ پچھلے ہفتے مجھے اس کا سراغ مل گیا کہ وہ کس ہوٹل میں چھپا ہوا ہے۔ گزشتہ شب میں نے اسے فون کر کے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وہ راضی ہوگیا اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ وہ مجھ سے کہاں ملنے آئے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں فلاں جگہ موجود ہوں اور اسے آدھ

گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں کہ وہ رقم لے کر آجائے۔''

''اور وہ نہیں آیا؟''

کولین نے کاندھے اچکائے۔ ''میں نے اسے نہ آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ فوراً ٹیکسی پکڑی اور پانچ منٹ بعد اس کے ہوٹل کی لابی میں موجود تھا۔ جب میں نے اس کے کمرے پر دستک دی تو وہ سمجھا کہ ہوٹل کا ملازم اس کا سامان اٹھانے آیا ہے۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ میرا قیاس درست نکلا۔ وہ ہوٹل سے فرار ہونے کے لیے اپنا سامان باندھ چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ مجھے دو ہزار ڈالرز ادا کردے تو ہمارا حساب بے باق ہوجائے گا اور میں آئندہ کبھی اسے پریشان نہیں کروں گا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ بری طرح پھنس گیا ہے تو اس نے دانش مندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے فوراً کوٹ کی اندرونی جیب سے دو ہزار ڈالرز نکال کر میرے حوالے کر دیے اور کہا کہ میں اسے رقم کی وصولیابی کی رسید دے دوں تاکہ میں آئندہ کبھی دوبارہ اس سے رقم کا تقاضا نہ کرسکوں۔ بات معقول تھی۔ میں نے ہوٹل کے پیڈ پر اسے دو ہزار ڈالرز وصول کرنے کی رسید لکھ دی۔''

ملگجے اندھیرے میں ہاروے اور کیپٹن کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ انہیں مقتول کی جیبوں میں سے کولین کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی رسید ملی تھی۔

''اب ختم بھی کرو یہ کہانی۔'' کیپٹن نے خشک لہجے میں کہا۔

''بس ختم ہوگئی۔ میں نے اس سے کہا کہ ہمارا حساب صاف ہوگیا اور اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے میرے سامنے ہی اپنا سامان کھولنا شروع کر دیا تھا۔ کہنے لگا کہ اب اس کا کیا فائدہ یہ ہوٹل دوسروں سے بہتر ہے۔''

''تو یہ ہے تمہاری کہانی۔'' کیپٹن نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تم کچھ بتانا تو نہیں بھولے؟''

اور پھر ہاروے نے چیخ کر کہا۔ ''تم نے اسے قتل کرنے کا ذکر نہیں کیا! ہمیں تمہاری کہانی کے اس حصے سے زیادہ دلچسپی ہے۔''

''میں نے اسے قتل نہیں کیا اس لیے میری کہانی میں وہ حصہ شامل نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم۔'' کولین نے پرسکون انداز میں جواب دیا لیکن اس مرتبہ اس کی آواز قدرے بلند ہوگئی تھی۔

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جب تم لومبارڈ سے ملاقات کرنے گئے تو تمہارے پاس ریوالور نہیں تھا؟'' ہاروے نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”یہ میں نے کب کہا؟ بلاشبہ میرے پاس اس وقت ریوالور موجود تھا۔“ اس اعتراف نے پولیس افسران کے قدم اکھاڑ دیے۔ انہیں جواب میں انکار کی توقع تھی اور وہ ذہنی طور پر صرف تردید سننے کے لیے تیار تھے۔ چند لمحوں کے لیے کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔

”اگر تم لومبارڈ کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے تو پھر اپنے ساتھ ریوالور لے کر کیوں ملاقات کے لیے گئے تھے؟“ کیپٹن نے سخت لہجے میں دریافت کیا لیکن اس مرتبہ لب و لہجے کی سختی میں دراڑیں محسوس کی جاسکتی تھیں۔

”اپنی حفاظت کے لیے تاکہ وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ اگر میں اسے اپنے ریوالور کی جھلک نہ دکھاتا تو کیا وہ اتنی آسانی سے مجھے رقم ادا کر دیتا؟ اگر وہ یہ نہ دیکھ لیتا کہ میرا ایک ہاتھ جیب میں ریوالور کے دستے پر جما ہوا ہے تو کیا وہ مجھے دو ہزار ڈالرز کی رقم سمیت اپنے کمرے سے باہر نکلنے دیتا؟“

ہاروے نے تاریکی سے نکل کر کولین کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ کر کئی مرتبہ زوردار جھٹکے دیے۔ ”جھوٹ مت بولو۔“ اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے ادا کیا۔ ”تمہیں یہاں صرف اس لیے لایا گیا ہے کہ ہم حقیقت جاننا چاہتے ہیں۔“ اس نے کولین کے عقب میں کھڑے ہو کر مٹھی میں جکڑے ہوئے بال اس طرح کھینچے کہ اس کا چہرہ اوپر کی طرف انتہائی تیز روشنی والے بلب کی جانب اٹھ گیا۔ کولین نے آنکھیں بند کر لیں۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اصل کس طرح پیش آیا تھا۔ تم نے لومبارڈ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ پھر تم نے اس کی جیبوں میں سے دو ہزار ڈالرز نکالے اور ایک کاغذ پر وصولیابی کی رسید لکھی جس پر ہوٹل کا نام اور پتا چھپا ہوا تھا۔ وہ رسید تم نے مقتول کی جیب میں رکھی اور کمرے سے باہر نکل آئے ٹھیک ہے؟ جواب دو! یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا؟“

کولین کا سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ اس نے زور زور سے سر کو نفی میں جنبش دینے کی کوشش کی۔

ہاروے نے اپنے افسر کا فولادی گھونسا تاریکی سے روشنی کی طرف لپکتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے کولین کا چہرہ سیدھا کرتے ہوئے آگے کی طرف بڑھایا۔ گھونسے کے پیچھے نفرت اور ایک ذہین آدمی کی ذہانت سے شکست کھانے کے غصے کی قوت پوشیدہ تھی۔ کمرے میں ایسی آواز گونجی جیسے آہنی ہتھوڑا پوری قوت سے گوشت پوست کے ٹکڑے پر مارا گیا ہو۔ ہاروے کا ہاتھ جھنجنا گیا۔ اس نے کولین کے بال چھوڑ دیے۔ کیپٹن کا گھونسا دوبارہ تاریکی میں مدغم ہو گیا اور مجرم ربر کے بنے ہوئے مجسمے کے مانند کرسی پر ڈھلک گیا۔

کیپٹن نے دروازہ کھول کر ایک ماتحت کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ کاسک ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

ہاروے ملزم کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے چہرے پر تھپڑ مار رہا تھا۔ ”ہوش میں آؤ مسٹر۔ ابھی سے ہمت ہار بیٹھے۔ ابھی تمہیں بہت کچھ برداشت کرنا ہے۔“

کولین کی پلکوں نے جنبش کی۔ ہاروے نے اس کے حلق پر ہاتھ جما کر سر کرسی کی پشت سے لگا دیا۔ ”جب تم کمرے سے باہر نکل کر نیچے جانے لگے تو تمہیں ہوٹل کا ملازم نظر آیا جو لومبارڈ کا سامان اٹھانے جا رہا تھا۔ تم نے اس سے یہ کیوں کہا کہ اب اسے وہاں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ لومبارڈ نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے اور وہ اس ہوٹل میں مزید قیام کرے گا؟ کیوں؟“

”کیونکہ۔“ کولین کے منہ سے دھیمی آواز نکلی۔ ”مجھے ڈر تھا کہ لومبارڈ یہ نہ سمجھے کہ میں واپس لوٹ آیا ہوں، کہیں غصے میں دروازہ کھولتے ہی ملازم پر گولی نہ چلا دے۔“

”نہیں، اس کی وجہ یہ تھی تم لومبارڈ کو قتل کر چکے تھے اور تمہیں ڈر تھا کہ ملازم دروازہ کھولتے ہی لاش دیکھ لے گا۔ تم چاہتے تھے کہ مقتول کی لاش تمہارے رخصت ہونے سے پہلے دریافت نہ کی جائے۔“

”اگر مجھے یہ خوف ہوتا تو میں فوراً ہی ہوٹل سے فرار ہو جاتا جبکہ نیچے آکر میں نے ہوٹل کے ریستوران میں کافی پی تھی اور تقریباً دس منٹ وہاں گزارے تھے۔“

اس امر کے کئی گواہ موجود تھے کہ کولین نے نیچے آکر کافی ہاؤس میں ایک کپ کافی پی تھی جس کے دوران وہ سگریٹ نوشی بھی کرتا رہا۔ ہوٹل کے استقبالیہ کلرک نے اسے اوپر جاتے ہوئے، نیچے آتے ہوئے اور پھر کافی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔

کاسک نے کمرے میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ لب کشائی کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”وہ دو ہزار ڈالرز کہاں گئے جو تم نے لومبارڈ کو قتل کرنے کے بعد اس کی جیب سے نکالے تھے؟“ جملے کا آخری حصہ اس نے بڑی روانی سے ادا کیا تھا۔

کولین کے ہوش و حواس اس وقت تک پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے لیکن اس نے کاسک کا بچھایا ہوا لفظی جال محسوس کر لیا۔ ”وہ دو ہزار جو لومبارڈ نے مجھے خود اپنے ہاتھوں سے دیے تھے وہ میں نے آج صبح اپنے بینک میں جمع کرا دیے تھے۔“

انہیں اس حقیقت کا علم تھا۔ اس روز صبح ہی سے کولین کی نگرانی کی جا رہی تھی اور دوسری طرف بڑی تیزی سے گواہوں کے بیانات قلم بند کیے جا رہے تھے تاکہ مکمل تیاریوں کے ساتھ مجرم کا سامنا کیا جاسکے اور جیسے ہی وہ کسی جگہ جھوٹ بولے، فوراً متعلقہ گواہ کے ذریعے اس کی تردید کر کے اسے اقبال جرم پر مجبور کر دیا جائے۔ لیکن جس طرح وہ نیم غشی کی حالت میں اس کے جال سے بچ نکلا تھا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ہاروے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ انہوں نے مجرم پر ہاتھ ڈالنے میں عجلت سے کام لیا۔ ان کی تیاری ناکافی تھی لیکن کولین کو گرفتار کرنے سے قبل جو شہادتیں ان کے سامنے آئی تھیں ان کے پیش نظر انہیں پورا یقین تھا کہ وہ مجرم کو پھانسی پر لٹکانے کے لیے بہت کافی ثابت ہوں گی اور یہ بھی کہ جب کولین کے سامنے وہ تمام ثبوت پیش کیے جائیں گے تو وہ خود ہی لومبارڈ کو قتل کرنے کا اعتراف کر لے گا۔ سگار فروخت کرنے والی دکان پر ملازم کلرک کا بیان تھا کہ کولین ان کا پرانا گاہک ہے اور اس نے گزشتہ شب اس کی دکان سے دو بار کسی جگہ فون کیا تھا۔ ہوٹل کے استقبالیہ کلرک کا بیان تھا کہ اس نے کولین کو اوپر جاتے ہوئے اور کچھ دیر بعد نیچے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ کولین کے اوپر جانے سے قبل لومبارڈ زندہ تھا کیونکہ صرف پانچ منٹ پہلے اس نے فون پر ہوٹل کے ملازم کو سامان نیچے لے جانے کے لیے طلب کیا تھا۔ انہیں مقتول کی جیبوں میں سے مجرم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو ہزار ڈالر وصولیابی کی رسید ملی تھی جو ثابت کرتی تھی کہ کولین اس ہوٹل میں مقتول سے ملنے گیا تھا۔ پھر دوسری صبح ملزم نے بینک میں دو ہزار ڈالرز جمع کرائے۔ جب وہ گرفتاری کے لیے کولین کے فلیٹ پر گئے تو وہ ریوالور بھی مل گیا جس سے گولی چلائی گئی تھی۔ عام حالات میں کسی کے خلاف اتنے بہت سے ثبوت مجرم کو خود ہی اقبال جرم پر مجبور کر دیتے ہیں لیکن یہ معاملہ شروع ہی سے مختلف ثابت ہو رہا تھا اور اب ہاروے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ انہوں نے ملزم کو گرفتار کر کے عجلت سے کام لیا، انہیں مزید شہادتیں جمع کرنی تھیں۔

ہاروے اپنے افسر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا تھا کاسک کی مدد کے لیے ایک اور پولیس والا اندر چلا گیا۔

”میں اس لیے باہر نکل آیا کہ اگر میں تھوڑی دیر اندر رہتا تو اس شیطان کی دو چار ہڈیاں توڑ دیتا۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”ان سے کہہ دو کہ یہ تمام رات اسے نہ سونے دیں اور متواتر سوالات کرتے رہیں۔ کہیں تو وہ غلطی کرے گا۔ کبھی تو اس سے چوک ہوگی۔ نیند کا غلبہ اتنا برا ہوتا ہے کہ آدمی کی

تین چیزیں

تین چیزیں ایک جگہ پرورش پاتی ہیں۔
1۔ پھول 2۔ کانٹے 3۔ خوشبو۔
تین چیزیں ہر کسی کو ملتی ہیں۔
1۔ خوشی 2۔ غم 3۔ موت۔
تین چیزیں ہر ایک کی مختلف ہوتی ہیں۔
1۔ صورت 2 سیرت 3 قسمت۔
تین چیزوں کو کبھی چھوٹا مت سمجھو۔
1۔ قرض 2 فرض 3 مرض۔
تین چیزیں کبھی نہ ٹھکراؤ۔
1۔ خلوص 2۔ تحفہ 3۔ محبت۔
تین چیزیں اللہ کو بہت پسند ہیں۔
1۔ گرمی کا روزہ 2۔ سردی کا وضو 3۔ جوانی کی توبہ۔

※※※

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا

محتاجی اور غربت سات چیزوں سے آتی ہے۔
1۔ جلدی جلدی نماز پڑھنے سے۔
2۔ کھڑے ہو کر پانی پینے سے۔
3۔ منہ سے چراغ بجھانے سے۔
4۔ آستین یا دامن سے منہ صاف کرنے سے۔
5۔ عصر کے بعد گھر میں جھاڑو دینے سے۔
6۔ دانتوں سے ناخن توڑنے سے۔
7۔ نماز کے بعد فوراً سونے سے۔

مرسلہ: عون عباس بابر، اوکاڑہ

※※※

سنہرے اقوال

☆ قیامت کے دن مومن کی میزان عمل میں سب سے زیادہ وزنی چیز جو رکھی جائے گی وہ اس کے اخلاق ہیں۔
☆ دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے۔
☆ ظالموں کو معاف کرنا، مظلوموں پر ظلم کرنا ہے۔
☆ لوگوں سے ملتے وقت اتنا مت جھکو کہ اٹھتے وقت سہارا لینا پڑے۔

مرسلہ: توصیف احمد، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

گرفت شعور پر کمزور پڑ جاتی ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب لاشعور بولنے لگتا ہے اور لاشعور کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

''ویسے آپ کا کیا خیال ہے کیپٹن؟'' ہاروے نے دریافت کیا۔

''اس ہی نے لومبارڈ کو قتل کیا ہے۔ اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم اس سے اعتراف کرانے میں ناکام رہے۔ اس کے پاس ہر سوال کا جواب پہلے سے تیار ہے۔ ہر نقل و حرکت کا جواز موجود ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس نے مقتول سے ٹیلیفون پر گفتگو کی تھی وہ ملاقات کے لیے مقتول کے کمرے میں گیا تھا اور ملاقات کے وقت اس کے پاس ریوالور تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم نے اگر اس کا کوئی ایک جھوٹ بھی پکڑ لیا تو باقی سب کچھ وہ خود قبول کرلے گا۔ وہ ہر چیز کا اعتراف کرتا ہے۔ بس گولی چلا کر لومبارڈ کو قتل کرنے کا اقرار نہیں کرتا اور یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی عینی گواہ موجود نہیں۔ اس کے خلاف ہمارے پاس صرف واقعاتی شہادتیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہی لومبارڈ کا قاتل ہے۔ ان واقعاتی شہادتوں کی بنیاد پر میں عدالت میں مقدمہ پیش کرنے پر ملزم کو خود اپنے ہی ہاتھوں رہا کرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر ہم اس سے زبردستی اقبال جرم کراتے ہیں تو یہ عدالت کے سامنے پیش ہوتے ہی پولیس کے مظالم کی داستان چھیڑ دے گا اور ارکان جیوری پورا مقدمہ سنے بغیر ہی اسے جرم سے بری کردیں گے۔ اس ریاست میں تمام حقوق صرف مجرموں کو حاصل ہیں اور تمام فرائض صرف پولیس والوں کے لیے ہوتے ہیں۔''

''پیٹر نے اس زاویے پر بھی تفتیش کی تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ پرانے زمانے کی عمارت ہے جس کی موٹی موٹی دیواریں ہیں...... مقتول کے برابر والا کمرا خالی تھا۔ جب تک کوئی دروازے کے قریب سے نہ گزرے، گولی کی آواز نہیں سن سکتا۔ اور میرا خیال ہے کہ جب کولین نے لومبارڈ کو گولی مار کر ہلاک کیا، اس وقت اتفاق سے راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا یا پھر اس کے شیطانی ذہن نے آواز دبانے کے لیے کوئی ترکیب سوچ لی ہوگی۔'' کیپٹن تھکے ہوئے انداز میں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔ ''تم ایسا کرو ہاروے، واپس اس کے فلیٹ پر جاؤ اور اچھی طرح تلاشی لو۔ ممکن ہے ہمیں کوئی ایسی چیز مل جائے جو اس شخص کو اقرار کرنے پر مجبور کردے۔ ہمیں آلۂ قتل مل گیا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے قتل کا محرک یعنی دو ہزار ڈالرز بینک میں جمع کرادیے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس وقت اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ خوب اچھی طرح تلاشی لینا، اطمینان کے ساتھ، ممکن ہے تمہیں کوئی ایسا ثبوت مل جائے جسے دیکھ کر یہ شخص ایک دفعہ خوف زدہ ہوجائے۔''

''بہتر جناب۔''

☆☆☆

ہاروے اپنے کام میں تجربہ کار تھا۔ اسے کولین کے فلیٹ میں جو چیزیں نظر آئیں۔ اس نے ایک فہرست بنالی۔ نشست گاہ میں اخبار میں شائع ہونے والا حرفی معما، پنسل، اس سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا جو کولین اس وقت پی رہا تھا، جب وہ اسے گرفتار کرنے آئے تھے۔ سگریٹ کا پیکٹ جس میں آدھی سگریٹیں باقی تھیں۔

غسل خانے میں جو اشیا موجود تھیں ان میں پندرہ استعمال شدہ بلیڈز شامل تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کولین استعمال شدہ اشیا پھینکنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ باورچی خانے میں تیس بتیس لال بیگ تھے اور ان کے علاوہ وہاں کئی درجن بھر خالی ڈبے پڑے تھے جن میں کبھی خورونوش کی اشیاء موجود تھیں۔ ان میں زیادہ تر بیئر کے ڈبے تھے۔ خواب گاہ میں ایک الماری کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ جس میں تین سوٹ بھی شامل تھے اور ایک کا رنگ گہرا خاکی تھا۔ یہ سوٹ پہن کر کولین مقتول سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ اس سوٹ کی جیبوں سے کینیڈا کا ایک سکہ کسی عورت کی بہت پرانی سی دھندلی تصویر اور سگریٹ بنانے والے کاغذ کی ایک گڈی جو آدھی استعمال کی جا چکی تھی، برآمد ہوئے۔ دوسرے سوٹوں میں ریزگاری کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں نکلا۔

ہاروے کو فلیٹ کی تلاشی لینے میں پچاس منٹ لگ گئے اور اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ قطعی طور پر حوصلہ شکن تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ آخر اسے وہاں کس چیز کی تلاش تھی، آلۂ قتل برآمد ہوچکا تھا۔ قتل کے محرک کا انہیں علم تھا۔ ان کے علاوہ اب یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ فلیٹ میں کہیں کولین کے ہاتھ سے لکھا ہوا اعتراف جرم مل جائے یا پھر کوئی ایسی تصویر جس میں کولین کو لومبارڈ کو قتل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہو۔

ہاروے واپس آگیا۔

''ہمارے معزز مہمان کی طبیعت کیسی ہے؟'' ہاروے نے کیپٹن کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے البتہ پیٹر اور کاسک کی حالت ابتر نظر آتی ہے جو اس پر محنت کررہے ہیں۔ تم سناؤ تمہارے ہاتھ کیا لگا۔''

''کچھ لال بیگ اور پندرہ استعمال شدہ بلیڈز۔''

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، کیپٹن نے ریسیور کان سے لگایا۔

''ہیلو بول رہا ہوں۔'' پھر اس نے بھویں اچکاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے ہاروے کی طرف دیکھا۔ ''ہاں میں نے فون کیا تھا۔ مقتول کے جسم سے نکلنے والی گولی کی رپورٹ کا کیا ہوا؟'' اس کے بعد کیپٹن خاموش ہوگیا۔ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ اس نے کئی بار تھوک نگلنے کی کوشش کی اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ کمرے پر خاموشی طاری ہوگئی۔

چند لمحوں بعد کیپٹن نے کہا۔ ''کولین کا ریوالور اعشاریہ اڑتیس بور کا ہے......''

''میں جانتا ہوں۔'' ہاروے نے کیپٹن کی بات کاٹتے ہوئے بے صبری سے کہا۔

''تو تمہیں معلوم ہے؟'' کیپٹن نے غصے میں بپھرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے ماتحت پر غصہ آرہا تھا۔ اسے ساری دنیا پر غصہ آرہا تھا اور ہاروے اس دنیا کا واحد فرد تھا جو اس وقت اس کے سامنے موجود تھا۔ ''ہوسکتا ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہو کہ مقتول کے جسم سے برآمد ہونے والی گولی اعشاریہ بتیس بور کی ہے! اب تم سمجھے اس کا کیا مطلب ہوا؟''

ہاروے کی نظریں فرش کی جانب جھک گئیں۔ کچھ دیر کمرے پر سکوت طاری رہا پھر ہاروے نے بے دلی سے دریافت کیا۔ ''اور وہ گولی جو ہم نے کولین کے فلیٹ میں چوبی فرش سے نکالی تھی؟''

''وہ اعشاریہ اڑتیس بور کی ہے اور اسی ریوالور سے چلائی گئی تھی جو کولین کی ملکیت ہے۔'' کیپٹن نے خشک لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھوں کی کہنیاں میز کی سطح پر ٹیک کر انگلیوں سے ٹینٹ کی شکل بنا کر افسردگی سے اسے گھورنے لگا۔

ہاروے نے ناقابل یقین انداز میں سر ہلا کر کمرے کی چاروں دیواروں کو دیکھا جیسے وہ ان سے اخلاقی حمایت کی توقع کررہا ہو۔ ''تم کچھ بھی کہو کیپٹن، میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کولین مجرم نہیں ہے۔''

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ کولین مجرم نہیں ہے، یہ تو تجربہ گاہ والے کہہ رہے ہیں۔'' کیپٹن نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اور وہ لوگ کبھی جھوٹ نہیں بولتے کیونکہ ان کے آلے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ کیا تم اپنے خیالات کو سائنسی آلات سے زیادہ صحیح تصور کرتے ہو؟''

اگر رانگ نمبر ڈائل کرنا تھا تو میرا ہی کیوں؟

''کیپٹن، تجربہ گاہ کی رپورٹ تم اپنے پاس ہی رکھو میں انسانی فطرت کے بارے میں کچھ واقفیت رکھتا ہوں اور وہ علم بھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کولین نے اعشاریہ بتیس بور کے ریوالور سے لومبارڈ کو قتل کیا اور گھر واپس جاتے ہوئے اس نے راستے میں کہیں وہ ریوالور پھینک دیا؟ میں اسے تسلیم نہیں کرسکتا۔ روشن سڑکوں پر کوئی بھی اتنی آسانی سے ریوالور نہیں پھینک سکتا۔ اور اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو اب تک آلۂ قتل ہمارے سامنے آچکا ہوتا۔''

''میں یہ سب کچھ نہیں جانتا کیپٹن۔'' ہاروے نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ وہ مجرم ہے۔ جرم اس کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہے۔ اس کے چہرے پر واضح لفظوں میں لفظ قاتل لکھا ہوا ہے۔ میری تعلیم و تربیت اور میرا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ مجرم ہے۔''

''لیکن تجربہ گاہ کی رپورٹ؟''

''ہم نے اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی، اس نے دروازہ کھولا اور ہمیں دیکھ کر نہ تو وہ گھبرایا، نہ ہی اسے کوئی تعجب ہوا۔'' ہاروے نے کیپٹن کا اعتراض نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پولیس کی ملازمت میں بہت سے شہریوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔ ان میں مجرم بھی تھے اور بے گناہ شہری بھی، کمزور بھی اور طاقت ور بھی۔ ایک بار میں تفتیش کے سلسلے میں کانگریس کے رکن سے بھی ملا تھا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میرا تعلق ہیڈ کوارٹر سے ہے تو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ حالانکہ کانگریس کا رکن بہت طاقت ور ہوتا ہے اور اس کا اشارہ مجھے ملازمت سے برخاست کرسکتا تھا۔ پولیس کا نام سن کر بے گناہ شہریوں کا بھی رنگ اڑ جاتا ہے لیکن نہیں کولین اس قدر بے گناہ تھا کہ اس کا رنگ پھیکا نہیں پڑا۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہماری آمد کا منتظر تھا۔

اس لیے ہمیں اپنے دروازے پر دیکھ کر اسے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا نہ تشویش لاحق ہوئی۔ اگر وہ بے گناہ ہوتا تو ضرور اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ آخر پولیس والے کیوں اس سے ملنے آئے تھے۔ لیکن اسے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ وہ نشست گاہ میں جا کر ہماری نظروں کے سامنے اخبار اٹھاتا ہے اور پنسل سے معمے کا ایک لفظ بھرنے لگتا ہے جیسے کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی نہ ہو۔ جیسے ہمارے وجود محض پتھر کے مجسموں جتنی اہمیت رکھتے ہوں۔ اس کا سارا ردعمل جھوٹ کا بہت بڑا پلندہ ہے۔ وہ پرسکون تھا اور بے پروائی ظاہر کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ضرورت سے کہیں زیادہ پرسکون تھا اور بے پروائی کے ظہار میں بہت آگے بڑھ گیا تم سمجھے کیپٹن۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟ وہ بے گناہ اور معصومیت کے اظہار میں ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ گیا۔ اتنی معصومیت جرم کا ثبوت بن جاتی ہے۔ اس نے یہ خیال نہیں کیا کہ وہ کسی ردعمل کا اظہار نہ کر کے خود کو عام بے گناہ شہری کی صف سے علیحدہ کر رہا ہے۔ اگر اس نے واقعی لومبارڈ کو قتل نہیں کیا تو اس صورت میں اسے اور بھی زیادہ خوفزدہ اور پریشان ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہم اسے مجرم سمجھتے ہوئے قتل کا الزام ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے زیادہ پریشان ہونا چاہیے کہ وہ خود اپنی جانب سے مقتول سے ملاقات کرنے اور ملاقات کے وقت ریوالور ساتھ لے جانے کا اقرار کر چکا ہے۔ یہ اعتراف ہمارے ہاتھ مضبوط کرتا ہے، اس کی بے گناہی کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ رقم کا معاملہ ہے جو قتل کا محرک فراہم کرتا ہے۔ یہ حقیقت کہ وہ ذرا بھی خوفزدہ اور پریشان نہیں ہے، یہ ثابت کرتی ہے کہ وہی قاتل ہے اور وہ ہماری آمد کا منتظر تھا اور اس نے پہلے ہی سے تمام غلط سوالوں کے صحیح جواب سوچ رکھے تھے اور ہر غلط حرکت کا ایک جواز پیدا کیا ہوا تھا۔ میں کہتا ہوں کیپٹن وہی لومبارڈ کا قاتل ہے۔ اگر وہ مجرم نہیں ہے تو پھر میں یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ لومبارڈ کو قتل نہیں کیا گیا۔ اس نے ناممکن طریقے پر عمل کرتے ہوئے خودکشی کی تھی۔“

”تو ثابت کرو نا، یہاں کھڑے میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو۔ جاؤ کچھ کرو۔“ کیپٹن نے جھلا کر کہا۔ ”صبح مجھے اسے رہا کرنا پڑے گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم اس پر الزام عائد کیے بغیر زیادہ دیر اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتے۔“

”مجھ پر بگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔“ ہاروے نے منہ... لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری کیفیت تم سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔“

”مجھے نتائج درکار ہیں، دلائل نہیں۔ اگر تم کچھ نہیں کر سکتے تو گھر جا کر سو جاؤ۔“

”ٹھیک ہے کیپٹن، تم اتنا تو کر سکتے ہو کہ دوپہر تک اسے آزاد نہ کرو؟“ ہاروے نے تقریباً التجا کرنے والے انداز میں کہا۔ ”مجھے ایک موقع دو، میں زندگی میں کبھی کسی مجرم کے بارے میں اتنا پر یقین نہیں ہوا جتنا کہ اب ہوں۔“

”ٹھیک ہے اب تم دفع ہو جاؤ تاکہ میں مکمل سکون کے ساتھ موجودہ صورت حال سے پوری طرح لطف اٹھا سکوں۔“

ہاروے نے چلتے چلتے اس کمرے میں جھانک کر دیکھا جہاں اس کے ساتھی کولین کی میزبانی میں مصروف تھے۔ کاسک ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔

”ہمیں معلوم ہے کہ تم نے ہی لومبارڈ کو قتل کیا ہے۔“ وہ تھکے تھکے لہجے میں بول رہا تھا۔ ”تم اعتراف کر کے خود کو اس عذاب سے چھٹکارا دلا سکتے ہو۔“

”ایسے جرم کا اعتراف کر لوں جو میں نے نہیں کیا؟“ کولین نے جواب دیا۔ وہ مجرم کا حلیہ مکمل طور پر تبدیل کرنے میں تو کامیاب ہو گئے تھے لیکن اس کے لہجے کے سکون میں کوئی فرق پیدا نہیں کر سکے۔

ہاروے نے اشارے سے کاسک کو باہر بلایا۔

”اسے حوالات میں بند کر دو تاکہ کچھ دیر آرام کر لے۔“

”کیپٹن کا حکم ہے؟“ کاسک نے پوچھا۔

”نہیں لیکن مقتول کے جسم سے نکلنے والی گولی اعشاریہ بتیس بور کی ہے اس لیے اس پر زیادہ محنت کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو کیپٹن کی مرضی معلوم کر سکتے ہو لیکن میرا مشورہ ہے کہ کچھ دیر بعد جانا۔ اگر ابھی اس کے کمرے میں گئے تو ممکن ہے زندہ واپس نہ آ سکو۔“ ہاروے کو اب بھی کولین کے قاتل ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ مجرم کو کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ مسلسل مار کھانے کی وجہ سے اس کے ذہن نے اپنے گرد جو دفاعی حصار قائم کر لیا ہے، وہ ٹوٹ جائے۔ ممکن ہے پھر پوچھ گچھ فائدہ مند ثابت ہو سکے۔

☆☆☆

سگار فروخت کرنے والی دکان کا کلرک جب صبح سات بجے دکان کھولنے آیا تو اسے یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ وہاں پہلے ہی سے ایک گاہک اس کا منتظر ہے جس نے کئی سال پرانے طرز کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس کی آستینیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ شخص کوڑے کے ڈھیر میں تلاش کرتا رہا ہے۔ کلرک کو خیال آیا کہ ممکن ہے تمباکو کی طلب سے مجبور ہو کر اس شخص نے کچرے کے ڈھیر میں بجھی ہوئی سگریٹوں کے ٹوٹے تلاش کیے ہوں۔

گزشتہ روز کلرک سے پولیس والوں نے بہت سے سوالات دریافت کیے تھے جس کی وجہ سے اس کی نظروں میں اپنی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ کولین نے اس کی دکان سے دو فون کیے اور یہ کہ وہ ان کا پرانا گاہک ہے۔ وہ ہاروے کا حلیہ اور نیند سے بوجھل پلکیں دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کا پولیس سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے اور وہ مزید تفتیش کیے لیے پتا نہیں کب سے دکان کھلنے کا انتظار کر رہا ہے۔

کلرک نے دکان کھولی، ہاروے اندر داخل ہوا۔

”فرمایئے؟“ اس نے روکھے لہجے میں کہا۔

”میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے آیا ہوں۔“

”کیا پھر پولیس......؟“ کلرک نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”میں بتا چکا ہوں جناب کہ میں فون پر ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکا تھا۔“

”میں تم سے گفتگو کے بارے میں کوئی سوال نہیں کر رہا۔ تم نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ کولین تمہارا پرانا گاہک ہے اور وہ تم ہی سے سگریٹ خریدتا ہے؟“

”جی ہاں، تقریباً روزانہ ہی وہ سگریٹ خریدتے تھے۔“

”کس برانڈ کا سگریٹ؟“

کلرک نے کاؤنٹر میں سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال کر اوپر رکھ دیا۔ ”یہ۔“

ہاروے کو وہی برانڈ کولین کے فلیٹ میں نظر آیا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ مشین سے تیار شدہ سگریٹ پینے کا عادی ہے؟“

”درست ہے؟“

”اچھا پرسوں رات اس نے تم سے کیا خریدا تھا، جب وہ فون کرنے یہاں آیا تھا؟“

”اپنے برانڈ کا......“ کلرک جواب دیتے ہوئے رک گیا۔ اس کی نظریں ہاروے کی ہتھیلی پر جمی ہوئی تھیں جس پر ہاتھ سے بنائی جانے والی سگریٹوں کے کاغذ کا آدھا استعمال کیا ہوا پیکٹ رکھا تھا جسے اس نے کولین کے اس کوٹ میں سے نکالا تھا جو وہ مقتول سے ملاقات کے وقت پہنے ہوئے تھا۔

خوبصورت باتیں

زندگی ایک ایسی خوب صورت تتلی ہے جو اپنے خوب صورت رنگین پر دکھا کر ہر انسان کو ورغلاتی ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے پھولوں سے لدی کیاریوں میں گم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

ہر چھوڑ کر جانے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا اور ہر ساتھ رہنے والا شخص ہمارا اپنا نہیں ہوتا۔

☆☆☆

محبت میں یہ قباحت ہے کہ جس سے محبت ہو جائے اسے آسانی سے آزاد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسے آزاد کرنے سے دل کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

☆☆☆

کچھ لوگ تمام عمر دنیا کو جان نہیں پاتے۔ ان کا حال بھیڑ میں گم ہو جانے والے بچے کی مانند ہوتا ہے۔

☆☆☆

دنیا میں جو دیتا ہے وہ لینے کا خیال فوراً پال لیتا ہے۔ یہی خیال طمع بن کر زہریلا ہو جاتا ہے اور محبت کو مار ڈالتا ہے

مرسلہ: احسان سحر۔ میانوالی

”نہیں......“ کلرک نے سگریٹ بنانے والے کاغذ کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے اپنے بیان کی تردید کرتے ہوئے کہا...... ”اسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔ مسٹر کولین نے پرسوں رات مجھ سے یہ پیکٹ خریدا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے وہ اپنے ہاتھوں سے سگریٹ بنا کر پینا چاہتے ہیں۔“

”کیا اس نے کاغذ کے ساتھ سگریٹ بنانے کے لیے تمباکو بھی خریدا تھا؟“

”نہیں، انہوں نے مجھ سے تمباکو نہیں خریدا تھا۔ میں سمجھا کہ ان کے پاس تمباکو ہوگا اور وہ صرف کاغذ خریدنا چاہتے ہیں۔“

ہاروے نے دوسری بار اچھی طرح فلیٹ کی تلاشی لی تھی لیکن سگریٹ بنانے کا تمباکو اسے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے کولمین کے لباسوں کی جیبیں الٹ کر دیکھ لی تھیں لیکن کسی جیب میں تمباکو کی ذرا سی بھی مقدار نظر نہیں آئی۔

نیند سے بوجھل آنکھیں اور سویا ہوا جسم اچانک بیدار ہو گئے۔ سرخ آنکھوں میں زندگی کوندنے لگی اور ڈھیلا ڈھالا بدن کمان کی طرح چست ہو گیا۔ ''پکڑا گیا پکڑا گیا!''

سراغرساں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔

کلرک کاؤنٹر پر جھک کر سراغرساں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''کیا سارے پولیس والے پاگل ہوتے ہیں۔ اس میں بھلا چیخنے چلانے کی کیا بات تھی۔ پولیس کی نوکری سے سگریٹ بیچنے کی ملازمت لاکھ درجے بہتر ہے۔ انسان کا ذہنی توازن تو درست رہتا ہے۔''

چند لمحوں بعد ہاروے دوڑتا ہوا واپس آیا۔ ''بالکل بھول گیا تھا۔ سگریٹ بنانے کے لیے تمباکو کا ایک چھوٹا ڈبا تو دینا۔''

☆☆☆

''ساری رات تم کہاں غائب رہے؟'' کیپٹن نے ہاروے پر بگڑتے ہوئے کہا۔

''ابھی بتاتا ہوں پہلے آپ کولمین کو یہاں طلب کریں۔''

''کیوں؟''

''ایک تماشا دکھانا ہے آپ کو۔''

''جو تماشا کل رات شروع ہوا تھا۔ اس نے ایک لمحے بھی سونے نہیں دیا۔ اب تم دوسرا تماشا دکھانا چاہتے ہو۔''

''یہ پہلے والے ڈرامے کا آخری سین ثابت ہوگا۔''

کولمین جمائیاں لیتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اسے نیند سے بیدار کیا گیا تھا۔ ''تم لوگ آخر کب تک اس طرح غیر قانونی طور پر مجھے بند رکھو گے؟''

''ٹھیک ہے، جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔'' ہاروے نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم تمہیں آزاد کر رہے ہیں لیکن اس سے پہلے تمہیں ایک کاغذ پر دستخط کرنے ہوں گے کہ یہاں تم سے صرف زبانی پوچھ گچھ کی گئی ہے۔ کسی نے تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا اور یہ کہ تم کسی بھی وجہ کی بنا پر پولیس کے خلاف مقدمہ قائم نہیں کرو گے۔''

کولمین نے مضحکہ اڑانے والی نظروں سے ہاروے کو دیکھا۔ ''اب تم دھوکے سے کسی سادے کاغذ پر میرے دستخط لینا چاہتے ہو تا کہ بعد میں اس پر اقبال جرم ٹائپ کر لو؟ مجھے تم لوگوں کی اس حرکت کا پہلے سے علم ہے۔ میں کسی کاغذ پر کوئی دستخط نہیں کروں گا۔''

کیپٹن نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ ہاروے نے آنکھوں سے اسے تنبیہ کر دی۔ ''دیکھو، گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہم نے لومبارڈ کے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ تم بعد میں غلط گرفتاری کے خلاف ہم پر کوئی مقدمہ نہ کھڑا کر دو۔''

''خوب، اس کا تو مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔'' کولمین نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کی آنکھیں لبوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

ہاروے نے سگریٹ بنانے کا کاغذ اور تمباکو جیب سے نکالا اور تھوڑا تمباکو کاغذ پر ڈال کر اس کی سگریٹ بنانے لگا۔ پھر اس نے کاغذ اور تمباکو کولمین کی طرف بڑھا دیے۔ ''لو سگریٹ پیو۔ ہم اطمینان سے مسئلے پر گفتگو کریں گے۔''

''شکریہ، میں یہ سگریٹ نہیں......'' کولمین جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ زرد ہو گیا جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ اس نے چپ چاپ ہاروے کے ہاتھوں سے سگریٹ بنانے کا کاغذ اور تمباکو لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار خوف کی پرچھائیاں لرزتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ سگریٹ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی تمباکو کاغذ پر سے گر جاتا اور کبھی تمباکو کی زیادہ مقدار کی وجہ سے کاغذ کھل جاتا تھا۔ آدھے درجن کاغذ ضائع ہونے کے بعد ہاروے نے اس کے ہاتھوں سے تمباکو کی ڈبیا اور کاغذ کا پیکٹ لے لیا۔

''اسے سگریٹ بنانے کا کوئی سابقہ تجربہ نہیں ہے۔'' ہاروے نے کمرے میں موجود اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اب ایسا موقع آ گیا تھا کہ کولمین بالکل خاموش رہا۔ اس نے اپنے تجربے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ کسی بے جان مجسمے کی طرح نشست پر بالکل ساکت بیٹھا تھا جیسے کوئی شخص جھیل کے بیچوں بیچ سطح پر جمی ہوئی برف کی تہ پر بیٹھا ہو اور اسے یہ ڈر ہو کہ اس کے سانس لینے سے برف کی تہ ٹوٹ جائے گی۔

''اور جب کوئی اس قدر اناڑی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے پہلے کبھی اپنے ہاتھوں سے سگریٹ نہیں بنائی۔'' ہاروے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، چلو اس جرم کی پاداش میں مجھے پھانسی پر چڑھا دو۔'' کولمین نے تلخ لہجے میں کہا۔

''اس کے باوجود اس شخص نے پرسوں رات سگار فروخت کرنے والی دکان سے سگریٹ بنانے والے کاغذ کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس نے مقتول کو پہلا فون کیا تھا۔ کچھ دیر پہلے سگار فروخت کرنے والی دکان کے کلرک نے مجھے یہ بات بتائی ہے کہ اس نے دو سال کی مدت کے دوران پرسوں رات پہلی بار کاغذوں کا یہ پیکٹ اس سے خریدا تھا۔ لیکن سگریٹ بنانے کے لیے تمباکو نہیں خریدا...... میں نے اس کے فلیٹ کی اچھی طرح تلاشی لی۔ اگر وہاں تمباکو کا کوئی ڈبا اب تک وہاں موجود ہوتا تو نظر آ جاتا کیونکہ یہ شخص بے مصرف اشیا پھینکنے کا قائل نہیں ہے۔ اس کے غسل خانے میں پندرہ استعمال شدہ بلیڈ نہانے کے ٹب کے نیچے پڑے ہیں۔''

کولمین کے چہرے کی رنگت مستقل طور پر تبدیل ہونے لگی تھی۔

''سوال یہ ہے کہ اس نے تمباکو کے بغیر سگریٹ بنانے کے کاغذ کیوں خریدے؟ صرف یہی نہیں، جب میں نے کاغذ کا پیکٹ اس کے کوٹ سے نکالا تو اس سے کاغذ استعمال کر لیے گئے تھے۔ وہ کہاں اور کیسے استعمال کیے گئے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ نہیں، میں آپ لوگوں کو عملی تجربہ کر کے دکھاتا ہوں جسے دیکھ کر ان تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا۔'' ہاروے نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بڑا سا لفافہ نکالا جو سربہ مہر...... تھا۔ مہر کو توڑ کر اس نے لفافہ کھولا اور اسے میز پر الٹ دیا۔ ''یہ ہے وہ ریوالور جو مسٹر کولمین کی ملکیت ہے اور جس کا ان کے پاس اجازت نامہ بھی موجود ہے۔ اور یہ ہے وہ استعمال شدہ گولی جسے ہم نے ان کے فلیٹ کے چوبی فرش میں سے نکالا تھا۔ ان کا ریوالور اور اس میں استعمال کیا جانے والا کارتوس دونوں ہی اعشاریہ اڑتیس بور کے ہیں۔ میری درخواست پر پولیس تجربہ گاہ نے انہیں واپس کر دیا ہے۔ اور یہ ہے اعشاریہ بتیس بور کی غیر استعمال شدہ گولیاں، یہ بالکل ویسی ہی ہیں۔ جیسی مقتول کے جسم سے نکلی تھی۔ اب آپ لوگ دیکھیں کہ میں اعشاریہ بتیس بور کی گولی اعشاریہ اڑتیس بور کے ریوالور میں ڈال کر کس طرح...... چلاتا ہوں۔''

کولمین کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید ہو گیا تھا۔

ہاروے نے اعشاریہ بتیس بور کا ایک کارتوس اٹھایا اس کے گرد سگریٹ بنانے کا کاغذ مضبوطی سے لپیٹا اور گوند لگے ہوئے کنارے چپکا دیے۔ اس طرح اس نے چار کاغذ کارتوس کے اوپر چپکا دیے۔ ''میرا خیال ہے کہ چار کاغذ کافی رہیں گے۔ اب اعشاریہ بتیس بور کے کارتوس کا قطر اعشاریہ اڑتیس بور ہو گیا ہے۔'' اس نے کولمین کے ریوالور کا گولیوں والا خانہ کھولا اور خالی جگہ میں کاغذ چپکا ہوا کارتوس بٹھا دیا۔

''اب آپ لوگ دیکھیں کہ اعشارہ اڑتیس بور کے ریوالور سے اعشاریہ بتیس بور کی گولی کس طرح چلائی جاتی ہے۔ پیٹر، تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔ میں دیوار کی طرف گولی چلا رہا ہوں۔''

اس نے ہاتھ بلند کر کے حفاظتی کھٹکا ہٹایا۔ ریوالور کی لبلبی دبائی۔ ریوالور کی نال سے ایک شعلہ نکلا، زوردار دھماکے کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا، چلے ہوئے کارتوس کا خول خانے سے نکل کر ہاروے کے قدموں میں گر گیا اس کے ساتھ کاغذ کے جلے ہوئے چند ٹکڑے بھی تھے جنہیں ہاروے نے احتیاط کے ساتھ چن کر میز پر رکھ دیا۔ کمرے پر مکمل سکوت طاری تھا۔

''اس نے لومبارڈ کو قتل کرنے کے بعد کاغذ کے جلے ہوئے ٹکڑے فرش پر سے اٹھا لیے ہوں گے لیکن استعمال شدہ کارتوس کا خول وہیں پڑا رہنے دیا۔ تا کہ وہ ہمیں فوراً ہی مل جائے اور ہم اسے تجربہ گاہ بھیج دیں۔ اس نے دو مرتبہ مقتول کو فون کیا تھا اور ان کے درمیان تقریباً ایک گھنٹے کا وقفہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے... اس وقفے میں سگار فروخت کرنے والی دکان پر ہی سگریٹ بنانے کے کاغذ کارتوس پر لپیٹے ہوں گے۔''

کولمین کے لب بے آواز حرکت کر رہے تھے۔ وہ دعا مانگ رہا تھا یا خود کو کوس رہا تھا۔ انہیں یہ جاننے کے لیے کسی آواز کی ضرورت نہیں تھی۔ مجرم کے چہرے پر جمنے والی موت کی زردی اس کی اندرونی کیفیت کا حال بیان کر رہی تھی۔

''صرف دس سینٹ۔'' ہاروے نے کولمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمباکو کا ڈبا صرف دس سینٹ میں آتا ہے، اگر تم ایک ڈبا خرید لیتے تو ہم سب کچھ جاننے کے باوجود تم پر قتل کا الزام عائد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔''

کچھ دیر بعد جب کولمین پر قتل کا الزام عائد کر کے اسے قانونی طور پر حوالات میں بند کر دیا گیا تو کاسک نے کافی پیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم ماہرین کی رپورٹ پر تکیہ کر لیتے تو قتل کا ایک مجرم چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر ہماری گرفت سے نکل جاتا۔''

''تم ماہرین کی رپورٹیں پڑھتے رہو۔'' کیپٹن نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''میرے لیے ہاروے جیسا ڈاگ کافی ہے جو سونگھ کر مجرم کو پہچان لیتا ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

انتقام ایک ایسی چنگاری کا نام ہے جو وقت کی راکھ میں دب کر بھی نشیمن کو جلا کر خاکستر کرسکتی ہے۔ بڑے بڑے جرم کا محرک کوئی بھی معمولی سا نقطہ ہوسکتا ہے جسے اگر نظر انداز کرکے ضبط کی چادر تلے دبادیا جائے تو دانش مندی کہلاتا ہے اور اگر نظر بھر کر دل میں انتقاماً رکھ لیا جائے تو شرافت کی چادر اوڑھے بڑے بڑے سادہ مزاج اپنے اصل روپ میں آجاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ماجرا اس نیک انسان کے ساتھ بھی پیش آیا جس کی آنکھوں نے ابھی گھر بسانے کے خواب دیکھنے شروع ہی کیے تھے کہ اچانک حاسدوں نے گل وگلزار پھلواری میں نفرت کے شعلے بھڑکادیے... جنہیں ٹھنڈا کرنے کا ہنر ملک صفدر حیات کے پاس تھا مگر... گزرے وقت اور بہتے پانی کو لوٹانا ان کے بھی بس کا کام نہ تھا لہٰذا صبر کے علاوہ کوئی رستہ نہ سوجھ رہا تھا۔ بندگلی میں بھٹکتے بھٹکتے بالآخر کڑی آزمائش اور جاندار تفتیش کے ذریعے قانون نے اصل مجرم تک رسائی تو حاصل کرلی مگر... نقصان کی تلافی پھر بھی ممکن نہ تھی۔

بے جرم وخطا زندگی کی قیمتی متاع

کھودینے والے مظلوم

کی کتھا

رائی کا پہاڑ

ملک صفدر حیات

ایک ٹھٹھرتی ہوئی صبح میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک نہایت ہی سنسنی خیز خبر میری منتظر تھی۔ میں جیسے ہی جاکر اپنے کمرے میں بیٹھا، کانسٹیبل امیر خان نے میرے پاس آکر بتایا۔ ”ملک صاحب! اُدھر ایک بندے کی لاش ملی ہے......“

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”اُدھر کدھر امیر خان؟“

”اُدھر کچا ایمن آباد روڈ والے پھاٹک کے قریب۔“ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ”ریلوے کی پٹڑی کے کنارے......“

ان دنوں میں ضلع گوجرانوالہ کے تھانا صدر میں تعینات تھا۔ یہ تھانا، شیخوپورہ موڑ کے نزدیک ہی واقع تھا۔ کانسٹیبل نے جس جائے وقوعہ کی نشاندہی کی تھی، یہ سارا علاقہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔

”اس بدنصیب کا نام کیا ہے؟“ میں نے کانسٹیبل سے سوال کیا۔ ”اور وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟“

”ابھی تک اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا جناب۔“ امیر خان نے بتایا۔ ”جو لوگ یہ اطلاع لے کر تھانے آئے ہیں ان میں سے کوئی بھی مقتول کے بارے میں کچھ نہیں جانتا......“

”اطلاع کنندگان کو میرے پاس بھیجو......!“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے ملک صاحب......!“ کانسٹیبل یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اطلاع کنندگان میرے سامنے حاضر تھے۔

وہ کل تین افراد تھے جن میں سے دو کا تعلق اصغر کالونی سے اور ایک کا تعلق کنہیا لال باغ سے تھا۔ کنہیا لال باغ اور اصغر کالونی جائے وقوعہ کے آس پاس کے علاقے تھے۔ میں نے ان تینوں کو بیٹھنے کے لیے کہا پھر باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

”اب بتائیں...... آپ لوگوں نے کس بندے کی لاش دیکھی ہے؟“

اصغر کالونی سے تعلق رکھنے والے افراد کے نام جمال دین اور اسحاق احمد تھے۔ ان میں سے اسحاق احمد نے جواب دیا۔

”تھانے دار صاحب! اس بندے کی لاش تو فیض محمد نے دریافت کی ہے۔ ہم تو اخلاقی طور پر اس کے ساتھ آگئے ہیں......“

”تم لوگوں نے بہت اچھا کیا۔“ میں نے کچے بعد

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیگرے اسحاق احمد اور جمال دین کی طرف دیکھا پھر اپنا روئے سخن فیض محمد کی جانب موڑتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں بھئی فیض محمد، تم نے صبح ہی صبح کس کی لاش ڈھونڈ نکالی ہے؟"

فیض محمد نامی وہ ادھیڑ عمر شخص کنہیا لال باغ میں مالی اور چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا اور اس کی رہائش بھی مذکورہ باغ کے اندر ہی ایک چھوٹے سے کوارٹر میں تھی۔ کنہیا لال باغ ریلوے پھاٹک سے آگے، کچا ایمن آباد روڈ کی دونوں جانب پھیلا ہوا تھا۔ فیض محمد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"تھانے دار صاحب! میں کسی کی لاش کو تلاش کرنے نہیں نکلا تھا۔ وہ تو بس، اتفاق ہی سے مجھے نظر آ گئی تھی......"

"اس اتفاق کی وضاحت کرو فیض محمد!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں صبح جلدی اٹھنے کا عادی ہوں اور رفع حاجت کے لیے ریل کی پٹری کے ساتھ آگے نکل جاتا ہوں۔" وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ "جب میں واپس آ رہا تھا تو اس وقت تک ہلکا ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے پٹری والی ڈھلان کے کنارے پر ایک گٹھری سی پڑی دیکھی۔ اندرونی تجسس مجھے اس گٹھری کے قریب لے گیا اور تبھی مجھے پتا چلا کہ وہ کوئی گٹھری نہیں بلکہ کسی جوان مرد کی لاش ہے۔"

اتنا بتانے کے بعد فیض محمد خاموش ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ "فیض محمد! تمہیں اس بات کا کیسے اندازہ ہوا کہ وہ جوان مرد لاش میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کیا تم نے اسے چھو کر دیکھا تھا؟"

"نہیں جناب......" وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میں نے تو اسے ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی حالت ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔"

"کیوں......!" میں مختلف سوالات کے ذریعے اپنا ذہن کلیئر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اس جوان کی حالت میں تمہیں ایسی کون سی بات نظر آئی تھی؟"

"جناب......!" فیض محمد نے ایک جھرجھری لی پھر میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "اس بدنصیب کی گردن شہ رگ کے مقام سے کٹی ہوئی ہے اور لباس کا بالائی حصہ خون میں تر بہ تر ہے......"

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر فیض محمد سے پوچھا۔ "کیا تم اس بندے کو جانتے ہو......؟"

"نہیں جی......!" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے جمال دین اور اسحاق احمد کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔

ان دونوں کی آنکھوں میں ناشناسائی کے تاثرات ابھرے اور جمال دین نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "تھانے دار صاحب! ہم نے موقع پر جا کر اس بندے کی لاش کو دیکھا ہے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ ہم سب کی ایک ہی رائے ہے کہ وہ بندہ ہمارے علاقے کا رہنے والا نہیں۔ سب نے اس کی شناخت سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہمارے لیے بالکل اجنبی ہے......"

"ہوں......!" میں نے ایک گمبھیر سانس خارج کی پھر ان تینوں سے مزید دو چار سوالات کرنے کے بعد کہا۔ "تم لوگ باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ جائے وقوعہ پر چلتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے اٹھے اور میرے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ٹھیک دس بجے میں جائے وقوعہ پر موجود تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ دس جنوری کی ایک ٹھنڈی ٹھار صبح تھی۔ وقت دس کا ہندسہ عبور کر چکا تھا لیکن ابھی تک سورج نے اپنا جلالی مکھڑا نہیں دکھایا تھا۔ ان دنوں دھند بھی بہت زیادہ ہو رہی تھی اور بعض اوقات تو پورا دن انسانی آنکھ سورج کی شکل دیکھنے کو ترس جاتی تھی۔

مذکورہ جوان کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ دبلا پتلا اور درمیانے قد کا مالک تھا۔ اس نے بوسکی کی قمیص اور لٹھے کی شلوار زیب تن کر رکھی تھی۔ پاؤں میں بند نیا جوتا تھا۔ بوسکی کی قمیص کے اوپر سیاہ گرم واسکٹ بھی نظر آ رہی تھی اور یہ بھی بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ قمیص کے نیچے اس نے موسم کی شدت سے نمٹنے کے لیے کوئی گرم سویٹر یا جرسی بھی ضرور پہن رکھی ہوگی۔ بعد ازاں جب میں نے اس کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا تو میرا یہ اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ بوسکی کی قمیص کے نیچے اونی سویٹر موجود تھا۔

اس اجنبی شخص کی گردن شہ رگ کے مقام سے کٹی ہوئی تھی اور اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ اسے موت کی گود میں سکونت اختیار کیے دس بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ کٹی ہوئی گردن سے ابلنے والے خون نے اس کے لباس کا بالائی حصہ بری طرح داغدار کر دیا تھا اور موسم کی شدت کے باعث وہ خون جم چکا تھا۔

جامہ تلاشی کے دوران میں جو چیزیں میرے ہاتھ لگیں ان میں ایک کنگھی، ایک ریشمی رومال اور ایک بٹوا

نمایاں تھیں۔ کنگھی ویسی تھی جیسا کہ دیگر جیبی کنگھیاں ہوتی ہیں لہٰذا اس کے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں۔ ریشمی رومال کے ایک کونے میں رنگ برنگا پھول کڑھا ہوا تھا اور دوسرے کونے میں انگریزی حروف ایم اور بی کاڑھے گئے تھے اور ان دونوں حروف کے درمیان ایک ننھا منا سا دل بنا ہوا تھا۔ ایم اور بی یقیناً ناموں کو ظاہر کرتے تھے اور ان میں سے ایک نام اسی مقتول کا تھا۔

مقتول کی جیب میں سے برآمد ہونے والے بٹوے میں سے ساڑھے تین سو روپے کی رقم نکلی تھی۔ آج کل ساڑھے تین سو روپے کی کوئی وقعت نہیں ہے لیکن اس زمانے میں، آپ کو یقین آئے یا نہ آئے...... یہ ایک ہینڈسم اماؤنٹ سمجھا جاتا تھا۔

مقتول کی لاش کے معائنے کے دوران میں مجھے ایک چیز نے بری طرح چونکا دیا تھا اور وہ تھے، اس کے مہندی لگے ہاتھ...... اس کے ایک ہاتھ پر سادہ اور دوسرے ہاتھ پر خوشنما ڈیزائن کی مہندی لگی ہوئی تھی جیسا کہ عام طور پر دولہا کے لگائی جاتی ہے۔ اس کے جسم پر سجا لباس بھی اسی جانب اشارہ کرتا تھا کہ یا تو وہ کسی شادی کی تقریب میں شامل رہا تھا یا پھر خود میر تقریب یعنی دولہا میاں تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر اس کی موت بڑی افراتفری اور سنسنی پھیلانے والی تھی۔

میں نے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبل کی مدد سے جائے وقوعہ کا اچھی طرح جائزہ لیا اور دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد آلۂ قتل کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک تیز دھار خنجر تھا جو مجھے ایک کھال (گندے پانی والی نالی) کے قریب گھاس میں پڑا ملا تھا۔ خنجر کے خطرناک پھل پر خون جما ہوا تھا۔ محتاط اندازے کے مطابق خنجر کے پھل پر دکھائی دینے والا خون اسی مقتول جوان کا تھا۔

میں نے موقع پر موجود افراد میں سے تین چار سے پوچھ گچھ بھی کی لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی اس مقتول شخص اور اسے پیش آنے والے اس خونیں واقعے پر روشنی نہ ڈال سکا۔ وہ سب کے لیے قطعی اجنبی تھا۔

اب سب سے پہلا سوال یہ اٹھتا تھا کہ جب اس اللہ کے بندے کو وہاں کوئی نہیں جانتا تھا تو پھر وہ تھا کون؟ وہ کہاں سے بن سنور کر آیا تھا اور اس کا قاتل کون ہو سکتا تھا؟ اس کے علاوہ بھی متعدد سوالات میرے سامنے تھے لیکن سردست میں ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں جانتا تھا اور یہ خاصی مایوس کن صورت حال تھی۔

میں نے مشیر نامہ تیار کرنے کے بعد اس اجنبی شخص کی لاش کو کانسٹیبل کے ساتھ ایک تانگے پر "سوار" کر کے سرکاری اسپتال بھجوا دیا اور خود بھی اسی تانگے پر بیٹھ کر تھانے آ گیا۔

تھانا صدر، جی ٹی روڈ پر واقع تھا اور سرکاری اسپتال جاتے ہوئے وہ تھانا راستے میں پڑتا تھا۔ ہم لوگ اسی تانگے پر سوار ہو کر تھانے سے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔

٭٭٭

قتل کی یہ واردات بڑی عجیب و غریب تھی۔ مقتول کو اس علاقے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ کسی اور علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ کون تھا اور کس علاقے سے وہاں تک پہنچا تھا یہ بڑے اہم سوالات تھے اور ان کے جوابات ہی مجھے اس کے قاتل تک پہنچا سکتے تھے۔ فی الحال میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ جائے وقوعہ سے مجھے جو آلۂ قتل ملا تھا وہ بھی میں نے لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے لاش کے ساتھ ہی بھجوا دیا تھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، وہ دس جنوری کا دن تھا اور خنکی و دھند سے بھرپور دن۔ شام تک میں اپنے کمرے میں بیٹھا اسی جوان مقتول کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے مہندی لگے ہاتھ بار بار میری نگاہوں میں چمکنے لگتے اور رہ رہ کر مجھے یہ خیال آنے لگتا کہ وہ کوئی دولہا تھا جو اجنبی جگہ پر بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

اس اجنبی مقتول کے مہندی لگے ہاتھوں کے اکسانے پر میں نے گرد و نواح کے تمام علاقوں میں بندے دوڑا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کر لی کہ کہیں کوئی شادی کی تقریب تو منعقد نہیں ہوئی تھی۔ جائے وقوعہ کے جنوب میں اصغر کالونی، رانا کالونی اور کنگنی والا جیسے علاقے تھے۔ شمال میں کچی پمپ والی، کچی دلمیر والی تھی، مشرق میں کنہیا لال باغ اور آگے نہر کے کنارے واقع بنجاروں کی بستی تھی جبکہ مغرب میں بھی اصغر کالونی کا کچھ حصہ پھیلا ہوا تھا جس کے بعد جی ٹی روڈ واقع تھی۔ ان تمام علاقوں میں پچھلے ایک ہفتے سے شادی بیاہ کی کوئی تقریب منعقد نہیں ہوئی تھی۔ گویا، اس اجنبی شخص کی پراسرار موت میرے لیے ایک معما بن گئی تھی۔

میں نے یہی سوچا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار کروں گا۔ ہو سکتا ہے، جب تک مقتول کو ڈھونڈتا ڈھانڈتا کوئی ادھر آ نکلے اور تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھنے کا موقع مل جائے۔ میں نے یہی طے کیا تھا کہ اگر کوئی بھی سرا ہاتھ نہ آیا تو میں مقتول کی لاش کے ایک دو فوٹو نکلوا کر تین چار متلاشی ٹیمیں ترتیب دے کر اجنبی مقتول کے حوالے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

معلومات حاصل کرنے کی مہم چلاؤں گا۔ مجھے اپنی محنت اور اللہ کی رحمت سے قوی امید تھی کہ میں بہت جلد نہ صرف یہ کہ اس نامعلوم مقتول کا سراغ لگا لوں گا بلکہ اس کے قاتل تک بھی رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

رات کو میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ تین افراد مجھ سے ملنے آگئے۔ ان کا تعلق گوجرانوالہ شہر کے علاقے ''سیالکوٹی دروازہ'' سے تھا۔ یہ سیالکوٹی دروازہ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی واقع تھا۔ میں نے ان بندوں کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔

ان کے چہروں پر مجھے بڑی گہری پریشانی نظر آئی۔ میں نے انہیں اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر باری باری ان کی صورتوں کا جائزہ لینے کے بعد استفسار کیا۔

''کیا بات ہے...... تم لوگوں کی شکلیں کیوں اتری ہوئی ہیں؟''

''ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ نے آج صبح ایک لاش سرکاری اسپتال بھجوائی ہے؟'' ان میں سے ایک نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

''ہاں بھجوائی ہے!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''ہم اس لاش کو دیکھنا چاہتے ہیں......''

''کیوں......!'' میں پوری طرح ان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''آپ لوگ اس لاش کو کیوں دیکھنا چاہتے ہیں......؟''

''تاکہ ہماری تسلی ہو جائے......'' ایک نے گلوگیر آواز میں کہا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیسی تسلی؟''

''تھانے دار صاحب! میرا نام محمد صدیق ہے۔'' ان میں جو قدرے سنبھلا ہوا تھا اس نے صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ اکبر علی اور اصغر علی دونوں بھائی ہیں اور ادھر سیالکوٹی دروازہ پر ہی رہتے ہیں۔ اکبر علی کا بیٹا کل رات سے غائب ہے......''

''ہوں...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایسے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا جیسے معاملے کی تہ میں اتر چکا ہوں، پھر میں نے دونوں دل گیر برادران کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم میں سے اکبر علی کون ہے؟''

اکبر علی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا۔ ''میں ہوں جی......!''

''تمہارا بیٹا کل رات سے کہاں غائب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جناب! اگر مجھے یہ پتا ہوتا کہ وہ کہاں غائب ہے تو پھر میں پریشان کیوں ہوتا......'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''سیدھا وہیں جا کر اسے ڈھونڈ لیتا۔ جیسے ہی پتا چلا کہ آپ نے کسی بندے کی لاش کو ٹیسٹ وغیرہ کے لیے اسپتال بھجوایا ہے تو ہم دوڑے ہوئے آپ کے پاس آگئے ہیں کہ کہیں......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور گھائل نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''اکبر علی! تمہارے گم شدہ بیٹے کا نام کیا ہے؟''

''جی...... اس کا نام ماجد ہے...... ماجد علی!'' اس نے جواب دیا۔

میرے تصور میں وہ ریشمی رومال گھوم گیا جو میں نے مقتول کی جامہ تلاشی کے دوران میں برآمد کیا تھا اور جس کے ایک کونے میں انگریزی حروف ایم اور بی بڑے خوب صورت انداز میں کاڑھے گئے تھے۔ ایم کا معما تو حل ہو گیا تھا۔ ایم سے یقیناً ماجد بنتا تھا۔ میں نے مزید تصدیق کی خاطر اکبر علی سے پوچھا۔

''تمہارا کہنا ہے کہ کل رات سے ماجد غائب ہے۔ تم نے آخری بار ماجد کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟''

''ٹرین میں......!'' ماجد کے چچا اصغر علی نے جواب دیا۔ ''ہم سب لوگ ٹرین میں ایک ساتھ لاہور سے آرہے تھے۔ جب ہم گوجرانوالہ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو ماجد غائب تھا......''

میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اس اجنبی مقتول کے راز سے واقف ہونے ہی والا ہوں۔ میں نے اکبر علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا تم لوگ کسی شادی میں شرکت کرنے لاہور گئے تھے؟''

''جی ہاں...... ماجد کی ہی شادی تھی۔'' اکبر علی نے جواب دیا۔

''لیکن...... آپ کو...... یہ بات کیسے...... پتا چلی......؟'' اصغر علی نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اکبر علی سے استفسار کیا۔ ''کیا تمہارے بیٹے ماجد نے لٹھے کی شلوار، بوسکی کی قمیص اور سیاہ گرم واسکٹ پہن رکھی تھی؟''

''جی...... جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں......''

''اور اس کے دونوں ہاتھوں پر مہندی لگی ہوئی تھی......؟''

''ہاں، ہاں......!'' اکبر علی نے اضطراری انداز میں گردن ہلائی۔ ''آپ نے ماجد کو کہاں دیکھا ہے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور میز کی دراز میں سے، اجنبی مقتول (جو کہ اب میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا) کی جامہ تلاشی میں حاصل ہونے والی چیزیں نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ان چیزوں کو پہچانتے ہو......؟''

''جی، یہ سب کچھ...... ماجد کا ہے۔'' اصغر علی نے بڑے وثوق سے بتایا پھر ریشمی رومال کو کھول کر اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں تھانے دار صاحب...... ایم کا مطلب ہے، ماجد اور بی کا مطلب ہے، بشریٰ...... ماجد کی شادی بشریٰ سے ہونے والی تھی۔''

''میرے پاس تم لوگوں کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں نے آج صبح جس شخص کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوایا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ ماجد ہی ہے...... یہ تمام چیزیں مجھے اسی کے لباس میں سے ملی ہیں۔''

اکبر علی نے روہانسی آواز میں پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے......؟''

''میں قاتل کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم لوگ تعاون کرو گے تو میں تفتیش کو کسی صحیح رخ پر ڈال سکوں گا۔ ابھی تو میں خود بھی اندھیرے میں ہوں......''

پھر میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں انہیں، جائے وقوعہ سے ماجد کی لاش کی دریافت کے بارے میں بتایا۔ جب میں خاموش ہوا تو اصغر علی نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ ہم سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں......؟''

''آپ لوگ مجھے ان واقعات کی تفصیلات سے آگاہ کریں گے جو ٹرین میں سفر کے دوران میں پیش آئے تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر اصغر علی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ریشمی رومال کو دیکھ کر یہ کہا تھا کہ...... ماجد کی شادی بشریٰ سے ہونے والی تھی...... اس بات کا کیا مطلب ہوا......؟''

''ہونے والی تھی مگر ہو نہیں سکی۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ہم لوگ لاہور سے خالی ہاتھ ہی واپس آگئے ہیں......''

''کیوں......؟'' میرے استفسار میں گہری دلچسپی تھی۔

اکبر علی نے جواب دیا۔ ''تھانے دار صاحب! اُدھر لاہور میں ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا تھا کہ ہنگامی حالات میں ہمیں شادی کینسل کرنا پڑی اور ہم لوگ خالی ہاتھ واپس آگئے۔''

''میں اس ناخوشگوار واقعے کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے مجھے ماجد کے قاتل تک پہنچنے میں آسانی حاصل ہو جائے گی......''

''بات بہت لمبی ہو جائے گی جناب......'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

اصغر علی نے کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ صدیق صاحب کے ساتھ ادھر اسپتال جا کر ماجد کی لاش چیک کریں۔ میں تھانے دار صاحب کو ساری کہانی سنا کر آپ کے پاس آتا ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جی...... کیا ممکن نہیں ہے؟'' اصغر علی نے پوچھا۔

''یہی کہ آپ میں سے کوئی اس وقت اسپتال جا کر ماجد کی لاش کا معائنہ کر سکے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اسپتال کا عملہ آپ لوگوں کو لاش کی ایک جھلک بھی نہیں دکھائے گا۔ اب پوسٹ مارٹم کے بعد ہی ماجد کی لاش آپ لوگوں کے حوالے کی جائے گی لہٰذا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اسی سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ مجھے ان واقعات کی تفصیل سے آگاہ کریں جن کے نتیجے میں یہ سانحہ پیش آیا ہے۔ اس چکر میں نہ رہیں کہ بات لمبی ہو جائے گی یا مختصر رہے گی۔ میں یہاں آپ لوگوں کی باتیں اور کہانیاں سننے کے لیے ہی تو بیٹھا ہوں۔''

وہ میرے جائز مطالبے سے انکار نہیں کر سکتے تھے لہٰذا اکبر علی اور اصغر علی نے ملے جلے انداز میں مجھے ماجد کی شادی کا مضحکہ خیز قصہ سنا ڈالا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں اس قصے سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے واقعات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تا کہ آئندہ کی تفتیش میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

آپ کو اس واقعے پر ہنسی بھی آئے گی اور جھنجلاہٹ بھی محسوس ہو گی۔ بہر حال، جو حقیقت ہے میں وہی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ﷲﷲﷲ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقتول ماجد کی شادی بشریٰ نامی ایک لڑکی سے طے پائی تھی۔ مقتول خود تو سیالکوٹی دروازہ گوجرانوالہ کا رہائشی تھا اور بشریٰ لاہور کے ایک محلے گھوڑے شاہ کی رہنے والی تھی۔ دراصل ماجد کی بڑی خالہ نسیمہ گھوڑے شاہ لاہور میں رہتی تھی۔ بشریٰ اس کی پڑوسن تھی اور یہ رشتہ نسیمہ ہی کے توسط سے لگا تھا۔

نسیمہ عرصۂ دراز سے بیمار چلی آرہی تھی۔ اس کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی اور بیماری ایسی کہ جس کا اختتام موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ گوجرانوالہ آکر ماجد کی شادی میں بھرپور شرکت نہیں کرسکتی تھی لہٰذا اس نے اپنی چھوٹی بہن سلیمہ یعنی ماجد کی ماں سے ایک فرمائش کی تھی اور سلیمہ نے یہ فرمائش اس خیال کے پیش نظر پوری کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ نسیمہ بستر مرگ پر پڑی ہے۔ یہ اس کی آخری خواہش بھی ہوسکتی ہے لہٰذا اس کی خوشی کی خاطر اس کی بات مان لینا چاہیے۔ سلیمہ نے اس کام کے لیے اپنے گھر کے دوسرے افراد کو بھی راضی کرلیا تھا۔

نسیمہ نے اپنی بہن سلیمہ کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ تمام لوگ تین دن کے لیے اس کے گھر آجائیں اور شادی کی تمام رسمیں اسی کے گھر میں رہتے ہوئے پوری کی جائیں پھر تین دن کے بعد ماجد اور بشریٰ کا نکاح ہو اور وہ سب دُولہا، دلہن کے ہمراہ واپس گوجرانوالہ چلے جائیں۔ نسیمہ کی یہ خواہش نما تجویز ماجد کے گھر والوں نے راضی خوشی مان لی تھی۔

چھ جنوری کی صبح ماجد اور اس کے گھر کے بیس افراد گوجرانوالہ سے ٹرین میں بیٹھ کر لاہور پہنچ گئے۔ گھر کے افراد میں ماجد کا باپ، ماں، چھوٹی دونوں بہنیں، چچا اصغر علی اور اس کی فیملی کے دیگر افراد کے علاوہ چند قریبی رشتے دار بھی شامل تھے۔ ماجد کا چھوٹا بھائی واجد علی اور چچا کی فیملی کے کچھ لوگ ادھر سیالکوٹی دروازہ والے گھر ہی میں رک گئے تھے۔ ایک اور شخص کو ادھر ہی رک جانا چاہیے تھا لیکن وہ ضد کرکے ''برات'' کے ساتھ گوجرانوالہ سے لاہور پہنچ گیا تھا۔ بعدازاں یہ شخص بڑا سنسنی خیز کردار ثابت ہوا تھا۔

اس کردار کا نام تھا کرم دین عرف کرمو...... عمر ستر سے متجاوز، سر اور ڈاڑھی کے بال ایک سو ایک فیصد سفید، کمر جھکی ہوئی، ہاتھ میں عصا، بینائی اتنی کم کہ بہ مشکل لوگوں کے چہروں کو پہچان پاتا تھا۔ سماعت بھی گزارے لائق تھی اور صحت بھی مخدوش اور قابل رحم۔ یہ شخصیت رشتے میں مقتول ماجد کا نانا جان تھا اور انہی کے گھر میں رہائش پذیر تھا۔ سلیمہ نے اپنی بڑی بہن نسیمہ کی خواہش پوری کرنے کے لیے شادی کی تمام تر تقریب اس کے گھر میں منتقل کردی تھی تو وہ اپنے باپ کی فرمائش کو کیسے رد کرسکتی تھی۔

سب کچھ حسب پروگرام دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ چھ جنوری کی دوپہر کو لاہور پہنچ گئے تھے اور اسی شام سے مختلف رسموں کا آغاز ہوگیا تھا۔ ماجد اور بشریٰ کے نکاح کے لیے دس جنوری کی صبح کا وقت طے کیا گیا تھا۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا گھوڑے شاہ، لاہور میں کھاتے اور شام سے پہلے دلہن کو لے کر واپس گوجرانوالہ پہنچ جاتے لیکن نو جنوری کی صبح ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ شادی کا پروگرام کھوہ کھاتے چلا گیا...... اور یہ سب کچھ کرمو بابا کی وجہ سے پیش آیا تھا۔

کرمو روزانہ گھر سے غائب ہوجاتا تھا اور پھر سہ پہر تک واپس آجاتا تھا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ وہ کہاں اور کس کام کے لیے جاتا تھا۔ سلیمہ نے اس غیر حاضری کے بارے میں جب بھی اس سے سوال کیا تو وہ یہ کہہ کر اسے مطمئن کردیتا۔

''جھلیے، میں نے کہاں جانا ہے...... میں تو ادھر ہی تھا۔''

''ابا جی! اگر آپ ادھر ہوتے تو مجھے نظر ضرور آتے۔'' سلیمہ نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''پتا نہیں، کہاں غائب ہوجاتے ہیں؟''

''میں گھر کے اندر نہیں تھا سلیمہ۔'' کرمو نے جواب دیا۔ ''ذرا باہر نکل گیا تھا۔''

''باہر کہاں......؟'' سلیمہ نے پوچھا۔

''میں ذرا دھوپ سینکنے اُدھر دوسری گلی میں چلا گیا تھا۔'' کرمو وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اُدھر ایک تھڑے پر بڑی کراری دھوپ آتی ہے......''

سلیمہ نے کرمو کی وضاحت کے بعد مزید جرح بحث کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ ایک تو کرمو کے ساتھ بات کرنے کے لیے کافی اونچی آواز میں بولنا پڑتا تھا۔ اس کی سماعت کافی کمزور تھی، دوسرے کرمو نے بڑی معقول دلیل پیش کی تھی۔

دن ایک ایک گھنٹا سرک کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کرمو روزانہ ہی گھر سے باہر نکل جاتا اور سہ پہر کے بعد واپس آجاتا۔ تشویش کی چونکہ کوئی بات نہیں تھی لہٰذا سلیمہ مطمئن ہوگئی مگر اس کا یہ اطمینان دیرپا ثابت نہیں ہوسکا تھا۔

نو جنوری کی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ اکبر علی کو کرمو کی یاد آئی اور کوئی دس بجے کے قریب اس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

''چاچا کرمو کہاں ہیں......؟''

''ادھر گھر میں ہی ہوں گے ابا جی۔'' سلیمہ نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

''میں نے چاچا کو پورے گھر میں ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ کہیں نظر نہیں آئے تو تم سے پوچھ رہا ہوں......؟''

''اوہ یاد آیا......'' سلیمہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''آپ ابا جی کو اُدھر دوسری گلی کے تھڑے پر دیکھیں۔ وہ وہاں آپ کو مل جائیں گے......''

''دوسری گلی کے تھڑے پر......!'' اکبر علی نے عجیب سی نظر سے اپنی بیوی کو دیکھا ''وہ تھڑے پر بیٹھ کر کیا کر رہے ہیں؟''

''کہہ رہے تھے، اس تھڑے پر بڑی اچھی دھوپ آتی ہے۔'' سلیمہ نے بتایا۔ ''وہ چار پانچ گھنٹے اُدھر ہی گزار کر آتے ہیں......''

''ٹھیک ہے، میں انہیں ادھر ہی دیکھ لیتا ہوں......''

''پر آپ کو ابا جی سے کام کیا ہے؟'' سلیمہ نے پوچھا۔

''آکر بتاؤں گا۔'' اکبر علی یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل گیا۔

جب اکبر علی مذکورہ تھڑے پر پہنچا تو ایک منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا لیکن یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ آنکھوں دیکھی حقیقت کو کسی خواب کے بیٹے میں نہیں ڈال سکتا تھا اور...... یہ حقیقت بہت ہی نازک اور تلخ تھی۔

کرم دین عرف کرمو ایک دیوار سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کیے تھڑے کے کنارے پر بیٹھا تھا۔ اس کا عصا بھی قریب ہی پڑا نظر آرہا تھا۔ یہ سب تو عین قابل یقین اور نارمل تھا۔ جس چیز نے اکبر علی کی عقل کے پرخچے اڑا دیے وہ بڑی انوکھی اور شرمناک تھی۔ کرمو کے سامنے تھڑے پر بہت سے کرنسی کے سکے پھیلے نظر آرہے تھے۔ گویا...... اکبر علی کا سسر اس تھڑے پر بیٹھ کر بھیک مانگ رہا تھا۔

اکبر علی نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وقوعہ پر کسی قسم کی ہنگامہ آرائی مناسب نہ سمجھی اور کرمو کو پہلی فرصت میں وہاں سے اٹھا کر گھر لے آیا۔ وہ جس مقصد سے تھوڑی دیر پہلے کرمو کو ڈھونڈ رہا تھا وہ پس پشت چلا گیا اور وہ خاصے جارحانہ انداز میں اپنے سسر سے بازپرس کرنے لگا۔ سلیمہ بھی کمرے میں موجود تھی۔ اکبر علی نے آواز دھیمی رکھتے ہوئے سلیمہ سے کہا۔

''پتا ہے، تمہارے ابا جی ادھر تھڑے پر بیٹھ کر کیا گل کھلا رہے تھے؟''

''کیوں...... کیا ہوا......؟'' سلیمہ نے سوالیہ نظر سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو وہاں دھوپ سینکنے جاتے ہیں۔''

''دھوپ سینکنے نہیں، بھیک مانگنے کہو سلیمہ!'' اکبر علی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''میری تو ناک کٹ گئی ہے......''

''اکبر علی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' سلیمہ نے بے یقینی سے باری باری اکبر علی اور کرمو کی طرف دیکھا۔

کرمو کی سماعت ضرور کمزور تھی لیکن وہ بالکل بہرا بھی نہیں تھا۔ اپنے داماد کے تبصرے نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔ وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر تپتے ہوئے لہجے میں اپنی بیٹی سے مخاطب ہوا۔

''سلیمہ! تمہارا گھر والا بکواس کر رہا ہے۔ میں اس عمر میں اب بھیک مانگوں گا اور وہ بھی اپنے نواسے کی ہونے والی سسرال میں آکر......؟''

''آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اکبر علی!'' سلیمہ نے بگڑتی ہوئی بات کو بنانے کی کوشش کی۔

''میں اندھا نہیں ہوں سلیمہ جو مجھے اتنی بڑی غلط فہمی ہو۔'' اکبر علی نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ''میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ کے ابا جان......'' وہ لمحاتی توقف کرکے گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تمہارے ابا جی دوسری گلی کے کنارے بنے ایک چبوترے پر بیٹھے تھے، بالکل بھکاریوں کے انداز میں اور ان کے آگے زمین پر درجن بھر سکے پھیلے ہوئے تھے جو آتے جاتے راہ گیروں نے ان پر ترس کھا کر پھینکے تھے۔ اگر تم لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں آرہا تو وہاں جاکر پوچھ لو...... سب سامنے آجائے گا۔ ہوسکتا ہے، وہ سکے ابھی تک اسی چبوترے پر پڑے ہوں۔ میں نے ان پیسوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، صرف انہی کو اٹھا کر لایا ہوں۔''

''ایک منٹ اکبر علی......!'' کرمو نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ تو ٹھیک ہے کہ میں پچھلے دو، تین دن سے اس تھڑے پر بیٹھ کر دھوپ سینک رہا ہوں لیکن بھیک مانگنے کا کوئی سوال نہیں۔ پتا نہیں، تم یہ کون سی کہانی سنا رہے ہو......؟''

''کہانی کوئی سی بھی ہو مگر مجھے بہت شرم آرہی ہے۔'' اکبر علی نے برہمی سے کہا۔

''آپ کو نسیمہ نے کئی بار کہا ہے کہ وہ بچوں سے کہہ کر چھت پر چارپائی لگوا دیتی ہیں۔'' سلیمہ نے ایک مرتبہ پھر بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ ''چھت پر پورا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دن دھوپ رہتی ہے۔ آپ کو کہیں آنے جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خوامخواہ کی جگ ہنسائی بن گئی ہے......"

"دھوپ تو مجھے باہر گلی میں بھی مل رہی تھی۔" کرمو نے بہ دستور خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "بس، میں گوشی کی باتوں میں آگیا تھا۔"

"گوشی...... کون گوشی؟" اکبر علی نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔" کرمو نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یہی کوئی چودہ، پندرہ سال کا لڑکا ہوگا۔ کہہ رہا تھا، اسی محلے گھوڑے شاہ میں رہتا ہے۔"

"اباجی! آپ نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ آپ گوشی کی باتوں میں آگئے تھے۔" سلیمہ نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "آپ اس لڑکے کی کون سی باتوں میں آگئے تھے......؟"

"مجھ سے گوشی نے کہا تھا کہ......" کرمو نے بیزاری سے بتایا۔ "بابا جی...... ادھر دوسری گلی کے کونے پر بہت تیز دھوپ آتی ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں اور...... میں اس کی باتوں میں آگیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور وہاں لے گیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ مجھے کسی چکر میں پھنسانے کے لیے چال چل رہا ہے۔"

"تو کیا گوشی آپ کو روزانہ وہاں لے جاتا ہے؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"ہاں......!" کرمو نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں صبح جب گھر سے نکلتا ہوں تو وہ مجھے گلی میں مل جاتا ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اس تھڑے تک لے جاتا ہے جہاں بیٹھ کر روزانہ میں دھوپ سینک رہا ہوں۔ چار پانچ گھنٹے کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر واپس یہاں چھوڑ جاتا ہے......"

"تو آپ کو کچھ پتا نہیں کہ لوگ ادھر آپ کو بھکاری سمجھ کر بھیک دے رہے تھے؟" سلیمہ نے دکھی لہجے میں اپنے بوڑھے باپ سے استفسار کیا۔

"تو بھی پگلی ہوگئی ہے سلیمہ!" کرمو نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ شیطان بھیک منگوانے کے لیے مجھے وہاں بٹھاتا ہے تو کیا میں خاموشی سے وہاں بیٹھا رہتا......" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"لوگ تو وہاں سے گزرتے ہی رہتے تھے اور بعض لوگ وہاں رک بھی جاتے تھے لیکن مجھے کیا پتا، وہ مجھے کوئی بھک منگا سمجھ کر بھیک دینے کے لیے رکتے ہیں۔ آپ لوگوں کو تو پتا ہی ہے، مجھے بہت ہی دھندلا نظر آتا ہے اور...... بدمعاش گوشی نے بھی مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا حالانکہ اس دوران میں وہ میرے پاس ہی بیٹھا رہتا تھا اور چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا رہتا تھا......"

"آپ نے خوامخواہ اباجی کی نیت پر شک کیا" سلیمہ نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے شاکی لہجے میں کہا۔ "ان بے چاروں کو تو پتا ہی نہیں کہ گوشی ان کے ساتھ کون سا کھیل، کھیل رہا ہے......"

"یقین کرو سلیمہ! وہ منظر دیکھ کر میرا دماغ خراب ہوگیا تھا۔" اکبر علی معذرت خواہانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس بات کا سخت افسوس و ندامت ہے کہ میں نے چاچا جی کو غلط سمجھا......" پھر وہ براہ راست کرمو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"چاچا جی! آپ مجھے معاف کردیں......"

"سیانوں نے اسی لیے کہا ہے کہ...... پہلے تولو، پھر بولو!" کرمو نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "تم نے بالکل الٹا کردیا اکبر علی۔ پہلے جو جی میں آیا، بول دیا۔ اب ترازو اور باٹ لے کر بیٹھ گئے ہو اور اپنی باتوں کو تولنے کی کوشش کررہے ہو؟"

"میں تسلیم کررہا ہوں نا کہ مجھ سے خطا ہوگئی۔" اکبر علی نے ندامت آمیز انداز میں کہا۔ "اگر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے تو آپ بھی درگزر کردیں۔"

"اکبر علی!" کرمو نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تمہیں ایک ہی شرط پر معاف کرسکتا ہوں۔"

"کون سی شرط؟" اکبر علی نے چونک کر اپنے سسر کی جانب دیکھا۔

سلیمہ نے کرمو سے پوچھا۔ "اباجی...... آپ کیسی شرط کی بات کررہے ہیں؟"

"میں کوئی تمہارے خاوند کو شاہی قلعہ سر پر اٹھانے کے لیے نہیں کہنے والا جو تم اس کے لیے اتنی فکرمند ہورہی ہو۔" کرمو نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "میری شرط ایسی ہے کہ اسے پورا کرنے کے لیے ہل بیل نہیں لگیں گے۔"

"یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں چاچا جی۔" اکبر علی نے معتدل انداز میں کہا۔ "بتائیں تو سہی، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں اباجی......" سلیمہ اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی۔ "آپ کھل کر بتائیں۔ ہم سب آپ کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

خواہش کا احترام کریں گے۔"

"میں چاہتا ہوں...... اس بدمعاش گوشی کو پکڑ کر میرے پاس لایا جائے جس نے اپنی کمائی کے لیے میری بے خبری میں یہ خطرناک کھیل کھیلا ہے۔" کرمو نے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں اسے اپنے سامنے مرغا بنا کر اس کی پشت پر چار اینٹیں رکھواؤں گا۔ ذرا اس شیطان کی اولاد کو بھی تو نصیحت ہو کہ بزرگوں کے ساتھ اس قسم کا بھیانک مذاق کرنے کا کتنا خوف ناک نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔"

"آپ کا یہ مطالبہ تو سو فیصد جائز ہے چاچا جی۔" اکبر علی نے جلدی سے کہا۔ "میں تو خود اس لفنگے کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی کرنے کے موڈ میں ہوں۔"

"میں کوئی مار دھاڑ اور ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا۔" کرمو نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ "بس، اس لڑکے کو ایسی سزا ملنا چاہیے کہ آیندہ کے لیے نصیحت ہوجائے اور ہاں......" کرمو نے چند سیکنڈ کا توقف کر کے کچھ یوں اضافہ کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ گوشی کے ماں باپ کو بھی میرے سامنے حاضر کیا جائے تاکہ میں پوچھ سکوں، انہوں نے اس شیطان کی کیسی تربیت کی ہے......؟"

پندرہ بیس منٹ کی تلاش کے بعد ایک بارہ سالہ بچے کو پکڑ کر کرمو کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اگرچہ کرم دین کی بینائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی لیکن جب اس نے آنکھیں چُندھی کر کے اس لڑکے کا معائنہ فرمایا تو اسے فتویٰ صادر کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

"یہ...... یہ تو گوشی نہیں ہے......" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اباجی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" سلیمہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ گوشی ہی ہے۔ اس کا اصل نام نصیر ہے لیکن سب لوگ پیار سے اسے گوشی کہتے ہیں۔ یہ اسی گلی میں رہتا ہے جس کے کونے والے تھڑے پر آپ روزانہ دھوپ سینکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس محلے میں اور کوئی گوشی ہے بھی نہیں......"

"میں آپ لوگوں کو جھٹلا نہیں رہا......" کرمو نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "مگر یہ وہ گوشی نہیں جو روزانہ میرے ساتھ تھڑے پر بیٹھا رہتا ہے...... میری نظر کمزور ضرور ہوئی ہے لیکن میں ابھی بالکل اندھا نہیں ہوا ہوں۔"

کرمو نے آخری جملہ اتنے اعتماد کے ساتھ ادا کیا تھا کہ اکبر علی نہایت ہی احترام کے ساتھ پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

"چاچا جی! جب آپ اس گوشی کو دیکھ کر یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ وہ لڑکا نہیں جو آپ کے ساتھ تھڑے پر بیٹھتا تھا تو پھر اس لڑکے کا کچھ نہ کچھ حلیہ بھی آپ کو یاد ہوگا جو آپ کے خیال میں گوشی ہے۔ آپ ذرا اپنے گوشی کے بارے میں تو بتائیں؟"

"وہ میرا نہیں، اپنے ماں باپ کا گوشی ہے۔" کرمو نے ٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ اس بچونگڑے سے قد میں کافی زیادہ ہے اور اس کی صحت بھی اچھی ہے۔ میں اسے اچھی طرح پہچان سکتا ہوں جو پچھلے دو، تین دن سے اُدھر تھڑے پر میرے ساتھ بیٹھتا رہا ہے......"

"بابا جی...... آپ قادرے کی بات...... تو نہیں کر رہے......؟" بارہ سالہ گوشی نے چونکتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"کون قادرا؟" کرمو نے استعجابیہ انداز میں گوشی کی طرف دیکھا۔

اکبر علی نے گوشی سے پوچھا۔ "تم کس قادرا کی بات کر رہے ہو......؟"

"جو ان بابا جی کے ساتھ سارا دن تھڑے پر بیٹھا رہتا ہے اور پھر وہاں جمع ہونے والے سکے اٹھا کر اپنے گھر کی طرف چلا جاتا ہے۔" گوشی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "سچ پوچھیں تو میں بھی ان بابا جی کو کوئی مانگنے والا فقیر ہی سمجھتا تھا۔ یہ تو اب پتا چلا ہے کہ یہ اس گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں......"

یہ ہنگامہ اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ گھر کے تقریباً تمام افراد ہی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ کسی نے گوشی سے پوچھا۔ "کہیں تم ہمارے پڑوسیوں کے لڑکے قادر بخش کی بات تو نہیں کر رہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں جی۔" گوشی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں اس قادرے کی بات کر رہا ہوں جس کی بڑی بہن کی شادی ہو رہی ہے...... بشریٰ باجی کا بھائی!"

یہ ایک ایسا انکشاف تھا کہ سب حیرت اور بے یقینی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ مقتول کے ہونے والے سالے کا نام قادر بخش تھا اور لوگ اسے قادرا کہتے تھے لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ قادرا گوجرانوالہ سے آئے ہوئے ایک بزرگ مہمان کے ساتھ اس قسم کی حرکت کیوں کرے گا۔ اسی امر کی تصدیق کے لیے گھر کے دو تین افراد قادرا کو بلانے چلے گئے لیکن وہ

اپنے گھر میں نہ پایا گیا۔ بشریٰ کے گھر والوں کو قادرا کے کارنامے کی خبر ہوئی تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا پھر یقین کی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے قادرا کی تلاش کا کام شروع ہوا۔ پندرہ بیس منٹ کی تلاش کے بعد قادرا کو ڈھونڈ کر کرمو بابا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

کرمو نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور بڑے وثوق سے بولا۔ "وہ لفنگا یہی ہے جو خود کو گوشی کہتا تھا اور مجھے روزانہ اپنے ساتھ اس تھڑے تک لے جاتا تھا۔ مجھے کیا پتا، یہ مجھے بھکاری بنا کر اپنی جیبیں بھر رہا تھا۔"

"ان بابا جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" قادر بخش عرف قادرا نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے ان کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو قادرے۔" گوشی نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم سارے پیسے اٹھا کر گھر لے جاتے ہو۔"

"گوشی! تم بکواس کر رہے ہو۔" قادرا نے گوشی کو آنکھیں دکھائیں۔ "مجھ پر الزام لگانے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

قادرا اپنا دفاع تو کر رہا تھا لیکن اس کے دلائل میں کوئی دم نہیں تھا۔ اس کے مکروفریب کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔ اکبر علی کو اس بات کی بڑی تکلیف تھی کہ دلہن کے چھوٹے بھائی نے ان کے گھر کے ایک بزرگ کے ساتھ بڑا گھٹیا اور بھیانک مذاق کیا تھا۔ اس نے جب کڑے انداز میں قادرا سے باز پرس کی تو قادرا بدتمیزی پر اتر آیا۔ جواب میں اکبر علی نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔

یہ بات چھپنے والی نہیں تھی۔ قادرا کے والدین بھی موقع پر پہنچ گئے۔ سفینہ اور صفدر کو اس بات پر طیش آ گیا کہ اکبر علی نے ان کے بیٹے کو تھپڑ کیوں مارا ہے۔ جواب میں اکبر علی نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کے بدتمیز اور بدتہذیب بیٹے نے جو حرکت کی ہے اس پر تو اس ناخلف کو زندہ زمین میں گاڑ دینا چاہیے۔ میں نے اسے ایک طمانچہ مار دیا تو کون سی قیامت آ گئی ہے......؟"

"ہمارا بیٹا بے قصور ہے۔" قادرا کی ماں سفینہ نے کہا۔ "آپ لوگ خوامخواہ اس پر الزام لگا رہے ہیں......"

"یہ الزام نہیں، حقیقت ہے سفینہ......!" سلیمہ نے متحمل انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "پہلی بات تو یہ کہ اباجی کو اس سلسلے میں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ پھر تمہارے بیٹے کی کارستانی کا ایک عینی گواہ موجود ہے۔ گوشی نے خود اپنی آنکھوں سے قادرا کو یہ گھٹیا حرکت کرتے دیکھا ہے......"

صفدر علی نے اپنے بیٹے قادر بخش سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ "قادرا...... سچ سچ بتاؤ، تم نے یہ سب کیا ہے؟"

"نہیں اباجی۔" وہ کن انکھیوں سے کرمو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں بھلا ایسا کیوں کروں گا۔ مجھے پتا ہے، یہ بابا جی گوجرانوالہ سے مہمانوں کے ساتھ آئے ہیں۔"

صفدر علی نے اپنے بیٹے کے بیان کو معتبر جانا اور بڑے روکھے پھیکے انداز میں اکبر علی سے کہا۔ "مجھے امید نہیں تھی، آپ لوگ میرے بیٹے پر ایسا گھناؤنا الزام لگائیں گے۔ میں تو بشریٰ کا رشتہ کر کے پچھتا رہا ہوں۔"

"آپ کو پچھتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بھائی صاحب!" سلیمہ نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کی بیٹی کی ابھی رخصتی نہیں ہوئی اور وہ اپنے گھر میں بیٹھی ہے۔ اگر ہم اسے بیاہ کر لے جاتے تو ساری زندگی کے لیے ہمیں پچھتانا پڑتا کہ کیسے کم ظرف لوگوں سے رشتے داری لگالی......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے اباجی کو جس انداز میں بے عزت کیا گیا ہے میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔ اب زمین اور آسمان چاہے ایک کیوں نہ ہو جائیں، میں آپ کے گھر میں اپنے بیٹے کا رشتہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔"

"ہمارا بھی یہی فیصلہ ہے کہ بشریٰ کی شادی تمہارے بیٹے سے کسی صورت نہیں ہوگی۔" سفینہ نے ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ لوگ وقت سے پہلے کھل گئے ہیں۔ اگر اس شادی کے بعد آپ لوگوں کی اصلیت کا پتا چلتا تو قیامت آ جاتی......"

الغرض، دونوں پارٹیوں کی جانب سے ایک دوسرے پر اس قدر کیچڑ اچھالی گئی کہ ان کے لیے ایک دوسرے کی شکل پہچاننا ممکن نہ رہا لہٰذا ایک دوسرے کی شکل پر ہمیشہ کے لیے لعنت بھیج کر بشریٰ اور ماجد علی کی شادی کو کینسل کر دیا گیا۔

اس تمام ترقضیے میں سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ سفینہ اور صفدر نے اپنے بیٹے کی غلطی کو تسلیم نہیں کیا تھا جبکہ تمام تر شہادتیں اس کے خلاف جاتی تھیں۔ بعض والدین احمقانہ حد تک اپنی اولاد کی حمایت پر اتر آتے ہیں جس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑے بھیانک نتائج ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس کیس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ سفینہ اور صفدر اپنی ضد پر ڈٹے رہے اور انہوں نے اپنی بیٹی کی زندگی برباد کر ڈالی تھی۔ اگر وہ لوگ لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے کی غلطی کو تسلیم کر کے معذرت خواہانہ رویہ اپنا لیتے تو یقیناً اکبر علی اور سلیمہ بھی اپنی غصہ تھوکنے پر مجبور ہو جاتے اور بات بن جاتی۔

❀❀❀

''شادی والا معاملہ تو گیا کھوہ کھاتے......!'' میں نے اپنے سامنے بیٹھے ان تین افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد تم لوگوں نے لاہور میں کیا کیا؟''

''کرنا کیا تھا جی!'' اکبر علی نے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''وہاں جتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا تھا اس کے بعد مزید رکنا بے وقوفی ہی ہوتا لہٰذا ہم نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ میں نے ماجد کو ریلوے اسٹیشن ٹکٹیں لینے بھیج دیا۔ آنے کو تو ہم بس کے ذریعے بھی واپس آ سکتے تھے۔ گھوڑے شاہ سے بسوں کا اڈا بادامی باغ اور ریلوے اسٹیشن تقریباً ایک جیسے فاصلے پر ہے لیکن ہم چونکہ لگ بھگ دو درجن افراد تھے اس لیے ٹرین ہی میں آرام سے آ سکتے تھے۔''

''اگر وہ بدمزگی نہ ہوتی تو ہم آج شام میں یہاں پہنچتے۔'' اصغر علی نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''اور دلہا دلہن بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔''

''تقدیر میں جو لکھا ہو، وہ ہو کر رہتا ہے تھانے دار صاحب۔'' صدیق نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ماجد کی قسمت میں وہ شادی تھی ہی نہیں۔''

''شادی گئی جہنم میں......'' اکبر علی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میرا تو جوان جہان بیٹا چلا گیا۔ پتا نہیں، کس منحوس کی نظر کھا گئی میرے ماجد کو......!''

اس کیس کا پس منظر تو کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ وہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ میری یادداشت میں محفوظ ہو گیا تھا جس کے سبب مقتول ماجد کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی لیکن گھر پہنچنے سے قبل وہ خود زندگی ہار گیا تھا۔ اس کی زندگی کے موت میں بدلنے کا سبب کیا تھا؟ اس سلسلے میں ابھی تک کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آیا تھا اور یہی سب سے اہم نکتہ تھا۔ میں نے کوئی کام کی بات تلاش کرنے کے لیے اکبر علی اور اس کے ساتھیوں سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''اکبر علی! ماجد ٹکٹیں بک کروانے ریلوے اسٹیشن اکیلا ہی گیا تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی......وہ اکیلا ہی گیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''گھر میں سے کسی اور نے اس کے ساتھ جانے کی کوشش نہیں کی تھی؟''

''نسیمہ کے بیٹے تو اس کے ساتھ جانے کو تیار تھے لیکن میں نے خود ہی ماجد کو اکیلے جانے کے لیے کہا تھا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''قادرے والے واقعے نے نسیمہ کے گھر میں بڑی افراتفری مچا دی تھی۔ اکثر لوگ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ صلح صفائی سے کام لے کر اس معاملے کو رفع دفع کر دیا جائے لیکن میں جو فیصلہ کر چکا تھا اس میں تبدیلی ممکن نہیں تھی......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ نسیمہ کے بیٹے ماجد کے ساتھ ریلوے اسٹیشن جانے کو تیار تھے لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کے گھر والے انہیں منع کر رہے تھے۔ جب میں نے ایسی صورت حال دیکھی تو زبردستی ماجد کو اکیلے ہی اسٹیشن کی جانب روانہ کر دیا۔ میں کسی بھی قیمت پر وہاں نہیں رک سکتا تھا اور نہ ہی مصالحت کی کوئی گنجائش تھی میرے نزدیک۔ آپ خود سوچیں تھانے دار صاحب......'' اس نے ایک بار پھر لمحاتی توقف کیا اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جو لوگ اپنے نا ہنجار بیٹے کی تصدیق شدہ غلطی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوں ان سے آگے چل کر کیا امید رکھی جا سکتی تھی۔ اچھا ہوا، ایسے کم ظرفوں سے چھٹکارا مل گیا ورنہ ہماری تو زندگی عذاب بن کر رہ جاتی......''

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''کل تم لوگ کتنے بجے ٹرین پر سوار ہوئے تھے؟''

''ٹرین کا ٹائم تو آٹھ بجے کا تھا لیکن ہم سات بجے ہی اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔'' اکبر علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ٹرین پلیٹ فارم پر لگی تو ہم اس میں بیٹھ گئے پھر اپنے وقت مقررہ پر ہی ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہوئی تھی......''

میں نے آج صبح کوئی دس بجے ماجد کی لاش کا معائنہ کیا تھا اور اس کے بدن و لباس پر جمے خون سے اندازہ ہوا

تھا کہ اسے موت کی آغوش میں پناہ حاصل کیے دس سے بارہ گھنٹے گزر رہے ہوں گے یعنی گزشتہ رات آٹھ اور گیارہ کے بیچ اس کی موت واقع ہوئی ہوگی۔ اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے میں نے اکبر علی سے پوچھ لیا۔

''تم لوگ گوجرانوالہ کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''لگ بھگ ساڑھے نو بجے رات۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم لوگ جب گوجرانوالہ اسٹیشن پر گاڑی سے باہر نکلے تو ماجد تمہارے ساتھ نہیں تھا۔'' میں نے اکبر علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے یہی بتایا تھا نا......؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہی حقیقت ہے۔''

''کل رات سے اب تک چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔'' میں نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''اور آپ لوگ اب میرے پاس آ رہے ہیں۔ آپ کو تو فوری طور پر ماجد کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانا چاہیے تھی......؟''

''ہم اپنے طور پر اسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' اصغر علی نے بتایا ''ہم ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ پتا چلا، آپ نے کسی نوجوان کی لاش کو اسپتال بھجوایا ہے، تو ہم آپ کے پاس آ گئے ہیں......''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کے عذر کو درست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں نے کل رات سے اب تک ماجد کو کہاں کہاں تلاش کیا ہے......؟''

''جناب! گوجرانوالہ میں جہاں جہاں بھی ہمارے عزیز رشتے دار بستے ہیں ہم نے وہاں جا کر دیکھ لیا ہے۔'' اکبر علی نے جواب میں بتایا۔ ''اس کے تمام دوستوں سے بھی معلوم کیا ہے مگر کہیں سے کوئی سراغ نہیں مل سکا......''

''تم لوگوں نے لاہور کا رخ نہیں کیا......'' میں نے سوالیہ انداز میں باری باری اکبر علی اور اصغر علی کی طرف دیکھا۔ ''ادھر نسیمہ کے گھر سے ماجد کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا؟''

''نہیں جناب......!'' اکبر علی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ادھر سے کچھ پوچھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔ جب ہم سب گھر والے ٹرین میں ایک ساتھ بیٹھ کر لاہور سے گوجرانوالہ کی جانب روانہ ہو گئے تھے تو پھر ماجد واپس لاہور کیسے جا سکتا تھا......''

''ہوں......!'' میں نے پرسوچ انداز میں گردن ہلائی پھر سوال و جواب کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اکبر علی! آپ لوگوں کو پہلی بار کس وقت احساس ہوا تھا کہ ماجد آپ کے ساتھ نہیں؟''

''جی...... یہ تو جب ہم ریلوے اسٹیشن پر اترے تو اس وقت پتا چلا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''گاڑی پلیٹ فارم پر لگی تو پہلے ہم نے گھر کی عورتوں کو نیچے اتارا پھر سامان کو اتارا گیا۔ اسی وقت یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ماجد ہمارے ساتھ نہیں۔''

''اسے غیر حاضر پا کر تم لوگوں نے کیا کیا؟''

''پہلے تو ہم نے اسے پلیٹ فارم پر تلاش کیا......'' اکبر علی نے جواب دیا۔ ''جب وہ کہیں نظر نہ آیا تو ہم نے ٹرین کے اندر جا کر بھی اسے دیکھ لیا مگر وہ کہیں بھی نہ مل سکا......''

''کیا تم لوگ ٹرین کی ایک ہی بوگی میں سفر کر کے گوجرانوالہ پہنچے تھے یا مسافر دو بوگیوں میں بٹے ہوئے تھے؟'' میں نے ایک ٹیکنیکل سوال کیا۔

''خوش قسمتی سے ہمیں ایک ہی بوگی کی ٹکٹیں ملی تھیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اور ہم سب لوگ ایک ہی بوگی میں بیٹھ کر لاہور سے گوجرانوالہ پہنچے تھے۔''

''پھر تو سفر کے دوران میں تمام وقت ماجد آپ کی نظر کے سامنے رہا ہوگا؟'' میں نے تیز آواز میں دریافت کیا۔

''جی ہاں......'' اصغر علی نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ دو تین بار اٹھ کر پچھلی بوگی میں بھی گیا تھا۔''

''پچھلی بوگی میں......؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی، اصغر ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اکبر علی نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''پچھلی بوگی میں دو تین مسافروں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ان سے گپ شپ کرنے ادھر گیا تھا۔ میں نے بھی اسے اس خیال سے نہیں روکا کہ چلو، ذرا اس کا دل بہل جائے گا۔ ہم لوگ جس نوعیت کی صورت حال سے نمٹ کر آ رہے تھے اس نے سب کے دل و دماغ کو بے حد افسردہ کر رکھا تھا۔''

اکبر علی کی وضاحت سے میری تسلی نہیں ہوئی کیونکہ میری کھوپڑی کے اندر ایک پولیس آفیسر کا دماغ تھا۔ اس انکشاف نے مجھے بری طرح کھٹکا دیا تھا کہ ٹرین کی پچھلی بوگی میں مقتول ماجد کی چند افراد سے دوستی ہو گئی تھی اور وہ گپ شپ کے لیے دو تین مرتبہ ان کے پاس بھی جا چکا تھا۔ گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں کسی سے دوستی ہو جانا اور وہ بھی کسی دوسری بوگی میں، چونکا دینے والی بات تھی۔ چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ یہاں پر کچھ گڑبڑ ہے۔ اس بارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں فی الحال میں کچھ نہیں جانتا تھا ...... اسی لیے جاننے کی کوشش کررہا تھا۔

''اکبر علی!'' میں نے مقتول کے باپ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دو...... تم نے اپنی بوگی میں آخری مرتبہ ماجد کو کب دیکھا تھا؟''

اس نے چند لمحات تک سوچا پھر بتایا۔ ''جب ٹرین کاموکی سے نکلی تو ماجد میرے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا اور پچھلی بوگی میں چلا گیا۔ وہ پہلے بھی دو مرتبہ ادھر سے ہوکر آیا تھا۔ وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا تھا۔

''اب ادھر زیادہ دیر نہ لگانا۔ ہم گوجرانوالہ پہنچنے والے ہیں۔ کاموکی کے بعد ایمن آباد اور پھر گوجرانوالہ......!''

''ہاں، ہاں ابا...... مجھے پتا ہے۔'' اس نے جاتے جاتے کہا تھا۔ ''جب گاڑی گوجرانوالہ کے ریلوے اسٹیشن پر لگے گی تو میں آپ کے پاس آجاؤں گا۔''

اتنا بتا کر اکبر علی خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''پھر جب گاڑی گوجرانوالہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لگی تو کیا اس وقت ماجد اپنی بوگی میں واپس آچکا تھا؟''

''نہیں جناب......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس وقت وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر عورتوں اور سامان کو نیچے اتروانا شروع کردیا کہ وہ کوئی بچہ نہیں، خود ہی اتر جائے گا لیکن جب ہم سب سامان کے ساتھ نیچے اتر چکے تو وہ غائب تھا......''

''اکبر علی!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا تھا کہ پلیٹ فارم پر ماجد کو موجود نہ پاکر تم لوگوں نے اسے ٹرین کے اندر بھی تلاش کیا تھا۔ کیا تم لوگوں نے پچھلی بوگی میں بھی اسے دیکھا تھا؟''

''تھانے دار صاحب! ہم نے ماجد کو صرف دو بوگیوں ہی میں تلاش کیا تھا۔'' اکبر علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک اپنی بوگی میں اور ایک پیچھے والی بوگی میں۔''

''آپ والی بوگی میں تو وہ تھا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پچھلی بوگی والوں نے کیا بتایا تھا۔ کیا تم نے ان لوگوں سے ماجد کے بارے میں پوچھا تھا جن کے ساتھ اس کی دوران سفر میں دوستی ہوگئی تھی اور جن سے گپ شپ کے لیے وہ دو تین مرتبہ پچھلی بوگی میں جاچکا تھا۔''

''جی، میں نے انہی سے پوچھا تھا۔'' اکبر علی کے بجائے چھوٹے بھائی اصغر علی نے جواب دیا۔ ''انہوں نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی تو ان کے پاس سے گیا ہے۔ گاڑی رکنے سے پہلے وہ انہیں ''خدا حافظ'' کہہ کر اپنی بوگی میں چلا گیا تھا۔''

''آپ میں سے کوئی ان افراد کے نام اور حلیوں سے واقف ہے جن سے ماجد کی دوستی ہوگئی تھی؟'' میں نے باری باری دونوں بھائیوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

اصغر علی نے جلدی سے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! جب مجھے بھائی صاحب (اکبر علی) نے بتایا کہ ماجد کی پچھلی بوگی کے دو تین مسافروں سے دوستی ہوگئی ہے تو میں نے خود ادھر جاکر دیکھا تھا اور ان سے بات چیت بھی کی تھی......''

''پھر تم نے اس بات چیت سے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ان میں سے ایک کا نام صداقت اور دوسرے کا نام سرفراز معلوم ہوا تھا۔'' اصغر نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''صداقت اور سرفراز لالہ موسیٰ جارہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ماجد سے ان کی دوستی تاش کے ایک کھیل سیپ (سویپ) کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ دونوں، دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر وقت گزاری کے لیے تاش کھیل رہے تھے۔ ماجد کا ادھر سے گزر ہوا تو وہ ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ ماجد نے صداقت کو دو چار ایسی ٹپس دیں کہ بازی پلٹ گئی۔ ان لوگوں نے ماجد کو بھی کھیل میں شامل کرلیا۔ ماجد جو دو تین بار اپنی بوگی سے پچھلی بوگی میں گیا تھا تو وہ گپ شپ کے علاوہ تاش کے کھیل کے لیے بھی گیا تھا......'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میرے پوچھنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ ٹرین جیسے ہی گوجرانوالہ کی حدود میں داخل ہوئی تھی، ماجد نے ان سے الوداعی کلمات کا تبادلہ کرلیا تھا اور پلیٹ فارم کا آغاز ہوتے ہی وہ ان سے مصافحہ کرکے رخصت ہوگیا تھا۔''

اصغر علی کی بات سن کر میرا ذہن الجھن کا شکار ہوگیا، کیونکہ یہاں ایک بہت بڑا واضح تضاد پیدا ہوگیا تھا۔ ماجد کی لاش ریلوے لائن کے کنارے جس مقام سے ملی تھی وہ اصغر کالونی اور کنہیا لال باغ والے پھاٹک کا علاقہ تھا اور یہ مقام گوجرانوالہ کے ریلوے اسٹیشن سے لگ بھگ دو میل کی دوری پر واقع تھا۔ صداقت اور سرفراز کے بیان کو اگر

درست مان لیا جاتا تو پھر ماجد کو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی کہیں پایا جانا چاہیے تھا لیکن وہ پلیٹ فارم سے دو میل پیچھے مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ماجد ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد جائے وقوعہ پر پہنچا ہو اور وہاں اس کو قتل کردیا گیا ہو کیونکہ ٹرین کے اسٹیشن پہنچنے اور وقوعہ کا وقت تقریباً ایک ہی تھا۔ اس کی مزید وضاحت پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ہوسکتی تھی۔

پتا نہیں کیوں، بار بار میرے ذہن میں یہ بات آرہی تھی کہ صداقت اور سرفراز کوئی اچھے لوگ نہیں تھے۔ اسی سوچ کی روشنی میں، میں نے اصغر علی سے سوال کیا۔

''تم نے تو ان لوگوں سے باقاعدہ بات چیت کی ہے۔ مجھے ان کی وضع قطع اور حلیے کے بارے میں وضاحت سے بتاؤ......؟''

''صداقت ایک دراز قامت اور گندمی رنگت کا آدمی ہے۔ اس کی بھاری بھرکم مونچھیں ہیں اور وہ نظر کا چشمہ لگاتا ہے۔'' اصغر علی نے بتایا۔ ''جبکہ سرفراز پستہ قامت اور سانولے رنگ کا ہے۔ وہ اچھا خاصا موٹا ہے اور اس کی آنکھوں کے زاویے میں بھی فرق ہے۔ وہ بھینگا تو نہیں لیکن پتا نہیں چلتا، وہ آپ کو دیکھ رہا ہے یا آپ کے ساتھ کھڑے کسی دوسرے شخص کو......''

میں نے صداقت اور سرفراز کے حلیے کو ذہن میں محفوظ کرلیا اور پوچھا۔ ''اصغر علی! انہوں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ لالہ موسیٰ جارہے ہیں۔ کیا وہ لوگ لاہور اسٹیشن سے آپ کے ساتھ ہی ٹرین پر سوار ہوئے تھے؟''

''اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھانے دار صاحب۔'' اصغر علی نے جواب دیا۔ ''وہ لوگ دوسری بوگی پر سوار ہوئے تھے اور ہم کسی اور پر۔ لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر، اگر ان پر میری نظر پڑی ہو تو مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔''

''یقین سے تو یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ وہ واقعی لالہ موسیٰ جارہے تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا، پھر اکبر علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم لوگ لاہور [illegible] گھوڑے شاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ صداقت اور سرفراز میں سے کوئی آپ کو وہاں تو نظر نہیں آیا تھا؟''

اکبر علی نے جواب دینے کے بجائے اصغر علی کی طرف دیکھا کیونکہ میرے اس سوال کا زیادہ بہتر جواب وہی دے سکتا تھا اور صداقت اور سرفراز سے صرف اسی کی ملاقات ہوئی تھی۔ اصغر علی، اپنے بڑے بھائی کا اشارہ پاکر نفی میں

گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں جناب...... ان دونوں بندوں کو میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹرین کے اندر ہی دیکھا تھا......''

''اکبر علی! کیا تمہیں اس بارے میں کچھ یاد ہے کہ ماجد پہلی مرتبہ کب اپنی بوگی سے اٹھ کر پچھلی بوگی میں گیا تھا؟'' میں نے مقتول کے باپ سے سوال کیا۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے جناب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب ٹرین نے راوی کا پل کراس کرلیا تھا تو ماجد پہلی بار پچھلی بوگی کی طرف گیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے......'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''وہ دونوں بندے لاہور ہی سے ٹرین پر سوار ہوئے تھے۔'' پھر میں نے باری باری ان تینوں کے چہروں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''اگرچہ مجھے امید نہیں کہ آپ میں سے کوئی میرے سوال کا جواب دے سکے گا لیکن میں پھر بھی جاننا چاہوں گا کہ صداقت اور سرفراز لالہ موسیٰ میں کہاں اور کس کے پاس گئے ہوں گے......؟''

انہوں نے میرے حسب توقع نفی میں گردنیں ہلادیں۔

میں نے اکبر سے کہا۔ ''تم مجھے گھوڑے شاہ میں اپنی سالی نسیمہ کے گھر کا ایڈریس نوٹ کروادو۔ اگر ماجد کے قاتل کے سلسلے میں مجھے لاہور جاکر بھی تفتیش کرنا پڑی تو میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لوں گا۔''

اس نے فوراً مجھے نسیمہ کے گھر کا ایڈریس لکھوادیا۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دینے کے بعد کہا۔ ''آپ لوگ اطمینان سے گھر جاؤ۔ مجھے جیسے ہی ماجد کے قاتل کے بارے میں کوئی سن گن ملے گی، میں آپ لوگوں کو اس کی اطلاع کردوں گا اور آپ لوگ بھی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ اگر کوئی ایسی، چھوٹی سے چھوٹی بات بھی پتا چلے جو اس قتل کی واردات کو حل کرنے کے لیے معاون ثابت ہوسکتی ہو تو آپ فوراً مجھے بتائیں گے۔''

اکبر علی گلوگیر آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! میرا بیٹا تو جان سے گیا۔ آپ اس کے قاتل کو گرفتار کرکے کڑی سے کڑی سزا بھی دلوادیں تو اس سے ماجد واپس نہیں آئے گا۔ آپ بس، جلد از جلد اس کی لاش میرے حوالے کردیں تاکہ میں اس کے کفن دفن کا بندوبست کردوں۔ میں اسے بیاہنے اپنے ساتھ لاہور لے گیا تھا۔ اب اس کا جنازہ اٹھانا پڑے گا......'' بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اکبر علی! مجھے امید ہے، کل شام تک ماجد کی لاش پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے ساتھ تھانے پہنچ جائے گی۔ تم لوگ کل شام میں ادھر کا چکر لگا لینا اور جہاں تک ماجد کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانے کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں مانتا ہوں کہ ماجد کا قاتل کیفر کردار تک پہنچ بھی جائے گا تو اس سے تمہارے بیٹے کی واپسی ممکن نہیں لیکن عام لوگوں کی عبرت کے لیے مجرم کو قرار واقعی سزا دینا بہت ضروری ہے ورنہ معاشرے میں جرائم کا تناسب خطرناک حد تک بڑھ جائے گا۔''

ان تینوں نے میری بات سے اتفاق کیا اور میں نے انہیں رخصت کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف آ گیا جو تھانے کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ اس کے بعد سرسبز کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک سڑک بھی شمال سے جنوب کی طرف چلی جا رہی تھی۔ دراصل یہ وہی سڑک تھی جو شیخوپورہ موڑ پر جی ٹی روڈ سے نکلتی تھی۔ مذکورہ سڑک شیخوپورہ روڈ کہلاتی تھی جو گوجرانوالہ سے قلعہ شیخوپورہ اور پھر لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کی جانب چلی جاتی تھی۔

میں تھانے سے اپنے کوارٹر میں پہنچا تو ماجد کے قتل کا معما بھی میرے ذہن میں بیٹھ کر کوارٹر میں آ گیا تھا۔ اس واقعے نے میری سوچ کو تتر بتر کر رکھا تھا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اب تک اس سلسلے میں جو واقعات میرے سامنے آئے تھے ان میں سے بہت سی کڑیاں گم تھیں۔ اگر میں ان کڑیوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ کیس خود بہ خود حل ہو جاتا تھا مثلاً......

مثلاً یہ کہ صداقت اور سرفراز کے مطابق وقوعہ کی رات ماجد گوجرانوالہ کے ریلوے اسٹیشن پر ان سے جدا ہوا تھا اور حقائق کے مطابق، عین اسی وقت وہ اصغر کالونی والے پھاٹک کے نزدیک قتل کر دیا گیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ اکبر علی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آخری مرتبہ کاموکی کے قریب پچھلی بوگی کی طرف گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے مقتول ماجد کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس تمام تر بحث اور سوچ بچار کا ایک ہی نتیجہ نکل کر سامنے آتا تھا اور وہ یہ کہ ماجد پچھلی رات صحیح سلامت گوجرانوالہ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اسے جائے وقوعہ پر ہی موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا یا پھر کہیں اور قتل کرنے کے بعد وہاں پھینکا گیا سب سے اہم بات یہ کہ وہ ٹرین میں سے نکل کر جائے تک کیسے پہنچا ہو گا...... مجھے اسی بات کا پتا چلانا تھا۔ اس بعد ہی میں اس کے قاتل تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔

ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں سونے کے لیٹ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بھی خاصی خنک اور دھند والی تھی۔ میں اٹھا تو ذہن الجھا ہوا تھا۔ عام طور پر میرے ساتھ ایسا ہوتا تھا۔ عموماً میری صبح کا آغاز بڑی ہشاشیت بشاشیت ساتھ ہوا کرتا تھا۔ مسئلے مسائل کب ذہن میں نہیں ہو لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب تو نہیں کہ انسان مکدر طبیعت ساتھ بیدار ہو۔ بہرحال، میں اپنی الجھن سے بہ خوبی آ تھا لہٰذا میں نے اس الجھن کی سلجھن کے بارے میں سو ہوئے ناشتا کیا اور تیار ہو کر تھانے پہنچ گیا۔

حوالدار خدا بخش میرے پاس آیا۔ اس نے سلام کیا اور بولا۔ ''ملک صاحب! رات سے میرے طبیعت ٹھیک نہیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آج کر لیتا ہوں؟''

''خدا بخش! کیا ہوا ہے تمہارے بچے کو؟'' میں ہمدردی بھرے انداز میں پوچھا۔

خدا بخش مقامی تھا۔ اس کی رہائش گوجرانوالہ ایک محلے ''محلہ باغبان پورہ'' میں تھی۔ اصل لفظ تو ''باغ پورہ'' تھا لیکن جب بھی اس محلے کا نام پکارا جاتا تو '' باغبان پورہ'' ہی کہا جاتا تھا۔ خدا بخش نے میرے کے جواب میں بتایا۔

''عثمان کو کل سے بخار تھا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ را میں بخار زیادہ تیز ہو گیا تھا......''

عثمان اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جس کی عمر سال کے قریب رہی ہو گی۔ میں نے کہا۔ ''میری طر سے تمہیں پوری اجازت ہے خدا بخش...... تم نہ صرف آج چھٹی کرو بلکہ اپنے بیٹے کو حکیم کے پاس بھی لے کر جاؤ۔ کل موسم بہت شدید ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، عثمان کو لگ گئی ہو گی......''

''میری گھر والی کل حکیم جی سے اس کی دو تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''انہوں نے بھی ٹھنڈ لگنا ہی بتایا لیکن بچے سنتے ہی کہاں ہیں۔''

''ہاں، یہ تو ہے......'' میں نے تائیدی انداز میں

''اگر وہ سن لیں تو پھر انہیں بچہ کون کہے گا۔ جو جی میں آتا ہے، کہہ ڈالتے ہیں۔ انہیں کسی بات کے اچھا یا برا لگنے کی قطعاً پروا نہیں ہوتی......''

''میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟'' خدا بخش نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''تم جاؤ...... میں نے تمہیں اجازت دے تو دی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور ہاں...... ذرا اے ایس آئی فدا حسین کو میرے پاس بھیج دینا۔''

''جی ملک صاحب!'' وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔ پھر میرے کمرے سے نکل گیا۔

اے ایس آئی میرے کمرے میں آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''فدا حسین! میں ذرا جائے وقوعہ کی طرف جا رہا ہوں۔ تم تھانے کے معاملات کو دیکھ لینا۔''

''وہ میں دیکھ لوں گا ملک صاحب۔'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا پھر پوچھا۔ ''آپ اُدھر خیریت سے جا رہے ہیں نا؟''

''ہاں بھئی، خیریت کہاں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ تفتیش باقی رہ گئی تھی، سوچا ہے پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پہلے اس کو نمٹا لوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ بے فکر ہو کر جائیں۔'' فدا حسین نے کہا۔

میں نے فدا حسین کو یہ بتا دینا ضروری سمجھا کہ حوالدار خدا بخش بھی دن بھر تھانے میں نہیں ہو گا لہٰذا اسے پہلے سے زیادہ محتاط اور چاق و چوبند رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کے بعد کانسٹیبل رمضان کو اپنے ساتھ لیا اور جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ آج کے دن کے لیے میرے ذہن میں ایک خاص پلان تھا۔

میں کانسٹیبل رمضان کی ہمراہی میں سیدھا پھاٹک والے کے پاس پہنچ گیا۔ مذکورہ شخص کا نام عمر فاروق معلوم ہوا۔ عمر فاروق کی عمر پچپن کے آس پاس تھی۔ وہ چھڑا چھانٹ تھا اور پھاٹک کے ساتھ بنے ریلوے کے کوارٹر میں رہتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹینشن ہو گیا۔

عمر فاروق جلدی سے اپنے کوارٹر کے اندر سے ہمارے لیے دو کرسیاں نکال لایا۔ اس وقت تک آسمان پر سورج تو جلوہ گر نہیں ہوا تھا تاہم دھند پوری طرح چھٹ چکی تھی اور فضا کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ تھوڑی دیر میں دھوپ نکل آئے گی۔

ہم کرسیوں پر بیٹھ چکے تو عمر فاروق نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! حکم کریں، میں آپ کی کیا خدمت کروں۔ موسم ٹھنڈا ہے۔ گرما گرم چائے تو چلے گی نا......''

''عمر فاروق!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا نام اتنا محترم ہے کہ میں تم سے کسی قسم کی خدمت لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ موسم ٹھنڈا ہے یا گرم، اس بات کو بھول جاؤ اور یہاں بیٹھ کر میرے چند سوالات کے کھرے اور سچے جواب دو۔ تمہارے جوابات سے ایسا لگنا چاہیے کہ کوئی عمر فاروق بول رہا ہے۔''

''مائی باپ...... آپ جو پوچھیں گے، میں سچ سچ بتا دوں گا۔'' وہ فدویانہ انداز میں بولا۔ ''لیکن یہ اچھا نہیں لگ رہا کہ آپ پہلی مرتبہ میرے غریب خانے پر آئے اور میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا......''

''تمہارا سب سے بڑا تعاون بلکہ احسان یہ ہو گا کہ تمہاری فراہم کردہ معلومات میرے لیے مفید ثابت ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تم فوراً میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔''

میرا حتمی انداز دیکھتے ہوئے اس نے مزید حیل و حجت سے کام نہیں لیا اور ایک کھڑی ہوئی چارپائی کو بچھا کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

''ابھی فوری طور پر کسی ٹرین کے گزرنے کا ٹائم تو نہیں ہے نا؟''

''آپ کے آنے سے کوئی دس منٹ پہلے ایک ٹرین لاہور کی طرف گئی ہے۔'' عمر فاروق نے بتایا۔ ''اب لاہور کی جانب سے ایک گھنٹے کے بعد ٹرین آئے گی تو مجھے پھاٹک بند کرنے اور ٹرین کو ہری جھنڈی دکھانے کے لیے اٹھنا پڑے گا۔''

''ایک گھنٹا بہت ہوتا ہے عمر فاروق!'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا کام متاثر نہیں ہونے دوں گا۔ اگر تم نے بھرپور تعاون کیا تو میں تمہیں پندرہ بیس منٹ میں فارغ کر دوں گا۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں سرکار!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں......''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں کس سلسلے میں تم سے پوچھ تاچھ کرنے آیا ہوں؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جی، کچھ کچھ اندازہ تو ہے......" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"مثلاً......!" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ "کیا کچھ کچھ؟"

"جناب! کل یہاں سے آپ کسی اجنبی بندے کی جو لاش لے کر گئے ہیں، میں سمجھتا ہوں، اسی کے سلسلے میں آپ مجھ سے سوال جواب کریں گے۔"

"تم نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے عمر فاروق!" میں نے سر کو تائیدی جنبش دی۔ "لیکن اب تک کی تحقیق کے مطابق، مقتول میرے لیے اجنبی نہیں رہا۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔"

"وہ بدنصیب کون تھا تھانے دار صاحب؟" اس نے دکھ بھرے انداز میں پوچھا۔

"ہاں عمر فاروق! وہ واقعی بہت بدنصیب انسان ثابت ہوا ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس کا نام ماجد علی تھا اور وہ بذریعہ ٹرین لاہور سے گوجرانوالہ آرہا تھا کہ تمہارے پھاٹک کے قریب اسے جان لیوا حادثہ پیش آگیا۔"

پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں، چند سیکنڈ کے اندر عمر فاروق کو مقتول ماجد علی کے بارے میں بتادیا۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"لیکن تھانے دار صاحب! اگر وہ ٹرین سے کٹ مرتا تو اس کا جسم سلامت نہ رہتا۔ اس کی تو گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ جب آپ کل یہاں آکر تفتیش کر رہے تھے تو میں نے اس اجنبی...... میرا مطلب ہے، ماجد علی کی لاش کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا......؟"

میرے "جان لیوا حادثہ پیش آگیا" کے الفاظ کا عمر فاروق نے کوئی اور مطلب لے لیا تھا۔ اس بے چارے نے یہی سمجھا تھا کہ میں ماجد کے ٹرین کے نیچے آکر ہلاک ہونے کی بات کر رہا ہوں۔ خیر، میں نے وضاحت کر دی تو وہ مطمئن انداز میں گردن ہلانے لگا۔

میں نے کہا۔ "عمر فاروق! جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، مقتول ماجد اور اس کے گھر کے بیس افراد ٹرین میں بیٹھ کر لاہور سے گوجرانوالہ آرہے تھے۔ وہ ٹرین کل رات ٹھیک پونے دس بجے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تھی۔ ظاہر ہے، وہ تمہارے اس پھاٹک سے گزرنے کے بعد ہی آگے گئی ہوگی؟"

"جی ہاں...... بالکل......!" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے خیال میں وہ اس پھاٹک سے کتنے بجے گزری ہوگی؟"

"لگ بھگ ساڑھے نو بجے جناب۔" عمر فاروق نے جواب دیا۔

"ہوں......!" میں نے پرسوچ انداز میں پوچھا۔ "ساڑھے نو بجے وہ تمہارے پھاٹک سے گزری اور پندرہ منٹ بعد وہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"عمر فاروق! کیا وہ ٹرین تھوڑی دیر کے لیے پھاٹک پر رکی بھی تھی؟"

یہ بہت ٹیکنیکل سوال تھا۔ اگر عمر فاروق کا جواب ہاں میں آتا تو اس سے یہ بات واضح ہوجاتی کہ ماجد کو یہیں اتار لیا گیا تھا۔

"تھانے دار صاحب!" عمر فاروق نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دن میں تو میں ہری جھنڈی دکھا کر ٹرینوں کو جانے کی اجازت دیتا ہوں لیکن رات میں یہ کام بتی سے کیا جاتا ہے۔ آپ نے ہماری وہ بتی تو دیکھی ہوگی جس کی ایک جانب ہرا اور دوسری طرف لال شیشہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک بتی جل رہی ہوتی ہے۔ حسب ضرورت پھاٹک والا ٹرین کو لال یا ہری سائڈ دکھا کر کام چلا لیتا ہے......"

"ہاں، میں ریلوے کے اس سسٹم سے اچھی طرح واقف ہوں۔" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ گزشتہ رات تمہارے پھاٹک پر ٹرین رکی تھی یا نہیں؟"

"آپ اسے رکنا تو نہیں کہہ سکتے جناب۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ "وہ مگر بہت آہستہ ہوگئی تھی......"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیوں آہستہ ہوگئی تھی؟"

"میں نے تو ٹرین کو ہری بتی دکھا دی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن کچی سے آگے والا سگنل ڈاؤن نہیں ہوا تھا اس لیے اس پھاٹک سے گزرنے کے بعد ٹرین کی رفتار بہت کم ہوگئی تھی۔"

"ٹرین کی رفتار کم ہوگئی تھی......" میں نے عمر فاروق کے الفاظ کو دہرایا پھر پوچھا۔ "کتنی کم......؟"

"اتنی کم کہ کوئی مسافر بہ آسانی ٹرین سے نیچے اتر سکتا تھا۔"

عمر فاروق کا جواب میرے حسب توقع تھا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "عمر فاروق! کیا تم نے ٹرین کی سست رفتار کے دوران میں کسی مسافر کو ٹرین سے نیچے اترتے دیکھا تھا...... کسی ایک مسافر کو یا...... دو مسافروں کو؟"

"جناب! میں بتی پکڑ کر پھاٹک کی اس سائڈ پر کھڑا تھا۔" اس نے اپنے کوارٹر کی سمت اشارہ کیا جو کنہیا لال باغ کی جانب واقع تھا۔ "اس جانب تو میں نے کسی کو ٹرین سے کودتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔"

ماجد علی کی گردن کٹی لاش ریلوے پھاٹک کی جس طرف پڑی ملی تھی وہ کنہیا لال باغ کی مخالف سمت میں یعنی اصغر کالونی کی جانب تھا لہٰذا اگر مقتول اور قاتل ٹرین سے اس طرف کودے تھے تو وہ عمر فاروق کی نظر میں آہی نہیں سکتے تھے۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ قاتل نے ماجد علی کو زبردستی وہاں کودنے پر مجبور کردیا ہو کیونکہ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی کہ مقتول اپنی مرضی سے وہاں اتر گیا ہو۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بہ دستور عمر فاروق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ ٹرین گزر گئی اور تم بتی لے کر اپنے کوارٹر میں آگئے۔ کیا صبح سے پہلے کوئی اور ٹرین بھی اس پھاٹک سے گزری تھی؟"

"جی۔ رات کو گیارہ بجے ایک مال گاڑی گزری تھی۔" عمر فاروق نے بتایا۔ "یہ مال گاڑی روزانہ رات کو گیارہ سے ساڑھے گیارہ بجے تک یہاں سے گزرتی ہے۔ اسے پاس کرانے کے بعد میں سکون سے سوجاتا ہوں کیونکہ پھر صبح سات بجے سے پہلے کوئی گاڑی ادھر کا رخ نہیں کرتی اور میں تو فجر کی نماز کے لیے اٹھ چکا ہوتا ہوں۔"

"ہوں......!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ساڑھے نو بجے اور گیارہ بجے والی ٹرین کو گزارنے کے درمیانی وقفے میں تم کہاں تھے اور کیا کرتے رہے تھے؟"

"جی...... میں نے کہاں جانا تھا۔" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ "میں ادھر اپنے کوارٹر ہی میں موجود تھا۔"

"تم اپنے کوارٹر سے باہر نہیں گئے تھے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "تو کیا تم سے ملنے کوئی کوارٹر میں بھی نہیں آیا تھا......؟"

اس کے چہرے پر کچھ اس نوعیت کے آثار پیدا ہوئے جیسے اس کے ذہن میں روشنی کا کوئی جھماکا سا ہوا ہو۔ اس نے فوراً کہا۔

"عمر فاروق! یہ بہت اہم ہے...... اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، گزشتہ رات ساڑھے نو اور گیارہ بجے کے درمیان تم سے ملنے کوارٹر پر کوئی آیا تھا......؟"

"وہ خاص طور پر مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا جناب۔" اس نے بڑے مضبوط لہجے میں بتایا۔ "وہ کوئی اجنبی مسافر تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس نے پوچھا کہ جی ٹی روڈ کس طرف ہے اور میں نے اسے بتادیا۔ بس، اتنی سی بات ہے۔"

عمر فاروق کے لیے یقیناً وہ اتنی سی بات تھی مگر میں اس اتنی سی بات کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔

"تم نے اس شخص کے لیے "اجنبی مسافر" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کا مطلب ہے، تم اسے نہیں جانتے تھے؟"

"میں واقعی اس سے ناواقف تھا۔" وہ بڑی سادگی سے بولا۔ "اس سے پہلے میں نے اس بندے کو کہیں نہیں دیکھا تھا۔"

"تم نے اسے جی ٹی روڈ کا راستہ بتایا اور وہ چلا گیا۔" میں نے عمر فاروق کا ٹرائل ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ بھی تم دونوں میں کوئی بات ہوئی تھی؟"

"جی ہاں!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں نے اسے جی ٹی روڈ کا راستہ بتانے کے بعد پوچھا تھا کہ بھائی، تمہیں جانا کہاں ہے......؟"

"پھر اس نے تمہیں کیا جواب دیا تھا؟" میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

"اس نے بتایا تھا، اسٹیشن جاؤں گا......"

"عمر فاروق! یہ تم نے بڑی پتے کی بات بتائی ہے۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تم مجھے اس اجنبی مسافر کے حلیے اور قد کاٹھ کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ......؟"

"عمر پینتیس کے آس پاس، دبلا پتلا اور لم ڈھینگ۔ آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی بٹنوں جیسی اور سر کے بال گھونگریالے۔ اس کی ٹانگوں کی لمبائی بھی غیر معمولی تھی۔ وہ کسی زرافے کی طرح چلتا تھا......"

میں نے عمر فاروق کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور اجنبی مسافر کے نقش و نگار اور وضع قطع کو ذہن میں نقش کرکے واپس آگیا۔

❋❋❋

میں توقع کر رہا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ گیارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنوری کی شام تک آجائے گی لیکن میری یہ توقع پوری نہ ہوسکی اور بارہ جنوری کی دوپہر میں مقتول ماجد علی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اسپتال سے تھانے پہنچ گئی جس کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی لگی ہوئی تھی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، بدنصیب ماجد علی کی موت نو جنوری کی رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ اس کی موت کی تاریخ اور وقت آپس میں بے حد مماثلت رکھتے تھے یعنی نو اور دس جنوری کی درمیانی رات اور نو اور دس بجے کے درمیان۔ موت کا سبب جسم سے بہت زیادہ خون کا اخراج بتایا گیا تھا جو یقیناً اس کی شہ رگ کٹ جانے کے باعث ہوا تھا۔ آلۂ قتل یعنی تیز دھار اور خطرناک خنجر پر پائے جانے والے خون کا نمونہ مقتول کے خون سے میچ کر گیا تھا جس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ ماجد کو اسی خنجر کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رجحان عام نہیں ہوا تھا اور نہ ہی عدالت فنگر پرنٹس کی رپورٹ کو کوئی اہمیت دیتی تھی۔

اکبر علی اور اس کا چھوٹا بھائی اصغر علی گزشتہ رات مقتول کی لاش کے انتظار میں کافی دیر میرے پاس تھانے میں بیٹھے رہے تھے۔ میں نے دونوں بھائیوں سے، عمر فاروق سے اجنبی مسافر سے متعلق حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں بھی مختلف سوالات کیے لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس گھونگریالے بالوں والے لم ڈھینگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اسی روز یعنی گیارہ جنوری کی دوپہر میں، میں نے ایک اور خاص کام بھی کر ڈالا تھا۔ ادھر گوجرانوالہ ہی میں، نوشہرہ روڈ پر ایک نوجوان اور ہونہار آرٹسٹ آفتاب مغل رہتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر تو فلم کے پوسٹروں وغیرہ کا کام کرتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا اسکیچ ورک بہت عمدہ تھا۔ میں نے دوپہر میں آفتاب مغل کو اپنے پاس تھانے بلایا اور اسے تین خاکے بنانے کے لیے کہا۔ یعنی خاکا نمبر ایک...... دراز قامت، رنگ گندمی، بھاری بھرکم مونچھیں، آنکھوں پر نظر کی عینک، یہ صداقت علی کا حلیہ تھا۔ خاکا نمبر دو...... پستہ قامت، سانولی رنگت، ہٹا کٹا، آنکھوں کے زاویے میں نمایاں فرق۔ یہ صداقت کے ساتھی سرفراز کا حلیہ تھا۔ صداقت اور سرفراز ٹرین کے اندر مقتول ماجد علی کے دوست بن گئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے لاہور سے گوجرانوالہ پہنچا تھا۔ خاکا نمبر تین...... عمر پینتیس سال، دبلا پتلا، لم ڈھینگ، آنکھیں بٹنوں جیسی چھوٹی چھوٹی، سر کے بال گھونگریالے اور ٹانگیں زرافے کی طرح غیر معمولی لمبی۔ یہ نامعلوم اجنبی مسافر کا حلیہ تھا جو عمر فاروق کے مطابق رات کے لگ بھگ دس بجے ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

آفتاب مغل نے بڑی توجہ سے ایک ایک شخص کے خاکے کو میری زبانی سنا اور پھر اپنے کام میں جت گیا۔ دو گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد وہ میرے حسب منشا تین خاکے بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ خاکوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اس ہدایت کے ساتھ آفتاب مغل کو جانے کی اجازت دے دی کہ وہ آیندہ روز دن میں میرے پاس ایک چکر ضرور لگائے گا۔

اصل میں، ان خاکوں کی ویری فیکیشن کے لیے میں انہیں مقتول کے چچا اصغر علی کو دکھانا چاہتا تھا۔ وہ بہ نفس نفیس صداقت اور سرفراز سے ملاقات کر چکا تھا لہٰذا وہ زیادہ بہتر طور پر بتا سکتا تھا کہ آفتاب مغل کی محنت رنگ لے آئی تھی یا اس میں چند آنچ کی کسر باقی تھی۔

اگلے روز جب اکبر علی اور اصغر علی مقتول کی لاش کے حصول کے لیے تھانے پہنچے تو آفتاب مغل میرے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے صداقت اور سرفراز کے خاکے ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”اصغر علی! ان دونوں بندوں کو پہچانتے ہو؟“

وہ ان خاکوں کو دیکھ کر چونک اٹھا اور حیرت بھرے انداز میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ تو وہی دونوں بندے ہیں جو لاہور سے لالہ موسیٰ جا رہے تھے اور ماجد سے ان کی دوستی ہوگئی تھی لیکن......“

وہ تذبذب بھرے انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔ ”لیکن کیا اصغر علی؟“

”بس جی...... ان تصویروں اور اصل بندوں میں انیس بیس کا فرق ہے جناب......“ اس نے جواب دیا۔

”اگر انیس بیس کا فرق ہے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”یہ فرق تو میں ابھی آپ کے سامنے نکلوا دیتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“ وہ تعجب خیز نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ”یہ فرق کون نکالے گا؟“

”جس نے یہ خاکے بنائے ہیں۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔ ”وہ آپ کے سامنے بیٹھ کر، آپ کے مشورے سے اس فرق کو ختم کر دے گا۔“

”وہ...... کون؟“ اصغر علی کی حیرت سہ چند ہوگئی۔

میں نے آفتاب مغل کی جانب اشارہ کر دیا۔

آیندہ آدھے گھنٹے میں، اصغر علی کی مشاورت سے وہ دونوں خاکے ہو بہو صداقت اور سرفراز کا عکس بن گئے۔ میں نے اجنبی مسافر کا خاکا بھی ان دونوں بھائیوں کو دکھایا لیکن شناخت کے سلسلے میں انہوں نے معذوری ظاہر کر دی۔ وہ اس لم ڈھینگ زرافہ مار کا شخص کو بالکل نہیں جانتے تھے۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد ماجد علی کی لاش اس کے وارثوں کے حوالے کر دی تاکہ وہ اس کی تدفین کے فریضے سے عہدہ برا ہو سکیں۔ وہ لوگ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد آفتاب مغل سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس کی نگاہ کا مطلب بہ خوبی سمجھ رہا تھا لہٰذا میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کا کام ختم ہوگیا تھا۔ اسے خوامخواہ تھانے میں روکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے آفتاب مغل سے جو تین اسکیچز بنوائے تھے انہیں میں استعمال کرنے کے لیے ایک جامع منصوبے کی تیاری کر چکا تھا۔ میں نے اسی روز ایک ماہر فوٹو گرافر کو تھانے بلوا کر وہ خاکے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”دلشاد صاحب! مجھے ان خاکوں کے تین، تین فوٹو گراف چاہئیں......“

”بن جائیں گے ملک صاحب۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”لیکن یہ نہایت ہی اہم معاملہ ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ان خاکوں کا راز ہم دونوں کے بیچ ہی رہنا چاہیے۔“

”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”پہلے کبھی میں نے آپ کو شکایت کا موقع دیا ہے......؟“

دلشاد بہت ہی تجربہ کار اور قابل اعتماد فوٹو گرافر تھا۔ بعض قانونی معاملات میں پہلے بھی میں اس کی ٹیکنیکل سپورٹ لے چکا تھا۔ اس کے دوستانہ استفسار کے جواب میں، میں نے کہا۔

”نہیں دلشاد، مجھے تم سے کبھی کوئی شکوہ نہیں رہا۔“

”ان شاء اللہ، اس مرتبہ بھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ اس نے کہا۔

”ان شاء اللہ!“ میں نے تہ دل سے کہا پھر پوچھا۔ ”یہ

سبزی فروش کا محبوبہ کے نام

ٹماٹر کی طرح میری خوبصورت محبوبہ!

آداب کے بعد عرض ہے کہ تم تو ایسے خفا ہو گئی ہو جس طرح سردیوں میں کریلے ناراض ہو جاتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری جدائی میں میرا چہرہ بے موسمی سبزیوں کی طرح بے رونق ہو جاتا ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جب تک تمہاری پودینے جیسی سبز آنکھیں نہ دیکھ لوں میری طبیعت ساگ کے ابال کی طرح بے چین رہتی ہے۔ میں نے کب سے دیسی ٹنڈے جیسی انگوٹھی بنوائی ہوئی ہے اور میں اسے تمہاری بھنڈی جیسی انگلی میں پہنانے کے لیے بے قرار ہوں۔ تم کو کیسے سمجھاؤں کہ محبوب اور محبوبہ ہری مرچ اور ادرک کی طرح لازم و ملزوم ہیں مگر ایک تم ہو کہ ہر وقت سبزی منڈی کے بھاؤ کی طرح ناک بھویں چڑھائے رکھتی ہو۔ کبھی تو پھول گوبھی کی طرح کھلا ہوا چہرہ دکھا دیا کرو۔ یہ کیا ہر وقت بند گوبھی کی طرح منہ بند رکھتی ہو۔ مانا کہ میرا رنگ بینگن کی طرح کچھ پکا ہے مگر میرے دل کے حسین جذبات شلغم کی طرح سفید اور پالک کی طرح ہرے بھرے ہیں۔ دیکھو! اپنے پیار کو صرف اور صرف آلو کی طرح بناؤ جو ہر وقت ہر موسم میں دستیاب ہوتا ہے، اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔

صرف تمہارا

مرسلہ: عمران حیدر بلوچ،
ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کام کب تک ہو جائے گا......؟"

"ملک صاحب! میں آپ کا یہ کام آج ہی کی تاریخ میں کردوں گا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں رات تک ادھر تھانے ہی میں بیٹھا ہوں اور سمجھو کہ...... تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

"تو پھر مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "تاکہ میں فی الفور اسٹوڈیو پہنچ کر اپنا کام شروع کرسکوں۔"

میں نے اسے فوراً اجازت دے دی۔

دلشاد کے جانے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر ماجد علی کے قاتل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے جس بے دردی سے گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا وہ قاتل کی اس کے لیے شدید ترین نفرت کو ظاہر کرتا تھا۔ ایسا شخص کون ہوسکتا تھا......؟

اس سوال پر پہنچ کر ذہن رک سا جاتا تھا اور سوچ تھم جاتی تھی۔ اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں نے وہ خاکے تیار کروائے تھے۔ حاصل شدہ معلومات کے مطابق، صداقت اور سرفراز کا تعلق لالہ موسیٰ سے تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لاہور کے رہنے والے ہوں اور کسی کام سے وہ لالہ موسیٰ گئے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ لالہ موسیٰ کے حوالے سے انہوں نے سراسر جھوٹ بولا ہو۔ میں حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس سلسلے میں یہ خاکے ہی میری مدد کریں گے۔

پھاٹک والے عمر فاروق کی ایک بات بار بار میرے ذہن میں تکرار کررہی تھی۔ یہ بات اس کی بھی نہیں بلکہ اس اجنبی مسافر کی تھی جس نے عمر فاروق سے جی ٹی روڈ کا راستہ پوچھا تھا۔ جب عمر فاروق نے استفسار کیا کہ آخر اس کو جانا کہاں ہے تو اس نے بے ساختہ جواب دیا تھا...... ریلوے اسٹیشن!

اس اجنبی نامعلوم مسافر کے جواب سے میرے ذہن میں فوراً یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن کیوں جانا چاہتا تھا؟ میرے ذہن نے موجودہ حالات کے تناظر میں یہ جواب دیا تھا کہ...... اپنے ساتھیوں صداقت اور سرفراز سے ملنے!

اس جواب کی روشنی میں صداقت، سرفراز اور وہ اجنبی مسافر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے نظر آتے تھے۔ اگر میرا ذہن غلط خطوط پر نہیں سوچ رہا تھا تو پھر حقیقت یہی تھی کہ یہ تینوں لاہور ہی سے ماجد علی کے تعاقب میں آئے تھے۔ انہوں نے تاش کے بہانے بڑی فنکاری سے ماجد کو اپنا دوست بنایا پھر جب ٹرین عمر فاروق والے پھاٹک پر ر... ہوئی تو اجنبی مسافر نے ماجد کو کسی بھی طرح ٹرین سے ... کودنے پر مجبور کردیا اور خود بھی چھلانگ لگادی پھر ما... کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ جی ٹی روڈ ... راستے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس تھیوری کے مطابق صداقت اور سرفراز نے اس وقت ٹرین کو خیرباد کہا ہوگا جب وہ گوجرانوالہ کے ریلوے اسٹیشن سے نکلنے لگی ہوگی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ میرے ذہن کی سوچی ہوئی ایک تھیوری تھی جو حقائق کی کسوٹی پر چڑھنے کے بعد غلط بھی ثابت ہوسکتی تھی لیکن میں اس تھیوری کو کسوٹی پر چڑھانے سے پہلے اس کے بارے میں منفی انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔

رات کو لگ بھگ نو بجے فوٹوگرافر دلشاد کی واپسی ہوئی۔ اس نے میرے حسب منشا ہر خاکے کے تین، تین فوٹو گرافس تیار کردیے تھے۔ گویا اب اصل کو ملا کر میرے پاس ان تین افراد کی شناخت کے لیے چار چار کاپیاں ہوگئی تھیں۔ میں نے دلشاد کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور وہ مجھے سلام کرنے کے بعد رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

تیرہ جنوری کی صبح میں علاقہ ایس پی کے دفتر جاکر ان سے ملا اور انہیں صورت حالات سے مکمل طور پر آگاہ کردیا۔ ایس پی صاحب نہایت ہی ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر تھے۔ انہوں نے بہت توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔

"صفدر حیات! حالات واقعی بہت گمبھیر اور حساس نوعیت کے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، ماجد کے قاتل کی تلاش کے لیے تمہیں تین محاذوں پر لڑنا ہوگا۔"

"یس سر!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔ آپ نے میری پیش کردہ تھیوری سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا ہوگا......"

"ہاں، بڑی اچھی طرح اندازہ لگایا ہے۔" وہ پُر... نظر سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ "اسی... میں نے تمہارے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے ... رائے کا اظہار کیا ہے۔"

"سر!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"صفدر حیات! تم ایک محنتی اور دیانت دار پولیس آفیسر ہو۔" وہ بہ دستور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ "تم نے اس کیس میں اب تک بڑی دوڑ دھوپ کی ہے لہٰذا میں تمہارا بوجھ کچھ کم کرنا چاہتا ہوں......"

میں نے متذبذب نظر سے ایس پی صاحب کو دیکھا اور کہا۔ "سر! میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟"

"صفدر حیات! تم ان تصویروں کے دو سیٹ میرے پاس چھوڑ جاؤ۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ "میں یہ معاملہ اعلیٰ افسران کے علم میں لاکر لاہور اور لالہ موسیٰ کے محاذوں پر ان افراد کے بارے میں انکوائری کرواتا ہوں۔ تم دو دن کے بعد دوبارہ دفتر آکر مجھ سے ملنا۔ انشاء اللہ! کوئی اچھی خبر ہی سننے کو ملے گی۔"

ایس پی صاحب کی بات میری سمجھ میں بیٹھ گئی تاہم میں یہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "اور سر...... ان دو دنوں میں، میں کیا کروں گا؟"

"تم ایک فعال اور ذمے دار پولیس آفیسر ہو۔" انہوں نے ایک بار پھر خلوص دل سے میری تعریف کی۔ "ظاہر ہے، ہاتھ پر ہاتھ رکھے خاموش تو بیٹھ نہیں سکتے اس لیے......" لمحاتی توقف کرکے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"تم باقی کی فوٹوز کی مدد سے اپنے تھانے کی حدود میں قاتل یا قاتلوں کی تلاش کا کام جاری رکھو خصوصاً جائے وقوعہ کے گرد و نواح کے علاقے کی کڑی چھان بین از حد ضروری ہے۔ وہاں سے قاتل کے سلسلے میں کوئی ٹھوس سراغ مل سکتا ہے۔"

"اوکے سر!" میں نے گردن کو خم کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا حکم بجالاؤں گا۔"

ایس پی صاحب نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور میں انہیں سلیوٹ کرکے واپس آگیا۔

اسی روز واپس تھانے پہنچنے پر میں نے اے ایس آئی فدا حسین کو اپنے پاس بلالیا وہ مجھے سلام کرکے بیٹھا تو میں نے کہا۔

"فدا حسین! ماجد مرڈر کیس میں اب تک جو تفتیش ہوچکی ہے وہ تمہارے بھی علم میں ہے۔ اگر کسی بات سے تمہیں واقفیت نہ ہو تو بتاؤ......؟"

"نہیں جناب! کوئی بھی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ لمحہ لمحہ کی صورت حال سے مجھے آگاہ کرتے رہے ہیں۔ آپ حکم کریں، معاملہ کیا ہے؟"

چالیس فراعنہ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فرعون کوئی ایک بادشاہ تھا جس نے حضرت موسیٰ کے زمانے میں خدائی کا دعویٰ کیا۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ فرعون دراصل ایک لقب ہے جو مصر کے بادشاہ اختیار کرتے تھے۔ ایسے سینکڑوں فراعنہ گزرے ہیں جن میں سے صرف چالیس حنوط شدہ لاشیں یعنی ممیاں محفوظ رہ گئیں کیونکہ انہیں چوروں سے بچانے کے لیے بعد کے زمانوں میں پروہتوں نے اہرام سے نکال کر وادی شاہان کے ایک پہاڑ میں قدرتی غار نما ہال میں محفوظ کردیا۔ یہ ممیاں 1898ء میں اتفاقاً ایک چور کے ہاتھوں دریافت ہوئیں۔ یہ ممیاں مصری عجائب گھر کی اوپری منزل کے کمرا 52 میں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں اس فرعون کی ممی بھی ہے جس نے حضرت موسیٰ کی نبوت کو جھٹلایا تھا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے بحیرۂ قلزم میں اپنے لاؤ لشکر سمیت ڈوب گیا تھا۔ اس کا نام فرعون منفتاح تھا۔ منفتاح رعمیس دوم کا بیٹا تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی تھی۔ منفتاح کی لاش 20 ویں صدی عیسوی میں سمندر سے نکالی گئی۔ قرآن کے فرمان کے مطابق لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔ قرآن پاک میں لکھا ہے۔ "ہم تیرے بدن کو اخلاف کے لیے نشانی کے طور پر بچالیں گے۔" منفتاح کے نام کے ساتھ 1225 ق م لکھا ہوا ہے قد ساڑھے پانچ فٹ ہوگا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی ہے۔ اس کی لاش عجائب گھر میں پڑی ہوئی تمام ممیوں میں سب سے زیادہ ٹھیک حالت میں ہے اور ابھی تک بالکل محفوظ ہے، اس کے تمام اعضا صحیح و سالم ہیں جیسے ابھی ابھی حنوط کیا گیا ہو۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

WWW.PAKSOCIETY.COM

''معاملہ یہ ہے کہ......'' میں نے فوٹو گرافس کا ایک سیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان تین افراد میں سے کوئی ایک ماجد کا قاتل ہوسکتا ہے۔ تم اپنی مرضی کے دو کانسٹیبلز کو اپنے ساتھ رکھ لو اور اپنی عقل کے مطابق ان افراد کا کھوج لگانے کی کوشش کرو......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ آج سے اس کیس کے تفتیشی افسر تمہی ہو!''

''بڑی مہربانی ہے جناب کی۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے کئی تھانوں میں محکمے کی خدمات انجام دی ہیں لیکن آپ جیسا تھانا انچارج کہیں نہیں دیکھا۔ آپ اپنے عملے کے چھوٹے سے چھوٹے فرد پر بھی بے تحاشا اعتماد کرتے ہیں۔''

''فدا حسین! اس کائنات کا کاروبار اعتبار اور اعتماد پر ہی چل رہا ہے۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''انسان خدا پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتا ہے تو خدا ہے ورنہ کچھ بھی پلے نہیں رہتا۔ بھروسا نہ ہو تو یقین قائم نہیں ہوتا اور اگر یقین قائم نہ ہو تو چیزیں اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔ کسی شے کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔''

''ملک صاحب! آپ نے بڑی گہری بات کردی ہے۔'' وہ یک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تو اندر باہر سے ہل کر رہ گیا ہوں۔''

''جو حقیقت تھی وہ میں نے بیان کردی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اب تم بھی حقیقت کی دنیا میں واپس آجاؤ۔ اگر میں نے تم پر اعتماد کرکے یہ فریضہ سونپا ہے تو تمہیں میرے اعتماد پر پورا اتر کر دکھانا ہے۔''

''جی...... انشاء اللہ!'' وہ بڑے جوش سے بولا۔ ''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا ملک صاحب!''

''وش یو گڈ لک!'' ان الفاظ کے ساتھ میں نے اسے رخصت کردیا۔

آیندہ دو روز تک میں بھی ایس پی صاحب کے مطابق، ہاتھ پر ہاتھ رکھے خاموش نہیں بیٹھ سکا تھا۔ اگرچہ میں نے فدا حسین کو اس کیس کی تفتیش کی ذمے داری سونپ دی تھی لیکن میں اپنے طور پر بھی تگ ودو جاری رکھے ہوئے تھا۔ نہ تو ہماری کوششوں میں کوئی کمی تھی اور نہ ہی جذبے میں کوئی شگاف لیکن وہی بات ہے کہ جو کام نہیں ہونا ہوتا وہ کسی بھی طور ہو کر نہیں دیتا۔ اس کیس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ دو دن تک اسٹارٹ رہنے کے بعد تفتیش کی گاڑی اپنی ہی جگہ پر کھڑی نظر آرہی تھی۔

حسب پروگرام دو دن کے بعد میں ایس پی صاحب سے ملنے ان کے آفس پہنچا تو ایک اچھی خبر میری منتظر تھی۔ ایس پی صاحب نے مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

''صفدر حیات! مبارک ہو...... میں نے تمہارے کیس کی جڑ کھود نکالی ہے۔ اب اس جڑ کو سکھا کر اور کوٹ پیس کر کشتہ تمہیں خود ہی تیار کرنا ہوگا۔''

''سر! لگتا ہے، آپ کے پاس کوئی بہت بڑی خوش خبری ہے......!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں تمہیں زیادہ سسپنس میں نہیں ڈالوں گا۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے لیے خوش خبری اور مبارک باد یہ ہے کہ تم نے مجھے جن مشکوک افراد کے فوٹو گرافس مہیا کیے تھے، میں نے بالائی سطح پر ڈوریاں ہلا کر ان کا سراغ لگالیا ہے......''

''یہ تو واقعی بہت بڑی خبر ہے سر!'' میں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگے۔ ''میں نے تمہاری فراہم کردہ تصویروں کا ایک سیٹ گجرات اور دوسرا لاہور بھجوایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے اعلیٰ افسران کو تمہاری کارکردگی کی رپورٹ بھی پیش کردی تھی......!''

انہوں نے تھوڑی دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر اس وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ضلع گجرات سے لالہ موسیٰ کے اندر تفتیش کے گھوڑے دوڑائے گئے لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ سادہ الفاظ میں یہ سمجھ لو کہ ان مشکوک افراد کے حوالے سے لالہ موسیٰ سے کوئی معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ وہ لالہ موسیٰ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔''

میں نے لالہ موسیٰ بڑی تفصیل کے ساتھ دیکھ رکھا تھا۔ یہ گجرات اور کھاریاں کے درمیان واقع ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لالہ موسیٰ کی وجۂ شہرت وہاں کی غلہ منڈی ہے جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشہور ہے۔ اگر وہ مشکوک افراد لالہ موسیٰ کے رہنے والے نہیں تھے تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ قرعۂ فال لاہور کے نام نکل آیا تھا۔ میں جن خطوط پر سوچ رہا تھا، ایس پی صاحب نے بھی اسی جانب اشارہ کردیا۔

''صفدر حیات!'' وہ اپنے وضاحتی بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''گجرات اور لالہ موسیٰ کی طرف سے اگرچہ کوئی حوصلہ افزا رپورٹ دیکھنے کو نہیں ملی تھی لیکن

لاہور سے موصول ہونے والی خبر نے ساری کوفت اور مایوسی کو دھو ڈالا ہے......''

وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئے تو میں نے انہیں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش سوالیہ نظر سے انہیں دیکھتا چلا گیا۔ وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

''میں نے اوپر کہہ کر گھوڑے شاہ اور اس کے گردونواح کے علاقے میں تفتیش کرائی تو پتا چلا کہ ان تین افراد کا مختلف تھانوں میں ریکارڈ موجود ہے۔ تم نے جس بندے کا نام صداقت بتایا وہ درحقیقت رفیق عرف فیکا ہے اور سرفراز کا اصل نام سلیم عرف موٹا سیما پتا چلا ہے جبکہ اجنبی مسافر کے ٹائٹل والا وہ زرافہ مارکا بندہ ایوب ہے۔ ان میں سے فیکا اور موٹا سیما کا تعلق لاہور کے علاقے مصری شاہ سے ہے جبکہ ایوب دو موریا پل کے قریب رہتا ہے۔ وہ لوگ چھوٹے موٹے جرائم میں کئی مرتبہ پولیس کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔ ایوب نے تو سات آٹھ سال کی جیل بھی کاٹ رکھی ہے......''

''سر! ہمارے لیے یہ کسی بڑی کامیابی سے کم نہیں۔'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''اب میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''میرا کام ختم ہوگیا صفدر حیات۔ یہاں سے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔'' ایس پی صاحب نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں ایک خاص لیٹر تیار کروا دیتا ہوں۔ تم مقتول کے چچا اصغر علی کو اپنے ساتھ لے کر فوراً لاہور روانہ ہوجاؤ۔ اصغر علی کو تم مجرموں کی شناخت کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤ گے کیونکہ وہ فیکا اور سیما سے ٹرین میں ملاقات کرچکا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ لاہور کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر کس سے ملنا ہوگا۔ اس کے بعد کی ہدایات تمہیں وہی پولیس آفیسر دے گا، میں جس کے پاس تمہیں بھیج رہا ہوں۔''

''اوکے سر...... میں وہی کروں گا جو آپ کا حکم ہوگا۔'' میں نے فرماں برداری سے کہا پھر پوچھا۔ ''سر! کیا ان تین افراد کو حراست میں لے لیا گیا ہے؟''

''سمجھو کہ وہ تینوں پولیس کی نگرانی میں ہیں۔'' انہوں نے گول مول جواب دیا۔ ''انہیں باقاعدہ گرفتار کرکے حوالات میں تو بند نہیں کیا گیا لیکن پولیس جب چاہے گی، انہیں پکڑ لے گی۔''

''ٹھیک ہے سر! میں آج ہی لاہور روانہ ہوجاتا ہوں۔'' میں نے بڑے عزم سے کہا۔

''تمہیں دس منٹ مزید میرے آفس میں رکنا ہوگا۔ میں وہ لیٹر ٹائپ کروا کے تمہارے حوالے کردوں، پھر تم

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

حضرت ابراہیم ادھم رحمتہ اللہ علیہ تشریف فرما تھے اور بھی بہت سے لوگ حاضر مجلس تھے۔ عارفانہ گفتگو ہورہی تھی۔ اسی اثنا میں ایک شخص آیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد عرض گزار ہوا۔

''یا حضرت! کیا سبب ہے کہ ہماری دعائیں اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا؟''

قدرے سکوت کے بعد آپؒ نے ارشاد فرمایا:

☆ تم اللہ تعالیٰ کو مانتے ہو مگر اس کی اطاعت نہیں کرتے۔

☆ قرآن کریم پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔

☆ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں کھاتے ہو مگر اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

☆ جانتے ہو کہ گناہ گاروں کے لیے دوزخ ہے مگر اس سے نہیں ڈرتے۔

☆ شیطان کو دشمن سمجھتے ہو مگر آخرت کا کوئی سامان نہیں کرتے۔

☆ اپنے خویش واقارب کو اپنے ہاتھوں سے زمین میں دفن کرتے ہو مگر عبرت نہیں پکڑتے۔ لہٰذا تمہاری دعائیں کس طرح قبول ہوسکتی ہیں؟

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل بہاولپور

جاسکتے ہو۔''

آیندہ دس منٹ کے اندر مذکورہ لیٹر ٹائپ کرکے میرے حوالے کردیا گیا۔ ایس پی صاحب نے کسی بڑے پولیس آفیسر لطیف کھوسا سے ملنے کو کہا تھا۔ لطیف کھوسا صاحب پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہوتے تھے۔ ایس پی کے مطابق، میرے والے کیس کی ڈوریاں لطیف کھوسا صاحب کے ہاتھ میں تھیں۔

میں تھانے واپس آیا اور اصغر علی کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔ سہ پہر تین بجے ہم نے شیخوپورہ موڑ سے لاہور جانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

والی بس پکڑی اور اس میں بیٹھ کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

اصغر علی بھی میری طرح خاصا پر جوش نظر آ رہا تھا۔ تین دن پہلے اس نے اپنے بھتیجے کو لحد میں اتارا تھا۔ یہ سن کر کہ ماجد کے قاتل کا سراغ لگا لیا گیا ہے، اس کے چہرے پر اطمینان کی چادر پھیل گئی تھی۔

راستے بھر ہم ماجد اور ان تین افراد کے بارے میں باتیں کرتے رہے جن کی حتمی شناخت کے لیے میں اصغر علی کو اپنے ساتھ گوجرانوالہ سے لاہور لے کر جا رہا تھا۔ یہ ایک نہایت ہی اہم مشن تھا اور میں نے مجرموں کی گرفتاری کا بھی پورا "بندوبست" اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

ماجد علی کو میرے تھانے کی حدود میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا لہٰذا قاتل کو گرفتار ہو کر بھی میرے تھانے کی حوالات ہی میں آنا تھا اور مجھے ہی اس کا چالان تیار کر کے عدالت کے حوالے کرنا تھا۔

لگ بھگ ساڑھے چار بجے سہ پہر ہم پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ میں نے اصغر علی کو باہر بٹھا کر لطیف کھوسا صاحب سے ایک بھرپور ملاقات کی۔ انہوں نے میرے ساتھ اسلم جنجوعہ نامی ایک پولیس اہلکار کو لگا دیا۔ اسلم جنجوعہ پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر ہمیں منزل مقصود تک لے گیا۔

اسلم جنجوعہ ایک دراز قامت اور ڈیل ڈول والا آدمی تھا۔ اگر یہ پتا نہ بھی ہو کہ وہ پولیس والا ہے، اسے دیکھ کر ہی مدمقابل پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ راستے میں ہمارے بیچ ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہوتی رہی تھی۔ اسلم جنجوعہ نے اپنے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ لطیف کھوسا صاحب کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ خاص قسم کے آپریشنز ڈیل کرتے تھے۔ میں اور اصغر علی جن مجرموں کی شناخت کے لیے گوجرانوالہ سے لاہور پہنچے تھے، اسلم جنجوعہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔

جنجوعہ صاحب ہمارے ساتھ دوستانہ انداز میں پیش آ رہے تھے تاہم ان کے رویے میں ایک خاص نوعیت کی سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ وہ ہمیں جس منزل پر لائے تھے وہ لاہور کے شاہی قلعہ کا عقبی علاقہ تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم ایک ایسے مکان کی طرف بڑھے جو اپنی "شکل" ہی سے متروک اور غیر آباد دکھائی دیتا تھا۔ مذکورہ مکان کے دروازے پر ایک وزنی قفل پڑا نظر آ رہا تھا۔

جنجوعہ صاحب نے جیب سے اس قفل کی چابی برآمد کرتے ہوئے کہا۔ "ان بدمعاشوں کو ہم نے کل ہی گرفتار کر لیا تھا۔ وہ اس گھر کے اندر بند ہیں......"

میں جنجوعہ کی بات کا مطلب تو بہ خوبی سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی پوچھ لیا۔ "آپ کن بدمعاشوں کی بات کر رہے ہیں جنجوعہ صاحب؟"

"جن کی تلاش میں آپ اور شناخت کے لیے آپ کا ساتھی اصغر علی یہاں پہنچے ہیں۔" اسلم جنجوعہ نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "وہ تینوں اس مکان کے ایک کمرے میں بند ہیں۔ جب آپ لوگ تصدیق کر دو گے کہ یہی تمہارے مطلوبہ بندے ہیں تو پھر انہیں باقاعدہ حوالات میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور ہم مذکورہ مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ مکان چار کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے آس پاس دور دور تک آبادی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ مکان کے اندر داخل ہونے کے بعد ہی پتا چلا کہ مجرموں کی نگرانی کے لیے ایک مسلح پولیس اہلکار بھی وہاں موجود تھا۔

اس اہلکار نے اسلم جنجوعہ کے حکم پر اس کمرے کا تالا کھولا جس کے اندر وہ تینوں مجرم قید تھے۔ اصغر علی کا جیسے ہی ان سے سامنا ہوا، اس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیکا کو صداقت کے نام سے اور سلیم موٹا کو سرفراز کے نام سے پہچان لیا البتہ ایوب کے حوالے سے اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

اصغر علی پر نگاہ پڑتے ہی فیکا اور سلیم موٹا نے جو "ری ایکشن" دیا تھا وہ اس بات کا ٹھوس ثبوت تھا کہ انہوں نے بھی اصغر علی کو فوراً پہچان لیا تھا۔ اصغر علی کو دیکھتے ہی وہ بری طرح چونک پڑے تھے۔

اس کے بعد کے مراحل بڑی آسانی سے طے ہو گئے۔ اسلم جنجوعہ نے ان تینوں کو باقاعدہ ہتھکڑیاں لگا کر ایک تفتیشی مرکز میں پہنچا دیا۔ اس نوعیت کی تمام تر ہدایات لطیف کھوسا صاحب نے پہلے ہی جنجوعہ صاحب کو دے رکھی تھیں۔ تفتیشی مرکز میں پورے "طمطراق" کے ساتھ جب اسلم جنجوعہ نے رفیق عرف فیکا، سلیم عرف موٹا، سیما اور ایوب لم ڈھینگ سے پوچھ گچھ کی تو خاصے تسلی بخش نتائج برآمد ہوئے۔ اصغر علی کو دیکھ کر فیکا اور سیما جس طرح چونکے تھے وہ ان کے مجرم ہونے کا بڑا واضح ثبوت تھا۔ وہ لوگ پولیس کی کڑی تفتیش کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے تھے۔ ان کے اقبالی بیان سے جو بات سامنے آئی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

ماجد علی کے قتل کی منصوبہ بندی میں وہ تینوں شریک ضرور تھے لیکن بدنصیب ماجد کو صرف ایوب ہی نے تن تنہا موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ واقعات کے مطابق، ماکھا نامی ایک دودھ فروش نے ایوب کو ماجد علی کے قتل کا "کام" سونپا تھا اور ایک موٹی رقم بھی اس کام کے لیے دی تھی۔ ایوب کو ماجد کی صورت دکھا کر بتا دیا گیا تھا کہ یہ بندہ اپنے خاندان کے ساتھ کتنے بجے لاہور ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوگا اور کتنے بجے وہ ٹرین گوجرانوالہ پہنچے گی۔ ماکھا دودھ فروش نے ایوب کو خاص طور پر یہ ہدایت کی تھی کہ ماجد کو گوجرانوالہ کی حدود میں موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔ ایوب نے فیکا اور سیما کو اپنی "مورل سپورٹ" کے لیے ساتھ رکھ لیا تھا۔ ان تینوں میں گہری دوستی تھی اور وہ مل بانٹ کر کھانے کے قائل تھے۔ بہت سارے جرائم انہوں نے ایک ساتھ مل کر کیے تھے۔

پروگرام کے مطابق، فیکا اور سیما نے تاش کے کھیل کا ڈراما رچایا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ ماجد سے دوستی کر لی۔ ایوب بھی بہت جلد ماجد کے ساتھ گھل مل گیا۔ ماجد بے چارے کو مطلق احساس نہ ہوا کہ وہ جن لوگوں سے دوستی گانٹھ رہا ہے، وہ تو اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی منصوبہ بندی کے ساتھ ٹرین پر سوار ہوئے ہیں۔ جب ٹرین گوجرانوالہ کی حدود میں داخل ہوئی تو ان تینوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر کے ایوب کو گرین سگنل دے دیا۔ ایوب کوئی خوبصورت بہانہ بنا کر ماجد کو ٹرین کے دروازے تک لے گیا۔ ان کی دیکھا دیکھی فیکا اور سیما بھی ان کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے تاکہ ناکامی کا امکان باقی نہ رہے، پھر اصغر کالونی والے پھاٹک پر جیسے ہی ٹرین کی رفتار دھیمی ہوئی، ایوب نے میکانکی انداز میں ماجد کو دھکا دیا اور خود بھی اس کے پیچھے تاریکی میں کود گیا۔ موسم کی شدت کے باعث ٹرین میں بہت کم مسافر سفر کر رہے تھے۔ وہ لوگ لگ بھگ دس منٹ تک دروازے میں کھڑے رہے تھے اور اس دوران میں کوئی مسافر ان کی طرف نہیں آیا تھا۔ کسی کو اس بات کی خبر نہ ہو سکی کہ دو افراد ٹرین سے "اتر" چکے ہیں۔ فیکا اور سیما اطمینان سے اپنی سیٹوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

ماجد بے چارہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے اچانک دھکا دے کر ٹرین سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر موجودہ صورت حال پر غور و فکر کرنے کے قابل ہوتا، ایوب بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے سر پر پہنچا اور پھر تیز دھار خنجر سے شہ رگ کاٹ کر ماجد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آلۂ قتل کو اس نے ادھر اندھیرے ہی میں پھینکا اور جائے وقوعہ سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ وہ چونکہ اس علاقے سے واقف نہیں تھا لہٰذا اس نے پھاٹک والے عمر فاروق سے جی ٹی روڈ کا راستہ پوچھ لیا تھا۔ ان تینوں کے بیچ یہ طے ہو گیا تھا کہ ایوب اپنا کام "نمٹانے" کے بعد سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچے گا۔ فیکا اور سیما اسے اسٹیشن پر مل جائیں گے۔ پھر یہ تینوں ایک ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔

یہ سب تو ٹھیک تھا کہ ماجد علی کا قاتل گرفت میں آ گیا تھا اور اس نے اقبال جرم بھی کر لیا تھا لیکن میرے ذہن میں کچھ باتیں کھٹک رہی تھیں لہٰذا میں نے ایوب لم ڈھینگ عرف زرافہ مارکا انسان سے سوال کیا۔

"ماکھا شیر فروش نے تمہیں ماجد کے قتل کے لیے کتنی رقم دی تھی؟"

"پانچ سو روپے......!" اس نے جواب دیا۔

آج کل پانچ سو روپے میں ایک وقت کا کھانا ہی پک سکتا ہے لیکن جس دور کی یہ کہانی ہے اس زمانے میں پانچ سو روپے کی بڑی قدر و قیمت ہوا کرتی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ ماکھا شیر فروش نے ماجد کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے یہ خطیر رقم کیوں خرچ کی، میں نے ایوب سے استفسار کیا۔

"ماکھا کی مقتول کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟"

"میں صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔" وہ نحیف سی آواز میں بولا "دوسری پارٹی کے معاملات میں دخل دینا میرے اصول کے خلاف ہے۔"

"اقبال جرم کے بعد تم اور تمہارے سارے اصول وصول تو جائیں گے کھوہ کھاتے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سفاکی سے کہا۔ "یہ بتاؤ، تم آنکھیں بند کر کے کسی بھی پارٹی سے کام پکڑ لیتے ہو یا......؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ "یہ بند آنکھوں کا کھیل نہیں ہے جناب...... جب تک سامنے والے پر پورا بھروسا نہ ہو، میں آگ اور پیٹرول کے اس کھیل میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔"

"اس کا مطلب ہے، تمہیں ماکھا شیر فروش پر مکمل بھروسا تھا؟"

"جی ہاں...... بالکل!" وہ بڑے وثوق سے بولا۔

"مثلاً...... کیا بھروسا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا......" وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے اور کہیں مجھے پھنسانے کے لیے تو کوئی چال نہیں چل رہا......“

”ٹھیک ہے!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، ماجد علی کی زندگی کا سودا کرنے والا ماکھا کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟“

”اس کا اصل نام مستقیم شاہ ہے۔“ ایوب نے بتایا۔ ”کسی زمانے میں وہ پہلوانی کرتا تھا، پھر بدمعاشی اور غنڈا گردی وغیرہ میں بھی اس نے قدم رکھ دیا۔ آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے ادھر گھوڑے شاہ میں دودھ دہی کی دکان بنالی ہے۔ وہ دکان داری بھی کرتا ہے اور کوئی ”ایسا ویسا“ کام آجائے تو اپنا کمیشن رکھ کر ہم لوگوں سے کروالیتا ہے۔ اگر اس نے مجھے پانچ سو روپے دیے ہیں تو یقیناً کسی سے زیادہ ہی وصول کیے ہوں گے......!“

ایوب کی ساری بکواس گئی جہنم میں۔ میرے لیے اس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ماکھا شیر فروش لاہور کے محلے گھوڑے شاہ کا رہنے والا تھا۔ یہ سارا فتنہ ”گھوڑے شاہ“ سے اٹھا تھا لہٰذا اس کا اختتام بھی گھوڑے شاہ ہی میں ہونا تھا۔

میں نے اسلم جنجوعہ سے کہا۔ ”جنجوعہ صاحب! ماکھا کو فوری طور پر شامل تفتیش کرنا بہت ضروری ہے۔“

”میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں!“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر ایک گھنٹے کے بعد جب ماکھا شیر فروش کو گرفتار کر کے اس تفتیشی مرکز پر لایا گیا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوگیا۔ ماکھا کو جیسے ہی پتا چلا کہ پولیس نے نہ صرف یہ کہ ایوب کو گرفتار کرلیا ہے بلکہ اس نے اپنے جرم کا اقرار بھی کرلیا ہے تو اس نے کسی قسم کی مزاحمت کا مظاہرہ کر کے اپنی ہڈیوں کا سرمہ بنوانے کے بجائے حقائق بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔

مستقیم شاہ پہلوان عرف ماکھا شیر فروش کے بیان کے مطابق، اس کام کے لیے گھوڑے شاہ ہی کے ایک باسی صفدر علی نے اسے سات سو روپے نقد ادا کیے تھے۔ اس نے دو سو اپنی جیب میں رکھے اور پانچ سو کے عوض یہ کام ایوب کو سونپ دیا۔ اللہ اللہ، خیر سلا!

صفدر علی، مقتول ماجد کا ہونے والا...... بلکہ کبھی نہ ہوسکنے والا سسر تھا۔ آئندہ ایک گھنٹے کے اندر وہ بھی تفتیشی مرکز میں موجود تھا۔ بشریٰ کا باپ صفدر علی کوئی عادی مجرم نہیں تھا لہٰذا اس نے تفتیشی مرکز کا مدالتانہ ماحول دیکھ کر ہی سب کچھ صاف اور سچ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

صفدر علی کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ ماجد علی کو قتل کردیا گیا تھا۔ اس نے ماکھا کو سات سو روپے ماجد کے ہاتھ پاؤں توڑنے اور ہڈی پسلی ایک کرنے کے لیے دیے تھے۔ اور یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ماجد پر یہ حملہ اس وقت کیا جائے جب وہ گوجرانوالہ کی حدود میں داخل ہوچکا ہوتا کہ اس ظالمانہ کارروائی کا الزام اس پر نہ آسکے۔ تو جنوری کو اس کے پڑوس میں ہونے والے ہنگامے کے باعث اس کی بیٹی بشریٰ کی ڈولی نہیں اٹھ سکی تھی جس بات کا اس کے دل و دماغ میں بہت زیادہ غصہ تھا۔ اس نے اسی غصے میں اندھے ہوکر انتقاماً ماکھا کو ماجد کو معذور بنانے کے لیے ٹھیکا دیا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اگر بشریٰ کی شادی نہیں ہوسکی تو ماجد بھی زندگی بھر چارپائی پر لیٹ کر معذوری کے دن گزارے لیکن ماکھا نے اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی ایفی شینسی دکھا ڈالی تھی۔

ماجد علی کا قتل میرے تھانے کی حدود میں ہوا تھا اور اس کا قاتل تھا ایوب لہٰذا ایوب کی گرفتاری اور اقبال جرم کے بعد میرا کام ختم ہوگیا تھا۔ چالان کی تیاری میں لاہور اور گوجرانوالہ کی پولیس نے مل کر کام کیا اور اس کیس سے تعلق رکھنے والے تمام جرائم پیشہ افراد جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے۔

بعض اوقات انسان کی ہٹ دھرمی اور غیر حقیقت پسندی بڑے تباہ کن نتائج لے کر آتی ہے۔ صفدر علی کے بیٹے قادرا نے، کرمو کے ساتھ جو واہیات مذاق کیا تھا، گوشی کی گواہی کی صورت میں اس کا بڑا واضح ثبوت موجود تھا لیکن صفدر علی قادرا کو حق بہ جانب سمجھ رہا تھا۔ اس موقع پر اگر صفدر علی اور اس کی بیوی سفینہ لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے نابکار بیٹے کی غلطی کو تسلیم کرلیتے تو یقیناً اکبر علی اور سلیمہ کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا اور کرمو...... بھی قادرا کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے مطمئن ہوجاتا، اس طرح تھوڑی بہت بدمزگی کے بعد بہر حال، ماجد اور بشریٰ کی شادی ضرور ہوجاتی۔

پہاڑ کی بہ نسبت رائی پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ پہاڑ تو میلوں دور سے دکھائی دے جاتا ہے جبکہ رائی پہلو میں بھی پڑی ہو تو بھی بعض اوقات نظر نہیں آتی لیکن جب یہی رائی، پہاڑ کی صورت اختیار کرلیتی ہے تو پھر وہی ہوتا ہے جو اس کیس میں پیش آیا......!

(تحریر: حُسام بٹ)

”میرا نام اوٹس فارن ہائٹ ہے۔“ اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔

”میں یہ نام کبھی نہیں بھول سکتا۔“ نک ویلوٹ نے کہا۔ ”کیونکہ جب سخت گرمی پڑتی ہے تو اس نام کا ذکر ضرور آتا ہے۔“

”لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ فارن ہائٹ تھرمامیٹر میں نے نہیں ایجاد کیا۔“

”میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“ نک نے پوچھا۔

پوسٹ کارڈ کی چوری

نجمہ مودی

زندگی میں بے مصرف مصروفیات... گھروں میں کاٹھ کباڑ اور دماغوں میں فضول خیالات کی بھرمار سے صرف اور صرف وقت کے زیاں کا احساس ہوتا ہے... مگر فالتو اور فضول اشیا کی چوری وہ بھی جان جوکھم میں ڈال کر نک ویلوٹ کا شاندار کاروبار تھا۔ اگرچہ یہ عجیب سی بات تھی مگر یہ اس کا روزگار تھا... اس بار بھی نک ویلوٹ نے کھیل ہی کھیل میں نہ صرف اپنا کاروباری فریضہ انجام دیا بلکہ ایک بند کہانی کو کھول بھی دیا۔ جس کے کئی مخفی کرداروں نے اسے بھی چونکا دیا۔

مغربی دنیا سے ایک دلچسپ انتخاب...... ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

”میں ایک تصویری پوسٹ کارڈ چوری کروانا چاہتا ہوں۔“

”تم اس پوسٹ کارڈ کو کسی کو بلیک میل کرنے کے لیے تو استعمال نہیں کرنا چاہتے؟“

”وہ ایک سادہ تصویری پوسٹ کارڈ ہے۔ اس قسم کے کارڈ عام دکانوں پر فروخت ہوتے ہیں۔ یہ پوسٹ کارڈ میں ورمانٹ کے ایک اسٹور سے چوری کروانا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں کتنے کارڈ چاہئیں؟“

”جس کارڈ کی میں بات کر رہا ہوں اس میں جھیل کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ اس اسٹور میں اندازاً ایک درجن کارڈ ہوں گے۔ تمہیں سب کے سب کارڈ چوری کرنے ہوں گے۔“

”تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میری فیس پچیس ہزار ڈالرز ہے۔“ نک نے کہا۔ ”ایک درجن پینی پوسٹ کارڈوں کے لیے یہ رقم بہت زیادہ نہیں ہے؟“

مسٹر فارن ہائٹ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نک کے خیال میں وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر قہقہے لگانے کی پریکٹس کرتا رہا تھا۔

”تم بیس پچیس سال پرانی بات کر رہے ہو مسٹر ویلوٹ۔ آج کل کوئی تصویری پوسٹ کارڈ دس سینٹ سے کم میں نہیں ملتا۔ البتہ ورمانٹ کے علاقے میں پچیس سینٹ کے تین کارڈ مل جاتے ہیں۔“

”اس کے باوجود......“

”کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“ فارن ہائٹ نے کہا۔ ”ورنہ میں تمہارے پاس نہ آتا۔“

”او کے، کام ہو جائے گا۔“ نک نے کہا۔

فارن ہائٹ اسے اسٹور کے بارے میں بتانے لگا۔

XXX

نک نے گلوریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آیندہ اسائنمنٹ پر اسے ساتھ لے جائے گا لیکن ان دنوں وہ اپنی بیمار ماں کو دیکھنے فلوریڈا گئی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اکیلا ہی ورمانٹ روانہ ہو گیا۔ وہ موسم خزاں کا ایک روشن دن تھا۔ درختوں کے پتوں میں سنہری اور بھورا پن جھلکنا شروع ہو چکا تھا۔ جس قصبے میں مذکورہ اسٹور واقع تھا اس کا نام الپائلڈ لیک تھا۔ وہ نک کے اندازے سے زیادہ بڑا نکلا۔ شاید اس کا سبب وہ ہوزری مل تھی جس میں سوسوا سو کاریگر کام کرتے تھے۔ نک جھیل کے ساتھ سے ہوتا ہوا قصبے کے وسط میں واقع اس چوراہے پر پہنچ گیا جس میں مذکورہ اسٹور واقع تھا۔

اس نے اپنی کار کسی خطرے کا خیال کیے بغیر سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور اتر کر اسٹور میں چلا گیا۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت اسٹور کا فرش صاف کر رہی تھی۔ اس نے پھول دار ایپرن باندھ رکھا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر نک کی طرف دیکھا۔ ذرا سا مسکرائی اور بہ دستور اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس وقت اسٹور میں کوئی گاہک نہیں تھا۔

”تمہارے پاس اس علاقے سے متعلق تصویری پوسٹ کارڈ ہوں گے؟“ نک نے پوچھا۔

عورت نے بھویں سکیڑ کر نک کا جائزہ لیا۔ پھر بولی۔ ”کیا تمہارے ذہن میں کوئی خاص قسم کی تصویر ہے؟“

”ایسی کوئی خاص تصویر بھی نہیں ہے۔“ نک نے کندھے اچکائے۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی جھیل وغیرہ کی تصویر زیادہ اچھی لگے گی۔“

”کبھی خوب صورت ہوا کرتی تھی۔“ عورت جھاڑو پر جھکتے ہوئے بولی۔ ”پوسٹ کارڈ اس طرف والے ریک میں رکھے ہیں۔ خود ہی پسند کر لو، پچیس سینٹ کے تین پوسٹ کارڈ ہیں۔“

نک سرسری انداز میں آگے بڑھ کر تصویریں دیکھنے لگا۔ تصویریں تمام رنگین اور واضح تھیں۔ پرانے وقتوں کی بلیک اینڈ وہائٹ اور مدھم تصویروں جیسی نہیں تھیں۔ اسے تصویری پوسٹ کارڈ خریدے ہوئے برسوں بیت چکے تھے۔ بیشتر تصویریں آس پاس کے شہروں کی تھیں یا کوہستانی مناظر کی تھیں۔ صرف ایک تصویر جھیل کی تھی۔

”کیا اس کے ساتھ کی اور بھی تصویریں ہیں؟“ نک نے جھیل کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔

عورت نے بھویں سکیڑ کر نک کی طرف دیکھا۔ پھر بولی۔ ”ہوں...... تو یہ بات ہے، تم بھی ان لوگوں میں سے ہی ہو جوان...... جو تصویروں کے چکر میں دور دراز کا سفر کر کے یہاں آ چکے ہیں۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”جھیل کی تصویر والا یہ ایک ہی پوسٹ کارڈ ہے۔“ عورت نے کہا۔ ”یا یوں سمجھ لو کہ تمہیں ایک سے زیادہ کارڈ نہیں مل سکتے۔ یہ تصویر میٹ سیڈلر نے بیس سال پہلے اتاری تھی۔ یہ کارڈ بھی اسی نے تیار کیے تھے۔ پتا نہیں کیا بات ہے، اچانک ان کارڈوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔“

”بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر یہ شخص جس نے یہ کارڈ تیار کیے تھے چاہے تو مزید پرنٹ تیار کر سکتا ہے۔“

عورت نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب وہ مزید پرنٹ تیار نہیں کر سکتا، اس کا اسٹوڈیو جو اس کے گھر کے اندر ہی تھا۔ گزشتہ ہفتے آگ لگنے سے جل کر تباہ ہو گیا ہے اور تمام نیگیٹو جل گئے ہیں۔ اس واقعے سے چند روز پہلے ایک اجنبی ہمارے قصبے میں آیا تھا اور جھیل کی تصویر والے تمام کارڈ خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یہ بات خاصی عجیب سی لگی، لہٰذا میں نے کارڈ فروخت کرنے سے انکار دیا اور انہیں ریک سے اٹھا کر کاؤنٹر کے پیچھے رکھ دیا۔“

”ذخیرہ اندوزی۔“ نک بے پروائی سے بڑبڑایا۔ ”ہوں جس چیز کی رسد کم ہو جاتی ہے یا طلب بڑھ جاتی ہے دکان دار اسے ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ ویسے تمہارے پاس کل کتنے کارڈ ہوں گے؟“

”ایک درجن یا درجن سے کچھ زیادہ، لیکن میں انہیں فروخت نہیں کرنا چاہتی۔“

اسی لمحے نک نے ایک جرمن شیپرڈ کو کاؤنٹر کے عقب سے نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ خاصا قد آور اور ہیبت ناک لگتا تھا۔ نک نے سوچا، غالباً یہ وہ رکاوٹ تھی جس کے سبب فارن ہائٹ...... کو اس کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر رکھے ہوئے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دبا دیا۔

”میں عام قیمت سے زیادہ دینے پر تیار ہوں۔ مثلاً ایک ڈالر فی کارڈ کے حساب سے کیسا رہے گا؟“

”سوری، اس کارڈ کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا لیکن تم ایک سے زیادہ نہیں خرید سکتے۔“

نک نے کندھے اچکائے۔ وہ عورت کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا، اس نے ایک جھیل والے کے ساتھ ساتھ اور دوسرے کارڈ بھی پسند کیے اور ایک ڈالر کا نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ عورت نے جھاڑو دیوار کے ساتھ ٹکائی، کاؤنٹر کے پیچھے جا کر نوٹ کیش بکس میں رکھا اور پچھتر سینٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ نک بہ ظاہر بے پروائی سے کاؤنٹر کے پیچھے جا کر دیکھنے لگا، شاید دوسرے کارڈوں کی کوئی جھلک نظر آ جائے۔ اسی لمحے شیپرڈ غرایا اور اچھل کر نک کی کلائی منہ میں دبا لی۔

”اوہ، اوہ۔“ نک نے گھبرا کر کہا۔ ”اپنے کتے سے کہو میری کلائی چھوڑ دے۔“

”مزاحمت نہیں کرنا۔“ عورت بولی۔ ”اس نے ابھی صرف پکڑا ہے۔ اگر میں اسے حکم دوں تو یہ تمہاری کلائی چبا ڈالے گا۔“

”پلیز، اسے حکم دو کہ یہ میری کلائی چھوڑ دے۔“

”آف کنگ۔“ عورت نے کہا اور کتا نک کی کلائی چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

نک اپنی کلائی سہلاتا ہوا حیرت سے عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ اگرچہ بہ ظاہر وہ موٹی اور سیدھی سادی عورت نظر آتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک تھی جو نک کو پہلے نظر نہیں آئی تھی۔

”اس کتے کی موجودگی میں کوئی شخص تمہیں لوٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا مسٹر۔“

”میرا نام سمنتھا کریگ ہے اور میں مس ہوں شادی شدہ نہیں ہوں...... اگر میرا کوئی شوہر ہوتا تو مجھے اس کتے کی ضرورت نہ ہوتی۔“

”اچھا مس سمنتھا۔“ نک ریزگاری جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا اور تمہارے کتے کا شکریہ۔“ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ذرا سا رکا۔ جیسے اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ”مس سمنتھا۔“ اس نے کہا۔ ”میں کچھ تصویریں اتروانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ یہ میٹ سیڈلر کہاں مل سکتا ہے؟“

”آج کل وہ جھیل کے کنارے ایک چھوٹے سے کاٹیج میں رہتا ہے۔ قصبے سے نکل کر جھیل والی سڑک پر مڑ جانا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد تمہیں اس کا سائن بورڈ نظر آ جائے گا۔“

نک نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کار میں بیٹھ کر جھیل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جھیل والی سڑک ڈھلوان تھی اور نیچے پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ ایک شاخ بائیں طرف چلی جاتی تھی اور ایک دائیں طرف۔ اس مقام پر ایک سائن بورڈ لگا ہوا تھا اور تیر کا نشان ظاہر کرتا تھا کہ سیڈلر کا کاٹیج بائیں جانب تھا۔ نک نے اپنی کار بائیں جانب موڑ دی۔ سیڈلر کا کاٹیج زیادہ دور نہیں تھا۔ نک نے کار دروازے کے سامنے روک دی اور اتر کر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دو مرتبہ اور دستک دی اور پھر کاٹیج کے اوپر سے گھوم کر جھیل کی طرف چلا گیا...... سامنے ایک لکڑی کی بوٹ جیٹی بنی ہوئی تھی جس پر ایک شخص بیٹھا مچھلی کا شکار کر رہا تھا۔

”ہیلو مسٹر۔“ نک نے آواز لگائی۔ ”میں میٹ سیڈلر کی تلاش میں ہوں۔“

”تم نے صحیح سمت میں آواز لگائی ہے۔ میں ہی میٹ سیڈلر ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت؟“

اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔ سر پر جو

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھوڑے بہت بال باقی تھے وہ زیادہ تر سفید تھے۔ نک آگے بڑھا اور جیٹی کے کنارے پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"مجھے اس علاقے کی کچھ تصویریں چاہئیں۔" اس نے کہا۔ "اور میں نے سنا ہے کہ تم ایک اچھے فوٹوگرافر ہو۔"

"کبھی ہوا کرتا تھا۔" بوڑھے فوٹوگرافر نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "لیکن گزشتہ مہینے آگ نے میرا سب کچھ جلا دیا ہے۔ کیمرے اور تمام ساز و سامان۔ آج کل مچھلی کے شکار پر وقت ضائع کر رہا ہوں۔ جب تک انشورنس کا چیک نہیں مل جاتا نیا سامان نہیں خرید سکتا۔"

"اوہ، بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔" نک نے ہمدردی سے کہا۔ "میں نے قصبے کے اسٹور سے یہ تصویریں خریدی ہیں وہاں موجود عورت نے بتایا ہے کہ ان میں سے بعض تصویریں تم نے اتاری تھیں۔"

سیڈلر تصویروں پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔ "یہ جھیل والی تصویر میں نے اتاری تھی۔ یہ بیس اکیس سال پرانی بات ہے۔ اس وقت میں نے اس کے بے شمار پرنٹ تیار کر کے اسٹور کر دیے تھے۔"

نک نے تصویر کو پکڑ کر آنکھوں کے سامنے بلند کیا اور جھیل کے ساتھ موازنہ کرتا ہوا بولا۔ "بہت خوب صورت تصویر ہے، غالباً جھیل کی دوسری جانب سے اتاری گئی تھی۔"

سیڈلر ایک ٹیکری کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "اس چٹان پر سے اتاری تھی وہاں سے اس جھیل کا منظر بہت خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔"

"تم نے اس تصویر سے خاصی دولت کمائی ہوگی نہ؟" نک نے پوچھا۔

سیڈلر نے کندھے اچکائے۔ "ایسی بھی کوئی بات نہیں، اس کے علاوہ میں نے ان پہاڑوں کی کئی اچھی اچھی تصویریں بنائی تھیں لیکن وہ سب کی سب آگ میں جل کر راکھ ہو گئیں۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے، آگ کیسے لگی تھی؟"

"کسی نے شرپسندی کی تھی۔ میری عدم موجودگی میں کوئی شخص میرے مکان میں گھسا اور چاروں طرف پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ پولیس کا خیال ہے کہ کسی نے مکان میں چوری کی تھی اور اپنا جرم چھپانے کے لیے آگ لگا دی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے پرانے نیگیٹیو بھی جل گئے ہوں گے۔ مثلاً اس تصویر کا نیگیٹیو بھی؟"

"نئی پرانی تمام تصویریں جل گئی ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس تصویر کی مانگ اچانک بڑھ گئی ہے۔ تقریباً تمام اسٹوروں میں اس تصویر والے کارڈ فروخت ہو چکے ہیں۔ نیا سامان خریدنے کے بعد میں اس تصویر کا پرنٹ دوبارہ بناؤں گا اور نئے کارڈ تیار کروں گا۔"

نک پوسٹ کارڈ کا معائنہ کرتا ہوا بولا۔ "کیا اس منظر میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے؟"

"کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اگر میرے پاس کیمرا ہو تو میں آج بھی اس چٹان سے بالکل ایسی ہی تصویر بنا سکتا ہوں۔ درخت کچھ بڑے ہو گئے ہیں۔ اس وقت سے اب تک ادھر کوئی نیا مکان بھی تعمیر نہیں ہوا۔"

نک نے دیکھا کہ تصویر میں ایک نارنجی رنگ کی باریک سی لائن جھیل کے کونے سے اٹھتی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید وہ پرنٹنگ کی خرابی کے سبب سے تھی۔ اس کے سوا تصویر میں اور جھیل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔

"عجیب بات ہے۔" نک نے کہا۔ "اس تصویر میں جھیل کے اندر کوئی کشتی نظر نہیں آتی۔"

"یہ تصویر میں نے ستمبر کی ایک صبح اتاری تھی۔ ستمبر کے مہینے میں یہاں خاصی ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ تقریباً جا چکے تھے اور مقامی لوگ اتنی ٹھنڈ میں یہاں تفریح کرنے نہیں آتے۔"

"تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔"

"میں اپنی تصویروں کے بارے میں کبھی نہیں بھولتا۔"

"کیا تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ تمہارے گھر کو کس نے آگ لگائی تھی یا کون تمہیں لوٹنا چاہتا ہوگا؟"

سیڈلر نے جیب سے پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھرتے ہوئے بولا۔ "تم سراغ رسانوں کی طرح سوال کر رہے ہو۔"

"میں سراغ رساں نہیں ہوں۔" نک نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہاں قریب ہی ایک رائٹر رہتا ہے۔ وہ میرے ساتھ بہت بغض رکھتا ہے۔ کیونکہ میں اس کی نام نہاد تحریک آزادی کا حامی نہیں ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ آگ بھی لگا سکتا ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟"

"ٹم لارکن۔" سیڈلر نے کہا۔ "وہ مہماتی واقعات لکھتا ہے۔ شکاریات وغیرہ پر۔ ویسے آج کل اس نے شکار کے خلاف لکھنا شروع کر دیا ہے۔"

نک موضوع بدلتا ہوا بولا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ ابھی تک تم نے کوئی مچھلی نہیں پکڑی۔"

"کسی زمانے میں اس جھیل کے اندر بہت مچھلیاں ہوا کرتی تھیں۔" سیڈلر ریل لپیٹتے ہوئے بولا۔ "بدقسمتی سے ان

دنوں مجھے مچھلی کے شکار کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اب شوق ہوا ہے تو مچھلیاں کہیں ہجرت کر گئی ہیں۔"

نک اٹھتا ہوا بولا۔ "تم سے باتیں کر کے بہت خوشی ہوئی ہے مسٹر سیڈلر۔ امید ہے کہ انشورنس والے جلد تمہارا چیک روانہ کر دیں گے اور تم دوبارہ اپنا کام شروع کر سکو گے۔"

"جلدی کی کوئی امید نہیں۔ یہ زبردستی کی چھٹیاں مجھے کنگال کرتی جا رہی ہیں۔"

نک واپس اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا اور دوبارہ کارڈ کو گھورنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے فارن ہائٹ کے مقصد سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اسے بغیر کسی سوچ بچار کے اپنا کام مکمل کرنا چاہیے۔ اس نے کارڈ کو الٹ کر دیکھا۔ دائیں طرف اوپر والے کونے میں ایک مربع بنا ہوا تھا۔ جس میں لکھا تھا۔ ٹکٹ یہاں چسپاں کریں۔ کارڈ کے وسط میں ایک عمودی خط کھنچا ہوا تھا جس کے ساتھ یہ عبارت لکھی تھی۔ تصویر میٹ سیڈلر۔ اسپائنڈ لیک ورمانٹ مطبوعہ یو ایس اے۔ شاید سیڈلر نے یہ تصویر کہیں سے چرائی تھی، تو کیا ہوا؟ اس تصویر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

نک نے کار اسٹارٹ کی اور واپس جانے کے لیے قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وسطی چوراہے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سمنتھا کریگ اور اس کا کتا کنگ اسٹور کے دروازے میں کھڑے تھے۔ نک نے سمنتھا کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ رات کی تاریکی میں اسے واپس آنا تھا اور جب تک وقت گزارنے کے لیے ٹم لارکن سے ملا جا سکتا تھا۔

XXX

قصبے کی ٹیلی فون ڈائریکٹری کے مطابق ٹم لارکن ماؤنٹین لین پر رہتا تھا۔ نک کو اس کا گھر تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مکان کی دیواریں مضبوط شہتیروں کی بنی ہوئی تھیں۔ دور سے دیکھنے پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان پر زنگ لگا ہوا ہے لیکن جب نک نے قریب سے معائنہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ مکان کاریگری کا عمدہ نمونہ تھا۔ واضح طور پر لارکن لکھنے کے پیشے سے خوب دولت کما رہا تھا۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز پر ایک بھورے بالوں والی عورت نے دروازہ کھولا۔ اس نے گھٹنوں تک اونچی جینز اور مردانہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جو اس کے جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"ہمیں ایلومینیم سائڈنگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔

نک اپنے منہ اور سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "کیا میرے منہ پر ایلومینیم کی کوئی پلیٹ لگی ہوئی ہے؟"

"تو پھر تم کیا بیچتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں ٹم لارکن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ اس وقت لکھنے میں مصروف ہے اور بے موقع مداخلت پر برہم ہو جاتا ہے۔"

"کیا تم مسز لارکن ہو؟"

"تقریباً۔"

"میں اس قصبے پر ریسرچ کر رہا ہوں اور میں......"

اندر سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ "باہر کون ہے جینی؟"

جینی اندر کی طرف منہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ کوئی ریسرچ اسکالر ہے۔ اس قصبے کی چھان بین کرتا پھر رہا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم مصروف ہو۔"

اسی لمحے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ایک بھاری جسم والا شخص جینی کے پیچھے نمودار ہوا۔ اس کی سرخ رنگ کی ڈاڑھی خاصی گھنی تھی۔ اگر اس کے جسم پر لکڑہاروں والا لباس اور ہاتھ میں کلہاڑا ہوتا تو زیادہ موزوں معلوم ہوتا۔

"میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں مسٹر؟"

"میرا نام نک ویلوٹ ہے۔ میں اس علاقے کے قدرتی مناظر اور خاص طور پر جھیل کے بارے میں ریسرچ کر رہا ہوں۔ میں یہاں گرمائی رہائش گاہ تعمیر کرنے کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس معاملے میں تم سے بہتر مشورہ کوئی نہیں دے سکتا۔"

"تمہیں ٹھیک بتایا گیا ہے۔" سرخ ریش شخص نے کہا۔ "میرا نام ٹم لارکن ہے، اندر آ جاؤ۔"

جینی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ لارکن کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ "ذرا احتیاط سے ٹم۔ میرے خیال میں یہ کوئی دردر گھومنے والا سیلز مین ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" لارکن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جاؤ۔ ہمارے لیے دو بیئر لے آؤ۔"

پھر وہ نک کی راہنمائی کرتا ہوا ایک کشادہ کمرے میں پہنچ گیا۔

"بیٹھو مسٹر ویلوٹ۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود بڑی سی میز کے پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس پر زیبرے کی کھال سے ملتا جلتا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ "جب بھی کوئی شخص میرے اور ٹائپ رائٹر کے درمیان حائل ہوتا ہے تو جینی کو فکر لگ جاتی ہے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے معذرت کرنا پڑتی ہے۔ ہاں تو میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں یہ مطلع کرنا چاہتا تھا کہ......"

"آں ہاں، تم جھیل کے بارے میں چھان بین کرنے آئے ہو۔ اس قصبے کا نام اسپائڈ لیک ہے جس کے لفظی معنی ہیں۔ دھبوں والی جھیل۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب نئے آباد کار یہاں آئے تو اس جھیل کے اندر جگہ جگہ سبزیاں اور کنول کے پودے ہوتے تھے۔ دور سے یہ چھوٹے چھوٹے دھبے معلوم ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ اسے دھبوں والی جھیل کہتے تھے۔ لہٰذا اس قصبے کا بھی یہی نام پڑ گیا۔ اسپائڈ لیک۔"

"اتنی خوب صورت تشریح کوئی رائٹر ہی کرسکتا ہے۔"

"افسوس کہ اب یہ جھیل، دوسری جھیلوں کی طرح آلودہ ہوگئی ہے۔"

"آج میں نے میٹ سیڈلر کو جھیل میں مچھلی کا شکار کرتے دیکھا تھا۔"

"سیڈلر بہت زیادہ خوش فہمی کا شکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے کوئی مچھلی نہیں پکڑی ہوگی۔ چند ہفتے قبل اس کے مکان کو آگ لگ گئی تھی۔ اب وہ نیا سامان خریدنے کے لیے انشورنش چیک کا منتظر ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے آگ اس نے خود ہی لگائی تھی۔"

"تم نے یہ بات کیوں کہی؟" جینی کی آواز دروازے کی طرف سے سنائی دی۔ اس نے تین بیئر کے گلاس اٹھا رکھے تھے۔ "ایسی باتیں تمہیں مصیبت میں مبتلا کرسکتی ہیں ٹم۔ تمہیں کیا پتا کہ یہ شخص کون ہے؟"

"آں ہاں ممکن ہے کسی نے شرارت اور تفریح کے طور پر اس کے گھر کو آگ لگائی ہو لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ سیڈلر جیسے شخص کے ساتھ ایسی حرکت کون کرسکتا ہے۔ بے چارہ افسردہ قسم کا بوڑھا آدمی ہے اور اکثر گلے میں کیمرا لٹکائے جنگلوں اور پہاڑوں کی تصویریں اتارتا پھرتا تھا۔ کوئی اس کا دشمن نہیں ہے۔ سوائے اس کی سابقہ بیوی کے۔"

"یہ فضول باتیں بند کرو ٹم۔" جینی چلّائی۔ "جس انداز سے تمہارا دماغ کام کرتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر تمہیں جرائم کی کہانیاں لکھنا چاہئیں۔"

"سیڈلر کی سابقہ بیوی کون ہے؟" نک نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"سمنتھا کریگ، قصبے کے وسط میں اس کا جنرل اسٹور ہے اس طرف آتے ہوئے تم نے ضرور اس کا اسٹور دیکھا ہوگا۔"

"میں اسٹور کے اندر بھی گیا تھا۔"

"اچھی عورت ہے، مردوں کی طرح مضبوط، خصوصاً جب اس کا کتا اس کے پاس ہو۔ ان میں علیحدگی کی وجہ بڑی واضح ہے۔"

نک بیئر کی چسکیاں لینے لگا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ سیڈلر کے پاس کوئی ایسی تصویر ہو جسے بعض لوگ پسند نہ کرتے ہوں اور اسی وجہ سے انہوں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی ہو۔"

"سیڈلر کسی کو بلیک میل نہیں کرسکتا۔"

"میں بلیک میل کی بات نہیں کر رہا۔ ہوسکتا ہے کہ سیڈلر خود بھی یہ بات نہ جانتا ہو کہ اس کی کوئی تصویر کسی کے لیے خطرناک ہے۔" نک نے جیب سے جھیل کی تصویر والا پوسٹ کارڈ نکال کر دکھایا۔

"یہ تصویر بھی غالباً اسی کی بنائی ہوئی ہے۔"

لارکن نے تصویر پر سرسری نظر ڈالی۔ "ہاں، یہ اسی کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔"

"کیا اس تصویر میں کوئی غیر معمولی بات ہے؟"

"میرے علم میں کوئی بات نہیں، یہ تصویر دو دہائیوں سے فروخت ہو رہی ہے۔"

"یہ جھیل کی سیدھی سادی تصویر ہے۔" جینی نے کہا۔ "اس میں کیا غیر معمولی بات ہوسکتی ہے۔"

نک پچھلی بات کی طرف واپس آتا ہوا بولا۔ "تو تمہارے خیال میں جھیل آلودہ ہوچکی ہے؟"

"آلودہ اور مردہ ہوچکی ہے۔ نہانے اور تفریح کرنے کے قابل نہیں رہی۔ میں نے اس سلسلے میں کئی لیکچر بھی دیے ہیں اور اب لوگوں نے میری باتوں پر توجہ دینی شروع کردی ہے کئی لوگ اس جھیل میں نہانے کے بعد بیمار ہوچکے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جگہ میرے لیے نامناسب ہے۔" نک نے کہا۔

"بالکل نامناسب ہے مسٹر ویلیٹ۔" جینی نے کہا۔ "ٹم کو ضروری کام کرنا ہے اور تم اس کے کام میں حائل ہو رہے ہو۔"

"سوری۔" نک اٹھتا ہوا بولا۔ "میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا۔"

ٹم لارکن اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ "تمہیں اسپائڈ لیک کے بارے میں پتا کیسے چلا؟"

نک نے قدرے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "اوٹس فارن ہائٹ نامی ایک شخص نے اس کا ذکر کیا تھا۔"

"آہ اوٹس فارن ہائٹ۔" لارکن نے کہا۔ "میں اسے جانتا ہوں بلکہ قصبے کا ہر شخص اسے جانتا ہے۔ پہلے وہی ہوزری مل کا مالک تھا لیکن کافی عرصہ قبل یہ مل فروخت کر کے ایک دوسرے علاقے میں منتقل ہوگیا تھا۔"

نک، لارکن سے...... ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔ "مدد کا شکریہ مسٹر لارکن، میرا خیال ہے کہ کیمپ سائٹ کے لیے مجھے کوئی اور جگہ دیکھنا پڑے گی۔"

جب وہ کار میں بیٹھ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ جینی کھڑکی کے قریب کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

XXX

جب چاروں طرف رات کی تاریکی پھیل گئی تو نک قصبے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی کار درختوں کے نیچے تاریکی میں کھڑی کردی اور پیدل سمنتھا کے اسٹور کی طرف ہولیا۔ چھوٹے علاقوں میں سورج غروب ہوتے ہی سناٹا چھا جاتا ہے۔ قصبے کی گلیاں تقریباً سنسان پڑی تھیں۔ نک اسٹور کے بغلی دروازے پر گیا اور تالے کا معائنہ کیا۔ وہ ایک عام قسم کا تالا تھا۔ نک نے ذرا سی کوشش سے اسے کھول لیا اور اندر داخل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ اسے پہلے ہی شک تھا کہ کتا دکان کے اندر ہی ہوگا۔ اس نے فی الفور جیب سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکالا۔ اسے آن کر کے دروازے کے پاس رکھا اور تیزی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھا جہاں غالباً جھیل کی تصویر والے بقیہ پوسٹ کارڈ رکھے تھے لیکن دوسرے ہی لمحہ کتا غرّاتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس کی کلائی منہ میں دبالی۔

"آف کنگ۔" اسٹور کی تاریکی میں سمنتھا کی آواز گونجی۔ "آف کنگ۔"

یہ آواز سنتے ہی کتے نے ذرا سا تامل کیا اور کلائی چھوڑ دی۔ نک جلدی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور پوسٹ کارڈ تلاش کرنے لگا۔ کتا بے یقینی کے انداز میں غرّا رہا تھا۔ پانچ سیکنڈ کے بعد ایک بار پھر "آف کنگ" کہا گیا۔ یہ الفاظ دروازے کے پاس رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر میں سے ہر پانچ سیکنڈ کے بعد نشر ہو رہے تھے۔ کتے نے غرانا بھی بند کردیا اور اپنی مالکن کے حکم کی تعمیل میں اطمینان کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔

نک نے نصف منٹ کے اندر پوسٹ کارڈوں والا لفافہ تلاش کرلیا۔ اس نے جیبی ٹارچ کی روشنی میں تمام کارڈوں کا معائنہ کیا۔ وہ تعداد میں کل گیارہ تھے اور سب جھیل کی تصویر والے تھے۔ نک نے لفافہ جیب میں رکھا اور اطمینان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر جیب میں رکھا اور باہر نکل کر دروازہ بند کردیا۔

XXX

اگلے روز نیویارک پہنچ کر نک نے مسٹر فارن ہائٹ سے ملاقات کی اور پوسٹ کارڈوں والا لفافہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"کل بارہ پوسٹ کارڈ ہیں۔" اس نے کہا۔ "ایک خریدنا پڑا اور باقی......"

"شاندار، بہت شاندار۔" فارن ہائٹ کارڈ دیکھتا ہوا بولا۔ "تم حیرت انگیز انسان ہو۔"

"کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔" نک نے کہا۔

"اس سے پہلے میں نے جس شخص کو تصویریں لانے کے لیے بھیجا تھا وہ انتہائی خوف زدہ حالت میں واپس آیا تھا۔ اس کی کلائی پر کتے کے دانتوں کے گہرے نشانات تھے۔"

"یقیناً وہ کتوں کی نفسیات سے واقف نہیں ہوگا۔"

فارن ہائٹ ایک پھولا ہوا لفافہ نک کی طرف اچھالتا ہوا بولا۔ "اس کے اندر تمہاری بقایا رقم ہے۔ بہرحال تمہارے ساتھ بزنس کر کے بہت خوشی ہوئی۔"

نک نے رقم گن کر جیب میں ڈالی اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس کی جیب میں دو دوسرے تصویری پوسٹ کارڈ ابھی باقی تھے۔ ان میں سے ایک اس نے گلوریا کو بھیج دیا اور دوسرا ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا۔ پوسٹ کارڈوں والا معاملہ ختم ہوگیا تھا۔

XXX

دو روز بعد گلوریا نے فون پر بتایا کہ اس کی ماں کی طبیعت ٹھیک ہوچکی ہے اور وہ واپس آرہی ہے۔ نک نے جیسے ہی فون بند کیا دروازے کی گھنٹی بجی، باہر ڈیوڑھی میں جو آدمی کھڑا تھا وہ دبلا اور لمبا تھا۔ اس نے اسپورٹس جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے نیچے جو قمیص اور ٹائی تھی وہ مختلف رنگ کی تھی۔ نک نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ یہ آدمی ایلومینیم سائڈنگ کا سیلز مین معلوم ہوتا ہے۔

فارن ہائٹ تم سے ملنا چاہتا ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اس کے ساتھ میرا معاملہ ختم ہو چکا ہے۔"

وہ شخص آگے بڑھا اور نک کے پہلو سے ریوالور کی نال لگادی۔ "نہیں ابھی معاملہ ختم نہیں ہوا۔" اس نے غرا کر کہا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

چالیس منٹ بعد نک ایک بار پھر فارن ہائٹ کے دفتر میں بیٹھا تھا۔

"تم نے مجھے مایوس کیا ہے نک ویلوٹ۔" فارن ہائٹ نے کہا۔ "تم اپنے مشن میں ناکام رہے ہو۔"

"یہ ناممکن ہے۔" نک نے کہا۔

"اچھا!" فارن ہائٹ نے کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ "ذرا یہ تو دیکھو، یہ لفافہ آج صبح کی ڈاک سے موصول ہوا ہے۔"

نک نے لفافہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے اندر جھیل کی دو تصویریں تھیں جو پوسٹ کارڈ کے بجائے پتلے کاغذ پر تھیں۔ واضح طور پر انہیں اوریجنل کلر نیگیٹو سے تیار کیا گیا تھا۔ تصویروں کے ساتھ ایک چھوٹا سا رقعہ تھا جس پر ذیل کی عبارت درج تھی۔

"تم نے جو آخری آدمی بھیجا تھا وہ بھی ناکام واپس چلا گیا ہے۔ بقیہ تصویروں اور پوسٹ کارڈوں کی قیمت اب بھی دس لاکھ ڈالرز ہی ہے۔"

نیچے جو تاریخ درج تھی وہ نک کی واپسی کے دوسرے دن کی تھی۔

"بلیک میل۔" نک نے ہولے سے کہا اور سوچنے لگا کہ آخری مرتبہ یہ لفظ اس نے کہاں سنا تھا۔ سیڈلر کے منہ سے، جینی کے منہ سے یا ٹم لارکن کے منہ سے۔

"ہاں، بلیک میل مسٹر ویلوٹ لیکن تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارا تعلق صرف تمہاری ناکامی سے ہے۔"

"تم نے مجھے پوسٹ کارڈ چوری کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ میں نے تمہیں لاکر دے دیے ہیں۔ تم نے تصویروں کی بابت کوئی بات نہیں کی تھی۔"

فارن ہائٹ اس شخص کی طرف مڑا جو نک کو لایا تھا۔

"روبن، ہمیں وہاں جانا پڑے گا۔"

روبن نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا یہ وہی شخص ہے جو کلائی پر دانتوں کے نشانات ساتھ لایا تھا؟" نک نے پوچھا۔ "اور جس نے سیڈلر کے مکان کو آگ لگائی تھی؟"

"تم کچھ زیادہ ہی باتیں جانتے ہو۔" روبن نامی شخص نے کہا۔

"شٹ اپ روبن۔" فارن ہائٹ گرجا۔ "تمہارا قیاس درست ہے ویلوٹ۔ بلیک میل کا چکر دو ماہ قبل شروع ہوا تھا۔ میں نے روبن کو اسپائڈر لیک بھیجا اور یہ وہاں سے جھیل کی تصویر والے تمام پوسٹ کارڈ خرید لایا۔ اس کے باوجود بلیک میلر کا خط آگیا۔ دوسری مرتبہ یہ وہاں گیا اور سیڈلر کے مکان کو آگ لگادی لیکن بلیک میلر کا خط پھر آگیا۔ تیسری مرتبہ یہ وہاں گیا اور کلائی پر کتے کے دانتوں کے نشانات ڈلوا کر واپس آگیا۔ تب میں نے تمہاری خدمات حاصل کیں۔ مجھے یقین تھا کہ تم ناکام واپس نہیں آؤ گے۔ یہ تصویریں، جو تمہاری نظر میں بے قیمت ہیں میری نظر میں بہت قیمتی ہیں۔"

"کیوں؟" نک نے پوچھا۔ "ان تصویروں میں کون سی ایسی بات ہے جس کی قیمت دس لاکھ ڈالرز سے بھی زیادہ ہے؟ اس میں جھیل کے سوا کوئی متحرک چیز نظر نہیں آتی۔ نہ کوئی آدمی، نہ کار اور نہ ہی کوئی کشتی۔"

"شاید مجھے دس لاکھ ڈالر ادا کرنے ہی پڑیں۔ لہٰذا تم بخوبی اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں یہ راز تمہارے سمیت کسی کو نہیں بتا سکتا۔"

"اب تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

فارن ہائٹ روبن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم اسپائڈر لیک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور تم بھی ہمارے ساتھ جاؤ گے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں ابھی وقت نہیں نکال سکتا۔"

"ہمارا خیال ہے کہ تم وقت نکال سکتے ہو۔"

"کیا یہ پروگرام آیندہ ہفتے تک ملتوی......"

"آیندہ ہفتے تک بہت دیر ہوجائے گی۔" فارن ہائٹ نے کہا۔ "یہ معاملہ فوری طور پر حل ہونا چاہیے۔ سوموار کو میری عدالت میں پیشی بھی ہے۔"

نک نے روبن کی طرف دیکھا جو بے چینی کے ساتھ ریوالور کو انگلیوں میں گھما رہا تھا۔ نک نے سوچا اس چکر سے بدمزگی کے بغیر نکلنا مشکل ہے۔

"ٹھیک ہے۔" بالآخر اس نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"بہت خوب مسٹر ویلوٹ۔"

"بلیک میلر کے بارے میں کوئی اندازہ؟"

"کوئی نہیں۔ یہ شخص جو کوئی بھی ہے، اس بات سے آگاہ ہے کہ تم اسپائڈر لیک گئے تھے تم وہاں کتنے لوگوں سے ملے تھے؟"

"صرف تین، نہیں چار۔ سمنتھا کریگ، میٹ سیڈلر، ٹم لارکن نامی ایک رائٹر اور اس کی گرل فرینڈ جینی۔"

فارن ہائٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میٹ اور سمنتھا کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ دونوں کسی زمانے میں میاں بیوی تھے اور ٹم لارکن کو بھی جانتا ہوں لیکن جینی کا نام میرے لیے نیا ہے۔"

"تمہاری وہاں ہوزری مل تھی؟"

"یہ گئے وقتوں کی بات ہے ویلوٹ، آج کل میں آئل ٹینکر فلیٹ کا مالک ہوں اور دنیا کے تین ملکوں میں میرے کیمیکل پلانٹ ہیں۔"

"پھر تو صورتِ حال بہت الجھی ہوئی ہے۔"

"نہیں۔ اب معاملہ چار افراد تک محدود ہوگیا ہے۔ روبن ان چاروں کو دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ ان میں بلیک میلر کون ہے۔"

"گن کے ساتھ؟"

"اگر ضرورت پڑی تو گن بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔"

رون نے راستے میں کہا۔ "میں سب سے پہلے اس وحشی کتے کو شوٹ کروں گا۔"

XXX

اسپائڈر لیک کا سفر ایک چھوٹے سے جیٹ طیارے میں کیا گیا۔ جس پر فارن ہائٹ کی کمپنی کا نام پینٹ کیا ہوا تھا۔ ائرپورٹ پر ایک کرائے کی کار مزید بیس میل کے سفر کے لیے ان کی منتظر تھی۔ سفر کے دوران زیادہ تر خاموشی رہی۔ جب ان کی کار قصبے کی حدود میں داخل ہوئی تو فارن ہائٹ نے کہا۔

"اس قصبے میں، میں نے اپنی زندگی کا پہلا کاروبار کیا تھا۔ ہوزری مل میں نے اس وقت خریدی تھی جب اس کے مالکان نقصان کی بنا پر اسے بند کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ میں نے اس مل کو پورے دس سال تک کامیابی کے ساتھ چلایا اور جب میں نے اسے فروخت کیا تو اس وقت وہ پورے زور و شور کے ساتھ چل رہی تھی۔ اہل قصبہ کو چاہیے کہ مجھے بلیک میل کرنے کے بجائے قصبے کے وسط میں میرا مجسمہ نصب کریں۔"

"اس حرکت کا ذمہ دار سارا قصبہ نہیں ہوسکتا۔"

"اس کا فیصلہ تو حقیقت کھلنے کے بعد ہی ہوگا۔"

ان کی کار جنرل اسٹور کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

نک نے ٹم لارکن اور جینی کو اسٹور سے نکلتے دیکھا۔ فارن ہائٹ اور لارکن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو ان کے چہروں پر خوش گوار حیرت نمودار ہوئی۔

"اوہ، ہیلو فارن ہائٹ۔" لارکن نے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قصبے میں قدم رکھنے کی ہمت بھی کرسکتے ہو۔"

"میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندگی ہو۔" فارن ہائٹ نے کہا۔

جینی، نک کو گھورتے ہوئے بولی۔ "یہ...... یہ وہی سائڈنگ سیلز مین ہے۔ تمہارا اندازہ صحیح ہے۔ یہ واقعی فارن کا آدمی ہے۔"

"میں کسی کا آدمی نہیں ہوں۔" نک نے کہا۔ "چلیں اندر چلتے ہیں۔"

"معاملہ کیا ہے؟" لارکن نے پوچھا۔

"تم نے سنا نہیں ویلوٹ نے کیا کہا ہے۔" روبن ابھری ہوئی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوا بولا۔ "اندر چلو۔"

سمنتھا، فارن ہائٹ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ اب تم کرائے کے غنڈے ساتھ لے آئے ہو۔"

"تمہارا سابقہ شوہر کہاں ہے سمنتھا؟" فارن ہائٹ نے پوچھا۔

"یہاں اس کا کیا کام؟"

"اسے فون کر کے یہاں بلاؤ۔"

"کیوں بلاؤں اسے؟" سمنتھا نے غصے سے کہا۔

"تم لوگوں میں سے کوئی شخص مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔" فارن ہائٹ نے کہا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے۔"

سمنتھا نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور بالآخر فون کی طرف بڑھ گئی۔ سیڈلر نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ جائے گا۔ اس اثنا میں ایک عورت اور اس کا بچہ خریداری کے لیے اسٹور میں داخل ہوئے لیکن سمنتھا نے انہیں واپس بھیج دیا۔

"اسٹور اسٹاک ٹیکنگ کے لیے بند ہے۔" اس نے کہا۔ "کل آنا۔"

دس منٹ بعد سیڈلر اسٹور میں پہنچ گیا۔

"ہیلو ٹم۔" اس نے باریش رائٹر کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، ہمیں زبردستی یہاں روکا گیا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں اور جینی اسٹور سے نکل رہے تھے کہ فارن ہائٹ اپنے بندوقچیوں کے ساتھ یہاں پہنچ گیا اور ہمیں گن دکھا کر اندر لے آیا۔"

"میرے پاس کوئی گن نہیں ہے۔" تک نے کہا۔ "اور بات ہونے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔"

فارن ہائٹ، روبن سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ذرا ہوشیاری سے سب پر نظر رکھو، جب تک میری بات ختم نہ ہو کوئی شخص جانے نہ پائے۔" پھر وہ دوسرے افراد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم چاروں میں سے کوئی شخص مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے، جب تک بلیک میلر بے نقاب نہیں ہو جاتا تم لوگ باہر نہیں جا سکتے۔"

"لیکن کوئی شخص کیوں تمہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے؟" جینی نے سادگی سے پوچھا۔ وہ حاضرین میں سب سے کم عمر تھی۔ اس کا انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ اصل حقیقت سے بے خبر ہے۔

اچانک تک کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے جھیل کی تصویر یاد آ گئی اور دفعتاً حقیقت اس کے ذہن میں روشن ہو گئی۔ اسے خیال آیا کہ اگر بلیک میلر بے نقاب ہو گیا تو فارن ہائٹ اسے بے دریغ قتل کر ڈالے گا۔ لہٰذا یہ بات سب کو بتا دینی چاہیے۔ پانچ آدمیوں کو قتل کرنا آسان کام نہیں تھا۔

"کیا تم خود جینی کے سوال کا جواب دو گے۔" تک نے کہا۔ "یا اگر اجازت ہو تو، میں اس کے سوال کا جواب دوں۔"

فارن ہائٹ ایک دم گھوم کر تک کو گھورنے لگا۔ "تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"تم نے چند پوسٹ کارڈ چوری کروانے کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے لیکن ابھی ابھی میرے ذہن میں اچانک ساری حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ بیس سال قبل جب تمہاری مل جھیل کے پانی کو آلودہ کر رہی تھی اس وقت سیڈلر نے اس کی تصویر اتاری تھی اور اتفاق سے وہ ایک خاص لمحہ تھا۔"

سیڈلر چونک کر بولا۔ "اوہ، تو یہ تم ہو جس نے ایک تصویر کی خاطر میرے مکان اور اسٹوڈیو کو جلا کر خاک کر دیا۔"

"تم سب لوگوں نے وہ تصویر دیکھی ہے۔" تک نے فارن ہائٹ...... کو سوچنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ "جھیل کی دائیں جانب ایک نارنجی رنگ کی باریک سی عمودی لکیر دکھائی دیتی ہے پہلے میں اسے پرنٹنگ کی خرابی سمجھا تھا لیکن نہیں، حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ کوئی مہلک کیمیکل ہے جو ہوزری مل کے کسی پائپ سے جھیل کے اندر گر رہا ہے۔ آج بھی اگر مل کا معائنہ کیا جائے تو اس مقام پر اس پائپ کا کوئی سراغ ضرور مل جائے گا۔"

لارکن نے سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر ایک دم تندہی چھا گئی تھی۔ "یہ شخص ایک خوب صورت جھیل کا قاتل ہے، جھیل کا ہی نہیں، ان ہزاروں مچھلیوں کا بھی جو اس کے شفاف پانی کی رونق تھیں۔ اس جھیل میں نہانے والے سیکڑوں لوگ بیماریوں کا شکار ہو چکے ہیں، نہ جانے ان میں سے کتنے مر بھی گئے ہوں۔"

"اس کے باوجود یہ ایک پرانی بات ہے۔" سمنتھا نے کہا۔ "اتنی پرانی بات پر دس لاکھ ڈالر کا مقابلہ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"اس وقت مسٹر فارن ہائٹ پر غالباً آلودگی پھیلانے کے سلسلے میں عدالت میں ایک مقدمہ چل رہا ہے۔ یہ آلودگی یا اس کے آئل ٹینکروں کے باعث...... یا کیمیکل پلانٹ کے باعث پھیلی ہے۔ اگر عدالت کو یہ علم ہو جائے کہ اس شخص نے بیس سال قبل ایک خوب صورت جھیل کو آلودگی سے تباہ کیا تھا تو موجودہ مقدمے کا فیصلہ اس کے خلاف ہونے کا قوی امکان ہے۔"

روبن کے چہرے پر الجھن نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے باس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تمہارے لیے اب کوئی حکم نہیں ہے۔" سمنتھا نے کہا۔ "تمہارے باس کا راز فاش ہو چکا ہے۔"

"پہلے اس عورت کا منہ بند کرو۔" فارن ہائٹ چلایا۔

"تک۔" سمنتھا چلائی۔ "جلدی آؤ۔"

کاؤنٹر کے عقب سے قدآور شیپرڈ غراتا ہوا نمودار ہوا۔ روبن کا ہاتھ تیزی سے جیب سے باہر آیا۔ تک نے قریبی ریک سے ایک اچار کی بوتل اٹھائی اور برقی سرعت سے روبن کے سر پر دے ماری۔ ریوالور ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ فرش پر گر گیا اور روبن سلوموشن میں فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ فارن ہائٹ نے لپک کر ریوالور اٹھانا چاہا لیکن تک اس کے اور ریوالور کے درمیان حائل ہو گیا۔

"ٹھہرو مسٹر فارن ہائٹ۔" اس نے کہا۔ "اب خطرے کی کوئی بات نہیں، یہی شخص تمہیں بلیک میل کر رہا تھا۔"

"روبن؟ میں یقین نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں یقین کرنا ہی پڑے گا ممکن ہے کہ جھیل کی آلودگی کے بارے میں ان میں سے کوئی شخص جانتا ہو لیکن عدالت میں تم پر جو مقدمہ چل رہا ہے اس کے بارے میں صرف روبن ہی جانتا تھا پھر یہ روبن ہی تھا جس نے سیڈلر کا اسٹوڈیو جلانے سے قبل جھیل کی تصویر کا نیگیٹو چوری کر لیا اور اس کے پرنٹ نکلوا کر رکھ لیے۔"

فارن ہائٹ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہتے ہو، تعجب ہے کہ مجھے پہلے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔ یہ شخص ہمیشہ سے لالچی اور کینہ ہے۔"

"آپ کیا چاہتے ہو فارن ہائٹ؟" لارکن نے پوچھا۔ "اس شخص کو آتش زنی کے جرم میں مقامی پولیس کے سپرد کرنا چاہتے ہو یا خود نمٹنا چاہتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ فارن ہائٹ خود ہی اس کا بندوبست کرے گا۔" تک نے کہا۔ "کیوں نہ اسے کار میں ڈال لیا جائے؟"

سب نے اس بات سے اتفاق کیا اور بے ہوش روبن کو اٹھا کر کار میں ڈال دیا۔

"اب کوئی شخص تمہیں بلیک میل نہیں کرے گا۔" تک نے کہا۔

فارن ہائٹ کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "لارکن اس بارے میں فیچر لکھنے سے باز نہیں آئے گا۔ اسے عوام کی صحت و صفائی کی ہر وقت فکر لگی رہتی ہے۔ کیا تم کار میں نہیں بیٹھو گے؟"

تک نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ایک آدھ دن اس قصبے میں گزارنا چاہتا ہوں۔ اس شخص سے محتاط رہنا، ہوش میں آنے کے بعد بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"میں اسے سیدھا کرنا خوب جانتا ہوں۔"

تک کار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر اسٹور کے اندر چلا گیا۔

سمنتھا اسے دیکھ کر بولی۔ "تم خاصے ہوشیار آدمی لگتے ہو۔"

تک نے کندھے اچکائے۔ "مصیبت سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ روبن بلیک میلر نہیں ہے۔"

تک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ بولا۔ "اور یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ بلیک میلر تم ہو۔"

قدرے تامل کے بعد سمنتھا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہارا اندازہ صحیح ہے تک۔ میں اس رقم سے جھیل کو صاف کروا کے اس میں نئے سرے سے مچھلیاں ڈلوانا چاہتی تھی۔"

"فکر نہیں کرو۔" تک نے اسے یقین دلایا۔ "ایسا ہی ہو گا۔ فارن ہائٹ کو طوعاً یا کرہاً یہ کام کرنا پڑے گا لیکن اب تم بلیک میلنگ والا طریقہ اختیار نہیں کرو گی۔ فارن ہائٹ کو کوئی خط نہیں لکھو گی۔"

"تمہیں یہ کیسے اندازہ ہوا کہ بلیک میلنگ میں کر رہی ہوں؟"

"واضح طور پر پہلی مرتبہ روبن نے قصبے کے تمام اسٹوروں سے جھیل کی تصویر والے سارے کارڈ خرید لیے تھے لیکن تمہارے سوا کسی کو کارڈوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا اور نہ کوئی دوسرا شخص نیگیٹو حاصل کر سکتا تھا۔ تم نے روبن کے ہاتھ تمام کارڈ فروخت کرنے کے بعد مزید کارڈ پرنٹ کروا لیے۔ یہ کام یا تو تم نے سیڈلر کی مدد سے کیا یا اس کے اسٹوڈیو سے نیگیٹو چرا کر خود ہی کارڈ پرنٹ کروا لیے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ تم نے سیڈلر سے علیحدگی سے قبل اس کے کچھ نیگیٹو اپنے قبضے میں کر لیے ہوں۔"

"تمہارے دلائل بہت کمزور ہیں۔" سمنتھا نے کہا۔ "مثلاً صورتِ حال...... یوں بھی تو ہو سکتی ہے کہ کارڈوں کا ایک پیکٹ جسے میں رکھ کر بھول گئی تھی اچانک میرے ہاتھ لگ گیا ہو۔"

تک نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے پاس ابھی ایک اور ثبوت موجود ہے۔ تھوڑی دیر پہلے گفتگو کے دوران تم نے کہا تھا کہ اتنی پرانی بات پر دس لاکھ ڈالر کا مطالبہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ فارن ہائٹ نے صرف یہ کہا تھا کہ اسے بلیک میل کیا جا رہا ہے، رقم نہیں بتائی تھی، لہٰذا یہ بات وہی شخص جان سکتا ہے جو بلیک میل کر رہا ہو۔"

"بہرحال، میرے پیشِ نظر ایک اچھا مقصد تھا۔" سمنتھا نے کہا۔ "تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے کتے کو بے ہوش کیے بغیر کارڈ کیسے چوری کر لیے؟"

"میرا بزنس سیکریٹ ہے۔" تک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

محفلِ شعر و سخن

❋ خرم نقوی......ایبٹ آباد
دنیا میں دو ہی آدمی باذوق ہیں عدم
اِک میں ہوں اور دوسرا میرا رقیب ہے

❋ عون عباس بابر......اوکاڑہ
ان پہ دشمنوں کا گمان ہوتا ہے
جن کے ہاتھوں میں پتھر نہیں ہوتے
شوقِ پرواز وہ بھی رکھتے ہیں
جن پرندوں کے پر نہیں ہوتے

❋ نبیلہ بشیر منگی......کے ایس ایم پشاور
جہاں پھولوں کو کھلنا تھا وہیں کھلتے تو اچھا تھا
تمہی کو ہم نے چاہا تھا تمہی ملتے تو اچھا تھا

❋ تفسیر عباس بابر......اوکاڑہ
کیوں کس لیے معتبر نہیں ہوتے
کیا گملے میں اُگنے والے شجر نہیں ہوتے
تیرا دل تیری آنکھیں تیرے وجود کا لمس
یہ معرکے ہم سے تو سر نہیں ہوتے

❋ محمد صفدر......چک نمبر ۴ ضلع خانیوال
سارا کرشمہ محبت کا ہے ورنہ
پتھر کی دیواروں کو کون تاج محل کہتا

❋ صوبیہ تفسیر......اوکاڑہ
اپنی مٹھی میں وہ میری جان لیے پھرتا ہے
بس میری موت کا سامان لیے پھرتا ہے
بات بے بات یونہی بات بڑھا دیتا ہے
وہ تو بس بحث کے عنوان لیے پھرتا ہے

❋ راجا افتخار علی افی......چوآسدن شاہ (موہڑہ)
اس نجومی نے تو مجھے پریشانی میں ڈال دیا
کہتا ہے تجھے موت نہیں کسی کی یاد مارے گی

❋ مریم کائنات......حیدر آباد
ہر بار وہ شخص پھیر لیتا ہے نگاہیں ہم سے
میں نے کاغذ پر بھی بنا کے دیکھی ہیں آنکھیں اس کی

❋ کنول زریں......گلبرگ، لاہور
اب بھی پوچھتے ہو مقام اپنا
کہہ جو دیا کہ زندگی ہو تم

❋ رابعہ ملک......ضلع شیخوپورہ
اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مرجاتے ہیں
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے رکتے ہیں گزر جاتے ہیں

❋ شوکت علی......لاہور
کرلی نا تم نے تسلی دل توڑ کر میرا
میں نے کہا تھا نا کچھ نہیں اس میں تیرے سوا

❋ احسان سحر......میانوالی
تیری کلائی جو پکڑوں تو شور مچاتی ہیں
یہ چوڑیاں آخر تیری لگتی کیا ہیں

❋ راشد حبیب تابش......گاؤں چھب، ضلع اٹک
ادا قاتل، نگاہ قاتل، زباں قاتل، بیاں قاتل
بتا قاتل کہاں جاؤں، جہاں جاؤں وہاں قاتل

❋ مہرین ناز......حیدر آباد
فصیلِ جسم پر پائی ہے کرب کی چادر
اہلِ درد سے پوچھو کہ زندگی کیا ہے

❋ رضوان تنولی......اورنگی ٹاؤن کراچی
نہ عشق با ادب رہا، نہ حسن باحیا رہا
ہوس کی دھوم ہے نگر نگر گلی گلی

❋ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
مقتل میں دونوں ہاتھ کٹنے کے باوجود
عباس ترے ہاتھ میں بازی ہے آج تک
تو نے بدل کے رکھ دیئے معنی حیات کے
تو تو شہید ہو کے بھی غازی ہے آج تک

❋ رحیمہ سرور......ساہوواڑی، لاہور
کبھی دن کی روشنی میں جھوم کے کبھی شب کے پھولوں کو چوم کے
یوں ہی ساتھ ساتھ چلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

❋ محمد کامران خالد......محلہ خسر خیل چھب
دونوں جہاں کی نہ رہی پھر خبر اسے
دو پیالے تیری آنکھوں نے جس کو پلا دیے

❋ عمران افتخار جوئیہ......گورچھ سنگھ
محسوس ہو رہا ہے یہ پھولوں کو دیکھ کر
گھبرا کے سو گئے ہیں شراروں کے قافلے

❋ عاصم اقبال جسپال......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
شاہین تیری پرواز سے جلتا ہے زمانہ
تیرے شاہ پروں کے نیچے یہ زمین یہ زمانہ

❋ جواد احمد بھٹی......سرگودھا
خاک مٹھی میں لیے قبر کی یہ سوچتا ہوں
انسان جو مرتے ہیں تو غرور کہاں جاتا ہے

❋ سعود احمد خانزادہ......نوشہرو فیروز، سندھ
بچھڑنے والے بچھڑ چلا تھا تو نسبتیں بھی گنوا کے جاتا
ترے لیے شہر بھر میں اب بھی میں زخم کھاؤں زباں زباں سے

❋ افتخار حسین اعوان......مظفر آباد، آزاد کشمیر
اس کی جیت سے ہوتی ہے خوشی مجھ کو
یہ جواز میرے پاس اپنی ہار کا تھا

❋ مسز بابر عباس......گلیانہ روڈ کھاریاں
کبھی جو عہدِ وفا مری جاں ترے مرے درمیان ٹوٹے
میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے زمیں پہ آسماں ٹوٹے
تری جدائی میں حوصلوں کی شکست دل پر عذاب ٹھہری
کہ جیسے منہ زور زلزلوں کی دھمک سے کوئی چٹان ٹوٹے

❋ رمضان پاشا......گلشن اقبال کراچی
اب خاک اڑ رہی ہے گلابوں کے شہر میں
وہ لُو چلی ہے اب کہ پتھر جھلس گئے

❋ بابر عباس......گلیانہ روڈ کھاریاں
تمہاری یاد میں پوشیدہ ہے سکونِ حیات
پیام آئے تمہارا ملے قرار مجھے
چلے بھی آؤ سکون لے کر میری دنیا میں
تمہاری یاد ستاتی ہے بار بار مجھے

❋ حسنین عباس، کمیل عباس......کھاریاں
کل رات بزم میں جو ملا گلبدن سا تھا
خوشبو سے اس کے لفظ تھے چہرہ چمن سا تھا
دیکھا اسے تو بھول پڑے اس کے خدوخال
پوچھا اسے تو چپ رہا، کم سخن سا تھا

❋ انیلہ رشید سیال......خیر پور (میرس) سندھ
آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

❋ سکندر اینڈ علی......پنجاب
میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آ کے میرے شہر سے چلا بھی گیا

❋ حسیب احمد چنائے......الگڈی
میرے غم کا ساتھی، میرے بخت کا ستارہ
تیری آرزو نے لوٹا، تری جستجو نے مارا
میں بساطِ زندگی پر غم آرزو کی بازی
کبھی ان کی شہ پہ جیتا، کبھی دل کی شہ پہ ہارا

❋ ادریس احمد خان......ناظم آباد
لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے
جانے کس لمحۂ تسخیر میں تو مجھ سے ملا
اب تو جس شے کو بھی چھو لوں تری مہکار آئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

❀ آفتاب احمد نصیر اشرفی......لاہور
اس کو بدل گیا نشۂ خود سپردگی
مانوس خد و خال مجھے یکسر لگے تھے

❀ شہلا خان......کوئٹہ
کون کہتا ہے یاد مت آؤ
تم تو جینا محال کرتے ہو

❀ عادل خان......ضلع چارسدہ
مانا کہ تو حسین ہے مگر اس قدر نہیں
جتنا کہ میری دید نے تجھ کو بنا دیا

❀ شانی گل ......لانڈھی، کراچی
ایک چہرے میں تو ممکن نہیں اتنے چہرے
کس سے کرتے جو کوئی عشق دوبارہ کرتے

❀ صفدر شیخ ......بہاولپور
وہ کوئی اپنے سوا ہو تو اس کا شکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے

❀ اسد صابر ......حیدرآباد
تُو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

❀ حسان رضا ......سکھر
قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

❀ حماد عظیم ......اورنگی ٹاؤن کراچی
ڈوبتا بھی ہے، ابھرتا بھی ہے، ہر سانس کے ساتھ
چاند کا اس کے گریبان سے ناتا کیا ہے

❀ نوشتہ گلزار ......سکھر
کوئی اور شے ہے وہ بے خبر جو شراب سے بھی ہے تیز تر
مرا مے کدہ کہیں اور ہے مرا ہم سبو کوئی اور ہے

❀ شاہد حسن زیدی ......لاہور
آرزوئیں رنج بن کر دل سے ٹوٹیں عمر بھر
بے طلب تو کوئی ایسے زخم کھا سکتا نہیں

❀ غنی داد ......کچلاک، بلوچستان
ہم عکس خونِ دل ہی مناتے پھرے مگر
وہ شخص آنسوؤں کی دھنک میں نکھر گیا

❀ جنید احمد ملک ......گلستان جوہر، کراچی
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

❀ فریدہ شاہ......لاڑکانہ
آنکھیں وہی ہیں آئینہ خانہ وہی مگر
حیرت یہ ہے کہ اب کوئی حیرت نہیں رہی

❀ فرحان رضوی ......پشاور
وہ میری رسائی میں نہیں ہے تو عجب کیا
حسرت بھی تو ہے عشق کا لہجہ اسے کہنا

❀ چوہدری مشتاق......ڈھڈیال
محبت کرنے والے لوگ خود کو توڑ لیتے ہیں
محبت کرنے والے دل مگر توڑا نہیں کرتے

❀ حافظ عاصم......مظفرگڑھ
تلاشِ منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ بھی عجیب دیکھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورتِ اعتبار بن کر

❀ آمنہ رفیق ......پنن وال، جہلم
لوگ کہتے ہیں کہ ہونٹوں پہ ہے مسکان میرے
کون جانے کہ تصور میں ہنسایا کس نے

❀ محمد عتیق ناز......گکھڑ منڈی
وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
میرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا

❀ یونس خان روغانی......خیرو ڈیرو سندھ
خزاں عزیز ہے ہم کو کہ اور اس کے سوا
بچا ہی کیا ہے ہمارے لیے تمہارے بعد

❀ ایم اعجاز......ضلع سرگودھا
آنکھوں سے نہ پڑھ لے کوئی چہرے کی اداسی
اس ڈر سے کبھی ذکر وہ میرا نہیں کرتے

کوپن
برائے
شمارہ
ستمبر
2013

محفلِ شعر وسخن

نام :---

پتا :---

اس کا بچپن بہت سے یتیم اور غریب بچوں کی طرح
کا تھا لیکن اس کے عزائم کسی جواں مرد فاتح کی طرح تھے جو
ئل سے یہ سوچ کر نکلا ہو کہ دنیا فتح کر لے گا۔
اس کے یہ عزائم اسے بھرپور مرد بنا بھی دیتے لیکن
جب لشکر ہی ساتھ چھوڑ جائے تو کسی کی بہادری بھی کیا
کرے۔ پہلے باپ مرگیا پھر ماں نے دوسری شادی کر لی،
دوسرے باپ کو اس کا وجود برا معلوم ہوا تو اس کی خالہ اسے
اٹھا کر اپنے گھر لے آئی۔ خالہ تو ماں جیسی ہوتی ہے۔ اسے

چادر

عائشہ فاطمہ

اگر مقدر سے چادر بڑی مل جائے تو پیروں کے چھوٹے ہونے کا خیال تک نہیں آتا مگر جب... چادر چھوٹی اور پیر باہر ہوں تو انسان اپنی کمتری کے احساس میں افسردہ رہتا ہے۔ اس کے اندر کی گھٹن بھی اکثر اسے بغاوت پر اکساتی رہتی تھی اور دل تھا کہ صحیح اور غلط کی الجھنوں میں گرفتار... مگر سوچوں کی رفتار نے ایک روز اسے اس گرداب سے نکال کر ایک سمت میں محوِ سفر کر دیا یہ اور بات کہ بند گلیوں میں کسی کو منزل نہیں ملا کرتی۔ بشرطیکہ انسان اپنی قوتِ ارادی کو بروئے کار لائے اور اندھیروں سے نکل جائے... بالآخر اس نے بھی یہی ہنر آزمایا اور صحیح سمت تلاش کر لی پھر چادر سے پیروں کی وہ جنگ بھی ختم ہوگئی جس نے اسے اندھیروں میں بھٹکا دیا تھا۔

آلام و مصائب میں گرفتار ایک لاوارث انسان کی کہانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماں سے بچھڑنے کا دکھ بھی نہیں ہوا۔ کبھی کبھی اس کی ماں بھی اس سے ملنے آجاتی تھی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں اپنے خاوند کے ساتھ کسی دوسرے ملک جارہی ہے۔ وہ چلی گئی۔ اسے زیادہ پروا بھی نہیں ہوئی۔ اس کا بچپن یہ سوچ کر بہل گیا کہ خالہ تو اس کے پاس ہے۔ خالہ کی کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذا وہ اکلوتا تھا۔ خالو بھی اس پر مہربان تھے۔ وہ اسکول جاتا رہا اور آٹھویں کلاس تک پہنچ گیا۔ خالہ اچھی خاصی تھیں کہ اچانک دو دن میں چٹ پٹ ہوگئیں۔ اس کے آنسو اس کی آنکھوں میں آکر ٹھہر گئے۔ اس کی ماں نے کہا تھا، مرد بچے روتے نہیں۔ اسے اس دن ماں بہت یاد آئی تھی۔ خالو کا سہارا بہت تھا۔ وہ اس کی دیکھ بھال کررہے تھے۔ پھر اس نے خالو کے رشتہ داروں کی زبانی عجیب عجیب باتیں سنیں۔ جو آتا یہ کہہ کر جاتا کہ عورت کے بغیر گھر کتنا سونا ہوجاتا ہے۔ وہ سوچتا تھا یہ کس عورت کی باتیں ہورہی ہیں۔ ایک دن یہ عقدہ بھی حل ہوگیا۔ کوئی عورت مددعلی کو مشورہ دے رہی تھی۔ ''مددعلی اب تم شادی کرلو۔'' وہ اب اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ شادی کے مفہوم سے واقف نہ ہو لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ شادی کے بعد ایک عورت گھر میں آجاتی ہے۔ اس دن کے بعد سے وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ آنے والی عورت کیسی ہوگی۔ خالہ کی طرح اس سے پیار کرے گی یا اسے مارا کرے گی۔ مارے گی کیسے خالو مجھے بچالیں گے بلکہ الٹا اسے ماریں گے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ دن آگیا جب خالو اپنی دلہن کو بیاہ کر اپنے گھر لے آئے۔ اسے حکم ملا کہ وہ اسے امی کہا کرے۔ یہ حکم اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے اندر کا فاتح جاگ اٹھا۔

''یہ میری امی نہیں ہیں۔ میں انہیں صرف خالہ کہہ سکتا ہوں۔''

''خالہ بھی تو امی ہوتی ہیں بیٹا۔ تم انہیں امی کہا کرو۔''

''نہیں خالہ بس خالہ ہوتی ہے اسے امی نہیں کہتے۔ میں بھی انہیں امی نہیں کہوں گا۔''

مددعلی کا منہ سرخ ہوگیا لیکن انہوں نے نئی آنے والی کو سمجھا دیا۔ ''بچہ ہے، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا۔ میں اسے سمجھالوں گا۔''

نئی آنے والی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور بات ختم ہوگئی لیکن ان کے باہر جاتے ہی وہ عورت شیرنی بن گئی تھی۔

''تو مجھے امی کہے گا تو اس گھر میں تجھے روٹی ملے گی ورنہ نہیں ملے گی۔ بھوکا ماردوں گی اگر میرے کہنے پر نہیں چلا تو۔''

''واہ! کیسے بھوکا ماردو گی۔ میرے خالو تمہیں ماریں گے۔''

''دیکھتی ہوں کون کس کو مارتا ہے۔''

اس عورت نے اندر جاکر اپنی ایک آستین پھاڑی اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ مددعلی کہیں دور نہیں گئے تھے کچھ دیر بعد ہی لوٹ آئے۔ وہ عورت انہیں دیکھتے ہی جھوٹ موٹ رونے لگی۔

''کیا ہوا زینب خاتون۔''

''مجھے ابھی میرے گھر چھوڑ کر آیئے۔''

''ابھی...... مگر کیوں؟''

''میں تمہارے بھانجے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

''تم تو میرے ساتھ رہنے آئی ہو۔''

''یہاں تم ہی تو نہیں ہو، وہ بھی تو رہتا ہے۔''

''میں نے تو تمہارے گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ میرا بھانجا بھی ہے۔''

''آپ نے بتا دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اتنا بدتمیز ہے۔ دیکھیے اس نے میرا کیا حال کیا ہے۔'' اس عورت نے پھٹی ہوئی آستین دکھائی۔ ''اور مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا ہے۔''

''ارے، اس نے یہ تمہارا کیا حال کردیا۔ وہ ایسا ہے تو نہیں۔''

''اس نے آپ کے سامنے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنی ماں نہیں سمجھتا۔''

''ہاں کہا تو تھا مگر یہ...... ٹھہرو، میں اسے بلا کر پوچھتا ہوں۔''

''ذرا سختی دکھایئے گا ورنہ آئندہ وہ اس سے برا سلوک کرے گا میرے ساتھ۔''

''تم دیکھو تو سہی۔''

مددعلی نے اسے بلایا اور پوچھا۔ اس نے ظاہر ہے انکار کردیا۔

''تم اب جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔'' مددعلی نے کہا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کردیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مددعلی نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ اپنی تکلیف کو بھول کر حیرت سے خالو کی طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی دن کے وقت آسمان پر تارے دیکھ لے۔

''یاد رکھو، اگر آئندہ تم نے اپنی ماں سے بدسلوکی کی تو اس سے برا حال کروں گا۔''

اس نے خالو کے الفاظ وہیں چھوڑے اور اپنے کمرے میں آگیا۔ کمرے میں وہ اپنے آنسو ساتھ نہیں لایا تھا۔ چند قطرے البتہ رخساروں پر ٹھہرے حالات کا جائزہ

لے رہے تھے۔ خالو نے آج تک مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اس عورت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے آتے ہی خالو کو میرے خلاف کردیا ہے۔ میں اتنی جلدی شکست قبول کرنے والا نہیں۔ مرد بچے رویا نہیں کرتے۔ وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ دیکھتا ہوں یہ عورت میرا کیا بگاڑتی ہے۔ میں اس عورت کو ''اے عورت'' کہہ کر پکارا کروں گا۔ یہ تو خالہ کہلانے کے لائق بھی نہیں۔

صبح ہوتے ہی جنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔ وہ عورت جو کہتی تھی وہ اس کے برعکس کرتا تھا۔ گھر کی چیزیں بھی بڑی تیزی سے ٹوٹنے لگی تھیں۔ جنگوں میں نقصان تو ہوتا ہی ہے۔ اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور شیشے کا جگ اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ایک دھماکا سا ہوا اور وہ اپنے کمرے میں مورچہ بند ہوگیا۔

اس گھر میں ایسی ہی گوریلا جنگ روز ہوتی تھی۔ کبھی پکڑا جاتا تھا کبھی صاف بچ نکلتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دشمن کو ناکوں چنے چبوادے گا۔ اسے شکست کا سامنا تو اس وقت ہوا جب دشمن کا سپہ سالار تبدیل ہوگیا۔ خالو نے کمانڈ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے ہتھیار پھینک دیے لیکن گرفتار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے فرار ہونے کی ٹھان لی اور ایک روز میدان چھوڑ گیا۔

کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی اور اس نے زمانے کے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ گھر چھوڑتے ہوئے اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں جائے گا اور کیا کرے گا۔ وہ کئی دن تک فٹ پاتھوں کی ننگی زمین پر سوتا رہا۔ پھر سمندر کی لہروں نے اسے ساحل کی طرف پھینک دیا۔ راستے سے گزرنے والے ایک بوڑھے بے اولاد جوڑے کو اس پر رحم آگیا۔ اسے پھر ایک گھر نصیب ہوگیا۔ اس بوڑھے جوڑے نے اس کی آنکھوں میں چھپے ہوئے خوابوں کو پڑھ لیا۔ وہ پھر اسکول جانے لگا۔

کچھ دنوں بعد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ غریب تھے۔ بوڑھا آدمی کسی اسکول میں کینٹین چلاتا ہے۔ اس کینٹین سے وہ بہت دولت کما سکتا تھا لیکن اسے دولت کمانی نہیں آتی تھی بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا تھا کہ انسان جتنی دولت کمائے گا قبر میں سانپ بن کر لپٹے گی۔ بوڑھی عورت اپنے خاوند کے بالکل برعکس تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ قناعت بزدلوں کا کھلونا ہے۔ زندگی تو یہ ہے کہ دنیا کی ہر نعمت اسے حاصل ہوجائے۔ اس تضادِ خیال کی بدولت دونوں کی اکثر لڑائی رہتی تھی۔ بوڑھی عورت اس سے اصرار کرتی تھی کہ وہ اسکول میں چیزیں دوگنی قیمت پر بیچا کرے، بچوں کو اسکول سے باہر تو جانے کی اجازت نہیں ہوتی وہ مجبور ہوں گے کہ تمہاری ہی کینٹین سے چیزیں خریدیں، بوڑھا کانوں کو ہاتھ لگاتا تھا کہ ایسی دولت کا کیا فائدہ کہ انسان گناہ اور ثواب کا فرق ہی بھول جائے۔

''نیک بخت! چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آدمی چادر چرانے کا اہتمام کرنے لگے۔'' بوڑھا کہتا اور غصے میں گھر سے باہر نکل جاتا۔

یہ وہ جملہ تھا جو بچے نے اس گھر میں آنے کے بعد سیکڑوں مرتبہ سنا تھا کیونکہ بوڑھا آدمی اسی جملے پر اپنی لڑائی ختم کرتا تھا۔

بچہ دل ہی دل میں اس جملے پر غور کرتا رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ پاؤں سکیڑنے سے بہتر ہے کہ آدمی چادر چرالے۔ پاؤں پھیلا کر سو تو سکے۔

بوڑھی عورت اس بچے کے آجانے کے بعد اپنے خواب اس کی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اس کی امیدوں کا مرکز بن گیا تھا۔

اس بچے کا نام نادر احمد تھا۔ اس نے گھر بدل لیا تھا لیکن نام اب بھی نادر احمد تھا۔

بوڑھی عورت نے اپنے خاوند سے لڑنا کم کردیا تھا۔ اب وہ نادر احمد کو سمجھانے میں وقت گزارنے لگی تھی۔

''تو میرے خاوند کی باتوں پر نہ جانا۔ دولت ہی سب کچھ ہے۔ دولت کے بغیر کوئی زندگی ہے؟ یہ کیا زندگی ہوئی کہ آج کھالیا تو کل کی خبر نہیں۔ اور کھایا بھی سوا جانوروں کی غذا۔''

بوڑھی عورت کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ نادر اس سے پوری طرح متفق تھا لیکن پھر بھی ایک دن اس نے اس بوڑھی عورت سے پوچھ ہی لیا۔

''ابا کہتے ہیں اچھے انسان بنو، دولت مند بننے کا کیا فائدہ۔''

''خوب دولت کماؤ۔ اچھے انسان خود بخود کہلاؤ گے۔ کتنے ہی اچھے انسان ہوجاؤ اگر تمہارے پاس دولت نہیں تو کوئی تمہیں اچھا نہیں کہے گا۔'' ماں نے جواب دیا۔

نادر کے دل میں یہ باتیں بیٹھتی گئیں کہ دولت ہی سب کچھ ہے۔ ابھی اس کی عمر اتنی نہیں تھی کہ دولت حاصل کرنے کے لیے ڈاکے مارتا یا چوری چکاری کے بارے میں سوچتا۔ اس نے سوچا کہ خوب دل لگا کر پڑھے۔ یہی وہ راستہ ہے جو اسے دولت کے دروازے تک پہنچا سکتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ دولت حاصل کرنے کے لیے پڑھ رہا تھا، علم حاصل کرنے کے لیے تعلیم وہ ہتھیار تھا جس سے وہ دولت کما سکتا تھا۔ ڈاکٹر بن گیا تو مریضوں کی جیب کاٹوں گا۔ انجینئر بن گیا تو ٹھیکے داروں سے رشوت لوں گا۔ وہ ڈاکٹر بن سکا نہ انجینئر۔ کہیں غربت آڑے آئی کہیں سخت مقابلہ۔ اس نے سید ھا سید ھا بی۔ اے کرلیا اور نوکری کی تلاش میں افسر نما دیواروں سے سر پھوڑنے لگا۔ اور وہ ٹھوکریں کھانے کے لیے چلتا رہا۔ ایسی ہی ایک ٹھوکر پر اس کی ملاقات ارشد سے ہوگئی جو کبھی اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ ارشد کی مدد سے اس نے انشورنس ایجنٹ کا کام شروع کردیا۔ کمپنی کی مدد سے اسے موٹر سائیکل بھی مل گئی۔ وہ موٹر سائیکل لے کر گھر پہنچا تو بوڑھی عورت کی آنکھیں ٹارچ کی روشنی کی طرح چمکیں لیکن فوراً ہی غریب کا دیا بن کر بجھ گئیں۔

”یہ کیا ٹھیکرا اٹھا لائے۔ میں نے تو خواب دیکھے تھے کہ تو ایک دن چم چم کرتی لمبی سی کار کا مالک بنے گا۔“

”وہ دن بھی آئے گا اماں۔ بس مجھے ایجنٹ سے مالک بننے دو۔“

”تو انشورنس کمپنی کا مالک بن جائے گا؟“

”آدمی کوشش کرے تو کیا نہیں ہوسکتا۔ میں نے بہت سے ایسے قصے سنے ہیں کہ کسی نے کسی دولت مند گھرانے میں شادی کرلی اور وہ بیٹھے بٹھائے دولت میں کھیلنے لگا۔“

”تو نے کوئی ایسی لڑکی دیکھ لی ہے کیا؟“

”لڑکی دیکھنا تمہارا کام ہے۔ میں نے تو ترکیب بتادی۔“

بوڑھی عورت کی آنکھیں پھر ٹارچ کی روشنی کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ اسی دن سے کوہ قاف کے سفر پر روانہ ہوگئی۔ اس نے ہر بڑے گھر میں جا جا کر نادر کے قصیدے پڑھے۔ اسے نادر کے بجائے نادر شاہ درانی بنا کر پیش کیا لیکن مخمل میں تو مخمل ہی کا پیوند لگتا ہے۔ وہ ٹاٹ تھا اور مخمل کی طلب کر رہا تھا۔ بڑھیا کے پیروں میں اتنی جان کہاں تھی۔ کچھ مایوسی کچھ جوڑوں کا درد۔ گری تو بستر سے اٹھنا بھول گئی۔ بہو تو آئی نہیں وہ خود رخصت ہوگئی۔ بڑے میاں نے شاید کوئی شرط رکھی تھی۔ بیوی کو رخصت ہوئے پورا مہینا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بھی بیوی کے پاس پہنچ گئے۔ نادر کی یہ پہلی بڑی کامیابی تھی۔ دونوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ مکان اس کا ہوگیا۔ انشورنس کمپنی کا مالک نہ ہوا تو کیا ہوا، ایک عدد مکان کا تو مالک ہوگیا۔

مالک بننے کا نشہ کچھ ہی دن طاری رہا۔ اس کی خواہشوں نے کمرے گنے تو صرف دو کمرے، ایک چھوٹا سا صحن، آگے راستہ بند۔ وہ پھر سڑک پر آگیا۔ چادر پھر چھوٹی پڑ گئی۔ اس کا کہنا تھا چادر چھوٹی پڑ جائے تو پاؤں نہ سکیڑو، بڑی چادر کا انتظام کرو۔ انتظام نہ ہوسکے تو چرالو۔ اسے پھر وہی خیال آیا کہ اگر کسی بڑے گھرانے میں شادی ہوجائے تو بیٹھے بٹھائے دولت مل جائے۔ یہ خیال یوں بھی آیا تھا کہ اس نے ایک فلم دیکھی تھی جس میں ہیرو ایک دولت مند لڑکی سے شادی کرلیتا ہے اور مزے کی زندگی گزارتا ہے۔ اب وہ ہر شام اس طرح سگنل پر جا کر کھڑا ہونے لگا جیسے فقیر کھڑے ہوتے ہیں۔ فقیر تو رکنے والی گاڑیوں کی طرف بھاگتے ہیں لیکن اس کی آنکھیں بھاگتی تھیں وہ خود کھڑا رہتا تھا۔ گاڑیوں میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے بھی اس کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔ چند روز بعد اسے اپنی حماقت پر خود ہنسی آگئی۔ اس نے سگنل پر کھڑا ہونا بند کردیا۔ کچھ دن پارکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ وہاں بھی کام نہ بنا۔ پھر ایک روز اس کی نظر اخبار کے ایک اشتہار پر پڑی۔ اخبار سونے کا عبارت چاندی کی بن گئی۔ خوابوں کا محل گھر کے آنگن میں آکر کھڑا ہوگیا۔ محل کے ایک دریچے میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ نظر ملی تو ہنسنے لگی۔ مہندی لگے ہاتھوں سے اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ اس کی طرف بھاگا لیکن نہ وہاں محل تھا نہ شہزادی۔ ہوا سے اخبار اڑ کر صحن تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اخبار اٹھایا اور دوبارہ نظر ڈالی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ چمکنے والی عبارت نظر کا دھوکا تو نہیں تھا۔ اس نے اشتہار کو دوبارہ پڑھا۔

”نہایت حسین دوشیزہ کے لیے ایک ایسے گریجویٹ لڑکے کا رشتہ درکار ہے جو لڑکی کے بیرون ملک اور اندرون ملک پھیلے ہوئے کاروبار کی نگرانی کرسکے۔ لڑکی کے والد کا انتقال ہوچکا ہے۔ تمام کاروبار کی مالک لڑکی ہے۔“

اشتہار کیا تھا، اس کے ہر خواب کی تعبیر تھا۔ کروڑوں کی جائداد، قبول صورت نہیں بلکہ نہایت حسین لڑکی اور شرط صرف گریجویٹ ہونا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ اشتہار صرف اس کے لیے دیا گیا ہے۔ یہ اشتہار کسی میرج بیورو کی طرف سے دیا گیا تھا۔ میرج بیورو کا پتا اور فون نمبر بھی درج کیا گیا تھا۔ مجھے فوراً فون کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا لیکن فوراً ہی ارادہ بدل بھی دیا۔ گھر میں فون تو تھا نہیں۔ وہ تیار ہوتا، باہر نکلتا۔ کسی جنرل اسٹور وغیرہ پر جا کر فون کرتا۔ پھر بیورو والے کہتے ملاقات کرنے آجائیے۔ جانا تو پھر بھی پڑتا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ براہ راست جا کر مل لے۔ اس سے ان لوگوں کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ میں بہت ضرورت مند ہوں۔

وہ اس طرح اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگا جیسے کمرے میں آگ لگ گئی ہو لیکن دراصل اسے کپڑوں کے انتخاب کی جلدی تھی۔ وہ الماری کھول کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے خیال میں اس کے پاس جو سب سے شاندار کپڑے تھے وہ نکالے اور جلدی جلدی تیار ہوکر خوشبو میں نہا گیا۔ احتیاطاً بی۔ اے کی ڈگری بھی ساتھ لے لی۔ اس کا بس چلتا تو مکان کے کاغذات بھی ساتھ لے لیتا۔

وہ صورت شکل کا بھی اچھا تھا۔ اکیلا تھا۔ اشتہار کی شرط کے مطابق بی۔ اے کی ڈگری بھی اس کے پاس تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ اس کا انتخاب ہوجائے گا۔ اس نے گھر کو تالا لگایا۔ بائیک اسٹارٹ کی اور اس پتے کی جانب روانہ ہوگیا جہاں میرج بیورو واقع تھا۔

علاقہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ دیکھی بھالی گلیاں تھیں۔ سیکڑوں بار یہاں سے گزر چکا تھا۔ کسی گھبراہٹ کے بغیر وہ اس شاندار بنگلے کے سامنے پہنچ گیا جہاں میرج بیورو کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس نے موٹر سائیکل کو سلیقے سے پارک کیا۔ جیب سے کنگھا نکال کر بالوں کو سلیقے سے جمایا اور بنگلے کے دروازے میں قدم رکھ دیا جہاں ایک پٹھان چوکیدار اسے یہ بتانے کے لیے کھڑا تھا کہ استقبالیہ کا دفتر کس طرف ہے۔ اس نے شیشے کا ایک بڑا دروازہ پار کیا اور کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ایک لڑکی کے سامنے پہنچ گیا جو اسے دیکھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

”کہیے جناب، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟“

”آپ کی جانب سے جو اشتہار دیا گیا ہے اسی سلسلے میں آیا ہوں۔“

”ہمارے بیورو کے تو ایک دن میں کئی اشتہار مختلف اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ آپ کس اشتہار کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟“

نادر نے اپنی جیب سے اخبار کا تراشہ نکالا اور اشتہار اس کے سامنے رکھ دیا۔ لڑکی نے ایک نظر اشتہار پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک لکیر ابھری۔ ایک مرتبہ پھر اس نے نادر کی طرف دیکھا۔

”آپ کو اسد صاحب سے ملنا ہوگا۔“

”مل لوں گا مگر معلوم تو ہو وہ بیٹھتے کہاں ہیں۔“

”بتا رہی ہوں۔ آپ تو بہت ہی جلدی میں ہیں۔ سیدھے ہاتھ پر جا کر دوسرے کمرے میں چلے جائیے۔ اس اشتہار کو اسد صاحب ہی ڈیل کریں گے۔“

”بہت شکریہ۔ میں ابھی ان سے ملتا ہوں۔“

نادر نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور سیدھے ہاتھ کی طرف چلتا ہوا دوسرے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ ”اسد درانی“ کی تختی بتا رہی تھی کہ اسے جہاں بھیجا گیا ہے یہ وہی کمرا ہے۔ اس نے ہلکی سی دستک دی اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ ایک صاحب بڑی سی میز پر جھکے ہوئے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ان کے سوا کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ نادر کو اپنی عقل مندی پر ناز ہونے لگا۔ اس نے سوچا، وہ اگر کچھ دیر کر دیتا تو یقیناً یہاں ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ اچھا ہوا وہ جلدی آگیا۔

دروازے کی آواز پر اسد صاحب نے چونک کر دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے نادر کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ نادر نے ان کی توجہ اشتہار کی طرف دلائی۔

”آپ یہ فارم بھر دیجیے۔“ انہوں نے ایک فارم نادر کی طرف بڑھا دیا۔ اس فارم کے ذریعے نادر کو اپنے بارے میں معلومات فراہم کرنا تھیں۔ نادر نے فارم کو پڑھنا شروع کیا اور ہر خانے میں مطلوبہ معلومات لکھنے لگا۔ وہ ابھی یہ فارم بھر ہی رہا تھا کہ وہ لڑکی اندر آئی جسے نادر استقبالیہ پر دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی اور پلیٹ میں مٹھائی رکھی ہوئی تھی۔

”کیا کوئی اور رشتہ ہوگیا جو آپ منہ میٹھا کرانے چلی آئیں۔“

”جی سر، وہ جو کروڑ پتی تاجر کی بیٹی کا ہم نے رشتہ کرایا تھا، ان لوگوں نے مٹھائی کا ٹوکرا بھجوایا ہے۔ میں نے سوچا آپ کا بھی منہ میٹھا کرادوں۔“

”ارے بھائی، میں زیادہ مٹھائی کھاتا نہیں ہوں اور آپ یہ دوسری مرتبہ میرا منہ میٹھا کرا رہی ہیں۔“

”کیا کریں سر۔ جب سے آپ آئے ہیں۔ رشتے بڑی جلدی جلدی ہورہے ہیں۔“

نادر ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور مرعوب ہورہا تھا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ بالکل درست جگہ پر آگیا ہے۔ یہ لوگ تو بڑے کامیاب رشتے کراتے ہیں۔ میرا کام بھی جلد ہی ہوجائے گا۔

”لیجیے صاحب، آپ بھی تو کھائیے۔“ لڑکی نے پلیٹ نادر کی طرف بڑھا دی۔

”جی شکریہ۔“ نادر نے کہا اور ایک گلاب جامن لے کر منہ میں رکھ لی۔

”آپ کی مٹھائی کا انتظار رہے گا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

”یہ تو آپ لوگوں کے اوپر ہے۔ جتنی جلدی مجھے موقع دیں۔“

”ارے اسد صاحب غضب کے آدمی ہیں۔ چٹکی بجاتے آپ کا رشتہ کرادیں گے۔“ لڑکی نے کہا اور ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

نادر نے جلدی جلدی فارم بھرا اور اسد صاحب کے حوالے کردیا۔ اسد صاحب نے ایک ایک اطلاع کو غور سے پڑھا اور ساتھ ساتھ سر بھی ہلاتے رہے۔ ایک دو مرتبہ ان کی زبان سے توصیفی کلمات بھی ادا ہوئے۔

”مبارک ہو۔ رجسٹریشن کے لیے ہم نے آپ کا فارم منظور کرلیا۔ اس میں کوئی ایسی اطلاع نہیں جس پر ہمیں اعتراض ہو۔“

”جی آپ کا شکریہ۔ بڑی مہربانی۔“

”رجسٹریشن فیس آپ کو ادا کرنی ہوگی۔“

”فیس کتنی دینی ہوگی اسد صاحب؟“

”زیادہ نہیں صرف دو ہزار روپے ہے۔ یہ بھی صرف آپ لوگوں کی خدمت کا نذرانہ ہے۔ اگر دفتر کے اخراجات نہ ہوں تو آپ لوگوں سے یہ بھی نہ لیں۔“

”نہیں، نہیں۔ یہ تو آپ لوگوں کا حق ہے۔“ نادر نے کہا اور ہزار کے دو نوٹ ان کی طرف بڑھا دیے۔

نادر کی حالت اس وقت یہ تھی کہ اگر اس کی جان بھی مانگی جاتی تو حاضر کردیتا۔ اس کا خواب آنکھوں کی سیج سے اتر کر اس کے سامنے آگیا تھا۔ دولت کمانے کے لیے کچھ دولت تو خرچ کرنی ہی پڑتی ہے، اس نے سوچا۔ دو ہزار روپے وصول کرنے کے بعد اسد صاحب اس سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔

”جناب، آپ نے جو کوائف درج کیے ہیں، کیسے یقین کیا جائے کہ یہ درست ہیں مثلاً آپ کنوارے ہیں یا شادی شدہ۔ یہ کیسے معلوم ہو؟“

”میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں۔ ویسے تحقیق آپ کا کام ہے۔ آپ تحقیق کریں۔“

”ہاں تحقیق تو ضروری ہے، آپ کو یہی بتانا مقصود تھا کہ تحقیق کرنے کی ہم نے پانچ سو روپے مزید فیس مقرر کی ہے۔ آپ پانچ سو روپے عنایت فرمادیں تاکہ دونوں رقموں کی رسید ایک ساتھ کٹ جائے۔ آپ بھی مطمئن ہم بھی مطمئن۔“

نادر احمد نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو کا نوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

”چلیے یہ مرحلہ تو طے ہوا۔ رسید ابھی آپ کو مل جاتی ہے۔“

”اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”کروڑ پتی بننے کی تیاری۔“ اسد صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اگر یہ رشتہ طے ہوگیا تو میں آپ کو الگ سے بھی انعام دوں گا۔“ نادر نے ذرا آگے بڑھ کر تقریباً سرگوشی میں کہا۔

”رشوت حرام ہے برخوردار۔ ویسے آپ اپنی خوشی سے کچھ دینا چاہیں گے تو میں انکار بھی نہیں کروں گا۔“

”میں آپ کو آدھی دولت دینے کو تیار ہوں۔ بس آپ یہ رشتہ کرادیں۔“

”بس سمجھو یہ رشتہ ہوگیا۔ آپ ایسا کیجیے کہ ایک اچھی سی تصویر مجھے پہنچا دیجیے۔ میں ہر ایک سے تصویر نہیں مانگتا بس آپ سے مانگ رہا ہوں۔“

نادر نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنی قسمت پر ناز کرتا ہوا اٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اسد صاحب سے جو بات ہوئی ہے اس کی روشنی میں وہ یقیناً خاص دلچسپی لیں گے اور بات آگے بڑھے گی۔

وہ گھر جانے کے بجائے تصویر کھنچوانے کے لیے ایک اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ یہ شہر کا مہنگا ترین اسٹوڈیو تھا لیکن اس کے لیے مشہور تھا کہ چہرہ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس نے اسٹوڈیو میں بتا بھی دیا کہ وہ یہ تصویر لڑکی والوں کے گھر بھیجنے کے لیے بنوا رہا ہے۔ تصویر جلدی وصول کرنے کے لیے اس نے ارجنٹ فیس دے دی۔ اس کے باوجود اسے دو دن انتظار کرنا تھا۔ یہ انتظار اس نے یہ سوچ کر گوارا کرلیا کہ ابھی تو فارم بھرا ہے۔ بات آگے بڑھنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ تصویر کی ضرورت تو اس کے بعد ہی پڑے گی۔

یہ دو دن اس نے کروڑ پتی بننے کے خواب میں گزار دیے۔ ایک انجانی لڑکی ہر وقت اس کے ساتھ رہی۔ اپنے بستر پر اس کا لمس محسوس کرتا تھا۔ موٹر سائیکل پر بیٹھتا تو یہ فرض کرلیتا کہ وہ لڑکی اس کے پیچھے بیٹھی ہے۔ پھر فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیتا تھا۔ وہ کیوں موٹر سائیکل پر بیٹھے گی۔ وہ آئے گی تو شاندار گاڑی میں میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے گی۔

دو دن بعد اس نے تصویر لی اور شادی دفتر پہنچ گیا۔ تصویر دیکھ کر اسد صاحب پھڑک اٹھے۔ ”تصویر ایسی ہے کہ لڑکی والے منع کر ہی نہیں سکتے۔“ انہوں نے لوید دی۔ اس کا فارم نکلوایا اور تصویر اس کے ساتھ لگا دی۔

”آپ نے یہ فارم ابھی تک بھجوایا نہیں۔“

”بھئی تصویر اس کے ساتھ لگے گی تو جائے گا۔“

”آپ یہ فارم تو بھجوا دیتے۔ تصویر بعد میں چلی جاتی۔“

”یہ ہمارا کام ہے۔ ہمیں معلوم ہے کس طرح اور کس وقت کرنا ہے۔ آپ اس میں دخل نہ دیں۔“

وہ دیکھ رہا تھا کہ اسد صاحب کے تیور اس وقت کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ وہ خاموش ہوگیا لیکن بے چینی تھی کہ اسے خاموش نہیں رہنے دے رہی تھی۔

”اسد صاحب، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں لڑکی کو ایک نظر دیکھ لوں؟“

”کمال کررہے ہیں آپ۔ اس لڑکی کے لیے پچاس سے زیادہ فارم آچکے ہیں۔ اب کیا وہ پچاس غیر مردوں کے سامنے آئے گی۔ جس کا انتخاب ہوجائے گا وہ صرف اس کے سامنے آئے گی۔“

”میں فوٹو ہی دیکھ لیتا۔“

”ہاں یہ ہوسکتا ہے لیکن یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کو ہمارے شعبۂ خواتین سے رابطہ کرنا ہوگا۔ تصویر وہیں ہوگی۔“

اسد صاحب نے اسے شعبۂ خواتین میں بھیج دیا۔ یہاں کی انچارج مس دردانہ تھیں۔ اسے فوٹو دیکھنے کے پانچ سو روپے مزید دینے پڑے۔ مس دردانہ نے فیس وصول کرتے ہی البم نکالی اور ایک تصویر اس کے سامنے رکھ دی۔ تصویر کیا تھی حسن کا مجموعہ تھی۔ اس کا جی مچلنے لگا۔ جو حسن وہ دیکھ رہا ہے اپنے دوستوں کو بھی دکھائے۔ انہیں بھی تو معلوم ہو کہ میں دولت کے ساتھ ساتھ حسن کی کس دیوی کا مالک بننے والا ہوں۔

”میں ایک دن کے لیے یہ تصویر اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں؟“

”جی نہیں۔ یہ ہمارا اصول نہیں۔“

”بس دو چار دوستوں کو دکھا کر آپ کو واپس کردوں گا۔“

”مسٹر، ذرا ہوش میں رہ کر بات کیجیے۔ یہ کوئی تماشا ہورہا ہے۔“

”میں اگر دوستوں کو یہاں بلا کر تصویر دکھا دوں؟“

”آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ بات آپ کی سمجھ ہی میں نہیں آرہی ہے۔ ہم تصویر نہ تو دے سکتے ہیں نہ آپ کے علاوہ کسی اور کو دکھا سکتے ہیں۔“

نادر نے بھی سوچا کہ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی ہے۔ چند دنوں کی تو بات ہے۔ وہ میری بیوی ہوگی۔ جی بھر کے دوستوں کو دکھالوں گا، جلالوں گا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے فوٹو کو غور سے دیکھا۔ ایک ایک نقش ذہن میں اتار لیا۔

فوٹو دیکھ لینے کے بعد تو اس کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ اب تو ایک پل بھی قرار نہیں آرہا تھا۔ اس نے شادی دفتر والوں کو فون کرنے کی کوشش کی لیکن ان لوگوں نے بڑی بدتمیزی سے جواب دیا کہ آئندہ فون کرنے یا یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ جب ہمیں رابطہ کرنا ہوگا تو ہم خود رابطہ کرلیں گے۔ وہ خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔ اب اس کے خواب تھے اور وہ تھا۔

پریشانی یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک روز شادی دفتر سے اس کے نام خط آگیا۔ تفصیل درج نہیں تھی بس اتنا لکھا تھا کہ فوراً آکر ملو۔

خط ملنے کے بعد اس نے یہ غور کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ کن کپڑوں میں ہے۔ جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح اٹھ گیا۔

”مبارک ہو۔“ اسد صاحب نے مبارک باد دی۔ ”لڑکی کے والدین نے آپ کو انٹرویو کے لیے طلب کیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے انہوں نے مجھے منتخب کرلیا ہے۔“

”یہی سمجھیے نادر صاحب۔ اب آپ کے اچھے دن آنے والے ہیں۔“

”مجھے انٹرویو کے لیے کب اور کہاں جانا ہے؟“

”یہ سب باتیں آپ کو مس فرحت بتائیں گی۔ انٹرویو فیس بھی آپ کو وہیں جمع کرانی ہوگی۔“

”میں نے رجسٹریشن فیس جمع کرادی تھی پھر......“

”وہ رجسٹریشن فیس تھی۔ اب آپ کا انٹرویو ہورہا ہے۔ بات کو یہاں تک پہنچانے میں کیا ہماری محنت نہیں ہے۔“

”کتنی فیس ہوگی؟“ نادر نے مردہ دلی سے کہا۔

”زیادہ نہیں صرف ایک ہزار۔ اور یہ بھی بتادوں کہ اس کے بعد ہم مزید کچھ طلب نہیں کریں گے۔ یہ آخری مرحلہ ہے۔“

”اس وقت تو ایک ہزار میرے پاس نہیں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ جب آپ فیس جمع کرادیں گے، انٹرویو اس کے بعد ہوگا۔ ہم تاریخ آگے بڑھا دیں گے۔“

نادر نے اس مرحلے پر لڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ جتنے پیسے جمع کرا چکا تھا وہ سب کے ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔

اس نے دوسرے دن جا کر یہ ہزار روپے بھی جمع کرادیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کل صبح دس بجے آپ یہاں پہنچ جایئے گا۔ یہاں سے آپ کو دفتر کی گاڑی لڑکی والوں کے گھر تک پہنچا دے گی۔"

گھر آنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اپنا انٹرویو خود لینے لگا۔ اس کے خیال میں جو سوالات پوچھے جا سکتے تھے ایک ایک کر کے دہراتا رہا اور ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا رہا۔ کبھی ایک جواب دیتا کبھی لفظوں میں ردوبدل کر دیتا۔ رات کو بہت دیر سے سویا تھا لیکن صبح ہوتے ہی اٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی تیار ہوا اور دس بجے سے پہلے ہی شادی دفتر پہنچ گیا۔

وہ اس دھن میں مگن چلا گیا تھا کہ صرف اسی کو بلایا گیا ہوگا لیکن دفتر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کچھ نہیں تو بارہ امیدوار کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ قرعۂ فال کس خوش نصیب کے نام نکلتا ہے۔ اس کی خوشی کافور ہو گئی۔ بس ایک امید تھی جو اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھی اور وہ یہ کہ وہ اسد صاحب کو آدھی دولت دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔ وہ یقیناً میرے حق میں فیصلہ کرائیں گے۔ اتنی دیر میں چپراسی آیا اور سب کو وین میں بیٹھنے کا حکم سنایا۔

"میرے پاس موٹر سائیکل ہے۔" نادر نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہا ہو میرے پاس جہاز ہے۔

"کوئی اپنی سواری پر نہیں جائے گا۔ سب لوگ ایک ساتھ جائیں گے۔ آپ اپنی موٹر سائیکل یہیں کھڑی کر جائیں۔"

اس موقع پر الجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے سر جھکایا اور دوسرے امیدواروں کے ہمراہ "وین" میں بیٹھ گیا۔

یہ وین کوٹھی کے شاندار ترین گیٹ میں داخل ہو کر رک گئی۔ ایک ایک کر کے سب اتر گئے اور لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اسد صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے۔ موقع دیکھ کر وہ اس کے پاس آئے اور سرگوشی کی۔ "میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے۔ فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوگا۔"

امیدوار ایک ایک کر کے اندر جانے لگے۔ نادر کی باری آئی تو وہ بھی اندر گیا۔ دوسرے کچھ بھی سوچ رہے ہوں لیکن وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہی وہ کوٹھی ہے جس میں آئندہ مجھے رہنا ہوگا۔ وہ ایک ایک کمرے کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ایک آدمی کی مدد سے وہ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں اس کا انٹرویو ہونا تھا۔ یہاں ایک بوڑھی مگر فیشن ایبل عورت بیٹھی تھی۔ اس نے نادر کو دیکھا اور اس کا فارم نکال لیا۔

"تشریف رکھیے۔"

"جی شکریہ۔"

"جس لڑکی سے آپ شادی کرنے آئے ہیں یہ... اس کی والدہ ہوں۔"

نادر کو اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کی ہو... والی ساس اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ سلام کرنا بھول... تھا۔ وہ اٹھا اور ان کی خدمت میں سلام عرض کر کے دوبا... بیٹھ گیا۔

اس عورت نے وہ تمام باتیں دوبارہ سے پو... شروع کیں جو وہ پہلے ہی فارم میں لکھ چکا تھا۔ یوں لگتا... جیسے وہ نادر کے حافظے کا امتحان لے رہی ہوں۔

یہ ایک رسمی سا انٹرویو تھا جو بہت جلد ختم بھی ہو گیا۔

"میں امید کرتی ہوں کہ آپ سے دوبارہ ملاقا... ضرور ہوگی۔"

اس کے علاوہ اس بوڑھی عورت نے کچھ نہیں کہا لیکن... اس ایک جملے میں پسندیدگی کی پوری داستان چھپی ہوئی تھی... وہ اگر انہیں پسند نہ آیا ہوتا تو دوبارہ ملاقات کی خواہش... اظہار کیوں کرتیں۔

تمام امیدواروں کو وین میں بٹھایا گیا اور دفتر پہنچا... گیا۔ یہاں پہنچ کر اسد صاحب نے اسے بتایا کہ ایک ...ے بعد خوش خبری سنا دی جائے گی۔ جو امیدوار کامیاب ہوگا اس کے نام خط لکھ دیا جائے گا۔

اسے یقین تھا کہ اسد صاحب اسی کے نام خط لکھیں گے۔ کامیابی کے اسی نشے میں سرشار وہ گھر چلا آیا۔ اب اسے انتظار کا ایک ہفتہ گزارنا تھا۔ یہ ایک ہفتہ پندرہ دن میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے نام کوئی خط نہیں آیا۔ اسے یقین تھا کہ خط ضرور لکھا گیا ہوگا۔ کہیں ڈاک میں گم تو نہیں ہو گیا... پہلے اس نے سوچا فون کر کے معلوم کرے لیکن پھر وہ کس... خیال کے تحت بذاتِ خود شادی دفتر پہنچ گیا۔ دفتر پہنچتے ہی... اسد درانی سے ملا۔

"اسد صاحب، کیا ہوا میرے معاملے کا۔ کوئی... نہیں ملا مجھے۔"

"ہمارا اصول یہ نہیں کہ معذرت کا خط لکھیں اور خوش... خبری کوئی تھی نہیں۔ اس لیے خط لکھا ہی نہیں گیا۔ لڑکی والوں نے کسی اور کا انتخاب کر لیا۔"

"آپ لوگ یہاں بیٹھ کر فراڈ کر رہے ہیں۔" نادر نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔

"اس میں فراڈ کہاں سے آ گیا۔ ہر کام آپ کے سامنے ہوا ہے۔ امیدوار آپ کے سامنے تھے۔ یہ لڑکی والوں کی مرضی کہ وہ کس کا انتخاب کرتے ہیں۔"

یہ تو نادر کا غصہ تھا جو ابل رہا تھا ورنہ بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ شادی دفتر والے دونوں پارٹیوں کو ملوا دیتے ہیں۔ دوسری پارٹی کی مرضی کہ وہ کس امیدوار کا انتخاب کرتے ہیں۔

نادر کو چپ ہونا پڑا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح عمارت سے باہر نکل آیا۔

وہ چھوٹی چادر میں پاؤں سکیڑنے کے بجائے بڑی چادر چرانے کا قائل تھا لیکن یہ چوری اسے مہنگی پڑ گئی تھی۔ جو کچھ جیب میں تھا وہ بھی چلا گیا تھا۔ دشمن سامنے نہیں تھا، لڑتا بھی تو کس سے لڑتا۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہتھیار پھینک کر تیاری میں مشغول ہو گیا۔

شاید یہ تیاری بھی اسے مہنگی پڑ جاتی لیکن ہوا یہ کہ اسے ایک دوست کی معرفت ملازمت مل گئی۔ وہ انشورنس ایجنٹ تو تھا ہی اب اسے انشورنس کمپنی میں باقاعدہ ملازمت مل گئی۔

یہیں اس کی ملاقات سلوی سے ہوئی۔

سلوی اس دفتر میں سیلز منیجر تھی۔ یہ کوئی ایسا بڑا عہدہ نہیں ہوتا لیکن اس کے ٹھاٹ باٹ ایسے تھے کہ کمپنی کے مالکان کے بھی کیا ہوں گے۔ لوگ کہتے تھے وہ شوقیہ ملازمت کرتی ہے ورنہ وہ ارب پتی ماں کی اکلوتی بیٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتی۔ کوئی مر بھی رہا ہو تو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ دولت کا نشہ کیا کم ہوتا ہے کہ حسن کا نشہ بھی تھا۔

اسے دیکھتے ہی نادر کے اندر کا سپاہی جاگ اٹھا۔ چادر چرانے کے خیال نے اسے بے چین کر دیا لیکن یہ چادر اتنی بلندی پر لٹکی ہوئی تھی کہ، ہاتھ پھیلاؤں تو جاتا نہیں پیمانے تک، والا معاملہ تھا۔ وہ سیلز منیجر تھی، حسین تھی، دولت مند اور مغرور بھی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کر سکتا تھا کہ اسے روز دیکھ لے۔ یہ فریضہ وہ اچھی طرح انجام دے رہا تھا۔ دفتر کے لوگ سلوی کو دیکھ کر نظریں جھکا لیتے تھے لیکن وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے زیادہ غیر معمولی بات یہ تھی کہ سلوی نے ابھی تک اسے اس حرکت پر ٹوکا نہیں تھا بلکہ نادر کی خوش فہمی نے تو اس کے کان میں یہ کہہ دیا تھا کہ سلوی اس حرکت کو پسند کر رہی ہے۔ وہ اسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا لیکن یہ وہم اس وقت حقیقت بن گیا جب وہ ایک دن چھٹی کے بعد دفتر سے نکلا اور اس کی موٹر سائیکل نے چلنے سے انکار کر دیا۔ وہ پریشان کھڑا تھا اور بالآخر طے کر چکا تھا کہ موٹر سائیکل یہیں چھوڑ کر بس سے گھر چلا جائے گا یا موٹر سائیکل گھسیٹتا ہوا کسی مکینک کے پاس جائے گا۔ اچانک سلوی کی گاڑی اس کے قریب آ کر رک گئی۔

"کیا ہوا، پرانی موٹر سائیکل نے جواب دے دیا؟"

"جی میڈم، کچھ گڑبڑ کر رہی ہے، ابھی اسٹارٹ ہو جائے گی۔"

"آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔ بائیک یہیں چھوڑ دو۔ کل آرام سے کسی مکینک کو بلا کر دکھا دینا۔"

"یہی میں سوچ رہا ہوں لیکن میڈم آپ جائیں، میں بس سے چلا جاؤں گا۔"

"جب گاڑی ہے تو بس سے کیوں!"

سلوی جیسی مغرور لڑکی نے اس کے لیے گاڑی روکی تھی اور اب گھر چھوڑنے کی پیشکش کر رہی تھی۔ یہ ایسی انہونی تھی کہ نادر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ پچھلے دروازے کی طرف بڑھا لیکن اتنی دیر میں سلوی اگلا دروازہ کھول چکی تھی۔ وہ جھجکتے ہوئے اس کے برابر بیٹھ گیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد سلوی نے اس کے بارے میں جاننے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے؟ اس کے ماں باپ کس معیار کے لوگ ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ چادر پھیلتی دیکھی تو چرانے کے ڈھنگ بھی آ گئے۔ اس نے جھوٹ کا سہارا لیا مثلاً یہی کہ اس کے والد بہت دولت مند تھے۔ بچپن بہت عشرت میں گزرا۔ پھر کاروبار میں پے در پے نقصانات ہوئے۔ پھر والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ اب وہ اکیلا ہے، یہاں تک کہنے کے بعد اس نے فیصلہ کن حملہ کیا۔

"میری یہ غربت ہمیشہ نہیں رہے گی۔ میں ایک دن دنیا کو دولت مند بن کر دکھاؤں گا۔"

"آپ کے یہ عزائم ہیں تو یقیناً آپ کامیاب ہوں گے۔ مجھے آپ کی یہ بات اچھی لگی۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو قناعت کے بوجھ تلے دبے ایک ہی حالت میں زندہ رہتے ہیں۔ انسان کو ترقی کرتے رہنا چاہیے۔"

"جی میڈم! مجھے دولت کی طاقت کا احساس ہے۔ میں یہ طاقت حاصل کر کے رہوں گا۔"

اتنی دیر میں وہ جگہ آ گئی جہاں اسے اترنا تھا۔ سلوی نے گاڑی روکی اور وہ نیچے اتر گیا لیکن دراصل وہ اترا نہیں تھا ایک زینہ اوپر چڑھ گیا تھا۔ اس نے سلوی سے وہ بات کہہ دی تھی جسے سن کر وہ اس کے بارے میں سوچنے پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجبور ہوئی ہوگی۔ عورتیں ان مردوں کو پسند کرتی ہیں جو ترقی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اگلے دن اس کی موٹر سائیکل مکینک لے گیا۔ وہ پھر پیدل ہوگیا۔ سلویٰ نے اسے پھر لفٹ دے دی۔ اب اس کے ذہن کے کارخانے میں ایک اور ترکیب ڈھل گئی۔ اس نے سلویٰ سے کہا کہ موٹر سائیکل میں کوئی ایسی خرابی ہوگئی ہے کہ اگلے چار دنوں تک مکینک کے پاس رہے گی۔ اسے معلوم تھا کہ کیا جواب ملے گا۔

”جب تک موٹر سائیکل بن کر نہیں آجاتی آپ میرے ساتھ جائیں گے۔“

یہ چار دن نادر کے لیے بہت تھے۔ وہ اس سے بے تکلف ہوگیا۔ آخر چوتھے دن اس نے پیشکش کردی۔

”میری خواہش ہے، آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں۔“

”کہاں کھلاؤ گے مجھے کھانا؟“

”آپ کے شایان شان کسی بھی ہوٹل میں۔“

”میرے شایان شان ہوٹل کے اخراجات جانتے ہو؟“

”میرے پورے مہینے کی تنخواہ لگ جائے گی اور کیا ہوگا۔“

”تم اپنی تنخواہ بچالو۔ کھانا میں کھلادوں گی۔“

”کیا آپ کے پیسے خرچ نہیں ہوں گے؟“

”میری دولت کا حساب جانتے ہو؟ سمندر سے قطرہ نکل جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ زبردستی اسے ایک ہوٹل میں لے گئی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر نادر کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہر خواب کی تعبیر اس کے سامنے تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اتنے بڑے ہوٹل میں آیا تھا اور وہ بھی سلویٰ کے ساتھ۔ اب وہ اس ملاقات کو ایک افسر اور ماتحت کی ملاقات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسے اب احتیاط کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کھانے کے دوران ایک موقعے پر اس نے سلویٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سلویٰ بالکل ایک عام لڑکی کی طرح مسکرا کر رہ گئی تھی۔

پتھر خود بخود پگھل گیا تھا۔ اس نے تو صرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

وہ اس رات نشے میں گھر آیا تھا۔ وہی نشہ جو اس نے اس دن محسوس کیا تھا جب شادی کا اشتہار اخبار میں دیکھا تھا۔ خواب میں بھی اس نے ایک محل دیکھا جس کے ایک دریچے میں ایک لڑکی بیٹھی اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔

اب سلویٰ اس کے لیے نہ معما تھی نہ پہیلی۔ ایک ایسی لڑکی تھی جو خود اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کے لیے شاپنگ کرتی تھی۔ اس کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل جاتی تھی۔ دفتر میں البتہ وہ اس کی سخت گیر افسر تھی۔

نادر نے اس سے بہت کچھ کہہ دیا تھا لیکن کچھ باتیں اب بھی ایسی تھیں جو اس نے نہیں کہی تھیں۔ ان میں سے ایک بات سلویٰ نے خود کہہ دی۔

”اب وقت آگیا ہے نادر کہ میں تمہیں اپنی امی سے ملواؤں۔“

وہ اس کی گاڑی میں اس کی شاندار کوٹھی کے سامنے پہنچا تو دربان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک اور ملازم بھاگا ہوا آیا، اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ نادر نے ایسی کوٹھیاں صرف باہر سے دیکھی تھیں۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی بڑی کوٹھی میں صرف ماں بیٹیاں رہتی تھیں۔

وہ نادر کو لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”میں ابھی ممی کو تمہاری آمد کی اطلاع دیتی ہوں۔“

”سنو!“ نادر نے اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے زندگی میں پہلی بار ڈر لگ رہا ہے۔“

”کیوں بھئی۔ یہاں رکھا ہوا شیر اصلی نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھو۔“

”شیر تو اصلی نہیں ہے، تمہاری ممی تو اصلی ہیں۔ مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے۔ نہ جانے مجھے دیکھ کر ان کا ردِعمل کیا ہو۔“

”فکر مت کرو۔ میں تمہارے بارے میں انہیں سب کچھ بتا چکی ہوں بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ان کی خواہش پر ہی تمہیں یہاں لے کر آئی ہوں۔“ اس نے کہا اور نادر کو اس عجائب گھر میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ نادر کبھی اپنے کپڑوں کی طرف دیکھتا تھا جو ہرگز اس ڈرائنگ روم کے قابل نہیں تھے، کبھی ڈرائنگ روم میں رکھی قیمتی اشیا کی طرف دیکھتا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ ایک مرتبہ جب وہ ڈرائنگ روم کے دروازے کے سامنے سے گزرا تو سلویٰ آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک عورت تھی جو یقیناً اس کی ماں ہوں گی۔ وہ ایک صوفے پر جم کر بیٹھ گیا۔ وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس نے انہیں دیکھ لیا ہے۔ ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگا۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اندر آیا ہے تو اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ آنکھیں ملتے ہی اس کے پاؤں بے جان ہوگئے۔ اس کے سامنے سلویٰ کی ماں نہیں وہ عورت کھڑی تھی جس نے کروڑ پتی لڑکی سے شادی کے لیے اس کا انٹرویو لیا تھا اور کہا تھا، وہ اس لڑکی کی والدہ ہے۔ اس وقت مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ انہیں نہ پہچانے۔ ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ وہ بھی اسے پہچان نہیں سکی ہیں۔

”ممی یہی وہ نادر ہیں جن کا میں آپ سے ذکر کرتی رہتی تھی۔“ سلویٰ نے تعارف کرایا۔

”اور میں اس لڑکی کی والدہ ہوں۔“

یہ وہی جملہ تھا جو انہوں نے بہت دن پہلے ادا کیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اسے پہچان چکی ہیں۔

”بیٹھیے نا، کھڑے کیوں ہیں۔“

وہ بیٹھ گیا لیکن اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ ایک چور دل کے اندر شور مچا رہا تھا کہ بس اب بھانڈا پھوٹنے والا ہے۔

”سلویٰ تو کہہ رہی تھی آپ بہت بولڈ ہیں مگر آپ تو گھبرا رہے ہیں۔“

”یہ گھبراہٹ فطری ہے۔ میں آپ سے پہلی مرتبہ جو مل رہا ہوں۔“

”آپ بھول رہے ہیں، ہم آپ سے پہلے بھی ایک مرتبہ مل چکے ہیں۔“

”مجھے یاد نہیں۔“ نادر نے سلویٰ کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے کہا۔

”آپ شاید شادی کے لیے انٹرویو دینے آئے تھے۔“

نادر کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ سلویٰ اپنے دل میں کیا سوچے گی کہ میں شادی کے لیے شادی دفتروں کے چکر لگاتا رہا ہوں۔

”سنا ہے آپ نے میرج بیورو میں جا کر بہت شور مچایا تھا؟“

”شور تو مچانا ہی تھا۔ جس لڑکی کا وجود ہی نہیں تھا اس کے لیے اشتہار دیا گیا تھا۔“

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وجود نہیں تھا۔ وہ لڑکی سلویٰ بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”جہاں تک مجھے یاد آتا ہے اس لڑکی کا نام کچھ اور تھا۔“

”ناموں میں کیا رکھا ہے۔“

”وہ کوٹھی بھی آپ کی نہیں تھی جہاں آپ نے انٹرویو لیے تھے۔“

”اوہ! تو آپ نے پوری معلومات کی تھی۔ آپ واقعی بولڈ ہیں۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں، ایک لڑکی کے لیے آپ کتنی مرتبہ انٹرویو برپا کر چکی ہیں۔“

”یہ ہمارا بزنس ہے۔ اس پر آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔“

”فراڈ کا نام بزنس نہیں ہوتا۔“

”ایسا ہم ہمیشہ نہیں کرتے۔ کتنے ہی لوگوں کی ہم نے شادیاں کرائی ہیں۔“

”ایسی ہی شادیاں کرائی ہوں گی کہ دکھائی سلویٰ، شادی کرادی کسی اور سے۔“

”ایسا تو بعض گھرانوں میں بھی ہو جاتا ہے۔“

سلویٰ اس بحث سے الجھنے لگی تھی۔ دونوں کی بحث تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ نادر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ سلویٰ کی امی کا کاروبار کیا ہے۔ ان کے ایک نہیں کئی شادی دفتر ہوں گے اور ایسے ہی فراڈ کر کر کے دولت جمع کرتی ہوں گی۔ سلویٰ ان کا بہترین ہتھیار ہوگی۔ ممکن ہے کرائے پر دوسری لڑکیاں بھی رکھی ہوں۔ اسی لیے وہ طویل بحث کے حق میں تھا۔ سلویٰ بار بار اپنی ماں کو ٹوک رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ یہ بحث کہیں تلخی میں تبدیل نہ ہو جائے۔

”یہ بحث بہت ضروری ہے۔“ سلویٰ کی ماں نے کہا۔ ”جب تک یہ ہمارے کاروبار کو دل سے قبول نہیں کریں گے اس وقت تک ہمارا کاروبار سنبھالیں گے کیسے۔ ہمیں تو ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ہمارا ساتھ دے سکے۔“

”یہ سب کچھ سمجھ گئے ہیں۔ باقی میں سمجھا لوں گی۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ترقی کے خواہاں رہتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔“

اسی وقت ملازم نے آکر اطلاع دی کہ چائے لگ گئی ہے۔ انہیں اٹھنا پڑا۔ چائے کی میز پر آنے کے بعد نادر توقع کر رہا تھا کہ بحث پھر چھڑ جائے گی لیکن سلویٰ کی ماں اب نادر کے قصیدے پڑھنے میں زبان و بیان کا زور دکھا رہی تھیں۔ اس قصیدے میں سلویٰ کا ذکر بار بار آرہا تھا کہ اس نے ایسے باعزم نوجوان سے ملاقات کا موقع فراہم کیا۔

اسے رخصت بھی اس شرط کے ساتھ کیا گیا کہ وہ پھر ملاقات کرے گا۔

دوسرے دن وہ دفتر پہنچا تو سلویٰ نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلوالیا۔

”تمہیں میری امی سے ملنا کیسا لگا؟“

”بہت اچھا۔“

”بحث تو آپ بہت تند و تیز کر رہے تھے۔“

”اس لیے کہ میں ان کے ہاتھوں نشانہ بن چکا تھا۔“

”چلیے یہ بھی تجربے کی ایک صورت ہے۔ اب دوسروں کو نشانہ بنانا آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔“

چند لمحے خاموشی کے بعد سلویٰ نے سنجیدہ لہجے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمجھانا شروع کیا۔

”دیکھو نادر شادی سے زیادہ کوئی کاروبار سود مند نہیں۔ اس میں منافع ہی منافع ہے۔ جیب سے کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ شادی ایک سے ہوتی ہے، فیس ہم جتنے لوگوں سے بھی وصول کرلیں اور امی نے تو اس کاروبار کو انڈسٹری بنا دیا ہے۔ جگہ جگہ میرج بیورو کھول دیے ہیں۔ خوبصورت نایاب لڑکیوں کے اشتہاروں پر لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ بعض مرتبہ تو فرضی دلہا بھی ہمارے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ دولت مند لڑکیوں کی ہم شادی کرادیتے ہیں اور ہمارا بھیجا ہوا دلہا اس کی دولت میں ہیر پھیر کرنے کے بعد طلاق دے دیتا ہے۔ کاروبار میں سب چلتا ہے یار۔“

نادر بھی سوچ رہا تھا کہ وہ اشتہار والی لڑکی سے اسی لیے شادی کرنا چاہتا تھا کہ دولت مند بن جائے۔ یہ موقع اگر مل رہا ہے تو ہاتھ سے کیوں جانے دے۔ لطف یہ بھی ہے کہ جس عورت نے ٹھکرایا تھا، یہ موقع اسی کے ہاتھوں مل رہا ہے۔ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ دولت لٹانے کا مزہ اسی وقت ہے جب ناجائز طریقے سے کمائی گئی ہو۔

نادر کو یقین تھا کہ سلومی اس سے شادی کرلے گی لیکن غالباً وہ اسے ابھی اور ٹھونک بجا کر دیکھنا چاہتی تھی۔ نادر اسے پورا موقع دے رہا تھا۔ غربت اور غریبی پر لعنت بھیجتا رہتا تھا۔ یہ ظاہر کررہا تھا کہ دولت کمائی جائے، چاہے کسی ذریعے سے ہو۔ اس میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی کیونکہ یہی اس کے اصل خیالات تھے جو اس کی زبان پر آرہے تھے۔ وہ تو پاؤں پھیلانے کے لیے چادر چرانے کا قائل تھا، اب یہ چادر اسے میسر آنے کو تھی۔

اس عرصے میں وہ سلومی کی والدہ سے بھی ملتا رہا تاکہ ان کا اعتماد خرید سکے۔ وہ پہلے انٹرویو میں ناکام ہوچکا تھا لیکن اب ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس کے پاس سلومی کی سفارش موجود تھی۔

سلومی نے اچھی طرح پرکھنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اسے انٹرویو کے لیے اپنی ماں کے سامنے پیش کردیا۔ اس مرتبہ وہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا۔ سلومی کی خوشی اس کی ماں کی شرائط کے مطابق پوری ہوگئی۔

چادر اتنی پھیلی کہ پاؤں پھیلانے کے بعد بھی ختم نہ ہوئی اس جنگ میں اسے شاندار فتح حاصل ہوئی تھی۔ اب اسے وہ سب کچھ میسر تھا جس کی آرزو وہ بچپن سے کرتا چلا آیا تھا۔ شاندار گاڑی، بہترین لباس، عالی شان کوٹھی اور خوب صورت بیوی۔

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ سلومی کا شوہر اس کے دفتر میں کلرک کے طور پر کام کرے۔ اس نے نوکری چھوڑ دی۔ اب وہ اسی مشین کا پرزہ بننے کو تیار تھا جس کا شکار وہ خود ہوچکا تھا۔ سلومی کی ماں کے ساتھ شادی دفتروں کا دورہ کرنے نکلا تو وہ اشتہار اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا جس میں ایک کروڑ پتی ماں کی اکلوتی بیٹی کے لیے ایک ایسے نوجوان کا رشتہ درکار تھا جو اس کے کاروبار کو سنبھال سکے۔

اس دورے کے بعد تجربہ حاصل کرنے کے لیے ایک شادی دفتر اس کے حوالے کردیا گیا۔ اس کا کام وہاں کچھ نہیں تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہاں بیٹھ کر داؤ پیچ سیکھ لے۔

یہ تربیت چند مہینے تک چلتی رہی پھر اسے ایک شادی دفتر کی مکمل ذمے داری سونپ دی گئی۔ نادر اسی راہ پر چل رہا جو سبق اسے دیا گیا تھا بلکہ کارکردگی دکھانے کے لیے لوگوں کو پہلے سے بھی زیادہ لوٹ رہا تھا۔

سلومی اور اس کی ماں اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھیں۔ کئی مشکل رشتے اس نے بھاری منافع کے ساتھ کرائے تھے۔ سلومی کی ماں کو ایک اچھا پارٹنر مل گیا تھا۔ اس پارٹنر کو انہوں نے پچاس لاکھ مہر کے عوض خریدا تھا۔ اپنی جیب سے کچھ بھی نہیں گیا تھا۔ اگر گڑبڑ کرتا تو الٹا اسے پچاس لاکھ دے کر جان چھڑانی پڑتی۔ اس پارٹنر کے آجانے کے بعد سلومی بھی ان کی مٹھی میں آگئی تھی ورنہ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب وہ کسی سے شادی کرکے اپنا حصہ طلب کرلے۔ اب وہ کہیں نہیں جاسکتی تھی۔ نادر بھی ان کے حکم پر چلنے پر مجبور تھا۔

اس روز تاش کی بازی جمی ہوئی تھی۔ سلومی، اس کی ماں اور نادر ایک میز پر جمع تھے۔ درمیان میں کاروبار سے متعلق باتیں بھی ہوتی جارہی تھیں۔

سلومی کی ماں نے اچانک کارڈ ہاتھ سے رکھ دیے۔

”ارے مجھے تو یاد ہی نہیں رہا، میں ایک اہم مسئلے پر تم لوگوں سے ڈسکس کرنے والی تھی۔“

”ممی میرے پاس بڑے شاندار پتے آئے تھے۔ میں جیتنے والی تھی اور آپ نے پتے پھینک دیے۔ بات کسی اور وقت بھی ہوسکتی تھی۔“

”پہلے کاروبار پھر کھیل۔ اس وقت نادر بھی موجود ہے اور یہ بات انہی سے کرنی ہے۔“

”جلدی کیجیے جو کہنا ہے تاکہ یہ بازی بیچ میں سے شروع ہو۔“

سلومی کی ماں نے قریب رکھے جوس کے آخری گھونٹ لیے اور کہنا شروع کیا۔

”ایک لڑکی کے والدین نے اپنی بیٹی کے رشتے کے لیے مجھ سے رجوع کیا ہے۔ لڑکی کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ اس کی ایک ٹانگ بے جان ہے۔ بیساکھی کے سہارے چلتی ہے۔ صورت کے اعتبار سے بھی بس قبول صورت ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ اوسط درجے کے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ رشتہ ان کا ہم پلہ ہو یعنی لڑکا غریب ہو۔ وہ لڑکے کو شادی کی صورت میں دس لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔ اگر اس سودے میں کوئی فائدہ ہے تو بس یہی ہے۔“

”تو کرادیجیے شادی۔ کوئی بھی غریب آدمی پکڑ کر آدھے آدھے پر سودا طے کرلیں۔“

”اگر اتنا آسان ہوتا تو یہ شادی کب کی ہوچکی ہوتی۔ مصیبت یہ ہے کہ غریبوں کو غریبوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ اگر یہ لڑکی دولت مند ہوتی تو سیکڑوں لنگری کی روٹی لینے دوڑ پڑتے۔ اشتہار دے کر دیکھ لیا ویسے بھی کوشش کرلی۔ کوئی تیار نہیں ہوتا۔“

”آپ کو میں نے پہلی مرتبہ مایوس دیکھا ہے۔“

”مایوس تو میں خیر کبھی نہیں ہوتی۔ ترکیب تو ایک اب بھی میرے ذہن میں ہے۔ تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔“ نادر نے کہا۔

”ترکیب یہ ہے کہ تم غریب آدمی بن کر اس لڑکی سے شادی کرلو۔“

”میں شادی کرلوں..... مگر کیوں؟“

”اس لیے کہ تمہیں دس لاکھ مل جائیں گے۔ وہ میری سلومی کے ہوں گے۔ ایک مہینے بعد کوئی بھی الزام رکھ کر اس لنگڑی کو طلاق دے دینا۔ اگر پچاس ہزار بھی مہر ہوا تو فائدے ہی میں رہوگے۔“

نادر ان کا منہ تک رہا تھا۔ کوئی ماں ایسی بھی ہوسکتی ہے جو اپنے ہی داماد کو دوسری شادی کا مشورہ دے رہی ہو۔

”کیا سوچ رہے ہو۔ یہ شادی محض دکھاوے کے لیے ہوگی۔“

”امی یہ تو سوچیے طلاق کے بعد غریب ماں باپ کے دل پر کیا گزر جائے گی جبکہ وہ بے چاری معذور بھی ہے۔“

”میں دیکھ رہی ہوں تمہارے اندر ابھی تک غریبوں والی ٹیکیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر اسے طلاق ہوگئی تو کون سی قیامت آجائے گی۔ کیا طلاقیں دنیا میں ہوتی نہیں ہیں؟“

ان کے تیور ایسے تھے کہ نادر کو اپنے برے دن یاد آگئے۔ حکم عدولی کی صورت میں کہیں یہ عیش و عشرت بھی ہاتھ سے چلا جائے۔ وہ تیار ہوگیا۔

”تمہارا دو کمروں کا جو مکان ہے وہ ابھی بکا تو نہیں؟“

”نہیں، وہ تو ابھی تک یونہی بند پڑا ہے۔“

”کل میں نوکروں کو بھیج کر صفائی کرادوں گی، تم وہاں منتقل ہوجانا۔ اس لنگڑی کو بیاہ کر وہاں لے آنا اور پھر وہیں سے طلاق دے کر رخصت کردینا۔ جتنی جلدی اسے

خانہ آبادی

شادی دراصل یہ معلوم کرنے کا نام ہے کہ تمہاری بیوی کو کس قسم کا انسان زیادہ پسند ہے۔ آج صبح میری بیگم نے مجھ سے کہا۔ ”اگر تمہیں مجھ سے سچی محبت ہوتی تو تم مجھے اپنی بیوی بنا کر میری زندگی تباہ نہیں کرتے۔“

اس کی بات تو درست تھی مگر میں نے کہا۔

”پیاری نصیبن! مجھے تم..... سے سچ مچ سچی محبت ہے۔ تم سے شادی کرکے میں نے اپنی زندگی کو تباہ ہونے سے بچایا ہے۔ میں ایک دن بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

وہ ہنسی۔ ”تم ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کرکے مجھے بے وقوف بناتے رہے ہو۔“

نصیبن کی یہ بات بھی درست تھی لیکن میں نے اسے مزید بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔ ”دیکھو میری جان، میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اگر وحید مراد جیسا خوب صورت اور امیر ہیرو بھی یہ چاہے کہ میں تمہیں چھوڑ کر سلمان خان بن جاؤں اور وہ میری جگہ لے لے تو میں ہرگز ہرگز تیار نہیں ہوں گا۔“

”میں جانتی ہوں۔“ نصیبن نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم کوئی ایسا کام نہیں کرسکتے جو میری دکھ بھری زندگی میں خوشیاں اور بہاریں لانے کا باعث بن سکے۔“

قلمی تعاون: وردا ملک، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے گھر رخصت کر دو گے اتنی جلدی یہاں آسکو گے، درمیان میں بھی اس سے کوئی بہانہ کر کے یہاں آسکتے ہو۔ سلوی تمہاری بیوی ہے، یہ تمہارا گھر ہے۔"

نادر اپنے گھر منتقل ہو گیا۔ لڑکی والوں سے کہہ دیا گیا کہ لڑکا مل گیا ہے۔ نادر کو لڑکی والوں سے ملوایا گیا۔ ایک مرتبہ پھر انٹرویو ہوا۔ کامیاب تو ہونا ہی تھا۔ لڑکی والے اتنے مجبور تھے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ لڑکے کی ملازمت نہیں ہے۔ دس لاکھ سے اپنا کوئی بزنس شروع کرلے گا، وہ شادی پر تیار ہو گئے۔ لڑکی والے اس کے گھر آئے، محلے والوں سے معلومات کی اور رخسانہ دلہن بن کر اس کے گھر آگئی۔

اب نادر کو طے شدہ منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ دو چار دن خوشی کے گزارنے کے بعد ہی اس نے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا بات بات پر لڑنا اپنا شعار بنا لیا۔ وہ ایسی بے زبان ثابت ہو رہی تھی کہ ایک لفظ زبان سے نکالنا گناہ سمجھتی تھی۔ ایک دن نادر نے مجبور ہو کر اس پر ہاتھ بھی اٹھا دیا۔ وہ خاموشی سے پٹتی رہی۔ تھک ہار کر وہ خود ہی باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو رخسانہ کے ماتھے پر بل تک نہیں تھا۔ ایک ٹانگ سے دوڑ دوڑ کر اس کی خدمت میں مشغول تھی۔

وہ جتنا ظلم توڑتا وہ اتنی ہی سراپا شکر گزار بن جاتی۔ رفتہ رفتہ نادر کو اس پر رحم آنے لگا۔ دوسری طرف سلوی اور اس کی ماں کے تقاضے بڑھتے جا رہے تھے کہ وہ رخسانہ کو طلاق دے۔ اسے ترکیب بھی سمجھا دی گئی کہ رخسانہ پر بدچلنی کا الزام لگا کر طلاق دے دو۔

"امی، اگر اس کے سوا کوئی ترکیب ہو تو بتائیے۔ یہ داغ ایسا ہوگا جسے وہ کبھی دھو نہیں سکے گی، ممکن ہے خودکشی ہی کرلے۔ قتل کا الزام میں اپنے سر نہیں لے سکتا۔"

"کوئی اور ترکیب تمہارے ذہن میں ہو تو تم بتا دو۔ ہمیں تو طلاق سے مطلب ہے۔"

"امی دس لاکھ روپے تو ہمیں مل ہی چکے ہیں۔ اگر وہ لنگڑی ایک کونے میں پڑی رہے تو کیا حرج ہے۔"

"سلوی یہ قطعی برداشت نہیں کرے گی کہ اس کے شوہر کی کوئی دوسری بیوی بھی ہے اور وہ بھی غریب اور لنگڑی۔ تم اسے فوراً طلاق دو۔"

"آپ مجھے تھوڑا موقع دیں میں ایسا قدم اٹھاؤں گا کہ وہ خود ہی راستے سے ہٹ جائے گی۔"

"نہیں، تمہیں اسے طلاق دینی ہوگی۔"

"سوچ لیں امی۔ اگر میں نے اسے طلاق دے دی اور بات عدالت میں پہنچ گئی تو کسی نہ کسی موقع پر یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ میرج بیورو والوں نے ایک ایسے شخص سے شادی کرا دی تھی جو ان کا داماد تھا۔ یہ فراڈ پکڑا گیا تو جانتی ہیں...... ہمارے کاروبار پر اس کا کتنا برا اثر پڑے گا۔"

نادر کی اس دلیل پر وہ گھبرا گئیں لیکن اپنی اکڑ پھر بھی قائم رکھی۔

"میں تمہیں صرف ایک مہینا اور دیتی ہوں۔"

"امی، شوہر کی بے رخی کسی بھی عورت کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ وہ مار پیٹ برداشت کرلیتی ہے لیکن بے رخی برداشت نہیں کرسکتی۔"

"ارے وہ بڑی ڈھیٹ مٹی کی بنی ہوئی ہے بہرحال یہ بھی کر کے دیکھ لو۔"

گھر پہنچتے ہی اس نے رخسانہ سے کہہ دیا کہ اس کے باپ نے جو پیسے اسے دیے تھے وہ اس سے بزنس شروع کر رہا ہے اس لیے پندرہ دن گھر نہیں آئے گا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے اماں کے گھر چھوڑ آئیے۔ جب آپ کا کام ہو جائے تو مجھے لے آیئے گا۔"

"خبردار! جو کہیں جانے کا نام لیا۔ میں جب آؤں تو تمہیں یہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ کہتے ہیں تو کہیں نہیں جاؤں گی۔"

نادر نے بزنس کا بہانہ کیا اور سلوی کے گھر آ گیا۔ پندرہ دن بعد اپنے دروازے پر دستک دی۔ دروازے رخسانہ ہی نے کھولا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ پھر اچانک بجھ گئی۔

"آپ کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔ بڑی محنت کرنی پڑی ہوگی۔"

"ہاں ہاں، بس زیادہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ کھانے کو ہے تو لے کر آؤ۔"

"ہے تو کچھ نہیں۔ آپ بیٹھیں، میں پکائے دیتی ہوں۔"

نادر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا اور الٹے قدموں باہر نکل گیا۔ کچھ دیر باہر رہنے کے بعد وہ واپس آیا کہ دیکھوں ردِعمل کیا ہوا۔ وہ گھر میں آیا تو کھانا تیار تھا۔

"میں بہت بری ہوں۔ آپ میرے لیے اتنی محنت کرتے پھر رہے ہیں اور میں نے کھانا تک پکا کر نہیں رکھا تھا۔"

"رخسانہ، تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو۔ تمہیں غصہ ہی نہیں آتا۔"

"کس بات کا غصہ؟"

"میں نے تمہیں تھپڑ مارا اور تم مجھ سے ناراض تک نہیں ہوئیں۔"

"آپ میرے شوہر ہیں۔ اگر آپ کو غصہ آ گیا تھا تو کیا میں بھی غصہ کروں؟"

"رخسانہ، دو دن بعد مجھے پھر جانا پڑے گا۔"

"تو کیا ہوا۔ تکلیف کے بعد ہی راحت ملتی ہے۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں میرے ہی لیے تو کر رہے ہیں۔"

اس رات وہ سونے کے لیے لیٹا تو سلوی اور رخسانہ کا موازنہ کرنے لگا۔ شوہر تو میں سلوی کا بھی ہوں لیکن اس کا سلوک میرے ساتھ ایسا ہے جیسے میں اس کا ملازم ہوں۔ ہر طرح سے اس کی دلداری کرتا ہوں لیکن وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔ اب بھی اسے یہ فکر نہیں کہ میں نے دوسری شادی کرلی ہے، فکر ہے تو یہ کہ میں نے دفتر کے کاموں سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اسے دولت کی فکر ہے میری نہیں۔ ایک رخسانہ ہے کہ میں نے ایک لمحہ اسے خوشی کا نہیں دیا اس کے ہونٹوں پر پھر بھی شکایت نہیں۔ اگر میں نے سلوی پر ہاتھ اٹھا دیا ہوتا تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتی، صرف اس لیے کہ وہ بڑی ماں کی بیٹی ہے اور رخسانہ غریب باپ کی نورِ نظر۔ جذبات تو سب کے ہوتے ہیں۔ خدمت گزاری اس کی عادت ہے اسی لیے وہ اپنے جذبات کو دبا لیتی ہے۔ تکلیف تو سب ہی کو ہوتی ہے۔

وہ اسی طرح کا موازنہ اٹھتے بیٹھتے کرنے لگا تھا۔ اب وہ سلوی کے پاس جاتا تھا تو اس کی ہر بات تیر بن کر دل میں اترتی تھی۔ اسے رخسانہ یاد آنے لگتی تھی جو مجسم صبر و رضا کا پیکر تھی۔

رخسانہ نے اپنے حسن سلوک سے اس کی نفرت کو محبت میں تبدیل کر دیا۔ ایک طرف سلوی اور اس کی دولت تھی دوسری جانب رخسانہ اور اس کی خدمت گزاری تھی۔ ایک طرف سونے کا محل، ایک طرف وفا شعار بیوی۔ یہ حقیقت بھی سامنے تھی کہ رخسانہ کا ساتھ دے کر ترقی کا ہر راستہ بند ہو جائے گا۔ اگر میں نے رخسانہ کا ساتھ دیا تو سلوی کی ماں میرا جینا حرام کر دے گی۔ وہ عجیب کشمکش سے گزر رہا تھا۔ اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یہ بات ایسی تھی کہ کسی سے مشورہ بھی نہیں لے سکتا تھا حتیٰ کہ رخسانہ کو بھی شریکِ مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

"سلوی ڈیئر، اب یہ آدمی ہمارے لیے خطرناک ہو گیا ہے۔"

"آپ کس آدمی کی بات کر رہی ہیں مما۔"

میں نہیں مروں گا

اسٹیج ڈرامے کے دوران ایک کارندہ ہانپتا ہوا دوڑ کر پروڈیوسر کے پاس پہنچا۔ پروڈیوسر اس وقت ڈریسنگ روم میں ہیروئن کے ساتھ کوک پی رہا تھا۔

"کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"سر وہ ہیرو نے ولن کو گولی مار دی ہے لیکن ولن نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر مجھے یہ چٹ تھما دی۔"

چٹ پر لکھا تھا۔

"میرے بقایا جات پچھلے پردے کے پیچھے سے مجھے دے جاؤ ورنہ میں گولی کھانے کے باوجود نہیں مروں گا۔"

☆............☆☆............☆

گلوکار کی بیوی نے شوہر سے کہا۔ "پچھلے مہینے آصف کی سالگرہ پر جو طبلہ تم نے دیا تھا۔ پڑوسیوں کو اچھا نہیں لگا۔"

گلوکار نے راگ الاپتے رک کر پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"کل میں نے سنا ہمارے پڑوسی، کمال صاحب ننھے آصف کو چاقو دے کر کہہ رہے تھے۔ بیٹا، دیکھنے کی کوشش کر کہ طبلے کے اندر کیا ہے؟"

وضاحت سے بتائیے ذرا

نجومی نے ہاتھ دیکھ کر لڑکی سے کہا۔ "تمہاری شادی ایک دراز قد اور گندمی رنگت والے نوجوان سے ہوگی۔"

"ذرا وضاحت سے بتائیے نا۔" لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"وہ چاروں ہی دراز قد اور گندمی رنگت والے ہیں۔"

مرسلہ: محمد مقبول عاشق۔ خوشاب

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں نادر کی بات کر رہی ہوں جو لنگڑی بیوی پر فدا ہوگیا ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ آج آٹھ دن ہوگئے۔ اس نے یہاں آکر جھانکا تک نہیں لیکن اس میں خطرے کی کیا بات ہے؟"

"خطرہ یہ ہے کہ اگر اس نے اپنی سسرال والوں کو یہ بتادیا یا کسی اور طرح یہ بات آؤٹ ہوگئی کہ وہ میرا داماد ہے اور ہم نے دھوکے سے شادی کرائی تھی تو اس کا کچھ نہیں جائے گا، ہمارا نام اخباروں میں اچھلے گا۔ سوچ لو، ہمارے کاروبار کو کتنا دھچکا لگے گا۔ پھر ایسا ناقابلِ اعتماد آدمی کسی اور وقت بھی ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"تم اس سے طلاق لے کر قصہ ختم کرو۔ جب وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوکر یہاں سے نکلے گا تب اسے ہماری حیثیت اور اپنی قیمت کا احساس ہوگا۔ گندگی کا کیڑا گندگی ہی میں خوش رہتا ہے۔ نوکری تک اس کی جاتی رہی ہے بھوکا مرنے دو اسے۔"

"ممی، میں کون سی اس سے خوش ہوں۔ مجھے تو اس سے گھن آنے لگی ہے لیکن سوچ لیں وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑ دے گا؟"

"پیچھا نہیں چھوڑے گا تو ہمیں شرط رکھنے میں آسانی ہوگی۔ ہم کہیں گے ابھی اور اسی وقت رخسانہ کو طلاق دے۔"

"دیکھ لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ یا تو مجھے چھوڑے یا اس لنگڑی کو۔"

☆☆☆

"رخسانہ تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔"

"کہیے، میں حاضر ہوں۔"

"مجھے بزنس میں بھاری رقم کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"کتنی رقم کی؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ میں اگر یہ گھر بیچ دوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"آپ کی چیز ہے، بیچ دیں مجھے اعتراض کیوں ہوگا، البتہ یہ ضرور پوچھوں گی کہ ہم رہیں گے کہاں؟"

"کچھ دن تمہارے گھر رہ سکتے ہیں۔ ہاتھ کھلتے ہی کرائے کا مکان لے لیں گے یا خرید لیں گے۔"

"آپ سوچ لیں، یہ مکان آپ کے ماں باپ کی نشانی ہے اسی لیے تو پوچھ رہی تھی کہ کتنی رقم کی ضرورت ہے۔ شاید ابا انتظام کر دیتے۔"

"پچاس لاکھ کی ضرورت ہے۔"

"پچاس لاکھ......! اتنی بڑی رقم ان کے پاس کہاں ہوگی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا تھا۔ تیس چالیس لاکھ کا مکان بک جائے گا۔ باقی رقم تمہارا زیور بیچ کر پوری کر لوں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ زیور کا کیا ہے پھر بن جائے گا۔"

"ٹھیک ہے جب ضرورت ہوگی مانگ لوں گا۔"

وہ یہ سوچ کر سلوی کے گھر گیا تھا کہ کوئی بات نکال کر جھگڑا کرے گا اور طلاق دینے کی دھمکی دیدے گا۔ وہ سوچے گی مہر کی رقم ادا کرنے کے لیے میرے پاس پیسے کہاں ہوں گے۔ بس یہی موقع ہوگا کہ میں واپس آجاؤں گا اور مکان بیچ کر مہر کی رقم ادا کر دوں گا۔

وہ ایسے وقت پہنچا جب سلوی کی ماں بھی گھر پر تھی اور سلوی بھی۔ سلوی تو نفرت کے اظہار کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی ماں نے منہ ضرور بگاڑا لیکن بیٹھی رہی۔

"ہم نے تمہاری شادی اس لیے کرائی تھی کہ تم اس لنگڑی کو لیے بیٹھے رہو۔"

"جب وہ کوئی موقع ہی نہیں دے رہی ہے تو طلاق کیسے دے دوں۔"

"میں نے کہا تھا بدچلنی کا الزام لگا دو۔"

"یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"تم ہماری دولت پر عیش بھی کرتے رہو اور اس کے ساتھ بھی رہو، یہ نہیں ہوگا۔"

"بس کچھ دن اور دیکھ لیں۔"

"اب میں مزید صبر نہیں کر سکتی۔"

"پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"تم رخسانہ کو طلاق دے دو۔"

"فی الحال میں یہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔"

"تو پھر سلوی کو طلاق دے دو۔"

"طلاق آپ مانگ رہی ہیں لہٰذا کورٹ میں جائیں۔"

"میں کورٹ میں جانا نہیں چاہتی۔"

"اس لیے نا کہ وہاں یہ انکشاف ہوجائے گا کہ آپ نے اپنے داماد کی شادی ایک غریب لڑکی سے کرا کے دس لاکھ اینٹھ لیے تھے۔"

"یہ بات بھی ہے کیونکہ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دینا چاہتے کہ تم جیسے مفلس سے ہم نے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی۔"

"طلاق آپ مانگ رہی ہیں اس لیے میں عدالت سے یہ فیصلہ لوں گا کہ مہر کی رقم جو مبلغ پچاس لاکھ ہے آپ معاف کریں۔"

یہ دھمکی ایسی تھی کہ وہ لاجواب ہوگئیں۔ وہ عدالت میں یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ اس نے بیوی سے اجازت کے بغیر دوسری شادی کرلی ہے اس لیے طلاق طلب کر رہے ہیں۔

"دیکھو نادر۔ تم سے ہمیں دشمنی نہیں ہے۔ تم رخسانہ کو طلاق دے دو تو اب بھی ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو۔"

"وہ ایک کونے میں پڑی ہے تو پڑی رہنے دی۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا۔"

"میں نے لکھ کر نہیں دیا تھا۔"

وہ لڑ بھڑ کر واپس چلا آیا لیکن مکان بیچنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسے امید ہوگئی تھی کہ وہ مہر معاف کرالے گا۔ وہی ہوا۔ دو تین ملاقاتوں اور تلخ کلامیوں کے بعد سلوی کی والدہ مجبور ہوگئیں۔

"تمہیں قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرنا ہوگا کہ تم ہمیں بلیک میل نہیں کرو گے۔ یہ کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ کبھی تم نے سلوی سے شادی کی تھی یا تمہیں فرضی غریب بنا کر رخسانہ سے تمہاری شادی کی گئی تھی۔"

اس نے قسم کھالی۔

سلوی کا وکیل آیا اور نادر سے یہ تحریر لکھوالی کہ وہ سلوی کے مانگنے پر اسے طلاق دے رہا ہے، مہر کی رقم ادا کرنے کا پابند نہیں۔

وہ وہاں سے یوں نکلا کہ کوئی ملازم تک اسے چھوڑنے نہیں آیا۔ پیدل ہی گھر کی طرف چل دیا۔ فاصلہ کم نہیں تھا لیکن اب اسے پیدل ہی چلنا تھا۔

وہ چادر چرانے کا قائل تھا لیکن یہ بھول گیا تھا کہ چرائی ہوئی چادر ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی۔ انسان کو اپنی ہی چادر میں پاؤں پھیلانے چاہئیں۔

اس کی چادر گھر میں تھی اور وہ گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

گھر پہنچا تو اس کے جوتے دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ برا حال تھا، رخسانہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"یہ آپ نے کیا حال بنایا ہوا ہے، کہاں سے پیدل چلے آرہے ہیں؟"

"کچھ نہیں رخسانہ۔ بزنس میں گھاٹا ہوگیا۔ مجھے صبح جلدی اٹھا دینا۔ نوکری ڈھونڈنے نکلنا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

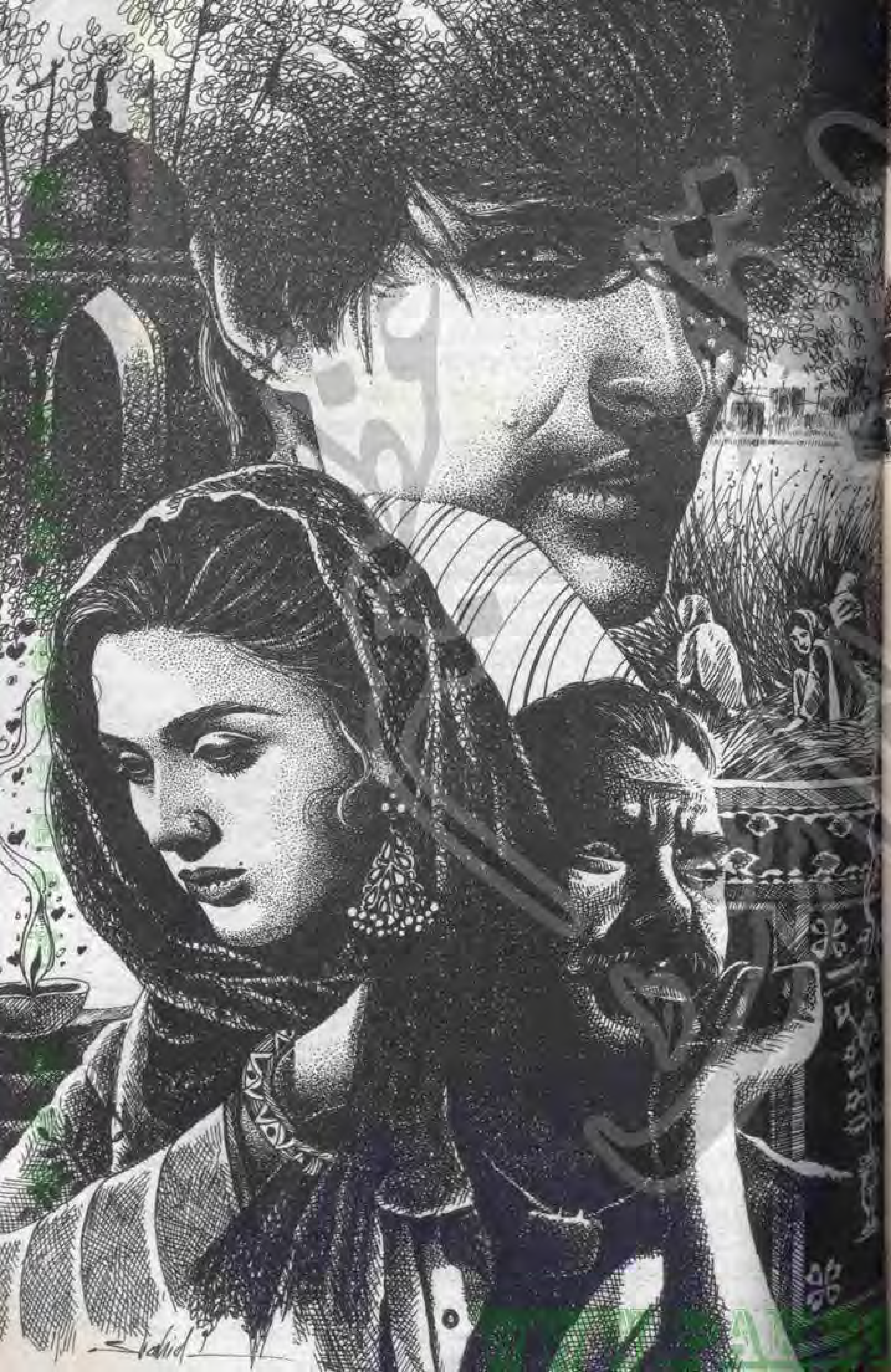

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر : 18

گل و گلزار سے راہ پر خار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ میرا نام شہریار ہے پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنایا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں میں پھوپی کبریٰ بھی رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر واپس آگیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام کردیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص، لیکن بذر گر کچھ قنوطی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کررہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہوگیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن دریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو

سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ دریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کردیا دریام خان چونکہ ایک متشدد مزاج شخص تھا اس لیے اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالانے اسے ناکام بنادیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ مجھے کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہوگیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا، غلط فہمی میں اس نے مجھے مارنا چاہا مگر حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہوگیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہوگئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان سوبی کا قتل ہوگیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچادیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوالے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوالیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی۔ یہاں سے فارغ ہوکر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم کی راہنمائی میں، میں نے دل جیت سے باز پرس کی۔ ایک خون ریز لڑائی میں اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ ایک دن میڈم کے اڈے پر میں نے ایک کمرے میں اسما کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا، اسی دوران اس کے اڈے پر حملہ ہوا۔ اس وقت وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ وہ میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد بلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرلیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرادی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دلجیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کرکے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کرکے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کرکے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس دوران ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ البتہ سوجو کو لے آیا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائداد کی خاطر۔ بخت خان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کردیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار، حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کرکے رقم وصول کرنے کی ذمے داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کردیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہی تو میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا۔ وہاں سے واپسی پر اچانک مجھے اغوا کرلیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے سوبی کا دوست زور آور تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کرچکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہوگئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہوگیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہدہ نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو درحقیقت چاچا کی جائداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے شکر ادا کرکے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم کو ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کردی۔ میں نے ضد کرکے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بند ھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس پر بہ مشکل قابو پاکر میڈم کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ہماری دسترس سے دور نکل گیا تھا۔ میڈم کی حالت کافی خراب تھی۔ راستے میں ایک مقامی ڈسپنسری میں میڈم کو دکھایا وہاں ڈاکٹر عالیہ اور اس کے شوہر صدیق سے ملاقات ہوئی جنہوں نے طبی امداد کے ساتھ ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ میڈم کو ہمدرد پاکر عالیہ نے اسے ایک مظلوم لڑکی کینیڈا پلٹ نگینہ کی کہانی سنائی جو اپنے چچا وڈیرے انور روز بھٹی اور رفاقت بھٹی کے ظلم کا شکار تھی۔ ان کی درخواست پر میڈم نے ساتھ دیا اور نگینہ کو اپنے بنگلے پر لے آئی۔ پھر ہم میڈم کی ماں اور بھائی سیمو کی تلاش پر روانہ ہوئے۔ ہم دریا پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی پر سوار کرا رہے تھے کہ پیرو ماچھی نے ہمیں للکارا جو دریا پار سے واپس آچکا تھا اور ملاح ونیا کے کیبن میں سو گیا تھا۔ میڈم نے اپنے ردعمل...

میں اسے زچ کیا اور ایک خونی لڑائی میں ہم اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق میڈم کے عزیزوں کو سردار یارن خان نے اغوا کرایا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف ہی تھا کہ یارن خان میڈم کا عاشق تھا کیونکہ میں اسے ایک تارک الدنیا شخص سمجھتا تھا۔ میڈم نے مجھے نور پور جاکر یارن خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپی، میاں جی نے پھیری لگا کر سامان بیچنے والے پٹھان گلاب خان کا گیٹ اپ دیا اور میں اس سوانگ میں نور پور پہنچا۔ کھالا مجھے پہچان گیا۔ وہیں میری ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جو مجھے پہچان نہ سکی۔ ایک رات میں یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہاں خوفناک بل ٹیریر کتوں سے میرا سامنا ہوا لیکن میں ان پر بہ مشکل تمام قابو پانے میں کامیاب رہا اور اس کوشش میں زخمی ہوگیا۔ وہیں ایک بندے سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور مقابلے کے بعد اس نے مجھے زیر کرکے چاقو سے فیصلہ کن ضرب لگانا چاہی تو ایک نسوانی چیخ سنائی دی جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز خانزادی کی تھی۔ پرویز پر قابو پانے کے بعد میں نے تہ خانے کا دہانہ تلاش کیا۔ تہ خانے میں برکت بیگ سے مڈبھیڑ ہوئی اس سے سخت تگ ودو کے بعد یرغمال بنا کر ماں جی اور سیمو کے بارے میں دریافت کیا اس کے مطابق وہ دونوں آغا نورن کے پاس تھے۔ یارن خان کے سلسلے میں ناکامی ہوئی وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا باہر پولیس نے گھیرا ڈال لیا تھا یہاں برکت میرے کام آیا میں خانزادی کو لے کر ایک سرنگ کے ذریعے باہر آ گیا۔ خان زادی کو میں نے کھالے کے حوالے کیا اور ماں اور سیمو کی تلاش میں نورن آغا کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اسے بے ہوش کرکے ان دونوں کو ساتھ لے کر میڈم کے پاس پہنچا مگر میڈم میری توقع کے برخلاف ناراض تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی لیکن میڈم نے اپنے رویے کی وضاحت کی۔ اور ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میرے ماں باپ کے قاتل رنگو قسائی کو اس نے اٹھوالیا تھا۔ کھالے نے بتایا کہ حیدر خان سخت پریشان ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے میڈم سے مشورہ کرکے ایک ہوٹل میں ملاقات طے کرلی حیدر خان یارن کی بیٹی کو اٹھوالینا چاہتا تھا۔ میں نے میڈم کی مرضی کے مطابق دو کروڑ میں سودا طے کیا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں میڈم میری منتظر تھی۔ پھر سنگین ورنگین لمحات کے دوران میڈم شکیلہ نے اپنے ماضی کے اوراق سے پردہ اٹھایا کہ وہ ایک امیر زادی کی ناجائز اولاد تھی اور ایک چوکی پر دریا میں بہتی ہوئی مچھیرے گامن کے پاس پہنچی اور اس نے اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیا۔ امیرزادی کو بھی اس کا علم ہوگیا اور اس نے اس کی تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا۔ گامن نے اسے اسکول میں داخل کرایا اور اس کو چندو ماہی کے نام سے پکارنے لگا۔ جوان ہونے پر پیر نظر حیات کے بیٹے عمر حیات نے اس سے چھیڑ خانی کی کوشش کی جس کی شکایت اس کے باپ سے کی گئی صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہوگیا عمر حیات اس کا قصوروار گامن اور چندو کو ٹھہراتا تھا اور انتقام پر بضد تھا اسی کوشش میں اس نے گامن کو فائر کرکے زخمی کردیا۔ مجبوراً چندو اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوگئی جہاں اس نے اسے مارا پیٹا پھر شرمندہ ہوا اور اسے واپس چھوڑ گیا لیکن گامن اور اس کا گھرانا چندو سے سخت ناراض تھا۔ عمر حیات نے اسے اپنانے کا عہد کیا اور اسے کورٹ میرج کے لیے ساتھ لے گیا اور دونوں شادی کی پلاننگ کررہے تھے کہ اچانک قدموں کی آہٹ ہوئی انہوں نے دروازے پر دیکھا تو بھونچکا رہ گئے۔ عمر حیات کی ماں اس کی بہنوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ یہاں کچھ جذباتی اتار چڑھاؤ کے بعد اس کی ماں ان دونوں کی شادی پر راضی ہوگئی اس شرط کے ساتھ کہ پہلے چندو اپنی تعلیم مکمل کرلے گی حویلی میں رہ کر۔ حویلی میں آکر اس نے تعلیم کا سلسلہ شروع کردیا اور میٹرک کے بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران عمر حیات کا ماموں رضوان کے ہاں آیا جو گوشہ نشین اور دین دار شخص تھا۔ اس نے چندو کے مستقبل کے بارے میں تشویش ناک اور حیرت انگیز پیش گوئیاں کیں۔ پھر ایک غلط فہمی کے نتیجے میں عمر حیات نے چندو پر تشدد کیا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ اسے لینے آیا لیکن چندو نے انکار کردیا اسی دوران ملک افراسیاب کی گاڑی وہاں سے گزری جو کہ ایک بدمعاش اور عیاش آدمی تھا اس نے عمر حیات کو گولی ماردی اور چندو کو زخمی حالت میں اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے آیا جہاں اس کے گرگوں نے چندو کو یارن خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا پلان بنالیا اور رات کی تاریکی میں شراب کے نشے میں اس کے پاس پہنچ گئے۔ جانو اور لالو نے باری باری اسے پامال کیا اور پھر سنوار کر یارن خان کے کارندے رنگو کے حوالے کرنے کی کوشش کی اسی دوران جانو نے لالچ میں لالو کو قتل کردیا لیکن رنگو جو لالو کا دوست تھا اسے بھی جان سے ماردیا۔ یارن خان کے بعد حیدر خان کے پاس سے ہوتے ہوئے چندو میاں دلبر حسین کے پاس پہنچی سب نے اس کے ساتھ ایک ہی سلوک کیا جس کے باعث وہ حاملہ ہوگئی دلبر حسین نے اسے اپنے نوکر مظہر کے حوالے کردیا۔ وہاں فرار کی کوشش کے بعد مظہر کو چندو نے قتل کردیا۔ یہاں ڈاکٹر شاہ جی نے اس کی مدد کی اور اس کے بچے کو اپنا نام دینے کے لیے پناہ کے ساتھ ہی شادی پر بھی تیار ہوگیا۔ لیکن صرف کاغذی حد تک۔ اسی دوران اس کے بیٹی پیدا ہوئی جسے ڈاکٹر نے چندو کی مرضی سے اپنے دوست کے حوالے کردیا پھر پلان کے مطابق اس کو طلاق دے کر نرسنگ ہاسٹل میں داخل کردیا۔ جہاں اس کی ملاقات جوزفین سے ہوئی جس نے اسے جمال گیلانی کے متعلق بتایا جو مالدار آدمی تھا اور قریب المرگ تھا لیکن شادی کرنا چاہتا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

چندو کو ایک نہایت عجیب وضع قطع میں مہین جسم کا آدمی دروازے کی دونوں چوکھٹیں تھامے کھڑا دکھائی دیا جس کی سرمہ بھری آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ ہکلائی۔ ”آ...... آپ کون ہیں؟“

”ماڑے کو جالم جمانہ جانت پڑا اپنے ہی باچھا کی چاند جیسی دلہن ہی نہ جانت ہے۔ سالا کیا کیا گجب (غضب) کیا ہوا ماڑی جان پر...... اڑے اورانی جی! ماڑے کو سالی دنیا میرو شاہ بولت ہے......“ اس کی آواز اور انداز تخاطب ہیجڑے کی طرح نہایت مضحکہ خیز تھا جبکہ آواز غیر معمولی طور پر تیکھی تھی۔ وہ پان کھا رہا تھا۔ بکری کی طرح تیز تیز منہ چلاتے ہوئے اجمل کو مخاطب کرکے بولا۔ ”ماڑے باچھا جی کو کیا ہووت؟ ماڑی عجت (عزت) بچانے کو بول دیوے تاں اپنی ناری کو ماڑے بارے۔ وہ کیا بولت ہیں...... ماڑا تارف شارف......“

اجمل سو رہا تھا مگر جو کر نما نو وارد کی آواز سن کر بیدار ہو گیا۔ بولا ”میرو شاہ! ادھر آؤ، میرے قریب۔“

”اڑے واہ اجمل باچھا! تو ماڑے سے چوری چوری اپنے پیراں میں قاف کی پری اُتار لیوت ہے اور ماڑے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

جرا (ذرا) خبر نہ ہوت۔" وہ ہاتھ نچا کر بولا اور پان چباتا ہوا کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی باسکٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چندو دلچسپی سے اُس کی سامری عہد کے جادوگروں کی سی چال اور بہروپیوں جیسے ڈیل ڈول کو دیکھنے لگی۔

وہ اسٹول کھینچ کر اجمل گیلانی کے قریب بیٹھ گیا۔ منہ میں پان کی گلوری کا محلِ وقوع بدلتے ہوئے کبھی اجمل کو تو کبھی چندو کو دیکھتے ہوئے باتیں کرنے لگا۔ چندو مزید حیرت سے دوچار ہوئی جب دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ چندو کے نام جائداد کی منتقلی اور شادی کا منصوبہ تیار کرنے والا اصل کردار وہی تھا جو دیکھنے میں نہایت احمق اور گاؤدی نظر آ رہا تھا۔ اس نے دس پندرہ منٹ میں یہ بھی دیکھ لیا کہ اجمل گیلانی کے کاروبار میں اجمل کی حیثیت محض اداکار کی تھی جبکہ پسِ پردہ ہدایت کار میرو شاہ ہی تھا۔

اجمل گیلانی نے آنکھیں موند لیں۔ میرو شاہ اسٹول سے اُٹھ کر اُس کے مزید پاس آ گیا۔ اپنی متجسس آنکھیں اُس پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ "چندو ماہی! بڑا نام بارت۔ ہیں؟ رانی دِکھے رانی...... ماڑے کو پتا ہووت کہ ایسی صورت جمانے (زمانہ) پہ راج کرنا مانگت...... پر جمانہ بڑا جالم (ظالم) ہووے سالا۔ ہجاروں (ہزاروں) مہارانیوں کو ماٹی میں رول دیوت ہے۔ پر نہیں۔ ماڑے اجمل میاں کی رانی کا راج میرو شاہ سلامت رکھ لیوت ہے۔ کوئی فکر نہیں کرنے کا۔ ایک دم۔ سالی جوجی نے ماڑے کو رام کہانی بول دیوت ہے اس لیے ماڑے سے جرا (ذرا) بھر نہ شرماوت رانی جی!"

زبان سمجھ میں آئے، نہ آئے، آنکھوں اور لفظوں سے پھوٹتی ہوئی صداقت اور خلوص سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس نے ممنون نظروں سے میرو شاہ کو دیکھا۔ دل کی دنیا بدلی تو اس کی مضحکہ خیز صورت اور حلیے کی طرف مطلق دھیان نہیں گیا، بولی۔ "آپ اِن کے کیا لگتے ہیں؟"

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "غلام...... ہاتھ باندھ کر جی مجوری (حضوری) کرنے والے ہووے تیرے ہج بینڈ (ہزبنڈ) کے...... بولے، ایک ٹانگ پر رات گجارو، ہم گجار (گزار) دیوت...... بولے، ماڑے کو جان کا نجرانہ (نذرانہ) دیوو، ماڑی ہتھیلی پر جان آ جاوت...... میرو شاہ یار کی غلامی کرے ہے، یار کی آنکھ بند ہووت تو یار کی جورو کے آگے ہاتھ باندھ دیوت......"

چندو کو اجمل کا کمبل ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں اُٹھا کر اجمل کا چہرہ دیکھا۔ کھلی آنکھیں اپنی جانب بلا رہی تھیں۔ وہ آہستگی سے اُٹھی اور قریب پہنچ کر مستفسر ہوئی۔ "جی!"

"چندو! میرو شاہ میرا خاص آدمی ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں؛ یہ جو کہتا ہے، اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتی جاؤ۔ میرے بعد مرضی کرنا۔" اس کی نحیف آواز میں التجا کا عنصر غالب تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی!"

"یہ مخلص آدمی ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ دھوکا نہیں دیتا۔ میں چاہوں گا کہ میرے بعد تم اِس پر بھروسا کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تم پر آنچ نہیں آنے دے گا۔"

"جی! میں سمجھ چکی ہوں۔" اس نے کن انکھیوں سے میرو شاہ کو دیکھ کر جواب دیا۔

ایسے میں میرو شاہ اُٹھ کر عقب میں آ گیا، بولا۔ "رانی جی! ماڑے بندے نیچے ماڑا انجار (انتظار) کرت...... اجمل میاں کو کوٹھی پر لے جاویں یا اِدھر ہی رکھ لیویں؟"

چندو یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے اجمل کو دیکھا۔ اجمل بولا۔ "ہاں چندو! میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ میں اپنی باقی سانسیں اپنے گھر میں لینا چاہتا ہوں۔ میرو شاہ سے کہو، وہ مجھے کوٹھی لے جائے اور تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

وہ اسپتال میں خود کو نسبتاً محفوظ خیال کر رہی تھی۔ اَن دیکھے ماحول میں جانے سے گریزاں تھی مگر اجمل کی حکم عدولی اس کے بس میں نہیں تھی اس لیے ناچار مان گئی۔ میرو شاہ اسے ساتھ لیے استقبالیہ کاؤنٹر پر آیا۔ وہاں اس کے دو آدمی موجود تھے۔ ایک نے کمپیوٹرائزڈ واؤچر اُس کے سامنے کیا۔ میرو شاہ سلپ کو دیکھتا رہا پھر چندو کی طرف بڑھا کر بولا۔ "سالے کپوٹر (کمپیوٹر) کی لکھت ماڑی سمجھ میں کب آوت ہے رانی جی...... جرا دیکھ کر بل تو بتا دیوت۔"

چندو نے بل دیکھا تو آنکھیں پھیلنے کو آ گئیں۔ اتنے پیسوں میں بیس مریضوں کا علاج کیا جا سکتا تھا۔ اپنی حیرت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس نے رقم بتائی۔ میرو شاہ کا اشارہ پا کر اس کے لمبے تڑنگے ساتھی نے پرس نکالا، بل ادا کیا اور میرو شاہ اور چندو کو پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں چل کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ دونوں گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ چند منٹوں بعد اجمل کو اسپتال کی ایمبولینس میں منتقل کر دیا گیا۔ چندو گاڑی سے اُتری اور میرو شاہ کے روکنے کے باوجود ایمبولینس میں آ گئی۔ اس نے اپنے عقب میں ابھرنے والی میرو شاہ کی

طنزیہ آواز سن لی تھی۔ "سالی! نوٹوں کی خوشبو پر تتلی بن کر آوت اور مردے پر احسان چڑھاوت۔ واہ مولا...... تو بڑا بے نیاج (نیاز) ہووت؛ جرا سمجھ نہ آوت ہے میرو شاہ کو!"

خدا کے کاموں کی سمجھ نہیں آتی۔ وہ جسے چاہے اُسے جھولے پر سوار کر دے۔ پَل میں زمین پر، پَل میں آسمان پر...... ہواؤں کے دوش پر اُڑا دے، تند و تلخ لہروں کے سپرد کر دے؛ اُس کی مرضی۔ اس کے کاموں کی جس کو سمجھ آتی ہے وہ لب بستگی کی دبیز چادر اوڑھ کر لوگوں سے چھپ جاتا ہے۔

چندو جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے کے انداز میں جدید طرزِ تعمیر کی وسیع و عریض کوٹھی کو دیکھ رہی تھی جس کے فرسٹ فلور پر واقع آراستہ بیڈ روم میں اس کا مجازی خدا سو رہا تھا۔ وہ بیڈ روم سے کچھ فاصلے پر سرخ ریلنگ تھامے کھڑی گراؤنڈ فلور میں جھانک رہی تھی۔ اس نے ریلنگ کے گول پائپ کو اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ خنکی کے باوجود اس کی ہتھیلیوں نے پسینا اگلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ خواب نہیں تھا۔

کبھی خواب اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ انسان سچ اور جھوٹ کی تمیز کھو بیٹھے مگر حقیقی منظر بھی اتنی جلد بدلتا جتنی جلد اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ اس نے گھوم پھر کر فرسٹ فلور کے سبھی کمرے دیکھے۔ بالکونی میں کچھ دیر ٹھہر کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ کو دیکھتی رہی جس کے باہر کئی افراد جمع تھے۔ ان کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوٹھی میں داخل ہونا چاہتے تھے جبکہ باوردی گیٹ کیپر انہیں داخل نہیں ہونے دے رہا تھا۔ ان کا اصرار بڑھا تو گیٹ کیپر اپنے کیبن میں جا گھسا۔ شیشے میں سے چندو کو نظر آ رہا تھا کہ گیٹ کیپر نے انٹرکام پر کسی سے رابطہ کیا تھا۔ چند لمحوں بعد اُسے میرو شاہ گراؤنڈ فلور کے بڑے چوبی دروازے سے نکل کر گیٹ کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی تیز رفتاری سے عیاں تھا کہ وہ غصے میں تھا۔ نصف راستے میں تھا جب چیخ کر بولا۔ "ماڑے کو علم ہووت کہ ان حرام جادوں نے اجمل میاں کو کیوں دیکھنا ہوت۔ نہ دیدے کہیں کے۔ مار مار کر ان سالوں کی......"

میرو شاہ نے فرطِ غیظ سے گیٹ پر مجتمع افراد کو اجتماعی گالیوں سے نوازنا شروع کیا تو چندو لمبی سانس پھیپھڑوں میں اتار کر اجمل گیلانی کی خواب گاہ کے ملحقہ کمرے میں گھس گئی۔ میرو شاہ کے حکم پر اِس کمرے کو ہنگامی بنیادوں پر چندو کے لیے سیٹ کیا گیا تھا۔ وہ بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں جوتوں سمیت لیٹ گئی۔

وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی مگر سوچوں کی یلغار نے ذہن کو شکست دے کر سلا دیا۔ تین بجے کا عمل تھا جب ایک نرس نے اُسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوئی۔ "کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟"

نرس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "میڈم! آپ کو صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

وہ خمار آلود لہجے میں حیرانی سے بولی۔ "اِس وقت؟"

"جی! وہ تھوڑی دیر پہلے جاگے ہیں۔"

وہ نرس کی معیت میں اجمل کے پاس آ گئی۔ اجمل کو جہازی سائز کے بیڈ میں دھنسا دیکھ کر ایک لمحے کو بھول گئی کہ وہ بیمار تھا۔ اسپتال کے اسپرنگ والے اونچے بیڈ پر لیٹا ہوا صحت مند شخص بھی بیمار معلوم ہوتا ہے۔ اجمل ہلکے نارنجی رنگ کے مخملیں کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ سوجے ہوئے ہاتھوں کا رنگ بھی چہرے کی طرح پیلا تھا۔ آنکھوں کے نیچے والی جلد بھی خاصی ابھر آئی تھی۔ وہ اس کے پہلو میں بیڈ پر ٹک گئی۔ جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگی۔ اجمل کی آنکھوں میں وارفتگی بھری چمک پیدا ہوئی۔ خفیف انداز میں مسکرایا، بولا۔ "چندو! یہ نرسیں نالیاں نہیں نکالتیں، نارمل انسان کی طرح مجھے ایک گھنٹا گزارنے کی مہلت نہیں دیتیں...... کہتی ہیں کہ اگر انہوں نے نالیاں نکالیں تو میں دس منٹ میں ہی مر جاؤں گا۔"

وہ صدقِ دل سے بولی۔ "نہیں! آپ ان کی بات مان لیں۔ وہ غلط تو نہیں کہتیں ناں۔"

"لیکن میں تمہیں دلہن کے رُوپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ چند منٹوں کے لیے ہی سہی...... پھر بھلے مر جاؤں۔"

چندو نے تڑپ کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھا۔ اجمل کے ہاتھوں کے برعکس اس کے ہونٹ ٹھنڈے تھے۔ بولی۔ "میں کل آپ کو دلہن بن کر دکھا دوں گی۔ اَب آپ آرام سے سو جائیں۔"

اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور فوراً ہی مان گیا، بولا۔ "تم واقعی بہت خوب صورت ہو۔ میں نے آج تک تمہارے جتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔"

وہ دل میں بولی۔ "میرے جتنی بدقسمت لڑکی بھی شاید روئے زمین پر نہیں ہوگی۔"

دل رکھنے کو مسکرا کر بولی۔ "آپ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔" اجمل کے لبوں پر آزردگی بھری مسکراہٹ ابھری۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

آنکھوں سے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جانے پر اس نے چندو کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھجکتی ہوئی قریب آئی۔ بے دردی سے لوٹے جانے اور مرضی سے اپنا آپ لٹانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ اس فرق کو محسوس کرنے لگی۔

اجمل نے کہا۔ ”چندو! اپنے بال کھول دو۔“

اس نے بال کھول دیے۔

”اِدھر پھیلا بھی دوناں!“

چندو نے کھلے ہوئے آبشار بال اس کے چہرے پر پھیلا دیے۔ اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس نے بند آنکھ کے پردے پر چمکتا ہوا ستارہ چوم لیا۔ چاند اور ستارے دسترس میں نہیں آتے۔ دور فلک پر خواب بن کر چمکتے رہتے ہیں مگر اس کا ستارہ اس کے لبوں کو توانائیاں سرفراز کر رہا تھا۔ اس کے بوسوں میں چھپی دیوانگی کو اجمل نے بھی محسوس کر لیا، بولا۔ ”میرے چہرے پر دوسری آنکھ بھی ہے جو حسد کی آگ میں جل رہی ہے۔“

اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دوسری بند آنکھ کو بھی چوم لیا۔ فوراً ہی بوسے کے بے ذائقہ ہونے کا احساس ہو گیا اور محبت کی دیوانگی سے معمور محل کی راہداری میں چندو کی پیش قدمی رُک گئی۔

اجمل بولا۔ ”کیا تمہیں میری بائیں آنکھ کا تل اچھا لگتا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ زلفیں اجمل کے چہرے پر سرسرا گئیں۔ کیف کا ناشناسا لمحہ اجمل کے پھیپھڑوں میں اُترا۔ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ شراب، خون اور بارود سے بُو کے بھبکے اُڑتے ہیں۔ میں آج تک کہتا آیا ہوں کہ بدبو نہیں، یہ تینوں چیزیں خوشبو پھیلاتی ہیں۔ آج سمجھ میں آ رہا ہے کہ لوگ ٹھیک کہتے تھے۔ شاید اصل مہک آج ہی پھیپھڑوں میں اُتری ہے۔ کاش! تم کچھ عرصہ پہلے میری زندگی میں آ جاتیں تو میں ان بدبودار چیزوں کو چھوڑ کر تمہارے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھنے میں رُجھ جاتا۔ بچ جاتا۔ میری زندگی بچ جاتی مگر اب بہت دیر ہو گئی ہے۔“

وہ اُس کی جسمانی حالت کو جانتی تھی اس لیے اُس پر وزن ڈالے بغیر پیار کر رہی تھی۔ جسے بیماری نے بدصورت کر رکھا تھا، اُسے چندو کی پیار بھری آنکھ دنیا کا خوب صورت مرد قرار دے رہی تھی۔ جن حرکتوں سے کل تک گھن آتی تھی، انہی حرکتوں میں عشق کی برکتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اجمل زیادہ نہ بولے مگر وہ بولے جا رہا تھا۔ چندو اُسے دیکھنے سے روک سکتی تھی یا بولنے سے...... تبھی اس نے اپنے بالوں میں اجمل کے چھپے ہوئے گالوں کو سہلاتے ہوئے اُسے دیکھنے کی اجازت دے کر خاموش کرا دیا۔ چند لمحوں کی ریاضت نے آنکھیں نم کر دیں۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں سسکنے لگی۔ دل سے ہوک نکلی۔ ”کاش! آپ کو میری عمر لگ جائے اور آپ کے حصے کی موت مجھے آ جائے......“

اجمل نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے کمرے سے بھاگ کر گیلری میں آ گئی۔ نرس دروازے کے پاس اسٹول پر بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ پوچھنے لگی۔ ”خیر تو ہے میڈم؟“

وہ جواب دیے بغیر دوڑتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ بیڈ پر بیٹھ کر دل کھول کر رونے لگی۔ قدرت کے کاموں کی طرح انسانی ذہن کا بھی پتا نہیں چلتا۔ اس نے اجمل کو اس لیے قبول کیا تھا کہ وہ اُسے چھونے اور چھیڑنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا اور اَب تب میں مرنے والا تھا۔ جب وہ مجازی خدا بن گیا تو دل یکبارگی اس کی بے چارگی اور کسمپرسی کے دُکھ سے بھر گیا۔ وہ اُسے بے بسی کی موت مرتے ہوئے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ کروڑوں کی جائداد لے کر افسردہ ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اُس نے یہ ڈیلنگ کر کے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ یہاں آنے سے تو بہتر تھا کہ وہ نرسنگ ہاسٹل میں زرینہ کے ساتھ رہتی اور اپنا کورس مکمل کرتی۔ نرس بن کر اپنی آہستہ روز زندگی گزارتی رہتی۔ وہ ایک ہی جست میں امیر تو ہو گئی تھی مگر اس کا دل اجمل کی متوقع موت کے خیال سے بنجر ہونے لگا تھا۔

وہ اتنی غمزدہ اور نڈھال تب بھی نہیں ہوئی تھی جب اُس پر میرزادے عمر حیات نے ہاتھ اُٹھایا، جب اس کی ذات پر پیرو ماچھی کا خبثِ دروں کلنک بن کر چپکا، جب گامن کی ٹانگ کٹی، جب بابا گامن نے اُسے گھر سے نکالا، جب فائزہ نے اُس پر تہمت لگائی، جب عمر حیات نے اُس کی عزت کا دامن تار تار کیا اور پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے بھیانک موت کو گلے لگایا، جب ملک افراسیاب کے غنڈوں نے اُس پر دائرہ حیات تنگ کیا، جب وہ کھلونا بن کر بھیڑیوں کے ہاتھوں پامال ہوتی رہی اور جب ڈاکٹر منور علی نے اُسے اسپتال کے لان میں ہمیشہ کے لیے الوداع کیا...... ہر دُکھ اپنی جگہ بہت بڑا تھا مگر وہ جیسے تیسے جھیلتی گئی تھی مگر یہ دُکھ

اتنے شدید انداز میں دماغ پر حملہ آور ہوا تھا کہ وہ بلبلا اُٹھی۔ سوئے آسماں منہ کر کے اونچی آواز میں رونے لگی۔ رانیں پیٹتے پیٹتے، کمزور انداز میں چیختے چیختے نڈھال ہو گئی۔ اُسے احساس تک نہیں ہوا کہ اس کے دروازے پر میرو شاہ، اسپتال کا بل ادا کرنے والا لمبا تڑنگا شخص اور نرس حیرت سے بھری آنکھوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ میرو شاہ نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا کر باقی لوگوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ وہ انہیں کہہ رہا تھا کہ چندو شدید ذہنی دباؤ میں ہے۔ چیخ و پکار کر رہی ہے، اچھا ہے، اِس طرح دل کا غبار نکل جائے گا اور تھوڑی ہی دیر میں نارمل ہو جائے گی۔

انسان کے دل کی دنیا بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وہ بھی بدل گئی۔ نہ صرف اس کی پھٹی پھٹی چیخیں تھم گئیں بلکہ آنکھیں بھی ایک دم خشک ہو گئیں۔ دل پتھرا سا گیا۔ سر جھکائے باتھ روم میں گھس گئی۔ وضو کر کے برہنہ پا قالین پر چلتے ہوئے کھڑکی تک آئی۔ یک بارگی دو طاق کھول دیے۔ باہر سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کے دوش پر فجر کی اذان کی روح پرور آواز سفر کرتے ہوئے کمرے میں اُتر آئی۔ اس نے دیوار کی طرف منہ کیا، ہاتھ اُٹھائے اور بلند آواز میں کہا۔ ”اللہ اکبر!“

اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ اعتراف دل سے کیا جائے تو دنیا کی ہر شے چھوٹی نظر آنے لگتی ہے۔ ظالم کا ظلم اور اپنا دکھ تک بونے لگتے ہیں۔ اُس کی زبان سے ادا ہونے والے ”اللہ اکبر“ کے لفظوں کا مخرج دل تھا، تبھی ایک دم پوری دنیا سمٹ سی گئی۔ پستہ قامت ہو گئی۔ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرا تو تینوں افراد کو صوفے پر براجمان دیکھا۔ وہ حیرت سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میرو شاہ! مجھے اجمل صاحب کی زندگی چاہیے...... کسی بھی قیمت پر...... کسی بھی طریقے سے...... تم بتاؤ، تم کیا کر سکتے ہو؟“

وہ ’آپ‘ سے ’تم‘ پر آ گئی تھی۔ لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا۔ سانپ نے پھنکارنا از خود سیکھ لیا تھا۔

میرو شاہ چونک گیا۔ کھڑا ہوا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”میرو شاہ رانی جی کا ہر حکم بجا لاوے پر......“

چندو کا لہجہ تھوڑا اور رُوکھا ہو گیا۔ ”پر ور کچھ نہیں۔ کیا اجمل صاحب کا علاج ملک سے باہر نہیں ہو سکتا؟“

میرو شاہ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

نرس نے کہا۔ ”میڈم! صاحب کے گردے بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اگر دو یا کم سے کم ایک ہی گردہ مل جائے تو کوئی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ زندہ رہیں گے ورنہ نہیں۔ ملک کے اندر یا باہر، صورتِ حال ایک سی ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ میرو شاہ! میرا حکم بجا لاؤ اور اپنے اجمل میاں کے لیے دو گردوں والا وجود اُٹھا لاؤ۔“

میرو شاہ نے مدد طلب نظروں سے نرس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ ”میڈم! یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ گردوں کی تبدیلی ہر اسپتال میں ممکن نہیں ہے۔ کچھ ڈاکٹر یہ کام بڑی رازداری سے کرتے ہیں مگر وہ بہت پیسا لیتے ہیں۔“

چندو نے دل پر ہاتھ رکھا۔ لمبی سانس لی اور کہا۔ ”کتنا پیسا؟“

نرس نے اپنا اندازہ بتایا۔

رقم خاصی بڑی تھی۔ چندو نے اپنی موجودہ حیثیت پر غائبانہ نظر ڈالی۔ پھر بولی۔ ”یہ تو کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ کیا تم کسی ایسے ڈاکٹر کو جانتی ہو جو یہ کام کرتا ہے؟“

وہ گھبرا کر بولی۔ ”نہیں میڈم! مجھے علم نہیں ہے۔“

میرو شاہ پلٹا۔ دونوں کو کمرے سے باہر بھیج کر تیزی سے چندو کے قریب آیا، بولا۔ ”ماڑی رانی جی! کیا غجب کرت ہو؟ بھلا ایسی باتیں کھلے میں کرنا دانش مندی کہلاوت؟“

وہ بولی۔ ”میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اجمل صاحب زندہ اور تندرست چاہئیں۔ تم کچھ کر سکتے ہو تو ٹھیک ورنہ میں خود کوئی راستہ نکالتی ہوں۔“

میرو شاہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ٹھاں ٹھاں کرنا آوت؟“

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں مگر سیکھ لوں گی۔“

”آگ سے کھیلن مانگے ہے رانی جی؟“

”اجمل صاحب کے لیے آگ پھانکنے کو تیار ہوں۔“

”ماڑے کھیل میں نہ اباؤٹ ٹرن ہووے نہ یوٹرن رانی جی! سوچ سمجھ کے فیصلہ کر لیوے...... پھر میرو شاہ ساتھ دیوت ہے۔“

چندو ماہی کی آنکھوں میں ایک وحشت سی رقصاں ہوئی۔ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میرو شاہ! میں نادان نہیں ہوں۔ میڈم جوزفین، اجمل صاحب اور تمہاری باتیں سن کر اور کوٹھی کا ماحول دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ یہاں کون سی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ یا تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نرسنگ ہاسٹل چلی جاؤں یا اس زندگی کو قبول کرتے ہوئے اپنی جون بدل لوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ رہی بات گولی بارود کی، اگر تم میرا ساتھ دو تو میں یہ سب کچھ کر گزروں گی۔ ہم اجمل صاحب کو بچا سکتے ہیں اور اگر نہ بچا سکے تو میں اس گروپ کو جو اجمل صاحب

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے بنا رکھا ہے، توڑنا نہیں چاہوں گی۔ یہ پہلے کی طرح اپنا کام کرتا رہے گا۔ اگر یہ ٹوٹ گیا تو اجمل صاحب کے بھوکے ندیدے رشتہ دار مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

میرو شاہ نے اس کے اندیشوں کی تائید کی۔

وہ بولی۔ "بس پھر ہمت کرو۔ کسی ایسے پرائیویٹ اسپتال کا سراغ نکالو جو گردوں کے جائز و ناجائز آپریشن کرتا ہو۔ گردوں کی دستیابی کے لیے ایک طرف تم کسی کڈنی ایجنٹ سے رابطہ کرو جبکہ دوسری طرف تم اجمل صاحب کے رشتہ داروں میں سے کسی آسان شکار کو اُٹھا لاؤ۔ اب تم یہ بہتر جانتے ہو کہ ہمارے پاس کتنی مختصر مہلت ہے اور کام کتنا بڑا ہے۔ یقیناً ہمارے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں ہے۔"

میرو شاہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر کمرے سے نکلا۔ اجمل کی خواب گاہ میں جھانک کر خوشی بھری بلند آواز میں بولا۔ "ماڑے اجمل میاں! مبارکاں ہووت...... ماڑی چندو رانی پھولن دیوی، اپنے مجاجی خدا (مجازی خدا) کی جندگی (زندگی) کے لیے میدان میں کود جاوت۔"

چندو کے کانوں میں اُس کی مہین مگر تیز آواز پڑی۔ اس نے سر جھٹک کر زیرِ لب کہا۔ "پھولن دیوی!"

اس کے اندر عجیب سی بے چینی اور درشتی بھر گئی تھی۔ اس کے رویے کو دیکھتے ہوئے میرو شاہ نے اپنے چاروں کارندوں کو ہنگامی طور پر بلا کر چندو کے سامنے پیش کر دیا۔ تعارف کے بعد چندو کی نظریں ایک قوی الجثہ شخص پر جم گئیں۔ وہ دیکھنے میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دیتا تھا۔

میرو شاہ نے چندو ماہی کی دلچسپی کو بھانپتے ہوئے بتایا۔ "رانی جی! یہ اپنا اُستاد نصری ہووت...... نصر حیات...... ایک دم بجلی کے مافق کڑک جاوت اور جالم (ظالم) سے جالم جور آور کی نجی (گردن) کڑک جاوت ہے۔"

چندو دل ہی دل میں اُس کے ڈیل ڈول سے خوف زدہ ہوئی مگر بہ ظاہر سخت لہجے میں بولی۔ "نصر حیات! مجھے اجمل صاحب کے لیے گردہ چاہیے۔"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھا، سر کو خفیف انداز میں جھکایا اور کہا، "میں حکم کی تعمیل کروں گا۔ شام کو دو گردوں والا ایک بندہ کوٹھی پر پہنچا دیا جائے گا۔ اگلا انتظام کر رکھیں۔"

چندو نے میرو شاہ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا، "اگلا انتظام تم کرو۔ آج رات میں ہی آپریشن ہو جانا چاہیے۔"

میرو شاہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا کہ وہ کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ جو کام اس سے تین ماہ میں نہیں ہو سکا تھا وہ ایک دن میں کس طرح ہو جائے گا۔

اس کے پیچھے کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے شخص نے کہا۔ "شاہ جی! مولا کا نام لے کر یہاں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہم کامیاب لوٹیں گے۔"

چندو نے سن رکھا تھا کہ دولت اور طاقت سے ہر کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسے نہ تو اپنی طاقت کا اندازہ تھا اور نہ ہی بینک میں پڑی ہوئی دولت کا، اُسے تو بس اجمل کے آپریشن کی فکر لاحق تھی۔ اس نے اجمل کے کریمنل گینگ کو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے احکامات صادر کیے اور اجمل کے کمرے میں چلی گئی۔

اجمل پر ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں تعینات تھیں۔ نرسیں باری باری ڈیوٹی دیتی تھیں جبکہ ڈاکٹر ہر تین گھنٹے کے بعد چکر لگا جاتا تھا۔ اجمل کا بدن سوجنے لگا تھا۔ پہلے صرف پیروں اور ہاتھوں پر سوجن تھی جو بڑھ کر اب پورے بدن میں پھیلنے لگی تھی۔ نرس نے اُسے یہ بتا کر مزید فکر مند کر دیا کہ اجمل کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک ہو گئی تھی۔

تین بجے کے قریب میرو شاہ اور نصر حیات فتح سے دمکتے ہوئے چہروں کے ساتھ چندو کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ میرو شاہ نے پان کی تازہ گلوری منہ میں داب رکھی تھی۔ بولنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے اس نے نصری کو رپورٹ دینے کا اشارہ کیا۔

اُستاد نصری بولا۔ "پچھتر ہزار میں ایک گردہ مل گیا ہے۔ پے منٹ کل کرنی ہے۔ اسپتال کا بندوبست بھی ہو گیا۔ اتنی ہی رقم اسپتال میں دینا پڑے گی۔ لیں! یہ رہا اسپتال کا کارڈ۔"

اس نے سینے والی جیب سے ایک کارڈ نکال کر چندو کی طرف بڑھایا اور مزید کہا۔ "آپریشن آج رات میں کسی وقت کیا جائے گا مگر اجمل صاحب کو پانچ بجے تک اسپتال پہنچانا ہو گا کیونکہ آپریشن سے پہلے کچھ ضروری ٹیسٹ لینے ہوتے ہیں۔"

چندو ماہی خوش ہو گئی۔ تمتماتے ماتھے کو سہلاتے ہوئے بولی، "یہ ہوئی نا بات...... اسپتال اگر دور ہے تو ابھی اجمل صاحب کو لے چلتے ہیں۔ قریب ہے تو کچھ دیر بعد یہاں سے نکلیں گے۔"

نصری نے بتایا کہ اسپتال زیادہ دور نہیں تھا۔ چندو کے ایما پر دونوں اجمل کو اسپتال منتقل کرنے کی تیاری میں

مصروف ہو گئے جبکہ چندو اجمل کے پاس آ گئی۔

وہ جاگ رہا تھا۔ اسے سامنے پا کر بولا۔ "تم کہاں چلی جاتی ہو؟"

اس نے اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا۔

وہ مایوسی سے بولا۔ "نہیں چندو! یہ بے فائدہ تکلیف ہے جو تم اُٹھا رہی ہو۔ اصولی طور پر تمہیں بھی دوسروں کی طرح میرے جلد مرنے کی دعا کرنی چاہیے۔"

چندو نے سر جھکا لیا۔ طنز بُرا لگا تھا، بولی۔ "نہیں! میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی عمر آپ کے نام کر دیتی اور آپ کے حصے کی موت کو اپنے گلے لگا لیتی مگر خدا اپنی مرضی کرتا ہے۔"

اجمل کے چہرے پر تکلیف کے آثار اُبھرے۔

چندو نے سوالیہ نظروں سے نرس کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "آپ فکر نہ کریں میڈم! میں نے پین کلر دوا دے دی ہے۔ وہ دراصل آپ کا پیر یورین بیگ سے ٹکرا یا تھا، اس لیے نالی تھوڑی کھنچ گئی تھی۔ آپ تھوڑا اِدھر ہو کر بیٹھ جائیں۔"

چندو جلدی سے اجمل کی طرف کھسک گئی۔

وہ آزردگی سے بولا۔ "مجھے زندہ رکھنا چاہتی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہیں اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"اور نقصان بھی کیا ہو گا؟" وہ اجمل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"مرتے ہوئے جو کچھ تمہیں دے چکا ہوں، زندگی کی طرف لوٹتے ہی اُسے تم سے چھیننے کی کوشش کروں گا یا تمہیں یہاں سے باہر جانے ہی نہیں دوں گا۔"

"آپ کی موت ٹل جائے، میں اگر باہر نہ بھی گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

"کیا تم میری بیوی بن کر یہاں رہنا چاہو گی؟" اجمل کے لہجے میں کھلی بے یقینی رچی ہوئی تھی۔

"اس میں حرج بھی کیا ہے؟"

"میں کوئی اچھا انسان تھوڑی ہوں۔"

"مگر اچھے بن تو سکتے ہیں ناں آپ!"

"نہیں...... مجھے اگر نئی زندگی بھی مل جائے، میں اچھا بننا نہیں چاہوں گا۔" وہ منہ بنا کر مایوسی سے بولا۔

"کیوں؟" وہ چونکی۔

اجمل کوئی جواب دینے چلا تھا کہ دو افراد اسٹریچر اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ اجمل نے حیرانی سے انہیں دیکھا، پھر چندو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

چندو نے اسپتال کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو وہاں منتقل کیا جا رہا ہے تاکہ آج رات آپ کا آپریشن کیا جائے۔"

اجمل نے مزاحمت کی مگر چندو نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر گراؤنڈ فلور تک لانے کے بعد پارکنگ میں کھڑی ایمبولینس میں ڈال دیا گیا۔ اُستاد نصر حیات چندو کے ساتھ تھا جبکہ میرو شاہ ایمبولینس میں اجمل کے پاس بیٹھ گیا۔ چندو کی گاڑی ایمبولینس کے پیچھے پارکنگ سے نکلی۔ اُسے اطمینان تھا کہ سب کچھ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر جلد اور ٹھیک انداز میں ہو رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اجمل آپریشن کے بعد تندرست ہو کر کوٹھی لوٹے گا۔ بعد میں کیا ہو گا؟ یہ اُس نے سرِ دست نہیں سوچا تھا۔

قسمت کچھ اور کرنے جا رہی تھی۔ جونہی گیٹ کیپر نے دروازہ کھولا، سفید بونٹ والی نیلی پولیس موبائل وین سڑک سے اُتر کر گیٹ کے عین سامنے آن رکی۔ ایمبولینس کی راہ مسدود ہو گئی اور وہ رُکی تو پچھلی گاڑی کو بھی رکنا پڑا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا نصر حیات اور ایمبولینس کا عقبی دروازہ کھول کر میرو شاہ دونوں ہنگامی طور پر باہر نکلے۔ گیٹ کے سامنے کھڑی پولیس وین کو دیکھ کر گیٹ کی طرف دوڑے۔ چندو نے ان کی تقلید کی۔ ان کے گیٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی پولیس موبائل سے کم و بیش چھ اہلکار برآمد ہو چکے تھے۔ ایک سپاہی نے گیٹ کیپر پر گن تان رکھی تھی جبکہ بلند قامت وردی پوش عین گیٹ کے درمیان کھڑا ہو کر چندو اور میرو شاہ کو گہری نظروں سے گھور رہا تھا۔

میرو شاہ نے قریب پہنچ کر کہا۔ "اڑے بدرو باچھا! یہ کیا کرت ہے ماڑے ساتھ...... دیکھت ہے کہ ماڑا اجمل باچھا جندگی (زندگی) اور موت کی کشمکش میں پڑا ہووت اور ماڑے کو جلد اسپتال پہنچنا ہووت...... یہ جالم قانون کی گڈی تو پاسے ہٹا چھوڑت!"

وہ انسپکٹر تھا۔ چندو کو بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اس کا نام غلام عباس تھا۔ چونکہ اس کی ذات بدرو تھی، اس لیے شہر بھر میں عباس بدرو کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے اپنے ہولسٹر سے پستول کھینچا اور انگلی پر گھماتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میرو شاہ! تمہارا سائیں بڑا ڈھیٹ جان ہے۔ تین ماہ ہو گئے اسے مرتے مرتے پر ابھی تک مرا نہیں۔ شیطان بھی بھلا مرتا ہے کیا؟...... میں زندگی اور موت کے پنگھوڑے کو روکنے یا تمہیں پکڑنے نہیں آیا، میں تو ایک قاتل بلکہ خوف ناک قاتلہ کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرو شاہ بھونچکا رہ گیا، بولا۔ ”اڑے باچھا! یہ کیا بولت...... ماڑے پاس قانون کا مجرم کا ہے کو ہووت؟ بول تو سہی؛ کون جالم قاتلہ ہے ماڑے درمیان؟“

انسپکٹر بدرو نے کڑی نظروں سے چندو کو دیکھا اور کہا، ”ہتھیار سے نہیں، آنکھوں سے قتل کرنے والا قاتل...... اوئے جیرے بلیڈ! ذرا میڈم کو اِدھر لاؤ۔ اپنی مجرم کی پہچان کرلیں۔ اس نے مجرمہ کا جو ہوش ربا حلیہ بیان کیا تھا، وہ تو اِسی عورت پر پورا بیٹھتا ہے۔“

چندو کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس کا دھیان فوری طور پر مظہر علی عرف مذرے پر گیا جس کے ہاتھوں اس کی بوڑھی ماں قتل ہوئی تھی اور وہ خود چندو کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُترا تھا۔ چندو نے اپنی زندگی میں اس حرامی مذرے کے علاوہ کسی انسان کو قتل نہیں کیا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی کہ اتنے سال گزرنے کے بعد پولیس کو کیسے پتا چل گیا کہ وہ مظہر علی کی قاتلہ تھی۔

ایسے ہی وقت میں غیر معمولی گھنی مونچھوں والے ایک سپاہی کے ساتھ آنے والی عورت پر چندو کی نگاہ پڑی۔ اس نے بہت قیمتی اور جدید فیشن کا لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ وہ نپے تلے انداز میں چلتی ہوئی قریب آئی۔ اچانک چندو کی گردن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ میک اَپ کی تہوں میں چھپے ہوئے خال وخد سے پہلی نظر کی اجنبیت دور ہو گئی اور یوں لگا جیسے اس نے اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا تھا۔ کہاں؟ یاد نہیں آیا۔ سوچ میں پڑ گئی۔

ایسے میں انسپکٹر بدرو نے اپنے بڑے سے ریوالور کی نال کا رُخ چندو کی طرف کیا اور پوچھا۔ ”میڈم! اسے غور سے دیکھیں اور پہچانیں۔ کیا اس نے ہی آپ کے بھائی کو قتل کیا تھا؟“

وہ اپنے انداز واطوار اور وضع قطع سے بہت امیر عورت دکھائی دے رہی تھی۔ چند لمحے انسپکٹر کے قریب رُکی پھر اعتماد بھری چال چلتے ہوئے چندو کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور چہرہ وفورِ غیظ سے تمتما رہا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک خاموش کھڑی چندو کو گھورتی رہی پھر بولی۔ ”چندو!“

چندو بے ساختہ بولی۔ ”جی! آپ کون ہیں؟“

مگر اس کے بتانے سے پہلے ہی چندو کی آنکھیں مارے حیرت سے پھٹنے کو آ گئیں۔ وہ اسے پہچان چکی تھی۔ وہ میرزادے عمر حیات کی بڑی بہن صفیہ تھی۔ جن دنوں وہ حویلی میں رہا کرتی تھی، صفیہ ملتان میں پڑھا کرتی تھی۔ وہ پہلے سے فربہ ہو گئی تھی۔ میک اَپ نے اُس کی رنگت میں بھی واضح فرق حائل کر دیا تھا۔

چندو کے منہ سے پھٹی پھٹی آواز نکلی۔ ”باجی صفیہ...... آپ! اوہ میرے خدا! آپ کتنی بدل گئی ہیں۔“

وہ ایک لمحے کو بھول گئی کہ صفیہ اس سے ملنے کے لیے نہیں آئی تھی بلکہ اُسے گرفتار کرانے کے لیے پولیس کی برات ساتھ لائی تھی۔ مگر جونہی اس نے صفیہ کے ہونٹ نفرت سے بھنچتے ہوئے دیکھے تو ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”مگر میں نے تو میرزادے کو قتل نہیں کیا تھا۔ یہ آپ پولیس کو لے کر یہاں کیوں آئی ہیں؟ اُسے تو ملک افراسیاب نے گولی ماری تھی۔ میرے سامنے......“

انسپکٹر بدرو کا زور دار قہقہہ فضا میں گونجا۔ اس نے مخصوص انداز میں اپنا دایاں ہاتھ لہرایا۔ دو سپاہی برق مستعدی سے چندو کے دونوں اطراف آئے اور اس کے کچھ سمجھنے یا بولنے سے پیشتر ہی اس کی کلائیوں میں قانون کا زیور پہنانے لگے۔ میرو شاہ اور نصر حیات حائل ہو گئے۔ انسپکٹر بدرو سے پہلے نرم لہجے میں پھر اونچا اونچا بولنے لگے مگر وہ کسی کی سننے اور ماننے پر تیار نہیں تھا۔

چندو نے سنا، وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرو شاہ! مجھے اجمل سے یا تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ تم جانتے ہو کہ میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ تعاون کیا ہے۔ اب بھی ایسا ہی کرتا مگر اب میرے بس میں کچھ نہیں رہا۔ یہ تھانہ شجاع آباد کا کیس ہے۔ اس خاتون کا بھائی کافی عرصہ پہلے قتل ہوا تھا اور چندو ماہی نامی لڑکی کو ایف آئی آر میں نامزد کیا گیا تھا۔ بہت تلاش بسیار کے باوجود یہ قاتلہ ہاتھ نہیں آئی تھی۔ پچھلے دنوں میڈم صفیہ اپنی کسی کلاس فیلو سے ملنے کے لیے کسی پرائیویٹ اسپتال میں گئیں۔ وہاں انہوں نے اپنے بھائی کی قاتلہ کو دیکھ کر پہچان لیا۔ پولیس لے کر اسپتال پہنچی تو پتا چلا کہ مذکورہ لڑکی اپنے مریض شوہر کو لے کر گھر چلی گئی ہے۔ میڈم صفیہ نے اپنی سہیلی کی اعانت اور اسپتال کے ریکارڈ سے اس کوٹھی کا پتا معلوم کرلیا۔“

میرو شاہ نے کہا۔ ”تو یوں بولت ناں بدرو باچھا کہ کیس شجاع آباد کا ہووت اور تھانہ حرم گیٹ کا باچھا سلامت ہم پر چڑھ دوڑت...... نا بابا! ماڑے کو جرا (ذرا) تنگ نہ کرت اور راستہ ایک دم چھوڑ دیوت۔ ماڑی رانی تیرے تھانے کی مجرم نہ ہووت ہے...... اے میڈم! جاناں...... اپنا تھانیدار باچھا ساتھ لاوت اور ماڑی رانی کو لے جاوت......“

صفیہ نے غصے میں سڑک پر تھوک دیا۔

انسپکٹر بدرو استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ”اوئے جا رے؛ بچے تھی وَنج مویا...... تجھے بتا رہا ہوں کہ میڈم صفیہ کے پیچھے کوئی بہت بڑا افسر بول رہا ہے کیونکہ مجھے اوپر سے حکم آیا ہے کہ میں میڈم کی مجرم کو فوری طور پر اپنے تھانے کی حوالات میں پہنچا دوں۔ شجاع آباد کی پولیس آج ہی اسے لینے کے لیے پہنچ رہی ہے۔“

چندو خاصی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ کچھ دیر سنبھلنے میں لگی۔ ایسے میں اجمل کا خیال آیا۔ قدم بڑھا کر میرو شاہ کے عقب میں آئی۔ متوجہ کرکے بولی۔ ”ان سے بحث مت کرو اور فی الحال میری فکر چھوڑ کر اجمل صاحب کو اسپتال لے جاؤ۔ تم دونوں میں سے ایک آدمی وہاں رہے جبکہ دوسرا مجھے چھڑانے کی کوشش کرے۔ دیر نہ کرو ورنہ نقصان ہو جائے گا۔“

میرو شاہ کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی۔ اس نے نصر حیات کو حکم دیا کہ وہ اجمل صاحب کو لے کر اسپتال کا رُخ کرے۔ انسپکٹر بدرو نے اپنے ڈرائیور کو راستہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ وین ریورس ہو گئی اور راستہ کھل گیا۔ ایمبولینس گیٹ تک آ گئی۔ ایسے ہی وقت میں زوردار آواز سے ٹائر چرچرائے اور مخالف سمت سے پولیس کی ایک موبائل وین ایمبولینس کے سامنے آن رکی۔ یہ تھانہ چہلیک کی موبائل وین تھی۔ اس کے عقب میں ایک کھلی چھت والا ہائی لکس ڈالا بھی آن رکا جس میں کم وبیش دس بارہ افراد کھڑے احتجاجی انداز میں ہاتھ لہرا رہے تھے۔

چندو اور میرو شاہ کے ساتھ ساتھ انسپکٹر بدرو نے حیرانی سے اس نئی کارگزاری کو دیکھا۔ ایک سب انسپکٹر موبائل وین سے نکل کر تیز قدموں چلتا ہوا گیٹ میں آیا۔ باری باری سبھی افراد کو کریدتی نظروں سے گھورنے کے بعد انسپکٹر بدرو سے مخاطب ہوا۔ ”سر! آپ یہاں؟ خیریت تو ہے؟“

انسپکٹر بدرو نے مختصراً اپنی یہاں موجودگی کا سبب بتایا اور اس کی آمد کی غرض وغایت دریافت کی۔

وہ بولا۔ ”سر! اٹھائیس آدمیوں نے ایف آئی آر درج کرائی ہے کہ ان کے قریبی عزیز اجمل کو امیر حسین شاہ عرف میرو شاہ، نصر حیات عرف نصری، ایماندار علی عرف مانا اور ایک نامعلوم خاتون نے اغوا کے بعد حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ کروڑوں کی جائداد ہتھیانے کے لیے۔ کورٹ نے اجمل کی برآمدگی اور ملزموں کو گرفتار کرکے عدالت میں حاضر کرنے کا حکم دیا ہے اور بیلف بھیجا ہے جس کے پاس عدالت کے احکامات موجود ہیں۔“

میرو شاہ نے فوراً ہی معاملے کی سنگینی کو بھانپ لیا۔ سمجھانے لگا کہ انہوں نے اجمل کو حبسِ بے جا میں نہیں رکھا بلکہ اس کے علاج کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ چونکہ انہوں نے ڈاکٹرز کی ہدایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اجمل کے رشتہ داروں کو اس سے ملنے نہیں دیا تھا، اس لیے وہ تھانے کچہری کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ میرو شاہ درست کہہ رہا تھا مگر یہ زبانی کلامی باتیں تھیں۔ قانون اور عدالت ان جذباتی مکالموں کو اہمیت نہیں دیا کرتی۔ سب انسپکٹر عدالت اور تھانے کے حکم کا پابند تھا۔ اس نے سبھی افراد کو اجمل سمیت اپنی تحویل میں لیا اور چشم زدن میں اپنی وین میں بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔

انسپکٹر بدرو نے چندو ماہی کی ہتھکڑیاں تھامنے والے اہلکاروں کو وین میں بیٹھنے کا حکم دیا اور چندو کو دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا وین کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔

چندو کا دل اندیشوں اور خوف سے بھر گیا۔ اس کے جذبات پر سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے تھے۔ وہ موبائل وین کے عقبی حصے میں دو وردی پوشوں کے درمیان پھنسی بیٹھی تھی جبکہ میرزادی صفیہ وین کے پیچھے آنے والی سوزوکی کار کی عقبی نشست پر براجمان تھی۔ چندو اسے دیکھ نہیں سکتی تھی مگر دل ہی دل میں اس کی نفرت بھری آنکھوں سے دہشت زدہ ہو رہی تھی۔ وہ جن دنوں میرزادے عمر حیات کی حویلی میں مقیم تھی، صفیہ کا رویہ اس کے ساتھ تب بھی معاندانہ ہوا کرتا تھا۔ اب جبکہ وہ چندو کو اپنے اکلوتے اور جواں سال بھائی کا قاتل گردان رہی تھی، اس سے خیر کی توقع عبث تھی۔

چندو نے سپاہیوں کی غیر اخلاقی چھیڑ چھاڑ اور معنی خیز گفتگو سے بہ مشکل توجہ ہٹاتے ہوئے عمر حیات کے قتل اور اپنی پوزیشن کے بارے میں سوچا تو خوف دو چند ہو گیا۔ جن حالات میں عمر حیات کو ملک افراسیاب نے گولی ماری تھی، وہ حالات سنگین انداز میں چندو کو ہی اس قتل کا مرتکب قرار دیتے تھے۔ اس نے آج تک یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ میرزادے عمر حیات کی ماں اور بہنیں حتیٰ کہ وسیب کے لوگ اسے ہی میرزادے کا قاتل قرار دیتے ہوں گے کیونکہ علاقے کا کوئی شخص نہ تو ملک افراسیاب کو جانتا تھا اور نہ کسی نے اس کے ہاتھوں میرزادے کو مرتے دیکھا تھا اس لیے ہر نظر میں چندو ہی اپنے دیوانے عاشق کی قاتل تھی۔ چونکہ اس کا رابطہ مکمل طور پر اپنے ماضی سے کٹ گیا تھا، اس لیے اسے اپنے پیچھے ہونے والی کارروائیوں کی مطلق خبر نہیں ہوئی تھی اور اسی بے خبری نے اسے مروا دیا تھا۔

اُس نے زندگی میں تھانے کی اندرونی دنیا نہیں دیکھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی اس لیے تھانے کے نام سے ہی ڈرتی تھی۔ آج یہ ڈر بھی اُترنے والا تھا۔ اسے زنانہ حوالات میں ڈال دیا گیا۔ قسمت نے ایک مرتبہ پھر آسمان سے زمین پر کھینچ اُتارا تھا۔

میر زادی صفیہ سلاخیں تھام کر کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”کم ذات نکلی ناں...... تو میرے جوان جہان ویر کا خون کر کے بھاگ گئی اور سمجھا کہ کبھی ہمارے ہاتھ نہیں لگے گی۔ دیکھ لیا۔ ناحق خون چھپا نہیں رہتا۔ تجھے پھانسی کے پھٹے نہ چڑھایا تو میرا نام صفیہ نہیں...... میں میر ظفر حیات کی بیٹی اور عمر حیات کی بہن نہیں اگر تجھے سسکا سسکا کر نہ مارا۔“

وہ منت آمیز لہجے میں بولی۔ ”باجی! میں میر زادے کو کس طرح قتل کر سکتی تھی؟ حیران ہوں کہ آپ لوگوں نے یہ سوچ کیسے لیا۔ نہیں باجی، نہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ملک افراسیاب نے اُسے گولی ماری تھی۔ وہی مردود مجھے اغوا کر کے اپنے اڈے پر لے گیا اور اس کے غنڈوں نے مجھے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا۔ خدا کے لیے میرا یقین کرو۔“

وہ سلاخوں سے ہاتھ نکال کر صفیہ کے ہاتھ پکڑنا چاہتی تھی مگر اس نے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ ہکا بکا کھڑی رہی۔ صفیہ پیر پٹختے ہوئے انسپکٹر کے آفس کی طرف بڑھ گئی تو اس نے بے جان انداز میں اپنا چہرہ صاف کیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ سمجھ میں آتا تھا کہ عمر حیات کی بہنوں اور ماں نے اتنا بڑا سانحہ دل پر جھیلا تھا کہ وہ کسی طرح بھی اس کی بات پر یقین نہیں کریں گی اور ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہوئے اسے تختۂ دار تک لے جائیں گی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے تھانے کے بعد عدالت میں پیش کیا جائے گا اور پھر جیل بھیج دیا جائے گا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس ابتدائی مرحلے میں اس کے ساتھ تفتیش کے نام پر کیا کیا جانے والا تھا۔

سہ پہر کو اس کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر میرو شاہ کا ایک کارندہ تھانے پہنچ گیا۔ انسپکٹر بدرو آرام کرنے کی غرض سے اپنے مکان پر گیا ہوا تھا۔ کارندے نے میرو شاہ کے بارے میں بتایا کہ وہ بھی حوالات میں بند ہے۔ اس نے چندو کو بے فکر رہنے کا پیغام بھیجا تھا اور کہا تھا کہ وہ اگلے دن عدالت میں پیش ہو کر رہا ہو جائے گا اور چندو کو رہا کروانے کی کوشش کرے گا۔ کارندے نے اپنی جانب سے بھی چندو کو تسلی دی اور انسپکٹر کے پیچھے مکان پر چلا گیا۔ اُس کی واپسی میں دیر ہو گئی۔ شام ڈھل گئی۔

چندو کی مایوسی میں اضافہ ہو گیا۔ لاج میں آ کر نرسنگ ہاسٹل سے نکلنے پر پچھتانے لگی۔ اگر وہ اجمل والے قصے کا حصہ نہ بنتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ آدمی برے وقت میں الٹی ہی تاویلیں سوچنے لگتا ہے۔ اسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ قسمت کا وار ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔ وہ کسی اور انداز میں صفیہ کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ صفیہ کے علاوہ بھی کئی لوگ اسے اپنے معمول میں مصروف رہ کر کھوجتے پھرتے تھے۔ وہ ہزاروں میں منفرد تھی۔ دور سے دکھائی دینے پر ہی پہچانی جاتی تھی۔ اگر وہ نقاب اوڑھنے کی عادت اپنا لیتی تو شاید زیادہ عرصہ تک چھپی رہ جاتی مگر اب سوائے پچھتانے کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اسے اُستاد نصری اور میرو شاہ سے توقعات وابستہ تھیں مگر وہ دونوں بھی پابند سلاسل تھے۔ وہ رہا ہونے کے بعد ہی اس کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔ نہ جانے اجمل کے ساتھ کیا گزری تھی؟ یہ پریشانی اپنی جگہ دل ہولا رہی تھی۔ آپریشن میں ہونے والی غیر معمولی تاخیر کے سبب اس کی زندگی کی موہوم اُمید دم توڑنے لگی تھی۔

تھانے کی حدود میں چلتے پھرتے وردی پوشوں اور حوالات کے سامنے کھڑے سنتریوں کی ہوس بھری نگاہوں سے وہ بری طرح نروس تھی۔ رات آٹھ بجے تک اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ ایسے ہی وقت میں اسے انسپکٹر بدرو دکھائی دیا۔ وہ سفید کلف دار لٹھے میں ملبوس شاہانہ چال چلتا ہوا اس کے سامنے سے گزر کر آفس کی طرف بڑھ گیا۔ ایک اجنبی شخص اس سے چپکا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انسپکٹر اسے گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔ چند لمحوں بعد تھانے کے خاموش ماحول میں ہلچل کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر سلاخوں سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ جھانک کر ہلچل کے سبب کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ پتا چلا کہ انسپکٹر کے حکم پر اہلکاروں نے تھانیدار کے ساتھ آنے والے شخص کو پکڑ کر مردانہ حوالات میں ڈال دیا تھا۔

گھنٹا بھر کے بعد انسپکٹر بدرو اسے سلاخوں کے پار دکھائی دیا۔ نوکیلی مونچھوں والا ایک سیاہ فام وردی پوش اس کے ساتھ تھا۔ انسپکٹر بدرو نے چندو کی طرف اشارہ کیا، کہا۔ ”یہ رہی تمہاری مجرم...... مسماۃ چندو ماہی!“ اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ ناچنے لگی۔ ایک ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”یہ دیکھنے میں نرم و نازک ہے مگر بہت ڈھیٹ جان ہے۔ اس سے اقبالی بیان لینے پر خاصی محنت کرنا پڑے گی۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں کہا ہے کہ بجائے تفتیشی آفیسر کے، تم خود اس کی تفتیش کر لیں۔ ادھر مکان پر لے جا کر۔ وہاں کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہوگا۔ مان گئی تو ٹھیک، ورنہ تم اُدھر شجاع آباد لے جا کر اپنے طریقے سے اس سے اعترافِ جرم کروا لینا۔“

سیاہ فام اہلکار جو یقیناً انسپکٹر بدرو کا ہم منصب تھا، کی تمام تر خباثت چہرے پر ہویدا ہوئی، مسکرایا اور ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ”یار بدرو! تم بڑے اُستاد آدمی ہو۔ ٹھیک ہے بھئی۔ جہاں کہتے ہو، وہیں لے چلتے ہیں۔ مکان پر کوئی دوا دارو بھی رکھا ہے یا نہیں؟“

چندو کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ وہ دونوں کے درمیان ہونے والی معنی خیز گفتگو سن کر کانپنے لگی۔ کافی عرصہ یارن خان اور میاں دلبر حسین جیسے خونیں شکاریوں کے پنجوں میں رہنے کی وجہ سے ان مکالموں کی سنگینی کو سمجھتی تھی۔ چیخ کر بولی۔ ”میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ تم لوگ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، یہیں پوچھ لو۔ میں کسی مکان وکان پر نہیں جاؤں گی۔“

انسپکٹر عباس بدرو ہنسا۔ سیاہ فام کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مکارانہ انداز میں بولا۔ ”سوہنیو! ڈر کیوں گئے ہو؟ یہ بڑا بھلے مانس افسر ہے۔ اس سے تعاون کرو گی تو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ چکر دینے کی کوشش کرو گی تو تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر تمہاری سوہنی سوہنی آنکھوں میں ڈال دے گا۔ کیوں بھئی باجوے! میں نے غلط تو نہیں کہا ناں تمہارے بارے میں؟“

باجوے نے مکروہ انداز میں ہنس کر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی اور کہا۔ ”ان باتوں کو چھوڑو۔ خود ہی دیکھ لے گی کہ میں کیسا ہوں۔ فوراً نکل پڑو۔ صبح سے پہلے میرا تھانے پہنچنا بے حد ضروری ہے۔ دیر ہو گئی تو میر زادے شہر میں جلوس نکال دیں گے۔“

تقریباً ایک گھنٹے بعد چندو پرانا شجاع آباد روڈ پر واقع ایک مضافاتی بستی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک فارم ہاؤس میں انسپکٹر عباس بدرو اور انسپکٹر خلیل باجوہ کی مشترکہ تفتیش بھگت رہی تھی۔ ان کی اس شیطانی تفتیش میں کوئی سوال شامل نہیں تھا۔ فارم ہاؤس لائے جانے کے دوران چندو نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی چیخ و پکار سننے والا قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی سے وہی عذاب جھیل رہی تھی جہاں سے ڈاکٹر منور علی شاہ نے اُسے نکالا تھا اور دل ہی دل میں کوس رہی تھی میڈم جوزفین کے دم کو جس کی لچھے دار باتوں میں الجھ کر اس نے اپنا پُرامن اور محفوظ مستقبل برباد کر ڈالا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں اور پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔

کمرے میں وال ٹو وال دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ریشمی کور والے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے باہر برآمدے میں ایک سپاہی کرسی پر بیٹھا پہرا دے رہا تھا۔ اسے کمرے کے اندر سے کسی کے بھاگ نکلنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ باہر کے کسی آدمی کی غیر متوقع آمد پر خبردار کرنے پر مامور تھا۔ رات کی سیاہی اور مضافات کے سکوت نے ماحول کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ایسی دبیز راتیں اپنے دامن میں بہت کچھ چھپا لیتی ہیں۔ کمرے کے اندر ہونے والے ظلم پر بھی رات قبائے لاعلمی اوڑھا رہی تھی۔

ولایتی شراب کے نشے میں چور دونوں ہٹے کٹے حرام زادوں کی جان لیوا تفتیش نے اُسے ڈیڑھ دو گھنٹوں میں ہی توڑ کر رکھ دیا۔ بے جان انداز میں چاروں شانے چت پڑی آر سی سی کی چھت کو گھور رہی تھی۔ قانون کے طاقتور ہرکارے بھی ہانپتے ہوئے ایک جانب مردہ کتوں کی طرح قالین پر پڑے تھے۔ انسپکٹر عباس بدرو کے ڈراؤنے خراٹے اور خلیل باجوہ کے منہ سے خارج ہوتی بدبو دار رطوبت نے کمرے کی فضا کو بے حد کریہہ بنا رکھا تھا۔ چندو نے چند لمبی لمبی سانسیں لیں۔ ہتھیلیوں کے بل طوعاً و کرہاً اُٹھی۔ اچانک نظروں میں مظہر علی عرف مذرے کا بدنما چہرہ گھوم گیا۔ وہ چوبی ملنا یاد آ گیا جس کی مدد سے اُس نے مذرے کا سر توڑا تھا۔ وہ اگر اس کے ناتواں ہاتھوں سے مر سکتا تھا تو یہ دونوں بھی خون میں لت پت ہو سکتے تھے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنا بکھرا ہوا وجود سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لباس پہنا اور محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا۔ کوئی ملنا یا اس سے ملتا جلتا ہتھیار نظر نہیں آیا تو ایک ذرا مایوسی ہوئی۔ یہ کمرا بالکل خالی تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے ریشمی گاؤ تکیے پڑے تھے جن کی مدد سے وہ دو سانڈوں کو قتل نہیں کر سکتی تھی۔

اچانک اس کی آنکھوں میں زندگی اور پھر درندگی کی لہر دوڑ گئی۔ انسپکٹر خلیل باجوہ کی یونیفارم دیوار گیر کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ ایک کھونٹی پر پیٹی اور ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس کی نظر ہولسٹر سے جھانکتے ہوئے پستول پر پڑی۔ وہ مردہ کتوں کی طرح آڑے ترچھے پڑے ہوؤں سے بچ کر ہولسٹر تک پہنچی۔ کانپتے ہاتھوں سے پستول نکالا۔ دیکھا۔ کبھی چلایا نہیں تھا۔ اب تک صرف فلموں میں ہیرو اور ولن کو پستول چلاتے دیکھ رکھا تھا۔ ملک افراسیاب کو گولی چلاتے دیکھا تھا۔ ہونٹ بھینچ کر سوچنے لگی، ’چلانے کی کوشش کروں گی تو گولی چل ہی جائے گی۔‘

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑا اور بدرو کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ وہ پہلو کے بل پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ چندو نے پستول کی نال کا رُخ اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کی طرف کیا اور دانت کچکچاتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے کی زوردار آواز اور مخصوص جھٹکے نے اُسے ڈرا دیا۔ وہ ڈگمگا کر دیوار سے ٹکرائی۔ پھر تکیے پر گری۔ فوراً ہی سنبھل کر اس نے جب بدرو کی طرف دیکھا تو دل یکبارگی توانا ہو گیا۔ اس کا حملہ کامیاب رہا تھا اور عباس بدرو خون میں لت پت بری طرح تڑپ رہا تھا۔ نرسنگ کی دو سالہ تربیت نے اسے سمجھا دیا تھا کہ بدرو پر دوسرا فائر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی۔ کھوپڑی کے مخصوص حصے میں لگنے والی ایک گولی ہی کافی تھی جس نے اپنے شکار کو چیخنے کی مہلت تک نہیں دی تھی۔

گولی کی زوردار آواز نے نہ صرف انسپکٹر خلیل باجوہ کے کوے جیسے سیاہ بدن میں بیداری بھر دی تھی بلکہ کمرے کا اکلوتا دروازہ بھی مسلسل دھڑدھڑایا جانے لگا تھا۔ سنتری پریشانی کے عالم میں دروازہ بجانے کے ساتھ ساتھ بلند آواز میں ”کیا ہوا صاحب جی؟“ کے فلک شگاف نعرے بھی لگا رہا تھا۔

خلیل باجوہ شراب کے نشے اور گہری نیند کے استغراق میں تھا۔ اُسے چند لمحے کمرے کی بدلی ہوئی کیفیت کو سمجھنے کے لیے درکار تھے۔ تبھی اس نے بے ساختہ آنکھیں ملیں اور بدرو کے اوپر نیچے جھٹکے لیتے ہوئے بدن کو غور سے دیکھا۔ اس کی مخمور نگاہیں کچھ نہ سمجھ پائیں مگر جونہی چندو اور چندو کے ہاتھوں میں دبا ہوا اپنا سرکاری پستول نظر آیا؛ اس کا نشہ آنِ واحد میں ہرن ہو گیا اور بجلی کی سی مستعدی سے اُٹھ کر چندو کی طرف بڑھا۔ اس کے ذہن نے فوری طور پر یہ کام نہیں کیا تھا کہ عباس بدرو کی کھوپڑی میں گولی اُتارنے والی اُس کی زندگی کا بھی قلع قمع کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

چندو نے اس کے سینے کا نشانہ لیا۔ گولی چلانا ہی چاہتی تھی کہ طوفانی رفتار سے چندو کی جانب بڑھنے والا انسپکٹر بدرو کے ٹھنڈے ہوتے جسم سے اُلجھ کر زمین بوس ہو گیا۔ وہ چندو کے نہایت قریب گرا تھا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور اس کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھ کر فائر کر دیا۔ گولی اس کے بائیں کان سے کوئی انچ بھر اوپر لگی اور کھوپڑی چیرتی ہوئی بیچ میں ہی کہیں پھنس گئی۔ اس کا بھاری بدن دو فٹ کے قریب ہوا میں اچھلا اور بدرو کے بدن کے آخری جھٹکوں کی گود میں گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی دونوں بانہیں بڑے خوفناک جھٹکوں کے ساتھ ساتھ لہرا رہی تھیں جبکہ منہ سے کم بلند خراٹوں سے ملتی جلتی آواز برآمد ہو رہی تھی۔

چندو کے ہاتھوں سے پستول چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ بائیں ہاتھ پڑے ہوئے تکیے پر گولیوں کے دونوں خول گرے تھے جن سے بارودی دھوئیں کے مرغولے اُڑ رہے تھے۔ دونوں اُس کی عزت کا جنازہ کاندھوں پر اُٹھائے قبر کا رُخ کر چکے تھے۔

اس دوران دروازے پر دستک دینے والے ہاتھوں میں ہیجانی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ چندو نے خوفزدگی کے عالم میں لرزتے ہوئے دروازے کو دیکھا اور جلدی سے پستول اُٹھا لیا۔ ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے اور وہ قالین پر پڑے ہوئے پستول کو دیکھ کر دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ دروازے کے علاوہ کمرے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ خوف دامن گیر تھا کہ دروازے پر ایک پولیس والا پہرا دے رہا تھا جو اپنے آقاؤں کی لاشیں دیکھتے ہی اُسے گولی مار دے گا۔ ڈرتے ڈرتے دروازے تک آئی۔ اپنی زبوں حال کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اونچی آواز میں بولی۔ ”کیا بات ہے؟ کیوں دروازہ توڑ رہے ہو؟“

ایک چیختی ہوئی آواز، جس سے برہمی آشکار تھی، سنائی دی۔ ”دروازہ کھولو۔“

وہ گردن موڑ کر ایک نظر ساکت و جامد پڑے درندوں کو دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ”دروازہ نہیں کھلے گا۔ تم آرام سے بیٹھے رہو۔“

”دروازہ کھولو ورنہ توڑ دوں گا۔“ چندو کے کانوں میں بھاری غراہٹ گونجی۔

وہ سہمی مگر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔ ”ایسی حرکت کرو گے تو تمہارا صاحب تمہاری گردن توڑ دے گا۔ اگر کہتے ہو تو میں اسے جگا دیتی ہوں۔“

چند لمحے خاموشی حائل رہی۔ دروازہ توڑ دینے کی دھمکی دینے والا سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ایک ذرا توقف کے بعد قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ”یہ فائر کس نے کیے ہیں؟“

”تمہارے صاحب نے تکیے کو اشتہاری مجرم سمجھ کر اس میں دو سوراخ کیے ہیں۔ اب پستول ایک طرف پھینک کر اطمینان سے پڑا خراٹے لے رہا ہے۔“ چندو نے چالاکی سے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”دونوں صاحب نشے میں ہیں۔ اگر انہوں نے تمہیں اپنا دشمن سمجھ لیا تو مجھے گلہ نہ دینا۔“

سنتری کی نہ سمجھ میں آنے والی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا مگر شراب پینے والے ساتھیوں کی حرکات سے بخوبی واقف تھا، بولا۔ ”کیا تم دروازہ کھول کر مجھے ایک نظر دیکھنے نہیں دو گی؟“

چندو سمجھ گئی کہ اس کا وار خطا نہیں گیا تھا کیونکہ سنتری کا لہجہ نرم اور مفاہمانہ ہو گیا تھا، بولی۔ ”نہیں...... وہ ایسی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ تم انہیں ایک نظر دیکھو۔“

سنتری جانتا تھا کہ اندر تفتیش کے نام پر کون سا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اس لیے سر ہلاتے ہوئے دروازہ چھوڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

چندو دونوں لاشوں سے ذرا فاصلے پر تکیے پر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے انسپکٹر عباس بدرو کی برہنہ پنڈلی کے پھڑکتے ہوئے ماس کو گھورنے لگی اور دروازے پر موجود پولیس والے کی نظروں سے بچ کر فارم ہاؤس سے نکلنے کے بارے سوچنے لگی۔ دو چار منٹ کی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اُسے ٹھکانے لگائے بغیر وہ نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ فارم ہاؤس کا راستہ بہت سنسان تھا۔ رات گہری تھی۔ وہ راستہ بھول سکتی تھی یا سمت کا تعین کرنے میں غلطی بھی کر سکتی تھی۔ دوسری پریشانی یہ تھی کہ فارم ہاؤس میں کہیں ایک سے زیادہ پولیس والے موجود نہ ہوں۔ ان خدشوں کے باوجود یہاں سے نکلنا بھی ضروری تھا ورنہ اُسے انتقاماً فی الفور گولی مار دی جاتی یا وہ ایک قتل کے بعد دہرے قتل کے الزام میں گرفتار ہو جاتی۔ اس صورت میں اُسے تختہ دار سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔

اچانک اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔ یاد آ گیا کہ برسوں پہلے فدرے کے مکان پر وہ اسی طرح دو لاشوں کے سرہانے بیٹھی اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھی۔ اس دن ڈاکٹر منور علی اسے جہنم کدے سے نکالنے کے لیے آ گیا تھا۔ تب بھی کسی کے آن پہنچنے کا امکان نہیں تھا۔ آج بھی کوئی امید نہیں تھی۔ اگر اس دن قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے غیبی مدد بہم پہنچا دی تھی تو آج بھی مدد مل سکتی تھی۔ کچھ دیر انتظار کیا۔ کوئی آس بر نہیں آئی۔ ایک نفرت بھری نگاہ عباس بدرو اور خلیل باجوہ پر ڈال کر اپنی ہمتیں یکجا کر کے اُٹھی اور دروازے تک آئی۔ کان لگا کر باہر کی سن گن لی۔ کچھ سنائی نہیں دیا تو اس نے بغیر آواز پیدا کیے چٹخنی کھول کر دروازے میں درز بنا کر باہر جھانکا۔ دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی کرسی پر ایک جانب گردن لڑھکائے پہرے دار نیند کے جھولے میں جھول رہا تھا۔

وہ دبلا پتلا شخص تھا۔ وردی اُس کے استخوانی بدن پر بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ اس کی کمزور بدنی دیکھ کر چندو کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ پستول کو فائرنگ پوزیشن میں رکھتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ٹریگر دبانا ہی چاہتی تھی کہ ایک خیال ذہن میں برقی کوندے کی طرح لپکا۔ رُک کر سوچ میں پڑ گئی۔ اسے سوتے میں قتل کرنا آسان تھا مگر اس کے بعد یہاں سے نکل کر شہر جانا مشکل تھا۔ یہی سوچ کر اُس نے بڑی آہستگی سے کرسی کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کی ہوئی گن اُٹھائی اور اپنے کندھے پر ڈال لی۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر کریدتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی کہ کہیں اس کے پاس پستول یا کوئی اور ہتھیار تو نہیں تھا۔ تسلی ہونے پر اس نے پستول کا رُخ اس کے سینے کی طرف کیا اور پاؤں کی زوردار ٹھوکر اس کے گھٹنے پر ماری۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوا اور خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ جونہی اس کے ذہن پر چھایا ہوا نیند کا خمار اُترا، چندو کے ہاتھوں میں پستول نظر آیا تو اس کی آنکھوں میں دہشت بھر گئی۔ ”کک...... کیا مطلب؟ یہ...... یہ تم کیا کر رہی ہو؟ اسے نیچے کرو۔ کہیں چل نہ جائے......“

وہ دانت پیس کر بولی۔ ”خبردار! اُٹھنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گی۔“

وہ کرسی سے اُٹھتے اُٹھتے تھم گیا۔ وائرلیس سیٹ لڑھک کر فرش پر گر گیا۔ وہ وائرلیس سیٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے گردن موڑ کر کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھنے کے بعد ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔ چندو نے دیکھا کہ اس کا چہرہ اپنے افسروں کی لاشیں دیکھتے ہی پیلا پڑ گیا تھا اور ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ ذرا دلیر ہو گئی، غرائی۔ ”اگر تم نے کوئی خرمستی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا انجام بھی ان کتوں جیسا ہو گا اور اگر میرے ساتھ تعاون کرو گے تو زندہ بچ جاؤ گے۔ کیا خیال ہے؟“

اس نے جلدی سے سر اوپر نیچے ہلایا۔ تھوک نگل کر سراسیمگی میں بولا۔ ”تم جو کہو گی، مانوں گا مگر مجھے گولی نہ مارنا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

چندو نے چند قدم پیچھے ہٹ کر اُسے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا اور سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ بولی۔ ”کیا اس فارم ہاؤس میں تمہارے علاوہ بھی کوئی پہرے دار موجود ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”نہیں! ابھی جوان رات کو ہی وین میں بیٹھ کر واپس چلے گئے تھے۔“

”یہاں کوئی سواری موجود ہے؟“ چندو بڑی کوشش

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے اپنا لہجہ درشت بنا رہی تھی۔

"ایک موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ پتا نہیں وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔" اس کے لہجے کے موہوم سے ارتعاش نے چندو کو حوصلہ دیا، بولی۔ "تمہارے پاس اس کی چابی ہے؟"

"نہیں۔ وہ ڈائریکٹ ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، موٹر سائیکل کی طرف چلو۔"

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے صحن عبور کر کے لوہے کے شیڈ تلے آئے۔ سنتری نے درست کہا تھا۔ شیڈ تلے اجڑے رنگ والے ٹریکٹر کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے چندو کے حکم پر موٹر سائیکل کو شیڈ تلے سے نکالا اور اس پر بیٹھ کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا سالخوردہ انجن گھر گھرا کر بند ہو گیا۔ مہین وجود سنتری نے فیول ناب گھمائی، چوک اُٹھائی اور دو تین مرتبہ پوری قوت سے کک ماری۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ نہ ہوئی تو مایوسانہ نظروں سے چندو کو دیکھتے ہوئے نیچے اُتر آیا، بولا۔ "لگتا ہے، یہ کام نہیں دے گا۔"

چندو پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ یہاں سے فی الفور نکلنا چاہتی تھی اور جانتی تھی کہ پیدل چل کر شہر تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ سڑک پر بھی کسی سواری کا ملنا توقع سے باہر تھا۔ زیادہ سوچ بچار کا وقت بھی نہیں تھا اس لیے فیصلہ کن انداز میں پستول تان کر خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "لگتا ہے، تم بھی کام نہیں دو گے، اس لیے تمہاری بھی چھٹی کرانا ہو گی۔"

اس کا نام امام دین تھا مگر یار دوستوں اور ہم منصب اہلکاروں کی تضحیک آمیز بے تکلفی نے اُسے ماے خان بنا دیا تھا۔ قانون نے اُسے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے پال رکھا تھا۔ جب بندوق اُٹھا کر نہتے اور قانون کا احترام کرنے والوں کے سامنے جاتا تھا تو اس میں چنگیزی روح حلول کر جایا کرتی تھی۔ یہاں معاملہ مختلف تھا۔ اگر اس نے اپنے دو ہٹے کٹے افسروں کو کمرے میں مردہ حالت میں نہ دیکھا ہوتا تو شاید اکڑ جاتا مگر اس وقت خوب رُو لڑکی کی صورت میں موت آنکھوں کے سامنے آن کھڑی ہوئی تو اس کی گھگی بندھ گئی۔ ہاتھ جوڑ کر زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ زندگی کے عوض میں ہر تعاون کی پیشکش کرنے لگا۔

اس کی کانپتی ہوئی آواز اور بدن پر طاری واضح کپکپی نے چندو کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ سرد لہجے میں بولی۔ "سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں چانس دیے بغیر تمہیں گولی مار دوں گی۔"

"مم...... میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کروں گا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو اور میرے بچوں کو یتیم نہ کرو۔" اس نے اپنے ہاتھ بہ دستور جوڑ رکھے تھے۔

چندو کے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔ ضرورت انسان کو مفاہمت کا راستہ دکھا دیتی ہے۔ اسے یہاں سے نکلنے کے لیے اس ماے خان کی ضرورت تھی، بولی۔ "مجھے فوری طور پر شہر پہنچاؤ۔"

ماے خان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ٹریکٹر پر نظر پڑی۔ اُسے جا کر ٹھونک بجا کر دیکھا اور اس کے صحت مند ہونے کا اعلان کر دیا، کہا۔ "ہم اس پر شہر جا سکتے ہیں۔"

رات پر صبح کی سپیدی حملے کرنے لگی تھی۔ کوئی اور چارہ نہ پا کر چندو نے آمادگی ظاہر کی تو ماے خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی جبکہ چندو ٹریکٹر کے ہائیڈرالک لیور پر پیر جما کر ڈرائیونگ سیٹ کے عقب میں لگے ہوئے چوبی تختے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پستول اس طرح ماے خان کی پشت سے لگا دیا کہ وہ اس کے گھٹنوں میں چھپ گیا۔ قریب سے دیکھنے پر بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اس نے ماے خان کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ دو تین مرتبہ کی کوشش کے بعد ٹریکٹر کا انجن بیدار ہو گیا۔ ماے خان کو ٹریکٹر کی ڈرائیونگ پر عبور نہیں تھا مگر وہ گزارا کر لیتا تھا۔ اس نے ایک جانکاہ جھٹکے کے ساتھ ٹریکٹر کو شیڈ تلے سے نکالا اور تھوڑی تگ و دو کے بعد کچے راستے پر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ سڑک کے کنارے فصل کی اونچائی قدرے زیادہ تھی۔ چندو نے کندھے سے گن اُتاری اور ماے خان کی بے خبری میں ایک طرف اچھال دی۔

رات کے اس پہر میں سڑکیں سنسان تھیں۔ ٹریکٹر کا اسٹیئرنگ ویل کسی اتھرے گھوڑے کی لگام کی طرح بار بار ماے خان کے ہاتھوں میں پھسل رہا تھا۔ یہ اعجاز کچھ تو اس کی ناتجربہ کار ڈرائیونگ کا تھا اور کچھ کمال کمر میں چبھنے والی پستول کی نال کا تھا۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی جس کی وجہ سے ٹریکٹر بے تحاشا اُچھل کود کر رہا تھا۔ شہر پہنچنے تک چندو کا برا حال ہو گیا۔ اوور ہیڈ برج سے اُترتے ہی اس نے ماے خان کو رکنے کا حکم دیا۔ وہ ٹریکٹر روک کر مستفسر ہوا۔ "کیا بات ہے؟ کیا یہیں اُترو گی؟"

چندو اس پر قدرے جھک آئی۔ کندھے پر سے ہاتھ کھسکا کر اس کی جیب تک لائی اور جو کچھ اس کی جیب میں موجود تھا، نکال لیا، بولی۔ "میں یہیں اُترنے لگی ہوں۔ آگے جانے کے لیے رکشا پکڑ لوں گی۔ میں چاہوں تو تمہیں یہیں گولی مار کر پھینک سکتی ہوں مگر میں نے تمہاری جان بخشی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تم ٹریکٹر موڑو اور واپسی کی راہ لو۔ اگر

کوئی گڑبڑ کرو گے تو سینے میں گولی مار دوں گی۔"

وہ گھگیا گیا۔ منت آمیز لہجے میں بولا۔ "خدا کے لیے مجھ پر یقین کرو؛ میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔"

چندو ٹریکٹر سے اُتر کر سڑک کی سائڈ پر کھڑی ہو گئی۔ امام دین عرف ماے خان سنتری نے برق رفتاری سے ٹریکٹر آگے بڑھایا، یوٹرن لیا اور اوور ہیڈ برج پر چڑھتا چلا گیا۔ برج سیدھی نہیں تھی۔ درمیان سے خم کھا جاتی تھی۔ اس خم تک ٹریکٹر دکھائی دیتا رہا پھر چندو کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب اس نے پستول اپنے لباس میں چھپایا اور چند قدموں کے فاصلے پر واقع چوک کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں تین چار آٹو رکشا ایک قطار میں کھڑے تھے۔ روڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے امام دین کے سامان کو ایک نظر دیکھا۔ تسلی ہوئی کہ کاغذوں کے پلندے میں سے کچھ نوٹ جھانک رہے تھے۔ اسے بروقت پیسوں کا خیال آ گیا تھا ورنہ وہ رکشا میں سفر کرنے کے قابل نہ ہوتی۔

وہ بہ ظاہر مطمئن اور بے پروا دکھائی دے رہی تھی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے کا خوف اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ ماے خان کی طرف سے کارروائی کیے جانے کا خطرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ چندو کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ وہ اوور ہیڈ برج اُتر کر واپسی کی راہ کا، یعنی پرانا شجاع آباد روڈ کا رُخ نہیں کرے گا بلکہ کسی قریبی تھانے پہنچ کر اپنے افسران کے قتل کی رپورٹ دے گا۔ دو تھانیداروں کے قتل کی خبر سنتے ہی شہر بھر کی پولیس اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہونے والی تھی۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور وہ طے کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُسے اس وقت کہاں جانا چاہیے تھا جہاں پہنچ کر وہ کچھ دیر کے لیے پولیس کی نظروں سے چھپ جاتی۔ وہ اپنی کوٹھی پر نہیں جا سکتی تھی کیونکہ کوٹھی کا راستہ پولیس نے دیکھ رکھا تھا۔ آ جا کے اس کے پاس میڈم جوزفین کا سہارا باقی تھا۔ اس کا خیال آتے ہی چندو نے رکشا میں بیٹھتے ہی اسے اس اسپتال چلنے کا کہا جس کے ملحقہ نرسنگ ہاسٹل میں وہ دو سال تک مقیم رہی تھی۔

میڈم جوزفین ابھی سو رہی تھی۔ چندو کی دستک پر میڈم جوزفین نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ چندو کو دیکھتے ہی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ ہاتھ تھم گئے۔ تعجب سے گویا ہوئی۔ "چندو تم! خیر تو ہے ناں؟"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "خیر نہیں میڈم! مجھے اندر آنے دیں؛ میں آپ کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیتی ہوں۔"

میڈم اُسے اندر لے آئی۔ دروازہ بند کر کے، چندو کو بیڈ پر اپنے ساتھ بٹھا کر سوالیہ نظروں سے گھورنے لگی۔ چندو نے بلا کم و کاست تمام ماجرا کہہ سنایا اور سرکاری پستول لباس سے نکال کر بیڈ پر رکھ دیا۔

دو انسپکٹروں کے قتل کا سن کر اور پستول دیکھ کر میڈم جوزفین کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھٹنے کو آ گئیں۔ ہکلا کر بولی، "یہ...... یہ تم نے کیا کر دیا بے وقوف لڑکی؟ اب تک تو شہر بھر کی پولیس ہوٹر بجاتی ہوئی تمہاری تلاش میں نکل چکی ہو گی۔"

جوزفین نے اجمل اور اس کے باپ کی صحبت میں زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے مگر اتنی سنگین نوعیت سے اس کا واسطہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ تبھی گھبرا گئی تھی۔ تشویش آمیز انداز میں پیشانی پر ہتھیلی رگڑتے ہوئے بولی۔ "چندو! میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔ سب کچھ بتایا تھا مگر تم نے پھر بھی حماقت کر دکھائی۔ اگر تمہاری کہانی میں عمر حیات کے قتل کا واقعہ شامل تھا تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟ اوہ مائی گاڈ! اب کیا ہو گا؟"

وہ بڑبڑاتی جاتی تھی۔ ساتھ میں سوچتی بھی جاتی تھی۔ جانتی تھی کہ پریشانی کبھی پریشان ہونے سے تحلیل نہیں ہوتی۔ بند راہوں کے بیچ کوئی درز کھوجنا پڑتی ہے۔

چندو سر جھکائے متفکر انداز میں بیٹھی ناخن کھرچتی رہی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک مصیبت سے نکل آئی تھی۔ دوسری منہ پھاڑے اُسے نگلنے کے لیے دہلیزِ جاں تک آ گئی تھی۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔

اس دوران میڈم جوزفین شاک سے نکل آئی۔ پستول اُٹھا کر اُسے تھمایا اور لباس میں چھپانے کا اشارہ کیا پھر فیصلہ کن انداز میں اُٹھتے ہوئے بولی۔ "اُٹھو چندو ماہی! تمہیں فوری طور پر کسی خفیہ ٹھکانے پر پہنچنا ضروری ہو گیا ہے ورنہ تم بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ پولیس میرے اور اجمل کے تعلقات کی نوعیت سے واقف ہے۔ بعید نہیں کہ کچھ ہی دیر بعد یہاں پہنچ جائے۔ اُٹھو! دیر نہ کرو۔"

چندو اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہاسٹل سے باہر آئی۔ میڈم نے سڑک پر جاتے ہوئے رکشا کو روکا۔ مول تول میں وقت ضائع کیے بغیر دونوں رکشا میں بیٹھ گئیں۔ میڈم نے اُسے اندرون شہر کے ایک محلہ میں پہنچانے کا حکم دیا اور آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔ چندو نے کچھ کہنا چاہا تو جوزفین نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ رکشا ڈرائیور کی موجودگی میں اس سنگین موضوع پر کوئی بات کی جائے اور نئی مشکل اپنے لیے پیدا کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

لی جائے۔

نصف گھنٹے کے بعد وہ اندرون شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک دوڈھائی مرلہ کے تنگ سے مکان میں بیٹھی تھیں۔ اس افلاس زدہ گھر میں مدقوق بشرے والی ایک پینتالیس سالہ عورت جسے جوزفین نے 'نجمہ' کے نام سے مخاطب کیا تھا، نے بہ ظاہر ان دونوں کی آمد پر کسی بھی استعجاب بھرے ردعمل کا مظاہرہ نہ کیا۔ چندو کو یوں محسوس ہوا جیسے جوزفین کی یہاں آمد اس کے نزدیک نہ ہی حیرت کا محرک تھی اور نہ ہی چندو کا اجنبی چہرہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتا تھا۔ گھر میں اوپر تلے دو کمرے تھے۔ اس نے صحن میں رُک کر جوزفین کو بالائی کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور خود ان کے لیے چائے یا ناشتا تیار کرنے کے لیے رسوئی میں گھس گئی۔

دیوار کے ساتھ نصب کی گئی سالخوردہ چوبی سیڑھی جوزفین کے وزن سے خطرناک انداز میں چرچرائی۔ چندو نے ازخود احتیاط کی اور جب جوزفین سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں داخل ہوگئی، تب اس نے تنگ سے زینے پر پاؤں رکھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی فرنیچر سے یکسر عاری کمرے کے پرانے قالین پر جوزفین کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھی تشویش آمیز نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ جوزفین کی کشادہ پیشانی پر فکروتردد کی غماز لکیروں کا جال تنا ہوا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دو پولیس افسروں کا قتل کسی بھی طرح ہضم نہیں ہوسکے گا اور اجمل، چندو ماہی اور خود اس کے گلے کی ہڈی بن جائے گا۔ وہ تھوڑی برہمی سے بولی۔ ''تمہیں کیا ضرورت تھی اپنے پیچھے عینی شاہد کو زندہ چھوڑنے کی...... جہاں دو تھانیداروں کو تم نے قتل کردیا تھا، وہاں ایک سپاہی تم سے مارا نہ جاسکا۔ تم نے حماقت کے بعد پھر حماقت کی۔''

''اُسے مار دیتی تو میں شہر کیسے آتی؟ وہ علاقہ بڑا ویران اور......''

''شِٹ! دوشیروں کو مارنے کے بعد بھی ڈر تمہارے اندر سے نہیں نکلا!'' اس نے ہونٹ سکیڑ کر کہا اور خاموش ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد نجمہ نے خاموشی سے ان کے سامنے سادہ سا ناشتا اور چائے کے دو بڑے پیالے رکھ دیے۔ جوزفین نے دریافت کیا، ''نجمہ! میروشاہ واپس نہیں آیا؟''

''رات کو ڈیڑھ بجے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اُسے فوری طور پر اسپتال پہنچنا ہے۔ بتا رہا تھا کہ صاحب کا آپریشن ہے۔'' نجمہ نے بتایا اور ان کے قریب ہی قالین پر ہتھیلی کی ٹیک پر بیٹھ گئی۔

''مم...... مگر اُسے تو پولیس پکڑ کرلے گئی تھی۔'' چندو نے حیرت سے کہا۔

''میروشاہ کے نزدیک گرفتار ہونا اور چھوٹ آنا بڑا کام نہیں ہے۔'' جوزفین نے قدرے بے پروائی سے کہا۔

نجمہ نے جوزفین سے پوچھا۔ ''تم اسپتال سے آرہی ہو؟''

''نہیں......'' جوزفین نے پراٹھا توڑ کر منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ ''میروشاہ نے تمہیں بتایا تھا کہ صاحب کا آپریشن کب ہونا ہے؟''

نجمہ نے نفی میں سرہلایا۔

ناشتا کرنے کے بعد جوزفین اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نجمہ کو سمجھانے لگی۔ ''نجمہ! یہ صاحب کی بیوی ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ خیال کرنا۔''

اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ حیرانی کی لہر نمودار ہوئی۔ چندو کو کریدتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ''تم فکر نہ کرو۔ یہ صاحب کی بیوی ہے تو میری مالکن ہوئی اور صاحب کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ یہ کب تک یہاں رہے گی؟''

''اسے یہاں تک پہنچانا میرا کام تھا، وہ میں نے کردیا۔ آگے میروشاہ جانے اور اس کا کام...... میں چلتی ہوں اور چندو! تم یہاں بے خوف ہوکر رہو۔ میروشاہ اسپتال سے فارغ ہوتے ہی یہاں آجائے گا۔ یہ اس کا گھر ہے۔ نجمہ تمہارا خیال رکھے گی۔ چاہو تو نہادھوکر فریش ہوجاؤ اور دو چار گھڑیاں آرام کرلو۔'' جوزفین نے پیار سے چندو کے گال تھپتھپائے اور چوبی سیڑھیاں اُتر گئی۔ نجمہ بیرونی دروازہ بند کرکے اس کے پاس آبیٹھی۔

چندو کی توقع کے برعکس نجمہ نے اس سے کچھ بھی پوچھنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ اس کا لہجہ مؤدبانہ اور سپاٹ تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت تھی۔ جوزفین نے اس کے ذمے یہی کام لگایا تھا کہ چندو کا خیال رکھے اور اس نے میروشاہ کے آنے تک چندو ماہی کا ہر طرح سے خیال رکھا۔

میروشاہ طویل اور جانکاہ انتظار کرانے کے بعد چندو کو ابتدائے شب میں نظر آیا۔ خاصا تھکا ہوا اور نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ چندو نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور بولا۔ ''مارا جانی یار...... ماڑا باچھا ماڑے کو چھوڑ جاوت ہے رانی جی! ہاہا...... کیا جلم (ظلم) ہووت ماڑی جان پر کہ جندگی (زندگی) ہی بے کار نجر (نظر) آوت ہے......''

وفورِ کرب سے چندو کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ زبان ہکلا گئی۔ بولی۔ ''کک...... کیا مطلب؟ اجمل صاحب مر گئے؟ اوہ میرے خدا! اب کیا ہوگا؟''

میروشاہ گھٹنوں میں سر ڈال کر ہولے ہولے سسکنے لگا۔ بڑبڑاتے ہوئے رانوں پر ہاتھ مار مار کر بین کرنے لگا۔ اجمل کے ساتھ گزرنے والی گھڑیوں کو یاد کرتے ہوئے واویلا کرنے لگا۔ اس کی بڑبڑاہٹوں سے چندو نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اجمل نے آپریشن کے دوران اپنی جان خالقِ حقیقی کے سپرد کردی تھی۔ چونکہ طویل بیماری نے اس کے بدن کی قوتِ مزاحمت کو دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا اس لیے وہ ڈاکٹروں کی چیرپھاڑ کے مقابلے میں خود کو زندہ نہ رکھ سکا۔

چندو کا ہاتھ تھام کر میروشاہ سسکا۔ ''یہ کس مقام پہ سوجھت تیرے کو بچھڑن کی...... اب تو آجا کہ دن سنورن کو آوت تھے......''

(یہ کس مقام پہ سوجھی تجھے بچھڑنے کی؛ اب تو آجا کہ دن سنورنے والے تھے)

اجمل ایک مختصر کردار لے کر چندو کی زندگی میں وارد ہوا تھا۔ بعض مختصر کردار پوری زندگی پر محیط ہوجاتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی تھا۔ مرگیا مگر چندو کے دل سے دُکھ کو محسوس کرنے والا حصہ ہی نکال کرلے گیا۔ بجا کہ اس کی موت اچانک نہیں تھی اور اس کی موت چندو کے مستقبل کے لیے خوش آئند بھی تھی مگر وہ اس کے لیے اس شدت سے ٹوٹ کر روئی کہ جل تھل ایک ہوگیا۔ اپنی زندگی میں لوٹ پوٹ کے تمام تر دکھ اور اضطراب شاید ایک ہی نقطے میں آن سمائے تھے۔ کافی دیر رونے کے بعد ازخود سنبھلی۔ پانی پیا اور میروشاہ سے محوِ کلام ہوگئی۔ اس نے اجمل کے آپریشن کی تفصیلات سنیں۔ میروشاہ اور نصر حیات نے بغیر وقت ضائع کیے اس کی موزوں انداز میں تدفین کردی تھی۔

وہ اجمل کی موت کے دکھ سے ایک ذرا نکلا تو اُسے چندو کی یہاں موجودگی پر تعجب ہوا۔ اس کے استفسار پر چندو نے پھر اپنی رام کہانی سنائی۔ میڈم جوزفین کے برعکس میروشاہ نے بے پروائی سے کندھے اُچکائے اور بولا۔ ''تو کیا ہووت؟ ماڑے دھندے میں جندگی ایسے ہی گجرت ہے رانی جی! ایک دم فکر نہیں کرت۔ سوچ لیوت کہ باچھا کی جاہ سنبھال لیوت؟...... ماڑے کو معلوم ہووت کہ کیا کرنا ہووے، کیا نہیں کرنا ہووے...... تم ادھر آرام سے سو جاؤ، بس!''

وہ دلاسا دے کر نچلے کمرے میں چلا گیا۔ علی الصباح جب وہ چندو کے پاس آیا تو اس کے عقب میں استاد نصر حیات بھی دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں نے مؤدبانہ انداز میں اُسے سلام کیا اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر قالین پر بیٹھ گئے۔

میروشاہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''چندو رانی! ماڑے کو اتنا بتا دیوے کہ ماڑے باچھا (بادشاہ) کی راج واڑی کا تاج سر پر رکھت یا جورو ماتق رسوئی پر راج مانگت؟''

وہ فوری طور پر میروشاہ کی بات سمجھ نہ پائی۔ اکثر میروشاہ کی مافوق الفطرت باتیں اس کے سر سے گزر جاتی تھیں۔ نصر حیات اس کے چہرے سے دلی حالت بھانپ گیا۔ مؤدبانہ انداز میں سمجھانے لگا۔ پوچھنے لگا کہ وہ اجمل کا کاروبار سنبھالنے کا ارادہ رکھتی تھی یا عمومی عورتوں کی طرح گھر بسانے کے خواب دیکھتی ہے۔ اس کے سامنے دونوں راستے کھلے تھے۔ اس نے گڑبڑا کر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ اُسے ڈر تھا کہ پولیس اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی اور تین افراد کے قتل کے الزام میں پھانسی کے تختے تک پہنچا دے گی۔ وہ عزت کی زندگی گزارنے کے واقعتاً خواب دیکھتی تھی مگر ماضی کی کرچیاں آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔ اس نے سر جھکا کر بہت کچھ سوچا۔ خود کو بھیڑیوں کے غول میں پاکر ایک ذرا گھبرائی پھر مستفسر ہوئی۔ ''میرا مستقبل کیا ہے؟''

میروشاہ اپنے مخصوص استہزائیہ انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نصر حیات نے جلدی سے کہا۔ ''مستقبل کے بارے خدا بہتر جانتا ہے۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم آپ کی حفاظت میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ رہی بات پولیس کی...... تو یہ فکر دل سے نکال دیں۔ قانون کی آنکھوں میں مرچیں ڈالنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ صاحب کے انداز میں کاروبار اور گروپ سنبھالنا چاہیں یا اپنی جائداد بیچ کر کسی اور شہر جا بسنا چاہیں، پولیس آپ کی گرد کو بھی چھو نہیں سکے گی۔ ذہن کو مستقبل کی پریشانیوں سے پرے رکھ کر فیصلہ کیجیے۔''

وہ شش و پنج میں گرفتار ہوگئی۔ میروشاہ اُسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے لگا۔ چندو نے جونہی گروپ کو سنبھالنے کی خواہش ظاہر کی، نصر حیات اس کے آئندہ کے کردار کا نقشہ کھینچنے لگا۔ چندو کو اس کا منصوبہ اچھا لگا۔

چندو ماہی پر عمر حیات اور دو انسپکٹروں کے بہیمانہ قتل کے مقدمے درج ہوچکے تھے۔ ایف آئی آر خاموش تو رہتی ہے مگر مٹنے کا نام نہیں لیتی۔ نصر حیات نے کہا تھا کہ اب جس بھی حکمتِ عملی کے مطابق چلا جائے، پولیس والوں سے پیچھا نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

چھڑایا جاسکتا۔ ان تینوں مقدمات کے چالان عدالت میں منتقل کرنا پولیس کی مجبوری تھی۔ عدالتی کارروائی بہت طویل تھی جبکہ اس دوران چندو ماہی کو بہر صورت جیل میں رہنا تھا۔ اس نے جیل نہیں دیکھی تھی مگر تھانیدار کے رویے کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُسے جھرجھری سی آگئی۔ سن رکھا تھا کہ جیل تھانے سے کہیں بڑا صعوبت خانہ تھا۔ تبھی پریشان ہوگئی۔

نصر حیات بولا۔ ”نہیں میڈم! میں نے کہا ناں کہ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ذرا غور سے سنیں۔“

وہ بتانے لگا کہ اس کی سگی بھانجی ایک ماہ پہلے گردن توڑ بخار کی لپیٹ میں آکر مرگئی تھی۔ اس کا نام شکیلہ رانی تھا۔ نصر حیات کی بہن اور بہنوئی ملتان کے ایک مضافاتی قصبے عباس پور میں رہتے تھے۔ غریب لوگ تھے۔ گزر بسر بہ مشکل ہوتی تھی مگر انہوں نے اپنی بیٹی کو جیسے تیسے کرکے کالج تک پہنچا دیا تھا۔ جونہی اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا، بیماری کے بھیس میں چھپی ہوئی موت نے آن دبوچا۔ ماں باپ کی کمر ٹوٹ گئی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی اکلوتی بیٹی کو تینوں بیٹوں پر فوقیت دی تھی۔ غریبوں کے ہاں شہری چونچلے کم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بیٹی کی مرگ کو سرکاری رجسٹر پر درج نہیں کرایا تھا۔ یعنی وہ دنیا کی نظروں سے اُٹھ گئی تھی مگر سرکاری کھاتے میں زندہ تھی۔ نصر حیات کے اندازے کے مطابق وہ چندو کی ہم عمر واقع ہوئی تھی اس لیے بہ آسانی قانونی طور پر اس کی جگہ لے کر قانون کی نظروں سے چھپ سکتی تھی۔

چندو نے حیرت سے سنا اور نصر حیات کے خاموش ہونے پر حیرت سے پوچھا۔ ”کیا شکیلہ رانی کے ماں باپ مان جائیں گے؟“

وہ بولا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے سگے رشتہ دار ہیں۔ بہن اور بہنوئی ہیں۔ نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیسا دنیا کے ہر مرض کا علاج ہے۔ انہیں ہم عباس پور سے نکال کر کسی اور دیہات میں دو چار ایکڑ جگہ لے دیں گے یا یہیں شہر میں لا بٹھائیں گے۔ روٹی کا وسیلہ بنادیں گے اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے بھی ساتھ دے دیں گے تو وہ ہمیشہ یہی کہیں گے کہ ان کی بیٹی شکیلہ رانی ابھی زندہ ہے۔ جب آپ شکیلہ کے ڈاکومنٹس پر یونیورسٹی جوائن کرلیں گی، اپنا حقیقی نام تک بھول جائیں گی تو آپ کو چندو ماہی قرار دے کر پولیس کبھی گرفتار نہیں کرسکے گی۔ کیوں شاہ جی؟ کیا خیال ہے؟“

میرو شاہ نے توصیف بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا۔ ”ماڑا جیا خوش کردیوت نصری اُستاد! ایک دم جبردست (زبردست) دیوت ہے ماڑے یار نے قانون کی پچی ہوئی چھاتی پر...“

چندو نے چند لمحے سوچا۔ پہلی سی نادانی نہیں رہی... ابھی پختہ کار بھی نہیں ہوئی تھی۔ پوچھنے لگی۔ ”مگر میری... کا کیا بنے گا؟ وہ تو میرے، یعنی چندو ماہی کے نام...“

نصر حیات نے مسکرا کر کہا۔ ”چونکہ پولیس اور... مختلف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے کہ پو... آپ کے خلاف ایف آئی آر کٹنے سے ریونیو آفس کا... آپ پر بند ہوجائے۔ آپ وہاں جائیں گی اور اپنا... شکیلہ رانی کے نام ہائبہ کردیں گی۔ بس! اتنی سی بات...“

چندو کے دل میں خوف آمیز تشکیک ہلکورے... تھی۔ نصر حیات نے جس سہل انداز میں ہتھیلی پر سرسوں... کر اس کی آنکھوں کے سامنے کردی تھی، چندو کی سمجھ... بالاتر تھا مگر اس کے پاس سوائے اس پر اور میرو شاہ پر... کرنے کے چارہ نہیں تھا۔ اجمل نے مرنے سے پیشتر... سمجھایا تھا کہ میرو شاہ قابلِ اعتماد آدمی تھا۔ اپنے بعد... پر بھروسا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے سر میں درد... لگا تو اس نے اپنی آنکھیں پوری سختی سے بھینچ لیں... سانس لے کر بولی۔ ”میں کچھ نہیں جانتی...... میں کچھ... سکتی۔ مجھے اجمل صاحب نے کہا تھا کہ میرو شاہ... بھروسے کا آدمی ہے۔ ان کے کہنے پر میں تم پر آنکھیں... کر کے اعتماد کرتی ہوں۔ میرے لیے جو بہتر ہے، وہی... میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ مجھے جیل نہیں جانا۔ مجھے... نہیں جانا۔ اور بس!“

میرو شاہ نے آگے کھسک کر اس کے ہاتھ تھام لیے... چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بے یقینی سے... ”ماڑے بارے باچھا نے ایسا بولت...... سچ؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ”تو پھر ماڑی رانی اپنی آنکھیں بند ہی... چھوڑت...... میرو شاہ جانت؛ میرو شاہ کا کام جانت...... ماسٹر نصری! اب جو بھی کرنا ہوت، ماڑے کو ہی کرنا ہوت...“

دونوں نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اُسے... رہنے کا مشورہ دے کر چلے گئے۔

آنے والے بائیس دن چندو نے اُسی گھر میں نجمہ... ساتھ گزارے۔ پہلے اُس نے یہی سمجھا تھا کہ نجمہ میرو شاہ... بیوی ہے مگر اُسے بعد میں پتا چلا کہ وہ اُس کی بیوی تو رہی ایک... طرف، رشتے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ حالات کی ماری... بے چھت عورت تھی۔ اپنے خاندان کی دھتکاری...

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ اجمل کے پاس سر چھپانے کی جگہ مانگنے گئی تھی۔ اس نے میروشاہ کے حوالے کردیا۔ میروشاہ نے اُسے قبول کرتے ہوئے اپنی چھت اور چولھا فراہم کردیا جبکہ اس نے میروشاہ کی بیوی کا کردار سنبھال لیا تھا۔ وہ مشینی انداز میں نہ صرف اپنا اور میروشاہ کا کام کاج کرتی بلکہ چندو ماہی کا خیال بھی رکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے بدن اور ذہن میں کوئی خواہش یا ردِعمل سمیت کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ نہ ہنستی تھی، نہ روتی اور نہ ہی اُسے کسی بات پر غصہ آتا تھا۔ بعض اوقات چندو کو اس کے غیر فطری رویے پر اُلجھن سی ہونے لگتی تھی مگر وہ مجبوری کے عالم میں دن پر دن گزارتی چلی گئی۔

وہ زندگی کے خونیں پنجوں میں چاروں طرف سے جکڑی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی دانست میں سانس لینے کے لیے ننھی سی روزن دکھائی نہیں دیتی تھی مگر نصر حیات اور میروشاہ نے اُسے مکھن کے بال کی طرح قانون اور اجمل کے رشتہ داروں کے غیظ و غضب سے نکال کر شکیلہ رانی بنادیا۔ وہ دنیا سے رخصت ہوجانے والی شکیلہ رانی کے ماں باپ کو عباس پور سے نکال کر شہر لے آئے تھے۔ چوک رشید آباد کے قریب انہیں ایک چھوٹا مگر خوبصورت سا مکان خرید کر دینے کے بعد نصری کے دل گرفتہ بہنوئی کی خواہش پر شاہین مارکیٹ میں نئی سائیکلوں کی دکان بنادی گئی جس سے ان کی گزربسر کا بہترین بندوبست ہوگیا۔ وہ جن کی طنابیں غربت نے کھینچ کر گردن اکڑا رکھی تھی، وہ راتوں رات لکھ پتی بن گئے۔ چونکہ یہ پلان نصر حیات کا تیار کردہ تھا، اس لیے انہوں نے اپنی مرحوم بیٹی کی اس طریقے سے پُر ہونے والی جگہ کو دل و جان سے قبول کرلیا تھا۔

ہم عمر ہونے کی وجہ سے چندو ماہی نے بہ آسانی شکیلہ رانی کا رُوپ دھار لیا اور نصر حیات کے ساتھ ریونیو آفس جا کر اپنی جائداد شکیلہ رانی کے نام منتقل کرادی۔ اس دوران میروشاہ کی زبانی اُسے اپنی تلاش میں سرگرداں پولیس کی ناکام و نامراد چھاپہ مار کارروائیوں کا علم ہوتا رہا اور دل موہوم سے خدشات کی تال پر دھڑکتا رہا۔

میروشاہ نے اُسے رانی کا خطاب دے رکھا تھا جبکہ نصر حیات بڑے مؤدبانہ لہجے میں اُسے 'میڈم' کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ پہلے پہل اُسے یہ خطاب ناشناسا اور عجیب سا لگا تھا مگر دو چار دِنوں میں ہی اُسے عادت سی ہوگئی۔ وہ اور اُس کی ہم جماعت نرسیں جوزفین کو میڈم کہا کرتی تھیں۔ وہ پردہ بھی سے ہٹ گئی تھی۔ چندو ماہی شکیلہ رانی اور پھر میڈم شکیلہ بن کر پردے پر جگمگانے لگی تھی۔

میروشاہ نے اُس کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اجمل کے رشتہ داروں نے واویلا کھڑا کیا۔ جائداد کی وراثتی تقسیم کے عدالتی کیسوں نے اُسے بہت اُلجھادیا۔ تھی ۔ وارثان کی راہ میں مفرور مجرمہ چندو ماہی آڑے آئی تھی کیونکہ اجمل کی بیوی ہونے کے ناتے اس کی جائیداد کی قانونی طور سے اہم وارث تھی۔ میروشاہ نے ان سب الجھنوں سمیت جائداد کا بڑا حصہ اجمل کے ندیدے رشتہ داروں سے لے لیا۔ جب قانونی موشگافیوں سے عہدہ برآ ہوگیا تو اُس نے چندو پر توجہ دی۔ شہر کے مضافات میں، بند بوسن کے پاس قدرے ویران ماحول میں اجمل کا زرعی رقبہ اور ڈیرا موجود تھا۔ میروشاہ کی تجویز پر نصر حیات چندو کو اُس ڈیرے پر لے گیا اور مخصوص انداز میں اُس کی تربیت شروع کرنے لگا۔ میروشاہ چاہتا تھا کہ اجمل کا نیٹ ورک سنبھالنے کے لیے چندو کو غیر معمولی طور پر سخت جان، چاق و چوبند اور بہادر ہونا چاہیے تھا۔ وہ خود لڑائی بھڑائی اور اسلحہ استعمال کرنے میں مہارت نہیں رکھتا تھا، اس لیے یہ کام اُس نے نصر حیات عرف ماسٹر نصری کے سپرد کردیا۔ ماسٹر نصری نہ صرف غضب کا فائٹر، چالاک منصوبہ ساز بلکہ ہر قسم کے اسلحے کے استعمال میں بھی خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ ایک طرف جہاں اُس نے چندو ماہی کو کسرت اور اسلحہ چلانے میں طاق کرنا شروع کردیا، وہیں میروشاہ نے اُسے ہر روز یونیورسٹی پہنچانا اور دوپہر میں واپس لانا شروع کردیا۔

میروشاہ اُسے مضبوط کرنا چاہتا تھا مگر اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ نہایت عسرت گیر اور پس ماندہ علاقے میں پرورش پانے والی، اپنے سائے سے لرزہ براندام کم عمر لڑکی کچھ ہی عرصہ میں اتنی بڑی شاطر بن جائے گی کہ بڑے بڑے سورما اس کا نام سن کر کانپنے لگیں گے...... انسانی زندگی طرفہ تماشوں کی آماجگاہ ہے۔ ...... وہ فاختہ تھی...... اپنے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے چونکنے اور ڈرنے والی مگر ماسٹر نصری کی چند ماہ کی غیر معمولی تربیت نے اُسے شہباز بنا کر جرائم کی فضا میں چھوڑ دیا۔ میرزادے عمر حیات کی بہن صفیہ، اجمل کے رشتہ دار اور پولیس اہلکار بہت پیچھے رہ گئے۔ جب تعلیم مکمل ہوئی پر وہ شہر کی نئی خریدی ہوئی سی ٹو والی کوٹھی میں منتقل ہوئی، تب تک وہ شعلہ جوالہ بن چکی تھی۔ گائمن کی چندو ماہی نہ رہی، سائیکلوں والے محمد علی کی شکیلہ رانی بھی نہ رہی۔ میڈم شکیلہ بن کر آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ کیا ہوگا؟ کیا ہوا تھا؟ یہ اندیشے اور ملال بہت پیچھے رہ گئے...... اور کیا کرتا ہے؟ بس یہی لگن اس کی زندگی کا عنوان بن گئی۔

دریا کی برہم لہروں سے شروع ہونے والی المناک کہانی اس کی بھری ہوئی جوانی کی دھڑکتی ہوئی سانسوں پر تمام ہوچکی تھی۔ شاید کہانی سنانے والے کو کہانی کے اختتام کا اعلان کرنا پڑتا ہے مگر اُس نے کوئی خبر نہیں دی تھی۔ بس بولتے بولتے اس کی آواز کمزور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ میرے سینے پر اپنا گال رکھ کر ننھے ننھے خراٹے لینے لگی۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے اس لگژری روم کے مدھم نائٹ بلب کی روشنی میں تاریخ کے بدلنے کا پتا نہیں چلا تھا۔

وہ جاگتے میں، جب بہت زیادہ خوش ہوتی تھی، اپنی پہلی انگلی کی آخری پور نچلے ہونٹ پر محبوبانہ ادا کے ساتھ پھیرتی تھی، چوم کر شرارت سے روک دیتی تھی، گویا زمانے کو روک رہی ہو...... میں نے تھوڑا سا سر اُٹھایا۔ اُسے دیکھا۔ سوتے میں بھی اس کی انگلی اسی آتش کدے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ اُس نے اٹالک 'وی' شکل کے گلے والی دو رنگوں والی قمیص پہنی ہوئی تھی جو آدھی آتشیں سرخ اور آدھی زرد تھی۔ سیاہ بالوں اور سرخ قمیص سے جھلکتی ہوئی گلابیں سفید گردن پر نظریں بے اختیار پھسل جاتی تھیں۔ ننھی سی اَن چھدی ناک، باریک لکیروں والے بھرے بھرے اور چمکدار ہونٹ...... اُسے دیکھے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔ دیکھتے رہنا بھی محال تھا، باوجود کہ اس کی سانسوں سے پھوٹتی ہوئی شراب کی بُو مجھے ناگوار لگ رہی تھی۔

میں عمومی طور پر اپنی قسمت کے پیدا کردہ ہیر پھیر پر حیرت زدہ رہا کرتا تھا۔ چندو کے سفر کی روداد سن کر میں ششدر رہ گیا۔ نور پور سے بھی زیادہ پسماندہ بیٹ کے علاقے میں آنکھ کھولنے والی کتنی بدل گئی تھی اور بصد کوشش اس کے اُجلے بدن پر تضحیک آمیز مسافتوں کی ایک ذرا سی گرد بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اُسے دیکھ کر رائی بھر گمان نہیں ہوتا تھا کہ اس کا تن بیٹ کی مٹی سے اور من بے پناہ ظلم سے سینچا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی بے پناہ معصومیت اس کے دُکھوں اور موجودہ گھناؤنے کردار کو چھپائے رکھتی تھی۔ وہ بیسیوں افراد کی قاتلہ اور جرائم کی دنیا کی مہارانی قرار پانے کے باوجود الھڑ سی یونیورسٹی گرل دکھائی دیتی تھی۔

میں نے بیڈ کے فوم پر پھیلی ہوئی بانہیں اُٹھائیں اور اُس کے سوئے بکھرے وجود کو بے اختیار بانہوں میں بھر لیا۔ وہ ایک ذرا کسمسائی پھر شانت ہوگئی۔ دل سے غبارِ خاطر جو تحلیل ہوگیا تھا۔ میں گھنٹا بھر اپنے چہرے پر پھیلے ہوئے اس کے ریشمی بالوں اور شیمپو کی بھینی بھینی خوشبو کے سحر میں گرفتار رہا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کا پس منظر جان لینے کے بعد میں اس کی شخصیت کے جادوئی حصار سے نکل آتا یا وہ میری نظروں میں پست ہوجاتی مگر اس کے برعکس وہ میری رگِ جاں سے بھی قریب ہوگئی۔ خاص سے عام ہو کر دل کے چور خانوں میں براجمان ہوگئی تھی۔

میں نے کئی مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔ "کیا میں میڈم سے محبت کرنے لگا ہوں؟"

ہر مرتبہ میرے اور میرے لبوں تک آنے والے جواب کے درمیان غزالہ کا بھرا پُرا وجود حائل ہوگیا اور میں میڈم کی محبت کا دم بھرتے بھرتے آہیں بھرنے لگا۔ آج پھر بے ساختہ جب ذہن میں یہی سوال اُبھرا اور میں نے جواب دینے کے لیے لب کھولے تو غزالہ عدم موجود تھی۔ اس کی یاد کی کسک سے ماورا ہو کر میں بڑبڑایا۔ "ہاں! میں میڈم سے محبت کرتا ہوں، دل و جان سے۔"

دل پہلو میں گنگنانے لگا۔ وہ ہے تو جہان ہے۔ وہ نہیں ہے تو بھری دنیا کھوکھلی ہے۔ خالی ہے۔ اس کے گداز بدن کے ہر زیر و بم پر میری زندگی کی حسین سانسیں لیتی تھیں۔

کسی کو ٹوٹ کر چاہنے والا اُسے بھی توڑ دینا چاہتا ہو تو صورتِ حال خاصی بدل جاتی ہے۔ میں اپنے جذبات کی منہ زور رو میں بہہ گیا۔ بانہوں کے کھنچاؤ میں ایک دم اضافہ ہوگیا۔ میڈم پر نیند کی گہری غنودگی اور شراب کا نشہ سوار تھا۔ سانس بھنچ گئی تو کسمسا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "نہیں ناں...... سونے دو۔"

وہ سو رہی تھی؛ ہر خوف اور تردد سے بے نیاز۔ میری آنکھیں بھی نیند کے بوجھ تلے دَب رہی تھیں مگر میں خود پر جبر کرکے جاگ رہا تھا اور اس کی سنائی ہوئی طویل کہانی کے بے ربط اقتباسات کو جی ہی جی میں دہرا رہا تھا۔ ایسے میں ہی نیند کی گہری وادی میں اُتر گیا۔

☆☆☆

سہ پہر کے چار بج چکے تھے جب میری آنکھ کھلی۔ اِردگرد دیکھا۔ میڈم نظر نہیں آئی۔ آئینے میں باتھ روم کا کھلا ہوا دروازہ نظر آرہا تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ مجھے سوتا چھوڑ کر ہوٹل سے یقیناً جاچکی تھی۔ اس پُرآسائش ہوٹل کے تھرڈ فلور پر واقع اس کمرا نمبر تین سو پانچ میں کھلنے والی عشق کی جنت سمیٹی جاچکی تھی۔ بھرپور نیند لینے کے باوجود مجھ پر کسلمندی سوار تھی۔ انگڑائی لے کر بیڈ سے اُترا۔ میڈم شکیلہ کا سگریٹ کیس اور لائٹر بیڈ کے وسط میں پڑا تھا۔ میری نگاہ اس سے پھسل کر میز پر پیپر ویٹ کے نیچے پڑے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ یہ ہوٹل کے لیٹر پیڈ کا ورق تھا۔ اس پر میڈم نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لکھ چھوڑا تھا۔ ”بیدار ہوتے ہی سی ون پہنچ جانا۔“

اچانک میری تمام تر سستی کافور ہوگئی۔ اس مختصر سے جملے نے مجھے یاد دلا دیا کہ میرے والدین کا سفاک قاتل رنگو قسائی سی ون میں مقید تھا اور میڈم شکیلہ نے اُسے گولی مارنے کے بجائے مجھے بطور تحفہ عنایت کیا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش یک لخت تیز ہوگئی اور میں جبڑوں کے اعصاب تھرتھراتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ تیار ہو کر ہال میں آیا۔ جب میں ایک رکشا کو اپنی جانب آتے دیکھ کر رُک گیا تھا، مجھے خیال آیا کہ میں نے تو ابھی تک سی ون دیکھ ہی نہیں رکھا اور نہ مجھے اس کے محل وقوع کا اندازہ تھا۔ میں نے فون پر میڈم سے رابطہ کیا۔ اس سے دریافت کیا تو اس نے عجلت بھرے انداز میں زوم ان کمپیوٹر کالج میں پہنچ کر پیا جی سے ملنے کا حکم صادر کیا اور فون بند کر دیا۔

چھ بجے کے لگ بھگ میں زوم ان کالج کے گیٹ پر رکشا سے اُترا۔ پیا جی کی گاڑی پارکنگ میں موجود تھی۔ میں پہلے یہاں آچکا تھا اور میڈم کی صدارت میں ہونے والی گینگ کے ماسٹرز کی اہم میٹنگ میں شامل ہو چکا تھا۔ خیال آیا کہ اس کمپیوٹر کالج کے تہ خانے کو ہی سی ون کا نام دیا جاتا ہوگا مگر گن مین کی رہنمائی میں جب میں پیا جی کے پاس پہنچا تو اُسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے تیار پایا۔ اس نے بتایا۔ ”میڈم نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں سی ون لے جاؤں اور جب تک تم وہاں رہو، تمہارے ساتھ رہوں۔ چلو! میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔“

ہم دونوں جلیل آباد سے نکلے۔ مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے کسی ہوٹل میں چلنے کا کہا۔ ڈیرا اڈا کے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد ہم نے سی ون کا رُخ کیا۔ رنگیل پور میں واقع ایک بڑے سے پولٹری فارم کی پارکنگ لاٹ میں گاڑی روک کر پیا جی نے مجھے اُترنے کا اشارہ کیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی پولٹری فیڈز کی مخصوص بدبو نے آڑے ہاتھوں استقبال کیا۔ بے اختیار میں نے نتھنے بند کر لیے۔ پیا ہنس کر بولا۔ ”ناک سے ہاتھ ہٹالو۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ اسمیل ختم ہو جائے گی۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”کیا مطلب؟ یہ کہاں ختم ہونے والی ہے؟“

وہ پھر ہنسا، بولا۔ ”تم نے وہ کہاوت نہیں سنی؟“

”کون سی؟“

”ایک لڑکی کا کسی قسائی سے بیاہ ہوگیا۔ قسائی کے گھر میں اُس کا استقبال کھالوں کی تیز بُو نے کیا۔ اس نے بھی تمہاری طرح ناک پر رومال رکھ لیا تھا۔ چند دن اسی تکلیف دہ عالم میں گزرے پھر بُو ختم ہوگئی۔ وہ اپنی ساس سے کہنے لگی کہ میں نے تمہارے گھر میں آ کر کھالوں کی بدبو ختم کر دی ہے۔“

میں نے بے ساختہ پوچھا۔ ”کیا مطلب؟ اس نے کس طرح بدبو ختم کی؟ کیا اپنے میاں کو کاروبار بدلنے پر مجبور کر دیا؟“

پیا نے میرا ہاتھ تھاما۔ متوازی بنے ہوئے تین پولٹری شیڈز کی طرف بڑھتے ہوئے ہنسا، بولا۔ ”شہریار! تم بھی تھوڑی دیر بعد یہ کہنے کے قابل ہو جاؤ گے کہ تم نے فارم کی بدبو ختم کر دی ہے۔ بھلا کیوں؟ اس لیے کہ تم اس بدبو کے عادی ہو جاؤ گے اور تمہیں بُری نہیں لگے گی۔ اسی طرح قسائیوں کی بہو بھی چند دنوں میں اس بو کی عادی ہوگئی تھی۔“

اس نے درست کہا تھا۔ انسان جس ماحول میں تھوڑا وقت گزار لے، وہاں کا عادی ہو جاتا ہے۔

چند لمحوں بعد ہم برابر چلتے ہوئے پولٹری شیڈز کے قریب پہنچ گئے۔ برآمدے کی شکل کی لمبی لمبی عمارتیں جن کے پہلو ترپال کی بنی ہوئی چقوں سے ڈھکے ہوئے تھے، سے کچھ فاصلے پر چھ سات کرسیاں پڑی تھیں۔ میز کے پیچھے بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر شخص حلیے اور طور و انداز سے فارم کا منیجر لگ رہا تھا جبکہ اس کے سامنے ایک باوردی سیکیورٹی گارڈ اور ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر تپاک سے پیا جی کا استقبال کیا۔ پیا نے ان کی مستفسرانہ نظروں کے جواب میں میرا تعارف کرایا۔ ”یہ ماسٹر شہریار ہے...... میڈم اس پر بہت بھروسا کرتی ہیں۔“

پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”شہریار! یہ عمیر پولٹری فارم ہے۔ اس کے نیچے ایک بہت بڑا تہ خانہ ہے جس کو ہم نے سی ٹو کا نام دے رکھا ہے۔“

میں نے توصیفی انداز میں سر ہلایا۔ بلاشبہ یہ بہت پُرسکون جگہ تھی۔ اطراف میں دور دور تک کوئی رہائش گاہ نہیں تھی۔ پولٹری فارم کے وسیع و عریض رقبہ کے چہار اطراف آر سی سی پلرز کے ذریعے خار دار تار لگائی گئی تھی۔ ایک ہی سیدھ میں تین شیڈ جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر تعمیر شدہ دو نسبتاً کم طویل شیڈ دکھائی دے رہے تھے۔ خالی جگہ پر چارہ کاشت کیا گیا تھا۔ مین گیٹ کے ملحقہ دفتر کے پیچھے بڑا سا چھپر دکھائی دے رہا تھا جس میں دو بھینسوں سمیت پانچ چھ مویشی کھڑے تھے۔ یہ موقع محل خالصتاً دیہاتی عمومیت کا حامل اور پیشہ ورانہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ سی ون کا یہاں تصور

نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تعارفی گفتگو کے بعد مجھے پیا نے بتایا کہ یہاں تین گن مین ہر وقت ڈیوٹی پر موجود رہتے ہیں۔ منیجر اور سیاہ فام محی الدین عرف میو کے علاوہ دس کے قریب ملازم چوزوں کی دیکھ بھال، خوراک کی ترسیل اور صفائی ستھرائی پر مامور تھے۔ چونکہ وہ گینگ کے لوگ نہیں تھے بلکہ سیدھے سادے مزدور طبع افراد تھے، اس لیے وہ سی ٹو کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور شکر بجا لاتے تھے کیونکہ اس فارم پر مزدوروں کی تنخواہ وسیب کے دوسرے فارمز کی نسبت دوگنا زیادہ تھی۔ گاہے بہ گاہے میڈم ٹپ بھی دے جایا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سبھی مزدور دل ہی دل میں میڈم کی آمد کی دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

رسمی گفتگو کے دوران میو ہمارے لیے دیسی ساخت کے پیالوں میں چائے بھر لایا، بولا۔ ”ماسٹر! یہ خالص دودھ پتی ہے۔ پیو گے تو جی خوش ہو جائے گا۔ شہری طوطے اس خالص چوری کو پچا (ہضم) بھی نہیں سکتے۔“

میں نے پیالہ لبوں سے لگایا۔ اس نے درست کہا تھا۔ چائے کی مہک اور پہلے گھونٹ نے ہی پروین کے ہاتھ کی چائے کی یاد تازہ کر دی تھی۔ وہ میری چائے میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ملایا کرتی تھی۔ پینے میں چند لمحے دیر ہو جاتی تو بالائی کی موٹی تہ جم جایا کرتی تھی۔ ذائقے اور خوشبو کے لحاظ سے نور پور اور ملتان شہر کی چائے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پروین کی یاد آئی تو پہلو میں درد سا اُٹھا اور میں گرد و پیش سے کٹ گیا۔ یہ کیفیت کافی دیر تک مجھ پر حاوی رہی جس سے سر جھٹک کر میں نے نجات حاصل کی اور جس کام کی غرض سے یہاں آیا تھا، اُس کے بارے سوچنے لگا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پیا نے چائے کا پیالہ کرسی کے پائے کے ساتھ زمین پر رکھا اور مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے شیڈ کے طویل برآمدے کے پچھواڑے میں آئے۔ چارے کے کھیت کے وسط میں ایک تنگ سی پگڈنڈی خارزار تار تک جاتی دکھائی دی۔ چند قدم پگڈنڈی پر چلنے کے بعد پیا دائیں ہاتھ مڑ گیا۔ چارے کے کھیت میں دو چار قدم چلا پھر رُک گیا اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر بولا۔ ”یہ ٹارچ اور ریوالور پکڑو اور اللہ کا نام لے کر اس ڈھکن کو اُٹھا کر نیچے اُتر جاؤ۔ راستہ اور شکار تلاش کرنا تمہارا کام ہے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رنگو قسائی بندھا ہوا ہے۔ اس سے جو بھی سلوک کرنا چاہو، کرو، وہ جان سے جاتا ہے تو بھلے چلا جائے، پروا نہیں کیونکہ ہم نے اُس کا اچار نہیں ڈالنا۔ کچھ چاہیے ہو تو ہال کے بڑے سوئچ بورڈ پر نچلے کونے والا بٹن پش کر دینا۔ فوراً رابطہ ہو جائے گا۔“

میں نے لہلہاتے ہوئے پودوں کے بیچ میں مذکورہ ڈھکن دیکھا۔ یہ بمشکل ڈیڑھ فٹ قطر کا تھا جس کی کناری لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک ہک لگا ہوا تھا جس کی مدد سے ڈھکن اُٹھایا جا سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں میڈم کی ذہانت کی داد دی۔ رہنمائی کے بغیر سی ون کے دہانے کو تلاش کرنا بعید از فہم تھا۔ اس نے ایسے معاملات میں انسانی نفسیات کو بڑی عمدگی کے ساتھ مدِ نظر رکھا تھا۔ میں نے ممنونانہ نظروں سے پیا کو دیکھا، ٹارچ اور ریوالور تھاما اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بے تکلف انداز میں میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”شہریار! مجھے اُستاد نصری نے ایک مرتبہ نصیحت کی تھی کہ دشمن کو اس وقت نہیں مارنا چاہیے جب وہ موت مانگ رہا ہو بلکہ اس وقت اس کا سر تن سے جدا کیا جانا چاہیے جب اس کے دل میں زندگی کی امنگ ہلکورے لینے لگے۔ میں یہی نصیحت تمہیں عین اُس وقت کرتا ہوں جب تم اپنے دیرینہ دشمن کو مار کر اپنے اندر جلتے ہوئے الاؤ کو بجھانے جا رہے ہو۔ محبت کی طرح انتقام بھی مکمل ہونا چاہیے۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ ڈھکن اُٹھا کر ایک طرف رکھا اور گھپ اندھیرے میں اُتر گیا۔ جونہی پیا جی نے ڈھکن اپنی جگہ پر رکھا، اندھیرے میں ایک دم اضافہ ہوگیا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا موقوف ہو گیا۔ میں نے ٹارچ روشن کی۔ روشنی کے ننھے سے مگر خاصے تیز دائرے نے مجھ پر آشکار کیا کہ میں دو فٹ کے لگ بھگ قطر اور چھ سات فٹ اونچائی والے گول پائپ میں کھڑا تھا جس کے سر پر ڈھکن نصب تھا۔ میرے پیروں تلے پختہ فرش تھا۔ اس پائپ نما جگہ کا جائزہ لینے پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے پیروں کے قریب ایک سرنگ کا دہانہ موجود تھا جس کا رُخ پولٹری شیڈز کی طرف تھا۔ میں فرش پر بیٹھ کر اس سرنگ میں داخل ہو گیا جو بمشکل اتنی ہی چوڑی اور بلند تھی کہ ایک آدمی گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے اس میں سے گزر سکتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اتنا ہی فاصلہ طے کیا جتنا شیڈ کے پچھواڑے سے سرنگ کے دہانے تک چارے کے کھیت میں طے کیا تھا کہ اس سرنگ کا ایک قدرے کھلے باکس میں اختتام ہو گیا۔ اس باکس میں خاصی خنکی تھی۔ ہوا کا دباؤ بھی کم تھا۔ عجیب طرح کی سیلن محسوس ہو رہی تھی جبکہ فرش پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

جوتوں کے سول کے برابر پانی کھڑا تھا۔

میں ابھی باکس کی ساخت پر غور کر رہا تھا کیونکہ مجھے پہلی نظر میں باکس سے کہیں جانے کا راستہ دکھائی نہیں دیا تھا، کہ اچانک سامنے والی دیوار دروازے کی طرح کھل گئی۔ یوں لگا جیسے اندر سے کسی نے دروازہ کھولا تھا مگر میں نے ٹارچ کی روشنی میں کسی شخص کو دیوار کے ہٹنے سے پیدا ہونے والے خلا میں کھڑے نہیں دیکھا۔ یقیناً پیا جی نے اوپر سے کسی میکانزم کے تحت اِسے کھولا تھا۔ میں اس دس فٹ طویل مگر کشادہ گیلری میں چلتا ہوا بڑے سے آہنی دروازے تک آیا۔ وہ غیر مقفل تھا اس لیے میرے دھکیلنے پر کھل گیا۔ ایک بہت بڑا کمرا میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں کمرے کے وسط میں پہنچ کر رُک گیا۔ گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ لکڑی اور گتے کی بنی ہوئی اَن گنت پیٹیاں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی اور ان میں اسلحہ یا منشیات بھری ہوئی تھیں۔

میں ان کے بیچ چلتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ میری آنکھوں میں جہاں تجسس کی پرچھائیاں رقصاں تھیں وہاں میرے اندر کی تمام تر نفرت بھی رَچی ہوئی تھی۔ میں جلد از جلد رنگو قسائی تک پہنچ کر اپنے سینے کی برسوں سے جلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ پیا جی نے مجھے فارم ہاؤس پر ٹریننگ دیتے ہوئے اپنے غصے اور اشتعال پر قابو پانے کا نہ صرف حکم دیا تھا بلکہ کئی ترکیبیں بھی بتائی تھیں۔ میں نے ایک ترکیب پر عمل کرتے ہوئے ایک پیٹی کو اُٹھا کر دوسری رو میں رکھ دیا۔ پیٹی خاصی بھاری ہونے کی وجہ سے میرے ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ اُسے سنبھالنے اور اُٹھا کر دوسری رو کی پیٹیوں پر رکھنے کے دوران میری توجہ بٹ گئی جس سے فائدہ یہ پہنچا کہ وقتی طور پر رنگو قسائی کی طرف سے دھیان ہٹ گیا۔ یہی پیا جی نے سمجھایا تھا۔

محبت کی طرح نفرت کے جذبے میں بھی غضب کا ہیجان اور قوت مضمر ہوتی ہے۔ برسوں پہلے رنگو قسائی کا دہشت ناک چہرہ میں نے اپنے گھر کے غلے والے بھڑولے کے سوراخ میں سے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ تب مجھے یہ چہرہ پہلی مرتبہ دکھائی دیا تھا۔ میں اس وقت بہت کم عمر تھا، بچہ تھا۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ سے نابلد تھا۔ مستزاد یہ تھا کہ والدین کی فوتگی کے بعد میں اپنی بہن کے ساتھ چاچا چراغ کی کفالت میں آ گیا تھا جس کے اپنے معاشی حالات کمزور تھے۔ کم عمری اور غربت کی وجہ سے میں اس درندے کی تلاش میں نہ نکل سکا۔ لڑکپن اور اوائل جوانی [illegible] دگرگوں معاشی حالات کے باوجود میں نے کھالے کی [illegible] میں اُسے تلاش کرنے کی اوپر تلے کئی کمزور [illegible] کوششیں کی تھیں۔ چند ایکڑ زمیندارے کے [illegible] بھری پری دنیا میں آنکھ اوجھل ہونے والا پہاڑ [illegible] ایک عام خال وخد والا انسان کیسے تلاش کیا جا سکتا تھا۔

ہاں! میں ایک کام کر سکتا تھا۔ وہ کرتا رہا۔ اس [illegible] کو بار بار چشمِ تصور میں لا کر زندہ کرتا رہا اور میں نے [illegible] فراموش نہیں ہونے دیا تھا۔ لانبے قد والے شخص کا [illegible] مگر تھوڑا سا اُٹھا ہوا بڑی مونچھوں والا خونخوار چہرہ، غیر [illegible] حد تک پھیلی ہوئی دہشت ناک آنکھیں اور چہرے [illegible] تاریک پس منظر میں خون کی سرخ آمیزش...... میری [illegible] کے ہزاروں مناظر سے ناآشنا نگاہوں نے کیمرے [illegible] طرح بھڑولے سے نظر آنے والے اس چہرے کو ہمیشہ [illegible] لیے محفوظ کر لیا تھا اور میری خاموش ریاضت نے آج تک اس چہرے پر وقت کی گرد نہیں پڑنے دی تھی۔

پھر حالات کے کٹھن چکر میں پس کر میں چاچے چراغ کے گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ ایسے میں قسمت نے یاوری کی اور مجھے میڈم شکیلہ سے ملا دیا۔ وہ زندگی کی کٹھنائیوں سے روشناسی کا جانکاہ سفر مجھ سے پہلے طے کر چکی تھی اور [illegible] کار ہو کر زمانے سے چابکدستی کے ساتھ نبرد آزما تھی۔ اس کے طاقت ور گروپ میں حادثاتی طور پر شامل ہونے کے بعد پہلے مشن کی تکمیل کے لیے دو آبے میں میاں دلبر حسین کی حویلی میں پہنچا تو وہاں غیر متوقع طور پر مجھے اپنے والدین کا قاتل چہرہ دکھائی دے گیا۔ تب مجھے اس کا نام معلوم ہوا۔ میں سخی محمد کو ساتھ لے کر خانزادی اسما کو اس کے حوالے کرنے اور اس کے دام کھرے کرنے کے لیے سنسان اور دہشت بھرے ماحول میں میاں دلبر حسین کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچا تھا۔ دو کروڑ روپوں کی وصولی اور اسما کی ترسیل کے دوران مجھے اس کا خوفناک چہرہ زندگی میں دوسری مرتبہ دکھائی دیا تھا۔ وہاں بھی مجھے اپنے اندر دہکتے ہوئے لاوے پر صبر کے چھینٹے مارنا پڑے تھے کیونکہ نہ صرف وہ میرا پہلا مشن تھا جسے میں ہر صورت پایۂ تکمیل تک پہنچا کر میڈم کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتا تھا بلکہ میاں دلبر حسین کی کمین گاہ میں میری معمولی سی غلطی کے سبب میرے لیے خوف ناک مقتل ثابت ہو سکتی تھی۔ تبھی میں اس پر خواہش کے باوجود ہاتھ نہ ڈال سکا۔ آج تیسری مرتبہ اس سے مڈبھیڑ ہونے والی تھی اور اُسے میرے انتقام کی بھینٹ چڑھنے سے روکنے والی

کوئی قوت حائل نہیں تھی۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور عمر بھر کی سنبھال کر رکھی ہوئی نفرت آنکھوں میں آ کر لاوہ بننا چاہتی تھی۔

میں کچھ دیر تک ریوالور انگلی پر گھماتے ہوئے اس اسٹور کی طرز کے بڑے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار بڑے بڑے سرخ دائرے ناچنے لگتے تھے جن سے میں سر جھٹک کر نجات حاصل کرتا تھا۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے وہی دریدہ جذبات منظر ابھر آیا۔ میں مٹی کے بھڑولے کے اندر گیہوں پر کھڑا تھا جبکہ پروین کا لرزتا ہوا وجود مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ فرطِ خوف سے ہماری زبانیں گنگ اور حواس مختل تھے اور تیز دھڑکنیں کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

میرے مقتول باپ کا نام امام دین تھا۔ بہت گبھرو اور خوب صورت جوان تھا۔ اس کی خوبصورت جوانی کو وسیب والوں نے ”سوہنا خان“ کا عنوان دے رکھا تھا۔ میری ماں کا نام رضیہ تھا۔ دیہاتوں میں عموماً طور پر نام کو بگاڑ کر سہل اور مختصر کر لیا جاتا ہے۔ اسے بھی ’رجو‘ کہا جانے لگا۔ ان دونوں کو میری آنکھوں کے سامنے رنگو قسائی نے خون میں نہلا دیا تھا۔ اس کے ساتھ دو ڈھاٹا پوش بدمعاش بھی تھے۔ اس نے بھی ڈھاٹا اوڑھ رکھا تھا مگر اتفاق سے ڈھاٹا کھسک گیا اور میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔

میں اور کھالے نے پیشہ ور جاسوسوں کی طرح سوہنا خان اور رجو کی زندگی کے واقعات کھوج ڈالے تھے۔ رشتہ داروں اور دوستوں کے ملنے جلنے والوں کو کئی کئی مرتبہ کرید کر پوچھا تھا مگر نہ تو ان کا کوئی جرم ہم پر آشکار ہوا اور نہ ہی ان کے کسی جانی دشمن کا نام سامنے آیا۔ آ جا کے ایک زمین کے ٹکڑے کی توجیہہ سامنے آئی جس کا مرکزی کردار فریدن خان تھا۔ کاغذات کی دیکھ پرکھ کے نتیجے میں پتا چلا تھا کہ میرے باپ نے اپنی موت سے چھ سات سال قبل فریدن خان نامی شخص کے ہاتھ اپنی اراضی بیچ دی تھی۔ چونکہ فریدن خان خود کاشت پر ٹھیکے داری کو ترجیح دیتا تھا، اس لیے اس نے خریدنے کے بعد یہ زمین میرے باپ کو ٹھیکے پر دے رکھی تھی اور میرے باپ نے بوجوہ اپنے خاندان کو ان معاملات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ میرے والدین کے اندوہناک قتل کے بعد فریدن خان نے کسی اور کو زمین پر مزارعہ بٹھا دیا۔ مجھے بعد کوشش کے فریدن خان نہیں ملا تھا۔ اس کا نام دوسری مرتبہ میری نظروں کے سامنے اُس وقت آیا جب حیدر خان کے بھیجے ہوئے غنڈوں نے چاچا چراغ سے زمین کی دستاویز پر انگوٹھے لگوا کر چاچی سمیت زندہ جلا دیا تھا۔ اگر میں اُس وقت موقع پر نہ پہنچ جاتا تو میرے خاندان کا کوئی فرد بھی زندہ نہ بچتا اور ہماری تمام تر اراضی اُسی فریدن خان کے نام منتقل ہو جاتی۔ جس طرح چاچے چراغ دین سے انگوٹھے ثبت کروائے گئے تھے، بعینہٖ میرے باپ سوہنا خان سے بھی چھ سات سالہ پرانی دستاویز پر انگوٹھے لگوائے گئے تھے۔

مجھے یہ تو اندازہ تھا کہ میرے باپ کی کسی سے بالخصوص رنگو قسائی سے کوئی دشمنی تھی نہ لین دین ہی کا تنازعہ تھا۔ رنگو قسائی آج کی طرح ان دنوں بھی کسی بڑے کا مہرہ تھا۔ اس نے کسی کے حکم پر اتنا بڑا قدم اُٹھایا تھا۔ اب اصل آدمی تک مجھے یہی بدبخت پہنچا سکتا تھا اور اسے مرنے سے پیشتر یہی کام کرنا تھا۔ بعید نہیں تھا کہ یہ اس واقعے کے پس منظر سے بھی آگاہ ہوتا جس نے سوہنا خان کو خاک و خون میں نہلا دیا تھا۔ یہی سوچ کر کہ مجھے اس سے بہت کچھ اگلوانا تھا، میں نے اپنے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کی اور ٹھنڈے دل و دماغ سے اس کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کیا۔ جب میں اپنی کیفیت سے قدرے مطمئن ہو گیا تو میں نے طائرانہ نظروں سے اس بڑے کمرے میں کھلنے والے ہال کے دروازے کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ سی ٹو اور نور پور میں واقع سردار یارن خان کی حویلی کے تہ خانوں کے میکانزم کو دیکھ لینے کے بعد ’سی ون‘ کا جادوئی ماحول میرے نزدیک زیادہ پیچیدہ اور حیران کن نہیں تھا۔ میں نے جلد ہی سامنے والی سپاٹ دیوار کے ایک حصے میں

ہنسی ہنسی میں......

☆ شادی ایک ایسا دن ہے جب لڑکا اسٹیج پر بیٹھا دوسری خوب صورت لڑکیوں کو دیکھ کر سوچتا ہے کہ یہ سب پہلے کہاں مر گئی تھیں؟

☆ لوگ کہتے ہیں ایک لڑکی کے پڑھنے سے سارا گھر تعلیم یافتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس لڑکی کے کالج جانے سے چالیس لڑکے فیل ہو جاتے ہیں اس کا کیا؟

مرسلہ: گل ناز رئیس، گلستان جوہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

دروازے کی موجودگی بھانپ لی۔ اسے کھولنے کی کوشش میں جلد ہی مجھے پلستر شدہ دیوار پر ایک ہلکا سا ابھار مل گیا۔ اسے دبایا، تھپتھپایا پھر زور سے پیچھے دھکیلا، کچھ نہ ہوا تو میں نے جھنجلا کر کھڑی ہتھیلی کی زوردار ضرب رسید کردی۔ دیوار کا تین ضرب چھ کا چوکور ٹکڑا خودکار انداز میں پیچھے ہٹنے لگا تو میں ایک طویل سانس لے کر رُک گیا۔ دیوار ہٹنے سے پیدا ہونے والے خلا سے تیز روشنی جھلک رہی تھی۔ چند لمحوں بعد میں اس وسیع و عریض ہال میں کھڑا تھا جس کی داہنی دیوار کی جڑ میں مردہ چھپکلی کے سے انداز میں رنگو پڑا ہوا تھا۔ یہاں اس کے علاوہ کسی اور کی موجودگی کی توقع نہیں تھی، اس لیے میں نے اسے فوری طور پر رنگو قسائی ہی قرار دیا۔ ایک ذرا رُک کر میں نے نو انچ موٹی دیوار کے اتنے ہی موٹے دروازے کو بند کرنے کی کوشش کی مگر فوری طور پر مجھے اس کے آپریشن کی سمجھ نہ آئی جس کی وجہ سے میں مجبوراً اسے کھلا چھوڑ کر نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا رنگو کی طرف بڑھ گیا۔

قریب پہنچنے پر مجھے احساس ہوا کہ وہ گہری نیند میں تھا یا بے ہوش تھا۔ اسے ہوش میں لانے سے پیشتر میں نے ہال کا سرسری انداز میں جائزہ لیا۔ مشرقی دیوار میں دو چوبی دروازے دکھائی دیے۔ جھانک کر دیکھنے پر پتا چلا کہ ایک دروازہ نہایت آرام دہ بیڈروم کا تھا جس میں ہال کی جانب والی دیوار پر ایک قدِ آدم کنٹرول پینل نصب تھا۔ پینل پر اَن گنت بٹن اور ننھے ننھے بلب دکھائی دے رہے تھے۔ دو بلب روشن تھے جبکہ ایک مسلسل بلنک کررہا تھا۔ بیڈروم سے متصل کراکری کم اسٹور تھا۔ اس کمرے کی ایک دیوار میں بڑی چوبی الماریاں نصب تھیں جبکہ دوسری دیوار میں سنک، چولہا اور کراکری کیبنٹ وغیرہ دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں کمرے اٹیچڈ باتھ تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مخدوش حالات میں میڈم اپنے کارندوں کو انڈر گراؤنڈ کرنے کے لیے سی دن کو استعمال کرتی تھی کیونکہ یہاں کافی تعداد میں لوگوں کے ہنگامی قیام کا بندوبست تھا۔

جس دیوار کے ساتھ رنگو پڑا تھا، اس کے دونوں کونوں میں بھی ایک ایک دروازہ نظر آرہا تھا جبکہ دیوار پر کئی گول سوراخ بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک سوراخ میں سے چمکدار زنجیر لٹک رہی تھی۔ میں بیڈروم سے ڈریسنگ اسٹول نکال کر رنگو کے پاس آگیا۔ اپنی توجہ اس حد تک بٹانے کے باوجود میرا تنفس قدرے تیز تھا۔

وہ پہلو کے بل دیوار کے ساتھ چمٹا پڑا تھا۔ اس کے توانا اعصاب اور گھنے سیاہ بالوں والے بدن پر محض ایک ہاف ٹراؤزر تھا جو اسے خاصا تنگ تھا۔ باقی تمام بدن ننگا اور دونوں ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ غور کرنے پر مجھے اس کی گردن میں اسٹین لیس اسٹیل کا انچ بھر موٹا کڑا دکھائی دیا۔ گردن کے پچھلے حصے میں جا کر یہ کڑا ایک چمکدار اسٹیل کی زنجیر سے منسلک تھا جسے میں نے بیڈروم کے دروازے میں کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ زنجیر کی غیر معمولی مضبوطی چھوئے بغیر محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں رنگو کے اتنا غفیل وجود کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور اسٹیل کے کڑے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ زنجیر سے براہِ راست منسلک تھا یعنی ویلڈ کیا گیا تھا۔ کڑے میں کوئی لاک یا کلپ دکھائی نہ دیا تو مجھے ایک ذرا حیرت ہوئی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کڑا کھلتا نہ ہو۔ اُسے سر سے گزار کر گردن تک پہنچایا نہیں جاسکتا تھا کیونکہ ایسی حالت میں اُسے بہ آسانی یا بہ وقت اُتارا بھی جاسکتا تھا جبکہ وہ خاصا تنگ تھا۔ غور کرنے پر کڑے کے اگلے حصے میں یعنی نرخرے کے پاس ایک لکیر اور نٹ نظر آگیا۔ یہ مخصوص ساخت کا نٹ صرف "L Key" سے ہی کھلتا تھا اور اسے ہاتھ سے، عام پیچ کس کے ساتھ یا کسی نوکدار شے کی مدد سے نہیں کھولا جاسکتا تھا۔

کڑے سے جڑی ہوئی اسٹین لیس اسٹیل کی مضبوط زنجیر دیوار کے ایک گول سوراخ میں غائب ہورہی تھی۔ ایسے ہی چار سوراخ اور بھی دیوار میں موجود تھے۔ یعنی اس دیوار کے ساتھ پانچ قیدیوں کو پابندِ سلاسل کیے جانے کا انتظام تھا۔ رنگو کے بائیں ہاتھ والا چوبی دروازہ نیم وا تھا۔ دکھائی دیا کہ وہ عام نوع کا ٹائلٹ تھا۔ شاطر میڈم کے دوسرے طلسم کدوں کی طرح یہاں بھی عقلِ انسانی کو تحیر زدہ کرنے کا خاصا سامان موجود تھا۔ مجھے حیران کرنے کے لیے تو یہ عجیب الوضع کڑا ہی بہت تھا جس نے ایک یکم شحیم سورما کو زخم خوردہ کتے کی طرح زمین چاٹنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ وہ جس قماش کا شخص تھا، اس سے توقع کی جاسکتی تھی کہ اس نے اس کڑے سے سر نکالنے یا اسے کھولنے اور توڑنے کی بھرپور کوششیں کی ہوں گی اور ناکام ہونے پر اس نے شکست تسلیم کی ہوگی۔

میں نے زنجیر کی لمبائی کو مدِنظر رکھ کر اسٹول تھوڑا پیچھے کرلیا تاکہ رنگو اگر مجھ پر حملہ کرنا بھی چاہتا تو مجھ تک نہ پہنچ سکتا۔ اُسے ہلانا جلانا بے سود رہا تو میں نے جوتے کی نوک پوری قوت سے اُس کی پسلیوں میں دے ماری۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ چند لمحے خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے کے تاثرات میں شناسائی کا

گمان غالب آگیا۔ مجھے پہچانتے ہی اس کی آنکھوں میں نخوت بھر گئی۔

میں اس دوران اسٹول پر بیٹھ چکا تھا۔

"ہاں بھئی......!" میں نے اپنے تئیں بہتیری کوشش کی کہ میرے قلب و ذہن میں کھولتا ہوا لاوہ میرے لبوں تک نہ پہنچ پائے مگر بے ساختہ کئی ناقابلِ اشاعت گالیاں میرے لبوں سے پھسل گئیں۔ "پہچانا مجھے؟"

اس کے ہونٹ فرطِ تضحیک سے بھنچ گئے۔ آنکھوں میں نفرت پھیل گئی۔ پنجابی لب و لہجے میں بولا۔ "ہاں! تمہارے جیسے بھونکنے والے کتوں کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔"

یہ میری گالیوں کا ردِعمل تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھڑک کر اس پر حملہ آور ہوتا، مجھے میڈم کا بارہا دیکھا ہوا رویہ یاد آگیا اور میں تھم گیا۔ یہ اس کا کمالِ فن تھا کہ جب میرے نزدیک اُسے فطری طور پر شدید غصے کی حالت میں ہونا چاہیے تھا، وہ ہرگز غصے میں دکھائی نہیں دی تھی۔ میرے خیال میں جب اُسے پریشان اور حواس باختہ نظر آنا چاہیے تھا، وہ مکمل طور پر اپنے حواس میں ملی۔ اسے خود پر اختیار تھا کہ دل کی کیفیت کو کبھی چہرے تک نہیں آنے دیتی تھی۔ اور اس وقت مجھے بھی ایسی ہی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ تبھی میں زبردستی مسکرایا اور لہجہ نارمل رکھتے ہوئے بولا۔ "چلو شکر ہے کہ تم نے مجھے پہچان تو لیا۔ اب یہ بھی بتادو کہ تم یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہو؟ کیا تمہیں علم ہے؟"

وہ ایک ہنکارا بھر کر خاموش رہا۔

میں نے تاؤ دلانے کے سے انداز میں کہا۔ "عجیب شہ زور ہو، ایک کڑا بھی نہیں کھول پائے اتنے دنوں میں!"

اس نے میرے لب و لہجے میں چھپے گہرے طنز کو محسوس کرلیا اور منہ بنا کر بولا۔ "یار! انٹ شنٹ باتیں مت کرو اور جس کام کے لیے آئے ہو، وہ کرو اور چلتے بنو۔"

اس کا لہجہ خالصتاً پنجابی اور روایتی انداز میں کڑک دار تھا۔ مجھ سے ذرا بھر خائف یا اپنے انجام کے بارے میں فکرمند دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کے اعصاب خاصے مضبوط تھے۔ میں اُسے چند لمحوں تک یک ٹک گھورتا رہا۔

وہ بولا۔ "تم مقدر والے تھے جو دو آبے سے مال لے کر زندہ نکل آئے ورنہ میری مرضی کے بغیر وہاں سے آج تک کوئی زندہ لوٹ کر نہیں آیا۔ مگر یاد رکھو کہ ہر مرتبہ قسمت ساتھ نہیں دیا کرتی۔ اُس کتیا سے بھی جا کر کہہ دو کہ اُسے یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ میرے آدمی جلد یا بدیر میرا کھوج نکالنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ پھر اس حرافہ اور اس کے تم جیسے گندے دلالوں کو بھری دنیا میں چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی۔ جاؤ، اُسے جا کر بتادو۔"

اس نے میڈم کے بارے میں جو زبان استعمال کی تھی، وہ میری برداشت سے باہر تھی۔ میں آپے سے باہر ہوگیا اور بھوکے درندے کی طرح اُس پر جھپٹا۔ وہ بے خبر نہیں تھا۔ بجلی کی سرعت سے بیٹھے بیٹھے ہی پرے کھسک گیا۔ میں اپنی ہی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا۔ ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس کی زوردار لات میرے پہلو میں لگی۔ درد کی کٹیلی لہر میرے پورے بدن میں پھر گئی اور میں ایک بار پھر دیوار سے ٹکرا کر پہلو کے بل فرش پر ڈھے گیا۔ میں نے دانت پیس کر اُٹھنے کی کوشش کی تو اس کی دوسری لات میرے جبڑے پر کسی آہنی گرز کی طرح لگی اور میرا ذہن بری طرح جھنجنا اُٹھا۔ سر جھٹک کر اپنے حواس بجالانے کی کوشش کی مگر آنکھوں کے سامنے چھایا ہوا اندھیرا چھٹنے سے قبل ہی اس نے میری گردن اپنے ہاتھوں کی فولادی گرفت میں لے کر پوری قوت سے دبا ڈالی۔ میری سانس سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ پھڑ پھڑا کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی مگر کم بخت کی انگلیاں میرے ماس میں اس بے دردی سے پیوست ہوگئیں کہ میں پوری کوشش کے باوجود نجات حاصل نہ کرسکا۔ جونہی میں نے پہلو بدل کر اس کی پسلیوں میں کہنی کی ضرب رسید کرنا چاہی تو اس نے گھٹنا میری ران پر دے مارا۔ اگر اس نے میری گردن نہ دبا رکھی ہوتی تو گھٹنے کی زوردار ضرب سے میرے حلق سے چیخ نکل جاتی۔

میں اپنی حماقت میں بہت بری طرح اس کے شکنجے میں جکڑا گیا تھا۔ سانس کی آمدورفت معطل ہوئی تو نہ صرف سینہ پھٹنے کو آگیا بلکہ بدن کی قوت بھی سلب ہونے لگی تھی۔ ایسے ہی وقت میں مجھے اس یکم شحیم آکٹوپس سے نجات حاصل کرنے کی ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے اپنا داہنا پیر دیوار پر رکھا اور اپنے آپ کو پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا۔ میرے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ ایک قدم پیچھے ہٹنے پر مجھے پہلو بدلنے کی مہلت مل گئی۔ وہ زنجیر میں جکڑا ہونے کی وجہ سے ایک حد تک میرے ساتھ کھنچ سکتا تھا اس لیے جونہی زنجیر کی گنجائش ختم ہوئی، اس کے بدن کو ایک خفیف سا جھٹکا لگا اور میری گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں ایک قدم آگے بڑھ کر آزاد ہوگیا اور لڑکھڑاتا ہوا زمیں بوس ہوگیا۔ گردن موڑ کر اُسے دیکھا تو ایک مرتبہ پھر حیران ہوگیا۔

اس کا گرانڈیل جسم جھٹکوں کی تال پر بری طرح لرز رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا اور سرخی مائل چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تڑپتا ہوا فرش پر گر گیا۔ بانہیں اور ٹانگیں بے ترتیب انداز میں فرش پر پھیل گئیں۔ سینہ دھونکنی بن گیا اور وہ آنکھیں بند کر کے ہانپنے لگا۔ اس کے منہ سے کریہہ خرخراہٹ بھی برآمد ہو رہی تھی۔ میں گردن سہلاتا ہوا اسٹول کی طرف بڑھا اور سوچنے لگا کہ اُسے اچانک کیا ہو گیا؟

''اوئے ڈرامے باز! یہ کیا ناٹک کر رہے ہو؟'' میں نے اس کے ٹخنے پر ٹھوکر ماری۔

وہ کچھ نہ بولا بلکہ آنکھیں کھول کر مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ وہ ناٹک نہیں کر رہا تھا بلکہ سخت تکلیف وہ مرحلے سے گزر چکا تھا یا گزر رہا تھا۔ چونکہ اس کے تاؤ دلانے پر میں ایک مرتبہ فاش غلطی کا ارتکاب کر چکا تھا اور اس کی نقد سزا بھی پا چکا تھا، اس لیے میں اس کی نہ سمجھ میں آنے والی حرکات کے جواب میں دوسرا احمقانہ قدم نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی آواز کو اشتعال اور عجلت سے مبرا رکھتے ہوئے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ ''یہ عورتوں کے سے مکر و فریب چھوڑ دو اور اُٹھ کر بیٹھو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ چلو شاباش!''

اس کے حلق سے دردناک آہ برآمد ہوئی۔ نحیف سی آواز میں بولا، ''مکر نہیں...... ہائے! اس عذاب سے تو مجھے موت آ جائے، بہتر ہے۔''

''تم کس عذاب کی بات کر رہے ہو؟'' میں چونکا۔

اس نے بہ دقت تمام ہاتھ اُٹھایا۔ گردن تک لے جا کر کڑا تھام لیا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''اس...... اس میں کرنٹ آ جاتا ہے...... جب اسے تھوڑی سی بھی کھینچ پڑ جائے...... لعنت ہے، تم پر...... تم سب بزدل چوہوں پر۔ میں...... میں مرد ہوں۔ سینہ تان کر چلتا ہوں اور دشمن کے سینے پر وار کرتا ہوں۔ پیٹھ پیچھے حملہ نہیں کرتا۔ ہاہ! تم...... ہیجڑے ہو...... عورت کے پٹھو...... چھپ کر وار کرتے ہو مگر تمہیں ان کمینی حرکتوں کا حساب دینا پڑے گا۔''

میرے حلق سے ایک طویل سانس نکل گئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھوں کے مضبوط شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہا تھا اور اس عالم میں زنجیر کھنچ گئی تھی۔ عین اسی لمحے کہیں میں اس سے الگ ہو گیا تھا ورنہ عذاب گیں کرنٹ شاک مجھے بھی لگ جاتا۔ تب سمجھ میں آیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں اتنی بے فکری سے کیوں آزاد چھوڑ دیے گئے تھے۔ وہ اگر کڑے کو چھیڑتا، کھینچتا یا زنجیر کو توڑنے کی کوشش کرتا تھا تو اُسے تیز شاک لگتا تھا۔

وہ دیوار کا سہارا لے کر اُٹھا اور لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد مجھ پر خشمگیں نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میرے ساتھ کی جانے والی یہ بے غیرتیاں، تمہیں کتنی مہنگی پڑیں گی۔''

میں نے کندھے اُچکائے۔ ''مہنگی پڑیں یا سستی! فی الحال تو تمہیں بھگتنی ہیں، بھگتو...... جان پر...... دل پر!''

''کیا تم لوگوں کو دو آبے والے واقعے پر غصہ ہے؟'' اس کی ذہنی کیفیت قدرے بحال ہو گئی تھی۔

''ہاں! مگر اس کے علاوہ ایک نہایت اہم حساب بھی تمہاری طرف نکلتا ہے۔ آج وہ بھی چکتا ہو جائے گا۔'' میرا لہجہ خنک ہو گیا تھا۔

''میں سمجھا نہیں!'' وہ حیرانی سے بولا۔ ''کون سا حساب؟''

میں کچھ دیر تک اُسے ٹٹولتی ہوئی نظروں دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا، ''رنگو! پہلی بات یہ ہے کہ دو آبے میں میرے اور سخی محمد کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا تھا، وہ غیر اہم واقعہ نہیں تھا مگر اس وقت میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہاری دھمکیوں کا مجھ پر یا میڈم کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تم، تمہارے غنڈے یا آقا لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہاری تلاش میں جو شخص بھی اِدھر آ نکلا، وہ زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔ اس لیے کھوکھلی دھمکیاں دے کر میرا پارہ نہ چڑھاؤ اور فضول میں کسی کمک کا انتظار بھی نہ کرو۔ اگر تم چاہو تو آرام سے بیٹھ سکتے ہو۔ تسلی سے میری بات سن اور سمجھ سکتے ہو۔ میں کھل کھلا کر بات کرنے کا عادی ہوں۔ کیا سمجھے؟''

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر نقاہت بھرے انداز میں دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، بولا۔ ''ہاں بولو! مجھ سے کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے نور پور دیکھ رکھا ہے؟''

''نور پور؟''

''ہاں! سردار یارن خان والا گاؤں...... ہیں؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اس نے الجھے الجھے انداز میں سر ہلایا۔ ''ہاں تو!''

''آج سے بہت سال پہلے جب تم جوان ہوا کرتے تھے، تم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ نور پور کے ایک کاشتکار کے گھر آدھی رات کو حملہ آور ہوئے تھے۔ تم لوگوں نے اس شخص کو اس کی بیوی سمیت قتل کر دیا تھا۔ کیا تمہیں وہ واقعہ یاد ہے؟'' میرے روئیں روئیں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹ پڑی تھیں۔

اس کی آنکھوں میں پہلے الجھن پھر تردد کے ڈورے

تیرے، چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''میں نے زندگی میں کوئی ایک آدھ نہیں، بیسیوں ایسی وارداتیں کی ہیں۔ اب یہ پتا نہیں کہ تم کس کاشت کار کی بات کر رہے ہو؟''

اس کے فاخرانہ جواب نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیے۔ میں بے اختیار چیخ اُٹھا مگر فوراً ہی اپنی آگ پر صبر کے چھینٹے مار کر بیٹھ گیا، بولا۔ ''رنگو! بکواس مت کرو۔ نور پور میں ہونے والی یہ اکلوتی واردات تھی جو تم نے کی۔ اپنے ذہن پر زور دے کر میرے سوال کا جواب دو۔ تم نے امام دین عرف سوہنا خان اور اس کی بیوی رضیہ عرف رجو کو قتل کیا تھا۔ تمہیں یاد ہے یا نہیں؟''

وہ ایک ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ تشکیک بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''تم کون ہو؟''

میں جی کڑا کر کے مسکرایا۔ ''تم جانتے ہی ہو کہ میں کون ہوں۔ شہر یار ہوں۔ میڈم شکیلہ کے گروپ کا ایک کارکن۔''

''تمہارا نور پور سے کیا تعلق ہے؟'' وہ پوری طرح سنبھل چکا تھا۔

میں نے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھام لیا۔ اُسے چند لمحوں تک ڈرامائی انداز میں گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''رنگو! تمہاری سانسیں گنی جا چکی ہیں......''

اس نے میری بات فوراً ہی کاٹ دی۔ ''یہ تو مجھے بھی علم ہے۔ کوئی نئی بات کرو۔''

''نئی بات بھی بتاتا ہوں۔ سنو! میں کہہ رہا تھا کہ تمہاری موت کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اب کوئی سچ یا جھوٹ تمہیں موت سے نہیں بچا سکے گا۔ تم نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟'' میں نے اس کی اعصاب شکنی کی غرض سے چند لمحے خاموشی اختیار کی، پھر کہا، ''میں چاہتا ہوں کہ تمہیں مرنے سے قبل نہ صرف اپنے جرم کا پتا چل جائے بلکہ تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تمہیں سزا دینے والا کون ہے اور یہی نئی بات ہے تمہارے لیے کہ میں کون ہوں۔ میں شہر یار ہوں۔ اُسی کاشت کار، سوہنے خان کا اکلوتا بیٹا، جسے سوہنے خان نے تمہاری آمد سے چند لمحے پیشتر اُٹھا کر بھڑولے میں پھینک دیا تھا۔ میں نے تمہیں اور تمہارے غنڈوں کو اپنی آنکھوں سے کشت و خون کا بازار گرماتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ میرے والدین کو قتل کرنے کا ایک مقصد ان کی جائداد کا حصول تھا مگر یہ اصل سبب نہیں تھا۔ کوئی اور تھا جس کا صرف تمہیں علم ہے۔'' فرطِ کرب و اشتعال سے میری آواز پھٹنے لگی۔ میں نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر تک گیانیوں کے سے انداز میں بیٹھا رہا، پھر سر اُٹھا کر بولا۔ ''رنگو! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے باپ کی تمہارے ساتھ نہ کوئی دشمنی تھی اور نہ لین دین کا ہی کوئی تنازعہ تھا۔ آج بھی اور کل بھی تم کسی خانزادے کی چوکھٹ کے کتے تھے۔ اپنے سائیں کے ہشکارنے پر انسانوں کا خون بہانے کے لیے رات کی تاریکی میں نکلتے تھے۔ دن کے اجالے میں منہ چھپائے پڑے رہتے تھے۔ میں نے تمہیں جہان بھر میں تلاش کیا اور آخرکار تمہیں ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیا اب تمہیں سوہنا خان یاد آ گیا ہے؟''

وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ بہت ہی ڈھیٹ اور خبیث فطرت شخص تھا، اس لیے سب کچھ سن لینے کے بعد نہ تو خوف زدہ ہوا تھا اور نہ ہی پریشان بلکہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خباثت سے مسکرایا اور بولا۔ ''بس میری جان! جب تم نے مجھے اپنے باپ اور ماں کو قتل کرتے دیکھ ہی لیا تھا اور اب پہچان بھی لیا ہے تو پھر پرابلم کیا ہے؟ ریوالور تمہارے ہاتھ میں ہے اور میں بندھا ہوا ہوں، مجھے گولی مارو اور قصہ ختم کرو...... یہ کیا پنجابی فلم کے ہیرو کی طرح لمبے لمبے ڈائیلاگ مارتے ہوئے فلمی سچویشن پیدا کر رہے ہو؟''

اس کی بے خوفی نے لحہ بھر میں میرا اعتماد متزلزل کر دیا۔ ذہنی جھٹکا لگا۔ سنبھل کر بولا۔ ''ابھی قصہ ختم نہیں کرنا مجھے۔''

''تو کیا تین گھنٹے کی فلم پوری کرنی ہے؟'' اس کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

''ابے قسائی کے بچے! زیادہ تیس مار خان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ قیامت تم اکیلے نے میرے خاندان پر نہیں توڑی تھی بلکہ تمہارے ساتھ دو اور غنڈے بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے منہ سر ڈھاٹوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ مجھے بتاؤ، وہ کون تھے؟''

اس کی آنکھیں مجھ پر ساکت ہو گئیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''ڈھاٹا تو میں نے بھی باندھ رکھا تھا۔''

''ہاں! مگر تمہیں یاد نہیں کہ تمہارا منڈاسہ کھل گیا تھا اور ایک لمحے کو مجھے تمہاری شکل نظر آ گئی تھی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر جواباً کچھ نہ کہا۔

میں نے سلگتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم ان دونوں کے بارے میں مجھے بتاؤ اور اس کتے کا نام بھی لو جس نے تمہیں میرے گھر بھیجا تھا۔ مجھے ان سوالوں کے جواب چاہئیں۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اتنی پرانی بات یاد ہی نہیں تو؟'' اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

"تو میں تمہیں گولی ماردوں گا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں نے تمہاری ماں اور باپ کو قتل کیا تھا۔ تم نے مجھے قتل کرتے دیکھ بھی لیا تھا۔ اب میں تمہارے رحم وکرم پر ہوں۔ تم مجھے گولی نہیں مارو گے تو کیا اپنی بہن کا دلہا بناؤ گے؟" اس نے کندھے اُچکا کر میری تضحیک کی۔ "میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے کہ گھٹیا فلم کے ہیرو کے طرح یہ مداری پن نہ دکھاؤ اور مجھے گولی مار کر دفع ہو جاؤ۔ میں نے اپنے حصے کی زندگی بھرپور گزار لی ہے۔ دو چار سال اور جیتا رہا تو بھی قیامت کو آنے سے نہیں روک سکوں گا۔ موت آج بھی ہے۔ موت کل بھی۔"

میں گڑبڑا سا گیا۔ پیاجی نے کہا تھا کہ دشمن کو اس وقت نہیں مارنا چاہیے جب وہ مرنے کی آرزو دل میں رکھتا ہو بلکہ اُس وقت اس کی زندگی کی طنابیں کاٹنی چاہئیں جب وہ زندگی کی طلب میں گڑگڑانے لگے۔ مجھے باور ہو گیا تھا کہ وہ ٹیڑھی کھیر تھی جو سیدھی انگلیوں سے نکلنے والی نہیں تھی۔ چند لمحوں تک بیٹھا اُسے دیکھتا رہا پھر اُٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مشرقی دیوار کی طرف بڑھا جہاں میں نے ایک بڑا سا سوئچ بورڈ دیکھا تھا۔ پیاجی کے بتائے ہوئے بٹن کو پش کیا۔

چند لمحوں بعد پیا کی مدھم سی آواز بورڈ میں کہیں نصب شدہ اسپیکر سے برآمد ہوئی۔ "کیا چاہیے ماسٹر؟"

میں سمجھ گیا تھا کہ بورڈ میں اسپیکر کے ساتھ ہی کوئی ننھا سا مائیک بھی نصب تھا جو مجھے نظر نہیں آرہا تھا، اس لیے بورڈ کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ "وہ حرام زادہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہے جبکہ مجھے اُس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں میو کو تمہاری طرف بھیج دیتا ہوں۔ وہ اس میں بولنے والا پرزہ فٹ کردے گا۔ چند منٹ انتظار کرو۔"

اس کے ساتھ ہی اس کی آواز آنا بند ہو گئی۔ میں واپس رنگو کے پاس آ گیا اور اسٹول پر پاؤں رکھ کر سرد لہجے میں بولا۔ "تم تو کیا، تمہاری پچھلی سات پشتیں بھی بول پڑیں گی۔"

اس نے محض نفرت بھرے انداز میں مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کی ادا و سکنات مجھ سے برداشت کرنا مشکل ہو رہی تھیں۔ موت کو آنکھوں کے سامنے رقص کرتا دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے مگر وہ نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس بھیانک ماحول میں کئی دن گزارنے کے بعد، اپنے ہاتھوں قتل ہونے والے کے اسلحہ بردار بیٹے کو سامنے پا کر اور اپنی فردِ جرم کھلنے پر بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کے حوصلے کی داد دینے کے بعد بولا۔ "رنگو! اگر تم چاہو تو آسان موت کو گلے لگا سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ جب میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گی، تمہیں بتا دوں گا۔" اس نے ہونٹ بھینچ کر میرا مذاق اُڑایا۔

"چونکہ یہ طے ہے کہ تمہیں مرنا ہی ہے، تو پھر تمہیں اپنے فرعون نما آقا سے ہمدردی کیوں ہے؟ مرتا ہوا انسان تو کسی کا دوست نہیں ہوتا۔" میں نے اُسے اکسانے کی کوشش کی۔

"ہونہہ!" اس نے بہ انداز عجب ہنکارا بھرا، اپنے دائیں بائیں بلا جواز جھانکا اور بولا۔ "جب یہ طے ہے کہ مجھے مرنا ہی ہے تو میں تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ کیوں ڈالوں؟ تم جیسے کتے کو منہ کیوں لگاؤں؟ رہی بات ہمدردی کی تو مجھے اگر اپنے یار بیلیوں سے ہمدردی نہیں ہے تو پھر میں اپنی جان کے دشمن کی 'سوکھ' (آسانی) کیوں مانگوں گا؟"

وہ چند لمحے خاموش ہو کر بولا۔ "اور موت...... موت آسان یا مشکل نہیں ہوتی...... موت تو بس موت ہی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے تعاون کو مدنظر رکھ کر تمہیں زندہ چھوڑ دوں؟"

"توں ہالے بچہ ایں میرا چن!" (تم ابھی بچے ہو میرے چاند!)۔ وہ ہنسا۔ "میری عمر خون، بارود اور آگ میں گزری ہے اس لیے میرے منہ میں چوسنی ڈالنے کی کوشش نہ کرو اور خاموش رہ کر اپنے حرامی باپ کا انتظار کرو جسے تم نے مجھ پر تشدد کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

مارے غصے کے میرا رواں رواں دہک اُٹھا۔ میں نے اتنے زور سے جبڑے بھینچے کہ دانتوں کی کڑکڑاہٹ گونج اٹھی اور میو کے آنے تک میں خاموش بیٹھا رنگو کو دیکھتا رہا۔ وہ کئی سال پیشتر جوانی کو خیرباد کہہ چکا تھا مگر ابھی بھی اُس کا سر تا پاؤں گھنے اور گھنگریالے بالوں میں چھپا ہوا بدن فولادی تھا۔

میو بیڈ روم سے برآمد ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہی ون میں داخلے کا ایک راستہ اس طرف بھی تھا جو نسبتاً کم طویل اور مشکل تھا۔ نجانے کس مصلحت کے تحت پیاجی مجھے لمبی اور گھور گھپ اندھیرے والی سرنگ کے دہانے پر چھوڑ گیا تھا۔

میو نے قریب آ کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "یہ کتے کا پلا بولتا نہیں ہے جبکہ میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بج اُٹھے۔ بس!"

اس نے استفہامی انداز میں سر ہلایا۔ چٹکی بجائی، بولا۔ "فکر نہیں کرو اُستاد! میں اس جیسوں کی بولتی بند بھی کر لیتا ہوں اور آواز گدی سے نکال کر ہتھیلی پر بھی رکھ سکتا

ہوں۔ ابھی لو!"

وہ بازوؤں کے کف چڑھا کر رنگو کی طرف بڑھا۔ میں اسٹول پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے دیکھنے لگا۔

سیاہ فام میو خاصا سخت بدن اور دراز قد کا مالک تھا۔ اس نے رنگو کو بالوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا اور پے در پے طمانچوں سے اس کی درگت بنا کر رکھ دی۔ رنگو کی برائے نام مزاحمت جلد ہی دم توڑ گئی تو میو نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان غصے سے پوچھا۔ "کیا خیال ہے بھوتنی کے، اتنا ہی کافی ہے یا دوسرا ٹریلر دکھاؤں؟"

اسے جواب میں چند غلیظ گالیاں ملیں۔ وہ میرے برعکس بپھر کر اس پر پل پڑا۔ اس نے چند ہی لمحوں میں لاتوں، مکوں اور ٹھوکروں سے اس کے کس بل نکال دیے۔ پھر پوچھا۔ جواب میں رنگو نے پھولی ہوئی سانسوں میں کہا۔ "اوئے حرامیا! جو کر سکدیں، کیتی وَنج...... میں پیو کولوں کجھ نہ پچھ!"

(اوئے حرام زادے! جو کر سکتے ہو، کرتے رہو اور مجھ باپ سے کچھ نہ پوچھو)

مجھے اس کی سخت جانی اور بے خوفی پر پھر حیرت ہوئی۔ میو نے ہاتھ روک دیا اور اس پر ایک غصہ بھری تنبیہی نظر ڈال کر کچن کم اسٹور کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں لمبے اور چمکدار پھل والی چھری دبی ہوئی تھی۔ اس نے بنا کچھ کہے رنگو کا ایک ہاتھ تھاما اور چاہا کہ اس کی انگلی کاٹ دے، مگر رنگو نے چشم زدن میں اس کے جبڑے پر دوسرے ہاتھ کا زوردار گھونسا جڑ دیا۔ یہ وار اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ یقیناً میو کے چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے۔ وہ کئی گز دور تک لڑھکتا گیا۔ پلٹا تو میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں کے گوشوں سے خون کی دو ننھی ننھی دھاریں نکل رہی تھیں۔ اس کے جبڑے کے اندرونی جلد پھٹ گئی تھی۔ ضرب کی شدت کو دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ تھا کہ دو چار داڑھیں بھی جڑوں سے ہل گئی ہوں گی۔

چھری اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی تھی جسے رنگو نے سرعت سے اُٹھا کر سونت لیا۔ لہراتے ہوئے وحشیانہ انداز میں اسے للکارنے لگا۔ میو جبڑے پر ہاتھ رکھے خون تھوکتا ہوا سانڈ کی طرح ڈکرایا اور رنگو کی طرف بڑھا۔ میں نے چیخ کر اُسے رکنے کا حکم دیا۔ وہ رُک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "جوش سے نہیں، ہوش سے کام لو پیارے!"

میری للکار نے اُسے بہت بڑے نقصان سے بچا لیا تھا ورنہ وہ جس انداز میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر حملہ آور ہوا تھا، بہ آسانی رنگو کا شکار ہو جاتا۔ رنگو کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ میو کے قریب آتے ہی اُس کے پیٹ میں چھری گھونپ دیتا۔

میو نے دانت کاٹنے اور سلگتی ہوئی آواز میں رنگو سے کہا۔ "چھری پھینک دو ورنہ......"

ہال میں رنگو کا بھاری بھرکم قہقہہ گونج اُٹھا۔ اس کا وحشت بھرا قہقہہ تھما تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا ورنہ؟ ماں کے یار...... میں بندھا ہوا ہوں مگر شیر ہوں۔ تم کھلے ہوئے ہو مگر کتے ہو! گندی نسل کے۔ ہمت ہے تو میرے قریب آؤ...... چھٹی کا دودھ نہ یاد دلا دوں تو میرا نام رنگو نہیں...... میں شیدے قسائی کا پتر نہیں...... آؤ!"

میو نے اُسے زیر لب گالی دی اور پلٹ کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں اُس کا مطلب سمجھ نہیں پایا مگر رنگو سمجھ گیا۔ تبھی حلق کے بل چیخا۔ "ہاں ہاں! جاؤ...... بجلی کا بٹن دباؤ اور اپنے اس باپ کو جھٹکے لگاؤ۔ ہیجڑوں میں بھی غیرت مند ہیجڑے ہوتے ہیں مگر تمہاری کتیا مالکن نے سب بے غیرتوں کو اکٹھا کر رکھا ہے۔ واقعی تمہیں کسی مرد نے نہیں، ڈرپوک خنزیر نے جنا ہے۔"

چیختے چیختے اُس کی آواز پھٹنے لگی اور حلق سے لگاتار مغلظات امنڈنے لگیں۔ اچانک اُس نے بھڑک کر پوری قوت سے چھری مجھے دے ماری۔ میں اس غیر متوقع حرکت کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے بے ساختہ پیچھے جھکا۔ اسٹول مجھے سنبھال نہ سکا اور میں اسٹول سمیت فرش پر کمر کے بل جا گرا۔ شکر ہوا کہ چھری دستے کے بل میرے کندھے پر لگی تھی۔ اگر اس کا پھل سامنے کی طرف ہوتا تو کم سے کم دو انچ تک ماس میں اُتر جاتا۔ ایسے ہی وقت ہال میں تالیوں کی زوردار آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اُٹھا۔ بیڈ روم کی طرف دیکھا۔ میڈم تالیاں بجاتے ہوئے بیڈ روم سے نکل کر میری طرف چلی آ رہی تھی۔ میو اس کے عقب میں چل رہا تھا۔

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "میڈم آپ؟"

وہ قریب آ کر رُکی۔ ایک نظر رنگو کو دیکھ کر ہنسی اور ستائشی لہجے میں بولی۔ "ویل ڈن استاد رنگو! تم نے تو میرے دو ٹائیگرز کو گھنگی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ اور تو اور...... میرے کنگ ٹائیگر کو بھی......"

اس نے جان بوجھ کر معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور مجھے شریر نظروں سے دیکھا، پھر میو کو قریب آنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ اسٹول اُدھر دیوار کے ساتھ رکھو اور استاد رنگو کا نیک کلپ کھول دو۔ رنگو استاد آدمی ہے اور استاد کا مقام یہ نہیں ہوتا کہ اسے باندھ کر مارا جائے۔ کیوں استاد؟"

رنگو کے نتھنے پھڑک رہے تھے مگر خاموش تھا۔ کوئی جواب نہ پاکر میڈم میری طرف متوجہ ہوئی۔ "شہر یار! اسی نے تمہارے والدین کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ ہے ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو بصدقِ دل سے۔ ہے ناں؟"

میں الجھ کر بولا۔ "جی میڈم!"

"تمہیں وہ کہانی بھی یقیناً یاد ہوگی جو میں نے رات بھر جاگ کر تمہیں سنائی۔ اس کہانی میں استاد رنگو کا بھی کردار شامل ہے۔ اس سے اپنا انتقام لو؛ میرا بھی...... یہ خالی ہاتھ ہے۔ اس لیے تم بھی خالی ہاتھ لڑو گے۔ کیوں استاد رنگو! تمہیں یہ بات پسند آئی؟"

رنگو نے دانت پیسے، مجھے اور میڈم کو باری باری گھورا اور دیوار پر تھوک دیا، بولا۔ "میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ تم وہی حرافہ ہو...... کیا نام تھا تمہارا؟ ہاں...... چندو ماہی...... مفت میں بکنے والی کنجری؛ ہاہ! تم مجھ سے کیا انتقام لوگی۔ نام بدلنے سے اصلیت نہیں بدل سکتی۔ جاؤ! اپنے گندے بدن کو مل مل کر دھوؤ اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ میں کیا بُرا ہوں؛ تم تو مجھ سے بھی لاکھ درجے زیادہ گندی ہو...... تم مجھ سے انتقام لوگی؟ واہ......"

اس کی استہزائیہ بکواس سن کر میرا خون کھول اُٹھا۔ اس نے میری موجودگی میں میڈم پر براہِ راست اپنے من کی غلاظت اچھالی تھی جو مجھ سے برداشت نہ ہو سکی اور میں بھڑک کر اس کی طرف بڑھا۔ میڈم نے آنِ واحد میں اپنا بازو حائل کر دیا، بولی۔ "نہیں شہر یار! جلد بازی نہ کرو۔ تم چند منٹ بعد اپنے دل کی بھڑاس تسلی سے نکال لوگے مگر ابھی نہیں؛ اس کا نیک کلپ کھلنے دو۔"

یہ کہہ کر وہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد میو سیاہ رنگ کی 'ایل کی' اُٹھا لایا۔ میڈم سے اجازت لے کر رنگو کے قریب چلا گیا۔ چونکہ وہ نیک کلپ کھولنے جا رہا تھا، اس لیے رنگو نے اُس پر حملہ نہیں کیا بلکہ خشمگیں نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ چند لمحوں میں میو نے اسٹیل کا کڑا کھول دیا۔

رنگو چند لمحے اپنی گردن مسلتا رہا پھر میڈم سے مخاطب ہوا۔ "اپنے دونوں کتوں کو ہشکار کر میری طرف بھیجو۔ میں بھی تو دیکھوں کہ تمہاری گندی چمڑی کے دیوانے کس طرح اپنی وفاداری ظاہر کرتے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ رنگو کی بکواس سن کر بھی میڈم کی پیشانی پر ایک بل تک نہیں پڑا بلکہ ایک شریر سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر مچل گئی، بولی۔ "شہر یار! اب تم جانو اور تمہارا شکار جانے۔ میں اور میو خاموش تماشائی بن کر تمہارے ہنر کا کمال دیکھتے ہیں۔ میں یہی فائٹ دیکھنے کے لیے بڑا ضروری کام چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔"

اس دوران میو بڑی مستعدی سے میڈم کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ محض تماشائی نہیں تھا بلکہ مخصوص انداز میں میڈم کو کسی بھی ممکنہ خطرے کے مقابلے میں تحفظ دے رہا تھا۔

میدان صاف ہو گیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے فرش پر پڑی ہوئی چھری دور پھینک دی اور کائیاں نظروں سے رنگو کو دیکھا۔ اس کی خون آشام آنکھیں بھی مجھ پر مرکوز تھیں اور وہ پہلوانوں کے مخصوص انداز میں دونوں بازوؤں کو ہلا کر خون کو گردش دے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ تر نوالہ نہیں تھا، آسان شکار نہیں تھا، اس لیے میرے رگ و پے میں برق بھری ہوئی تھی۔ میں نے اُسے حملہ کرنے میں پہل کا موقع دیا تو اُس نے بڑے نپے تلے انداز میں میری جانب قدم بڑھایا۔ جونہی قریب آیا، میں پنجوں کے بل ہوا میں اُچھلا اور میں نے اس کے سینے پر دونوں پیر پوری قوت سے مارے۔ وہ میری فلائنگ کک کی زوردار چوٹ کھا کر کمر کے بل گرا۔ میں اس سے پہلے فرش سے اُٹھ گیا تھا اور جونہی میں نے اُس پر چھلانگ لگائی، اس نے اپنے دونوں گھٹنے اکٹھے کر لیے۔ میں پیٹ کے بل اس کے اُٹھے ہوئے گھٹنوں پر گرا اور سانپ کی طرح کروٹ بدل گیا مگر اس دوران اس نے چابکدستی سے میرے بال مٹھیوں میں بھر کر میرا سر فرش پر دے مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ میں نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ایڑی کے بل گھوما اور اس کے بائیں کولھے پر زوردار کک رسید کی۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ہتھیلیوں کے بل بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور اس کی دونوں جڑی ہوئی ٹانگیں میری بائیں پنڈلی پر لگیں۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے فرش پر گر گیا۔

میں نے گرتے ہی کروٹ بدل کر اُس سے دور ہونے میں کوئی تاخیر نہیں کی مگر وہ مجھ سے پہلے فرش کو چھوڑ چکا تھا۔ جونہی میں نے اُٹھنا چاہا، اس کا زوردار مکا میری کنپٹی پر پڑا۔ میں نے بے ساختہ سر تھام لیا۔ چند جھٹکے دیے مگر حواس بحال نہ ہوئے۔ اس دوران موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے رنگو نے مجھے مشینی انداز میں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ چونکہ وہ برہنہ پا تھا، اِس لیے بڑی چالاکی کے ساتھ اپنے ٹخنے مجھے مار رہا تھا۔ ٹخنوں کی مسلسل چوٹوں سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔

اچانک اس کا پاؤں میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، زوردار جھٹکا دے کر پاؤں موڑ دیا۔ اس کے حلق سے تیز سسکی نکلی۔ ایسے ہی وقت میں وہ اچانک فرش پر جھکا، ہتھیلیوں کے بل ٹکا اور اس نے بندر کی سی پھرتی سے اپنی دوسری ٹانگ پوری قوت سے گھما کر مجھے دے ماری۔ چونکہ میں اس کے ارادے کو بھانپ گیا تھا، اِس لیے سر بچا گیا اور اس کی پنڈلی میرے کندھے پر لگی۔

میں دانت پیس کر اس کا پاؤں موڑتا گیا اور وہ کروٹ پر کروٹ بدلتا گیا۔ اس کی پاؤں چھڑانے کی ہر تدبیر میں اپنی گرفت میں غیر معمولی طاقت بھر کر کاٹتا رہا۔ پھر اُس کی مزاحمت کا دم خم ٹوٹ گیا۔ میں نے موقع مناسب جانا اور اچھل کر اُس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ پاؤں چھوڑ کر اس کی تھوڑی کے نیچے دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ جب تک وہ میرا ارادہ بھانپتا، وہ بُری طرح میرے دیہاتی داؤ میں پھنس چکا تھا۔ میں نے وحشیانہ انداز میں پوری قوت صرف کر کے اُس کا سر اُوپر اُٹھا لیا۔ اب اگر وہ اندھا دھند زور لگاتا تو اس کے منکے کے ٹوٹنے کا احتمال تھا، اس لیے مزاحمت ترک کر کے خرخرانے لگا۔

پھر اچانک میں نے اس کی تھوڑی تلے سے ہاتھ نکال لیے۔ اس کی ناک فرش پر لگی۔ پورے بدن کو جھٹکا لگا۔ میں نے اُسے سر کے عقبی بالوں سے پکڑا اور پے در پے فرش پر مار کر اس کی ناک خون میں تر کر کے چپٹی کر دی۔ اس کی خرخراہٹ نے باقاعدہ چیخوں اور گالیوں کی شکل اختیار کر لی تھی مگر وہ نہ تو میرے نیچے سے نکل سکتا تھا اور نہ اپنے بال چھڑا سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے کس بل نکل گئے اور اس نے اپنا سر ایک جانب ڈال دیا۔ میں اچھل کر دو قدم دور جا کھڑا ہوا۔ دیکھا کہ اس کے چہرے کے نیچے فرش پر خون کافی مقدار میں موجود تھا اور پچکی ہوئی بدوضع ناک سے خون باریک دھاریوں کی صورت میں نکل کر خون کے ننھے تالاب میں مسلسل اضافہ کر رہا تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی انگلیوں پر جست لگائی۔ میرے سخت سول والے جوتوں نے اس کی انگلیاں پیس ڈالیں تو اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے بندر کی طرح اچھل اچھل کر اس کے دونوں پیروں کی انگلیاں بری طرح کچل ڈالیں۔ کچھ ہی دیر میں اس میں ہاتھ اُٹھانے کی سکت بھی نہ رہی۔

میں نے چند لمحے دم لیا۔ سوچا پھر اس کے دونوں پیر تھام کر ہوا میں بلند کیے۔ گھٹنوں کے عقبی حصوں میں اپنے پیر رکھے اور اس کے پیروں کو پوری قوت سے موڑ کر ان پر اپنا پورا وزن ڈال دیا۔ اعصابی کھنچاؤ نے اُسے تڑپنے اور چیخنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دانت پیس کر اس کے پیروں کو فرش سے لگا دیا۔ دونوں گھٹنوں کی ہڈیاں اپنی جگہوں سے کھسک گئیں اور ہال رنگو کی دلدوز چیخوں سے گونج اُٹھا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُسے بالوں سے پکڑ کر اُٹھا دیا اور طمانچوں کے تسلسل پر رکھ لیا۔ میرے ہاتھ خون سے لتھڑ گئے مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ مجھ پر عجیب سی جنونی کیفیت طاری تھی، گویا میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اُسے کتنا مارا۔ نجانے کس وقت وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا مگر میرے ہاتھ بدستور چلتے رہے۔

میرے کانوں میں میڈم کی تیز آواز پڑی۔ "شہر یار! رک جاؤ پلیز...... رنگو بے ہوش ہو گیا ہے۔"

میں نے ہاتھ روکا۔ جھک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ میں انگلی گھسیڑ دی۔ اس کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا مگر بے ہوشی نہ ٹوٹی۔ جونہی میں نے انگلی دہری کی اور آنکھ کا ڈھیلا باہر کی طرف کھینچا، اس کے حلق سے دردناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کا جسم مسلسل جھٹکے لے رہا تھا۔

"خد...... خدا واسطے...... میری آکھ!" اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی بے ربط آواز برآمد ہوئی۔

میری نفرت میری برداشت پر حاوی تھی۔ میں نے وحشیانہ انداز میں اس کا ڈھیلا باہر کھینچ لیا۔ خون کی باریک مگر تیز دھار میرے چہرے تک آئی جبکہ خون اور رطوبت سے لتھڑے ہوئے باریک عضلات میرے ہاتھ سے چمٹ گئے۔ اس کا جھٹکے لیتا وجود ایک دم ساکت ہو گیا مگر درد کی شدت سے وہ پھر ہوش میں آ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ فرش پر تڑپنے کے انداز میں ملنے لگے اور ایک آنکھ میں دنیا جہان کا درد سمٹ آیا۔

انسانی ماس میں بڑی لچک ہوتی ہے مگر ایک حد پر جا کر کاغذ کی طرح ٹھوس ہو جاتا ہے اور پھٹنے لگتا ہے۔ اس کے نچلا ہونٹ بھی گوشے سے پھٹنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے گھٹنوں سے اوپر تک اُس کی ٹانگیں جھٹکے لینے لگیں۔ آدھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہونٹ پھٹ گیا تو میں نے چھوڑ دیا اور اوپر والا ہونٹ مونچھ سمیت پکڑ لیا۔

ایسے ہی وقت اس کی گھگیائی ہوئی آواز مجھے سنائی دی، ”بب...... بس...... مم...... مینوں مافی......“

(بب...... بس...... مم...... مجھے معافی......)

اس کے حلق سے نکلنے والے اس ادھورے جملے نے میرے اندر جلتے ہوئے فلک بوس الاؤ پر پانی کے چند چھینٹے مارے۔ ایک ذرا تسکین ہوئی۔ میں نے اس کا ہونٹ چھوڑ دیا اور پاؤں ناک پر سے ہٹا کر اس کی پھولی پچکتی ہوئی چھاتی پر رکھ دیا۔ عین اس طرح جیسے شکاری اپنے شکار کو مار گرانے کے بعد اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر فخریہ انداز میں فوٹو کھنچواتے ہیں۔

اس کی تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت دیدنی تھی۔ وہ چند لمحے تڑپتا رہا پھر گردن ایک طرف ڈال کر بے حد مایوسی سے بولا۔ ”میں ہار گیا...... ہاہ! اُستاد رنگو قس...... قسائی ہار گیا۔ کل کے لونڈے سے ہار گیا۔ ہائے!“

اس کے جسم کا کوئی عضو سلامت نہیں تھا اور اگر اُسے اسی حالت میں چھوڑ بھی دیا جاتا تو بہ مشکل آدھا گھنٹا نہیں گزار سکتا تھا، پہلے ہی مر جاتا۔ چاروں شانے چت فرش پر پڑا ایک آنکھ سے چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ پانی سے بھری ہوئی تھی۔ دوسری آنکھ کی جگہ پر خون سے بھرا ہوا گڑھا اور پچکی ہوئی خون آلود ناک اس کی شکل کو مزید ڈراؤنا کر رہے تھے۔ اس کی آنکھ میں بجا طور پر شکست تحریر تھی۔

میں نے چھاتی پر رکھے ہوئے پاؤں کے دباؤ میں اضافہ کیا اور موت کی خنکی لہجے میں سمیٹ کر کہا۔ ”امید ہے تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ ہم دونوں میں سے شیر کون ہے اور کتا کون؟“

اس کے بے جان انداز میں پھیلے ہوئے بازوؤں میں موہوم سی حرکت پیدا ہوئی جو فوراً ہی معدوم ہوگئی۔ کانپتی ہوئی شکست خوردہ آواز میں بولا۔ ”ہاں! میں ہار گیا ہوں۔ اب مجھے یوں بے عزت کرنے سے بہتر ہے مجھے مار دو۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ خدا کے لیے مجھے مار دو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔“

اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے متغیر ہوگیا۔ آواز میں کپکپاہٹ لحظہ بہ لحظہ بڑھنے لگی تھی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے اعتراف ہے کہ تم بہت بہادر آدمی ہو۔ شکست پر موت کو ترجیح دیتے آئے ہو مگر آج تم زندہ رہتے ہوئے ہار گئے ہو۔ ایسی حالت میں بہادر آدمی ٹوٹ جاتا ہے اور دل سے شکست تسلیم کر لیتا ہے۔ کیا خیال ہے؟ جو پوچھوں گا، بتاؤ گے یا نہیں؟“

اس نے اپنی آنکھ بند کر لی۔ ہونٹ کپکپاتے رہے۔ خاصے طویل توقف کے بعد بولا۔ ”اب تمہیں حق ہے کہ تم مجھ سے سوال کرو اور میں جواب دوں۔ پوچھو! کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

میں نے اس کے سینے پر سے پاؤں ہٹا لیا اور فرش پر پیروں کے بل بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں سوال کرنے لگا۔ وہ آنکھ بند کیے مجھے بے ربط انداز میں جواب دینے لگا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نہ تو کچھ چھپا رہا تھا اور نہ ہی جھوٹ بول کر مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بولتے بولتے نڈھال ہوگیا۔ پانی مانگا۔ میرے اشارے پر میوا اس کے لیے پانی کا گلاس بھر لایا اور اس کے حلق سے لگا دیا۔ کچھ پانی ہوا کی نالی میں چلا گیا جس سے اُسے کھانسی آگئی۔ زخموں کا درد بڑھ گیا۔ بہ دقت چند گھونٹ پینے کے بعد اس نے سر فرش پر ڈال دیا، بولا۔ ”ڈرو مت! قریب آجاؤ۔ میں رنگو قسائی ہوں۔ مرد کا بچہ ہوں۔ ہار گیا تو مردوں کی طرح ہار مان بھی گیا۔ اب اگر تم مجھے قتل بھی کرنے لگو گے تو میں ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔“

وہ آدھا مر چکا تھا۔ آدھا زندہ تھا۔ آنکھ اور ناک کے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مسلسل جھٹکے لے رہا تھا۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا، اس لیے اس کے کہنے پر قریب تو ہوگیا مگر اپنے تئیں بھی خاصا محتاط رہا۔ اس میں ہاتھ ہلانے تک کی سکت نہیں تھی مگر وہ مرنے سے پہلے مجھے مار دینے کے لیے کوئی بھی فیصلہ کن حملہ کر سکتا تھا۔ اس نے کچھ میرے پوچھنے پر اور کچھ اس نے از خود بتا دیا۔ چونکہ وہ طویل عرصہ تک سردار یارن خان کا دست راست رہا تھا، اس لیے اُسے پس منظر سمیت وہ سب کچھ معلوم تھا جو نور پور کے کسی اور شخص کے علم میں نہیں آیا تھا۔ اس کی بے ربط انداز میں دی ہوئی معلومات سے میں نے سوہنے خان کی اندوہ ناک کہانی ترتیب دے لی۔

میرا باپ، امام دین عرف سوہنا خان، مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔ وہ جب خوشبو دار تیل سے چپڑے ہوئے بالوں میں سیدھی مانگ نکال کر، سفید براق لٹھے کا تریزوں والا سوٹ پہن کر نور پور سے نکلتا تو بیسیوں محبوبانہ نظریں اُس پر ساکت ہوجایا کرتی تھیں۔ چونکہ وہ زمیندارے کے ساتھ ساتھ مال ڈنگر کا بیوپار بھی کرتا تھا اور مال کی خرید و فروخت

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے سلسلے میں علاقے کی مال منڈیوں میں آنا جانا لگا رہتا تھا، اس لیے اسے نور پور سے باہر بھی کافی وقت گزارنا پڑتا تھا۔ وہ باہر جانے کے لیے خصوصی طور پر تیار ہو کر گھر سے نکلا کرتا تھا۔ جب رضیہ عرف رجو سے اُس کا بیاہ ہوا تو نور پور کے بھی مرد و زن نے دانتوں میں انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ رجو اُس سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ خدا نے اُسے آنکھوں کا اضافی حسن دے رکھا تھا۔ جس کو بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھ لیتی، اسی کا ہو رہتا۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد تک اُس کی شخصی دل کشی اور حسن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

نور پور میں سردار یارن خان کا ایک طرح کا بلا شرکت غیرے راج قائم تھا۔ وہ جو چاہتا، کر گزرتا تھا اور جسے چاہتا اپنے دارے پر بلا کر دو چار جوتے لگوا کر، بے عزت کر کے سیدھا کر دیتا تھا۔ چونکہ سوہنا خان اپنی موج میں گم رہنے والا شخص تھا اور اپنے کام سے کام رکھتا تھا، اس لیے وہ سردار یارن خان کے دارے پر حاضری دینے یا گپ شپ لگانے کے لیے نہیں جایا کرتا تھا۔ سرِ راہ اگر اُس سے ملاقات ہوجاتی تو ادب سے سلام کر کے رُکے بغیر گزر جاتا تھا۔ اس عادت کے پیشِ نظر سردار یارن خان کی نظر میں وہ مغرور اور اکڑ خان قرار پایا تھا اور اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا۔

جب اُس نے دارے پر سوہنے خان کی بیوی کے حسن کا چرچا سنا تو اس کے دل میں رجو کو دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا۔ اس میں بیسیوں برائیاں تھیں مگر ابھی تک اس نے نور پور کی کسی دھی رانی کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب اس نے ایک دن دارے کے سامنے سے سہیلیوں کے جھرمٹ میں گزرتی ہوئی رجو کو دیکھا تو بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ انہی دنوں اتفاق سے اُسے لاہور جانا پڑا جہاں وہ سال بھر رہا۔ واپس آیا تو وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ رجو کو بھی بھول چکا تھا۔ آتے ہی اُسے رجو یاد آئی مگر اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تیر گئی اور ایک استہزائیہ جملہ لبوں پر مچل گیا۔ ”ہن تاں اُہ ماں بنی وَدی ہوسی!“

(اب تو وہ ماں بن چکی ہوگی)

رجو واقعتاً اس دوران ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ وہ اس کے دل سے محو ہو چکی تھی مگر جونہی اُس نے ایک دن چہل قدمی کے دوران فصلوں میں رجو کو دیکھا تو اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ ماں بن کر بھی غضب ڈھانے والی دلکشی رکھتی تھی۔ اس نے بے اختیار اُس کا رُخ کیا۔ قریب جا کر پوچھا۔ ”تم رجو ہی ہو ناں؟ سوہنے خان کی ذال؟“ ذال مقامی زبان میں بیوی کو کہا جاتا تھا۔

رجو نے سر پر دوپٹا درست کیا۔ ایک نظر اُسے دیکھ کر سر جھکا لیا، بولی۔ ”السلام علیکم خان جی! میں رجو ہی ہوں۔“

وہ یہ کہہ کر وہاں سے کھسکنے لگی۔ یارن خان نے روک لیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ ناچار ’ہوں ہاں‘ میں جواب دینے لگی۔ یارن خان کو اس کے عدم دلچسپی والے رویے سے باور ہوگیا کہ وہ وہاں سے جلد از جلد کھسکنا چاہتی

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

تھی۔ اس نے اپنی زبان میں کمال کی مٹھاس بھر کر اُسے کسی وقت حویلی آنے کی دعوت دی۔

وہ جاتے ہوئے بولی۔ ''ڈیکھساں خان جی...... آپنے سائیں کوں آکھساں جے اُوہ میکوں حویلی گھن گیا تاں!''

(دیکھوں گی خان جی! اپنے شوہر سے کہوں گی اگر وہ مجھے حویلی لے گیا تو اس کے ساتھ آجاؤں گی)

وہ چلی گئی مگر یارن خان کا پہلو خالی کر گئی۔ اس کے بعد وہ تاک میں رہنے لگا۔ رجو کا نسوانی دل اُس کی غیر معمولی دلچسپی اور انہماک تاڑ گیا اور وہ اپنے طور پر اس سے دور رہنے لگی۔ کوشش کرنے لگی کہ گھر سے کم سے کم نکلا کرے۔ پھر ایک دن یارن خان نے گلی میں اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ حیرت اور خوف سے دم بخود رہ گئی۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنی کلائی چھڑانا چاہی تو یارن خان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ وہ کلائی نہ چھڑا سکی اور بے بسی سے نور پور کے رکھوالے کو دیکھنے لگی۔ اس دوران ہی یارن خان نے اپنے دل کی تمام تر ہوس اس کے گوش گزار دی۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ حیران بھی تھی کہ تمام کا تمام نور پور اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتا تھا کہ وہ برادری کی کسی دِھی بھین کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ آنکھ اُٹھانا تو ایک طرف رہا، اس نے گلی کے بیچوں بیچ اس کی کلائی تھام کر دعوتِ گناہ بھی دے ڈالی تھی۔ بہ مشکل اس سے پیچھا چھڑا کر گھر پہنچی۔ شام تک اپنے بچے کو گود میں لیے روتی رہی۔ جب سوہنا خان تھکا ہارا گھر پہنچا، اُسے روتے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ جب اس کے استفسار پر رجو نے یارن خان کی تمام کارگزاری سنائی تو اس کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ آگ بگولہ ہو کر اُسی وقت گھر سے نکلا اور یارن خان کی حویلی پہنچ گیا۔

یارن خان کا برادری کی کسی عورت کو گلی میں روکنا اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا تو سوہنے خان کا یوں بپھر کر دارے پر پہنچنا بھی نور پور کی روایت میں نہیں تھا۔ اس نے دارے میں کئی لوگوں کی موجودگی میں یارن خان کو ماں بہن کی گالیاں دیں، بُرے نتائج کی دھمکیاں دیں اور سینہ ٹھونک کر کہا۔ ''اگر تمہیں کسی مرد کے بچے نے جنم دیا ہے تو میری بیوی کو پھر ہاتھ لگانا۔ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تمہاری سات پشتیں بھی یاد رکھیں گی۔''

یارن خان ندامت اور تضحیک کے پسینے میں بھیگ گیا۔ جب تک سوہنا خان دارے میں چھاتی پھلائے بلند آواز میں بولتا رہا، وہ سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ سوہنا خان بے پناہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت طاقت ور اور دلیر بھی تھا۔ اس کی بانہیں سلامت تھیں۔ بھائی اور قریبی رشتہ دار بھی اس کے لیے جان دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ اور برادری کے زُعم میں انجام کی پروا کیے بغیر اس نے یارن خان کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔

پھنکارتا ہوا دارے سے نکلا۔ عشا کے وقت اس کے گھر بھائی چراغ دین اور قریبی رشتہ دار جمع ہو گئے۔ اس نے جوش میں یہ اعلان کر دیا۔ ''اگر اس خبیث کے بچے نے دوبارہ رجو کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو میں اسے نور پور کی گلیوں میں گھسیٹ کر مار دوں گا۔''

یہ دھمکی کسی ذریعے سے یارن خان تک پہنچ گئی۔ وہ سوہنے خان کی سرشت کو جانتا تھا۔ جانتا تھا کہ سوہنے کو بڑ ہانکنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا، اس پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ دارے میں آکر یارن خان کو بُرا بھلا کہنے سے بھری برادری میں خان کی بہت سبکی ہوئی تھی اور اس کا ذہن مارے تضحیک کے جل رہا تھا۔

اگلے دن حیدر خان اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں کے درمیان نہ جانے کیا باتیں ہوئیں۔ تمام دن وہاں رہنے کے بعد جب شام کو حیدر خان کی موٹر کار دارے سے نکلی، اس سے ایک گھنٹا بعد یارن خان نے بھی لاہور کا رُخ کر لیا۔ وہ فطری طور پر منتقم مزاج اور کمینہ انسان تھا۔ اس نے اپنے اندر بھڑکی ہوئی تضحیک کی آگ پر برف ڈالنے کے لیے چند چھٹے ہوئے بدمعاشوں کی خدمات حاصل کر لیں۔ انہیں اپنے ساتھ نور پور لے آیا۔

آتے ہی اس نے سوہنے خان سے انتقام لینے کا منصوبہ تیار کر لیا اور انتظار کرنے لگا کہ کون سی شب سوہنا خان اپنے گھر سے باہر گزارتا ہے۔ وہ اپنے معمول کے مطابق ہر پندرہ دن بعد مال ڈنگر لے کر ملتان کی منڈی مویشیاں جایا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک رات کو اپنے کارندوں کی مدد سے یارن خان نے سوہنے خان کی دیوار پھاندلی اور سوہنے خان کی عزت کی دھجیاں اُڑا دیں۔ ساتھ میں رجو کو سمجھا بھی دیا کہ اگر وہ سوہنے خان کو بتائے گی تو یا وہ قتل ہو جائے گا یا عمر بھر جیل میں گزارے گا۔ رجو دیہاتی عورت ہونے کے باوجود بہت سمجھ دار تھی۔ اس دھمکی میں پنہاں بربریت، یارن خان کی طاقت اور اپنا مخدوش مستقبل دیکھ کر لب بستہ ہو گئی مگر اس کی تمام تر شوخیاں اور جوانی کی سر مستیاں ہوا ہو گئیں جنہیں سوہنے خان کی محبت بھری آنکھوں نے چند دنوں میں ہی تاڑ لیا۔ اس کے مسلسل بجھے بجھے رہنے کو پہلے تو سوہنے خان نے طبیعت کی خرابی قرار دیا

مگر کئی دن گزرنے پر بھی رجو کی کیفیت جوں کی توں رہی تو وہ گھبرا گیا اور لگا ہے یہ لگا ہے کریدنے لگا۔

یارن خان ہر پندرہ روز بعد سوہنے خان کے گھر نقب لگانے کے لیے پہنچ جایا کرتا تھا۔ رجو دو تین ماہ میں ہی سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ چہرہ پیلا پڑنے لگا۔ اپنے خاوند کو بتانے کی خواہش رکھنے کے باوجود نہ بتا سکی کیونکہ اُسے سوہنے خان کی سلامتی عزیز تھی۔ اس نے سکون کی سانس لی جب ہر پندرہ دن بعد رات کے اندھیرے میں اسے پامال کرنے والا یارن خان کچھ عرصہ نور پور رہنے کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ کسی نے کہا کہ لاہور گیا ہے تو کسی نے کہا کہ جاپان سدھار گیا ہے۔ رجو کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کہاں گیا تھا، اُسے تو جان چھوٹنے کی خوشی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے سابقہ معمول پر لوٹ آئی مگر سوہنا خان دیکھ رہا تھا کہ رجو کے معمولات میں پہلی سی شوخی نہیں رہی تھی۔

رجو نے سوچ رکھا تھا کہ چھ سات ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ یارن خان نور پور لوٹ کر نہیں آئے گا مگر اس کی توقع کے برعکس وہ ڈیڑھ ماہ بعد نور پور پہنچ گیا تو وہ پھر اندیشوں میں گھر گئی مگر آنے والے دنوں میں یارن خان نے اُسے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ سننے میں یہ بھی آیا تھا کہ اس نے شادی کر لی تھی۔ اس خبر کی تصدیق یوں بھی ہوئی کہ وہ مہینے میں ایک آدھ چکر لاہور کا لگانے لگا تھا۔

اس کی شادی ہو گئی تھی، اس نے کسی اور عورت سے رہ و رسم دوستی پیدا کر لی تھی یا ویسے ہی رجو اس کے دل و دماغ سے اُتر گئی تھی، اس بحث کے قطع نظر رجو نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے محبوب شوہر کی دلداریوں میں رُجھ گئی۔ اس کے حقوق پر مارے جانے والے ناپسندیدہ شب خون کے لرزہ براندام واقعات کو اس نے اپنی تنہائی کے آنسوؤں میں چھپا دیا۔ ایک لمبا عرصہ عافیت میں گزر گیا اور وقت نے اس دُکھ پر گرد کی دبیز تہ چڑھا دی۔

سوہنا خان اپنی ڈگر پر بہ دستور چل رہا تھا۔ دونوں بچے بڑے ہو رہے تھے۔ انہی دنوں ایک بھینس کے لین دین پر سردار حیدر خان سے اُس کی منہ ماری ہو گئی۔ حیدر خان بی ڈی ممبر تھا۔ آنے والے انتخابات میں ضلع کونسل کے ممبر کی نشست پر الیکشن لڑنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی نوخیز سیاسی قوت کے زعم پر سوہنے خان کو ماں کی گالی دی۔ سوہنا برداشت نہ کر پایا اور آستینیں چڑھا کر اس پر چڑھ دوڑا۔ دو چار گھونسوں میں ہی اس نے حیدر خان کو دھنک کر رکھ دیا۔ لوگوں نے پکڑ دھکڑ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔

حیدر خان نے پھولی ہوئی سانسوں کے بیچ بڑے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ ''ایڈا غیرت وند ہوویں تاں یارن دے بال نہ پالیں!''

(تم اتنے غیرت مند ہوتے تو یارن خان کے بچے نہ پالتے)

سوہنے خان کے دل پر گھونسا لگا۔ سر دست اس نے حیدر خان کو منہ بھر کر گالیاں دیں، یارن خان کے لیے بھی سخت سست الفاظ کہے اور اگر اُسے لوگوں نے مضبوطی سے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ حیدر خان کی گدی سے زبان کھینچ کر پڑ (میدان) پر ڈال دیتا۔

بھینس کا سودا بیچ میں ہی رہ گیا اور وہ تلملاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ دلیر شخص تھا۔ اس کے اعصاب مضبوط تھے مگر حیدر خان کے طعنے نے اُسے توڑ کر رکھ دیا۔ شام تک اندر ہی اندر گھٹتا رہا، سوچتا رہا اور رجو کے طور و اطوار پر غور کرتا رہا۔ آگ جلتی ہے تو دھواں اُٹھتا ہے۔ بات ہوتی ہے تو بتنگڑ بنتا ہے۔ اگر حیدر خان کی کہی ہوئی بات سچ نہیں بھی تھی تو کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جس کے بل پر اس نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔

اس شام اس نے بچوں کو پہلی مرتبہ تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ عادات، خال و خد، قد بت...... وہ کسی بھی لحاظ سے یارن خان سے مشابہت نہیں رکھتے تھے۔ بیٹے نے باپ کی شکل چرائی تھی۔ بیٹی ماں پر گئی تھی۔ پھر بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔ شک کا کانٹا مسلسل پہلو میں چبھ رہا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جب اس نے شام کا کھانا غیر معمولی عدم رغبتی سے کھایا تو رجو کا ماتھا ٹھنکا۔ چنگیر خالی کر کے کندوری سے ہاتھ پونچھنے والے نے بہ مشکل آدھی روٹی پیٹ میں اُتاری تھی۔ متفکر ہو گئی۔ پریشانی کا سبب دریافت کرنے لگی۔ سوہنے کے ٹالنے پر اپنے مخصوص انداز میں دھرنا دے کر بیٹھ گئی اور پوچھنے پر مصر ہو گئی۔

سوہنے نے ادھر اُدھر کی ہانکیں۔ ٹالا۔ نہیں ٹلی تو چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ جب دونوں بچے کھیلتے کودتے سو گئے تو اس نے لحاف اُتار کر پائنتی پر اکٹھا کرتے ہوئے کہا۔ ''رجو! بول تو ذرا...... تجھے دنیا میں کون سب سے زیادہ پیارا ہے؟''

وہ الجھ کر اُسے دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ عورت کے نزدیک بچے سے زیادہ پیارا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔ اس نے اپنے دل میں جھانکا۔ یہاں کچھ مختلف تھا۔ بیٹا اپنے باپ کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ سچ دکھائی دیا تو سچ بول دیا۔ ''میکوں توں پیارا ہیں وَل شہرا جانی میڈی دلڑی دا راجا ہے۔''

(تم مجھے پیارے ہو۔ تمہارے بعد شہرا میرے دل کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

راجا ہے)

سوہنے نے اُسے اپنی چارپائی پر بلایا۔ اس کا داہنا ں ہاتھ اپنے سر پر رکھا۔ بایاں ہاتھ پہلو میں لیٹے ہوئے بیٹے کے سر پر رکھا۔ پوچھا۔ ”تو پھر سچ سچ بتا؛ یہ دونوں بچے میرے ہی ہیں ناں؟“

رجو کی آنکھیں خوف اور احساسِ ذلت سے پھٹنے کو آ گئیں۔ تھوک نگل کر بولی۔ ”میڈا خان! اِہ توں کے پیا آ دھیں...... میں تیڈی...... میڈی آل وی تیڈی...... پڑھیا کیا ہے؟“

(میرے خان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہاری ہوں۔ میری نسل بھی تمہاری ہے مگر ہوا کیا ہے؟)

سوہنے خان کی غیرت مند آنکھیں جھک گئیں۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آج مجھے اُس بے غیرت حیدر خان نے رڑے میدان میں طعنہ دیا ہے کہ میں یارن خان کے بچے پال رہا ہوں۔“ سوہنے کی سانسیں پھول گئیں۔ سینہ دھونکنی ہو گیا۔ رجو کو دیکھے بغیر بولا۔ ”رجو! یہ بات وسیب کے پانچ سات بندوں اور دو تین وپاریوں (بیوپاریوں) نے بھی سنی اور وسیب میں میری غیرت کا سرِ عام جنازہ نکل گیا۔ سچ بتا رجو! میری امانت میں تم نے خیانت کی ہے؟ اس کتے یارن خان نے......“

رجو کا دم گھٹنے لگا۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس کے ہاتھ میں پیدا ہونے والی لرزش کو سوہنے خان نے محسوس کر لیا۔ درشتی سے بولا۔ ”رجو! کھاناں قسم میرے سر کی...... شہرے کے سر کی...... اور بول! کیا میری عزت کا جنازہ تم نے اُٹھا دیا ہے؟“

رجو نے دونوں ہاتھ کھینچ لیے۔ سسک کر چارپائی سے اُٹھ گئی۔ کمرے کا وسطی شہتیر پچھلے سال ٹوٹ گیا تھا۔ سوہنے خان نے شہتیر کے ٹوٹے ہوئے حصے تلے کھجور کا تنا کاٹ کر ستون کی شکل میں کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس ستون کے عقب میں جا کر چھپنے کے سے انداز میں چپک کر کھڑی ہو گئی۔ روتے ہوئے بولی۔ ”خان! میکوں مارن تو پہلے میڈی گال سن گھن!“

(خان! مجھے قتل کرنے سے پہلے میری بات سن لے)

رجو کی خوف سے معمور فریاد سنتے ہی چارپائی سے اترتا ہوا سوہنا تھم گیا۔ وجود ایک دم بے جان ہو گیا۔ سر جھک گیا۔ چارپائی کی بانہہ پر ہاتھوں کی گرفت ہیجانی ہو گئی۔ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ”میں سن تاں گھدا ہے پر تو اپنا دل ولاون کیتے سنا گھن!“

(میں نے سن تو لیا ہے مگر تم اپنا دل بہلانے کے لیے ہی دو)

یوں لگا جیسے اس کی آواز اندھے کنوئیں سے برآمد ہوئی ہو۔ رجو لرزتی ہوئی آواز میں الف سے یے تک رام کہانی سنا کر فردِ جرم بنی خاموش ہو گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر وحشت بھری نظروں سے اپنے سرتاج کو دیکھنے لگی۔ اس کے سائیں نے چارپائی سے اُٹھنا چاہا۔ اُٹھ نہ پایا۔ ٹوٹے دل سے بولا۔ ”تو نے میری کمر توڑ دی ہے۔ آہ! مجھے مردار کھلانے سے پہلے مار دیا ہوتا۔“

رجو تڑپی۔ ”میں نہ کل تجھے مرتا دیکھ سکتی تھی، نہ آج...... مگر میں تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ شہرا (شہریار) اور پری (پروین) تمہارا خون ہے۔ میں پاک کلام کی......“

اس نے اپنا ابھری رگوں والا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ بولا۔ ”قسمیں نہ کھا اور آ کر پری کے ساتھ سو جا۔ جو ہونا تھا، ہو چکا اور جو ہونا ہے، وہ ہو کر ہی رہے گا۔“

رجو میں اتنی ہمت پیدا نہ ہو سکی کہ وہ سوہنے کے قریب آ جاتی۔ وہ جب چارپائی پر لیٹ گیا تو ڈرتے ڈرتے قریب آئی اور اس کے پیروں پر چہرہ رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔

اس کا ایک آنسو سوہنے کے دل پر گراں گزرتا تھا۔ آج وہ ٹوٹ کر رو رہی تھی مگر وہ دیکھ تک نہیں رہا تھا۔ رجو نے بچوں کا واسطہ دیا۔ اپنی محبت کا واسطہ دیا۔ اس کی عمر بھر کی ریاضت کے جواب میں سوہنے نے فقط اتنا کہا۔ ”معاف کرنے کا حق غیرت والوں کو ہوتا ہے، بے غیرتوں کو نہیں۔ جاؤ، مجھے تنگ نہ کرو اور سو جاؤ۔“

وہ اس کے پیروں سے لپٹی رہی۔ مقدر پہلے ہی سویا ہوا تھا۔ سسکتے سسکتے اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔ رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی۔ سوہنے خان کو چارپائی پر نہ پا کر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ گہری نیند سونے کا رسیا اُسے سلا کر کہیں چلا گیا تھا۔ کہاں؟ یہی سوچ رہی تھی۔ ناگاہ اس کی نظر بھڑولے والی نکڑ پر پڑی۔ چونک گئی۔ سوہنے خان کا کیمبل پوری کلہاڑا اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار سینے پر جا ٹھہرا۔ ”یا اللہ خیر!“

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

خالد میاں کے ہاں

بقول شیکسپئر ”زندگی ایک اسٹیج ہے اور انسان اداکار“ اور کچھ کردار تو اتنے جاندار ہوتے ہیں کہ منظر سے ہٹ کر بھی مٹ نہیں پاتے... ایسا ہی ایک گھرانا خالد میاں کا بھی ہے جس کے سارے مکین اپنی اپنی جگہ نگینے کی طرح فٹ ہو کر بھی معاشرے کے بکھرتے نظام میں ”مس فٹ“ لگتے ہیں۔ انسان کا کمال یہی ہے کہ چاہے من چاہا کچھ نہ ملے مگر... زندگی کا کارِ رواں چلتا رہتا ہے۔

منظر امام کا اچھوتا انداز......

معاشرتی مسائل کا

انوکھا سلسلہ

خالد میاں کے ہاتھ میں اخبار اس طرح چپکا ہوا تھا جیسے مقناطیس سے لوہا چپک جاتا ہے۔ ان کی بیگم ناظمہ ان کے سامنے بیٹھے بیٹھے بیزار ہو چلی تھی۔ پھر اس نے تنگ آ کر خالد میاں سے پوچھا۔ ”یہ تو بتائیں، میں کب تک بیٹھی رہوں؟“

”جب تک اللہ نہیں اٹھاتا ہے گا۔ تب تک تو بیٹھی رہو۔“ خالد میاں نے جواب دیا۔

”آپ کی تو یہی خواہش ہے کہ میں اٹھ جاؤں تو آپ تیسری کو لے آئیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

(ناظمہ خالد میاں کی یہ دوسری بیوی تھیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے ناظمہ سے شادی کرلی تھی مگر ان کی بیٹی سمن پہلی بیوی سے تھی)

خالد میاں مسکرا دیے۔ ''دیکھو ناظمہ۔ ہم کبھی اپنے منہ سے ایسی خواہش نہیں بتاتے ہیں گے، ویسے تم جو بہتر سمجھتی ہوگی، وہ کرلو۔''

ناظمہ بھنا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ لاڈلا بدحواسی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے آنے کا یہی انداز ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی خبر لے کر آیا کرتا۔

''بھائی صاحب۔ بھائی صاحب۔'' اس نے خالد میاں کو مخاطب کیا۔

''لو سن لو۔'' خالد میاں نے ناظمہ کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا لاڈلا بھائی کیا خبر لے کر آیا ہے گا!''

''بھائی صاحب۔ وہ جو میرا دوست ہے نا انور۔ وہ بجلی کے کھمبے پر چڑھ گیا تھا۔''

''ارے تو پھر کیا ہوا؟'' ناظمہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا آپا۔ بجلی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے کچھ نہیں ہوا۔'' پھر اس نے خالد میاں کی طرف دیکھا۔

''بھائی صاحب یہ بجلی کا کھمبا کیا ہوتا ہے؟''

''ابے تیرا دوست جس پر چڑھ گیا ہے گا۔ اس کو بجلی کا کھمبا کہتے ہیں۔'' خالد میاں بھنا کر بولے۔

''بھائی صاحب۔ یہ بجلی کہاں سے آتی ہے؟''

''ابھی تو کہیں سے بھی نہیں آتی ہے گی۔''

''میں نے سنا تھا کہ رینٹل پاور والا جہاز بھی آیا ہوا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟'' ناظمہ نے پوچھا۔

''یہاں کبھی کسی چیز کا کچھ ہوا ہے گا جو اس کا ہوتا؟'' خالد میاں نے کہا۔ ''تم نے تو سنا ہے گا۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے۔ تو اس کا بھی یہی حال ہوا ہے گا۔''

''بھائی صاحب۔ یہ گلاس کیسے ٹوٹتا ہے؟'' لاڈلا نے پوچھا۔

خالد میاں اس سوال پر بھنا کر رہ گئے۔ ''ابے کسی دن جب ہم تیرا سر توڑ دیں گے تو سمجھ میں آجائے گا کہ گلاس کیسے ٹوٹتا ہے گا۔''

ناظمہ نے بات ختم کرنے کے لیے لاڈلا سے کہا۔ ''جا میرا بھائی۔ بازار سے سبزیاں لے کر آجا۔ دلہا بھائی سے پیسے لے لے۔''

''تمہارے اس عقل مند بھائی کو ہم پہلے ہی سو روپے دے دیے ہیں گے۔'' خالد میاں نے بتایا۔

''بھائی صاحب۔ سو روپوں میں تو سبزی والا صرف پودینہ دیتا ہے۔ ویسے یہ پودینہ کیا ہوتا ہے؟''

''ابے تو جاتا ہے گا یا نہیں۔''

''جا رہا ہوں ڈبو کھیلنے۔'' لاڈلا جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''دیکھا۔ اب یہ ڈبو بھی کھیلتا ہے گا۔''

''تو کیا کرے۔ جب ہر محلے میں ڈبو کی میزیں رکھی ہوں گی تو ڈبو ہی کھیلے گا۔ ٹینس تو کھیلنے سے رہا۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' خالد میاں نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہمارا تو پورا کلچر ہی تباہ ہوکر رہ گیا ہے گا۔ کہاں تو جوانوں میں کتابوں کا شوق ہوا کرتا ہے گا۔ ایک دوسرے سے علمی اور ادبی بحث کرتے ہیں گے۔ اب ڈبو کھیلتے ہیں گے۔ گٹکا کھاتے ہیں گے۔ موبائل پر عشق کرتے ہیں گے۔''

سمن ہاتھ میں ایک فائل لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے شانے سے ایک بیگ بھی لٹکا رکھا تھا۔ ''ابو۔ میں سیمینار میں شرکت کے لیے جا رہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''بیٹا کس موضوع پر سیمینار ہوتا ہے گا؟''

''انٹرنیشنل پالیٹکس۔'' سمن نے بتایا۔

''بی بی۔ انٹرنیشنل پالیٹکس سے ہمارا کیا لینا دینا۔'' ناظمہ نے کہا۔

''یہ دنیا گلوبل ولیج ہے مدر۔ آج کل ایک کے حالات کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے۔''

''دیکھو۔ تم مجھے مدر مت کہا کرو۔'' ناظمہ نے برا سا منہ بنایا۔ ''زیادہ سے زیادہ آنٹی کہہ لیا کرو۔''

''یہی تو پرابلم ہے مدر کہ آپ میرے ابو کی بیوی ہیں۔ اسی لیے ڈنڈی مار کر مدر بولتی ہوں۔ اگر امی کہوں گی تو آپ کو برا لگے گا۔ اچھا اب اجازت دیں۔ بائی بائی۔''

اس کے جانے کے بعد ناظمہ نے کہا۔ ''حد ہوگئی خالد صاحب۔ جب آپ کی اتنی جوان بیٹی تھی تو پھر آپ نے مجھ سے کیوں شادی کی تھی؟''

''بالکل یہی سوال میرا بھی ہے گا۔'' خالد میاں نے کہا۔ ''جب تم خود اتنی جوان ہیں گی تو پھر مجھ سے کیوں شادی کی ہے گی؟''

☆☆☆

خالد میاں کے سامنے بیٹھے ہوئے استاد معشوق نرالے عالم بہت دیر سے اپنی کمر کو دبائے جا رہے تھے۔

''کیا ہوگیا خان صاحب۔'' خالد میاں نے دریافت کیا۔

''دوا کو درد، لا دوا ہوگیا ہے۔'' معشوق خان نے جواب دیا۔

''دوا کے لیے کچھ آسان کردیے ہیں گے۔ بس اتنا سمجھ میں آیا ہے گا کہ سر میں درد ہے گا۔ اس کے بعد پلے نہیں پڑا ہے گا۔''

''بس اس گفتار نازک انداز بے حجابانہ کو ذی شعور کرلو۔''

''آپ کا کوئی علاج نہیں ہے گا۔ آپ نے مرحوم استاد نرالے عالم کو شاید گھول کر پی لیا ہے گا۔''

''اسی لیے تو ہم معشوق نرالے عالم بہ سینۂ شمشیر اصفہان ہیں۔ خیر۔ تم نے وہ خنجر نارسائی بھرسانہ سگ آوارگان زمیندارانہ تو باچشم پرنم کرلیا ہوگا۔''

''سمجھ گیا۔ آپ اس خبر کی بات کررہے ہیں گے کہ ایک زمیندار نے ایک بندے کو اپنے کتوں سے بھڑوا دیا ہے گا۔''

''ہاں۔ میں اسی خبر نارسا دل دوز کی افشانی کررہا ہوں۔''

''ہاں پڑھ لی ہے گی۔ تم دیکھ لینا ان کتوں کو ضرور سزا ملے گی۔'' خالد میاں نے بتایا۔

''اور اس نامعقول نانجار فروغ بدچشم کا کیا ہوگا؟''

''اس کا کیا ہونا ہے گا معشوق بھائی۔ یہاں کبھی کسی زمیندار، وڈیرے وغیرہ کو سزا ملی ہے گی جو اس کو ملے گی؟ سزا صرف کتوں کو ملے گی۔ اگر ملی تو۔''

''یہ تو نا جود ونج بے محالہ ہے۔'' معشوق نے کہا۔

اس دوران لاڈلا داخل ہوگیا۔

''یہ لو معشوق بھائی۔ اب یہ آیا ہے گا کوئی الٹی خبر لے کر۔'' خالد میاں نے کہا۔ پھر لاڈلا کی طرف دیکھا۔ ''ہاں بھائی کیا خبر لایا ہے گا؟''

''دلہا بھائی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

''ابے خدا کا شکر کر کہ تیرے سر میں بھی کچھ تو ہے گا۔ درد ہی سہی۔''

لاڈلا نے معشوق کی طرف دیکھا۔ ''معشوق انکل۔ یہ سر کا درد کیا ہوتا ہے؟''

خالد میاں بھڑک اٹھے۔ ''ابے تو ہمارے لیے سر کا درد ہے گا۔ جا بھاگ جا یہاں سے۔''

لاڈلا برا سا منہ بنا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''بھائی خالد۔ یہ شمع گزیدگی کا مشورہ کس نے دیا تھا؟'' معشوق نے پوچھا۔

''تم شاید یہ پوچھ رہے ہیں گے کہ میں نے دوسری شادی کی حماقت کیوں کی ہے گی؟''

''ہاں۔ یہی میرا تبسم جانانہ ہے۔''

''تو بھائی۔ اس وقت میری قسمت خراب ہو رہی ہے گی۔ اسی لیے میں نے شادی کرلی ہے گی۔''

☆☆☆

ناظمہ بہت دنوں سے سمن کا رشتہ اپنے ایک پھوپی زاد بھائی سے کروانا چاہتی تھی لیکن اسے سمن سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سمن جب سیمینار سے لوٹی تو ناظمہ کچھ دیر کے بعد اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ سمن اس وقت اپنے بیڈ پر کتاب لیے بیٹھی تھی۔ ناظمہ کو دیکھ کر اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔

ناظمہ بیڈ پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ ''سمن۔ تم مجھے اپنا دشمن کیوں سمجھتی ہو؟''

''نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''خیر، تم چاہے کچھ بھی سمجھو۔ میں تمہاری ہمدرد ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔''

''مہربانی ہے آپ کی۔''

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''جی فرمائیں۔ کیا ضروری بات ہے۔''

''میں نے تمہارے لیے ایک رشتہ ڈھونڈا ہے۔''

''اچھا۔'' سمن سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ''کون ہے وہ؟''

''میرا پھوپی زاد بھائی۔ بہت ذہین ہے۔ ایک بار انٹر میں فیل ہوچکا ہے۔''

''ماشاء اللہ۔'' سمن نے طنز سے گردن ہلائی۔ ''اب تک تو وہ PHD کرچکا ہوگا۔''

''ارے کہاں۔ اس کے بعد بددل ہوکر اس نے پڑھائی چھوڑ ہی دی تھی۔''

''واہ۔ واہ۔ تو اب کیا کرتا ہے؟''

''اپنا شوروم ہے اس کا۔'' ناظمہ نے فخر سے بتایا۔

''گاڑیوں کا۔''

''گاڑیوں کا نہیں مچھلیوں کا۔ رنگ برنگی مچھلیاں بیچتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ فی الحال میری شادی کی فکر نہ کریں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے اچھی طرح سوچ لینا۔ ایسے رشتے بار بار نہیں آتے۔''

''ٹھیک ہے۔ سوچ لوں گی۔''

ناظمہ کے جانے کے بعد سمن نے موبائل پر ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف جنید تھا۔ اس کے ہیلو کہتے ہی سمن شروع

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوگئی۔ ''تم بھی بس سوچتے ہی رہو۔ اس طرف میری شادی کی باتیں ہورہی ہیں۔''

''سمن۔ بس ایک مہینے کی بات ہے۔'' دوسری طرف سے جنید نے کہا۔ ''تم کو تو معلوم ہے نا کہ الیکشن سر پر ہیں۔ مجھے ایک پارٹی نے اپروچ کیا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تم جیت جاؤ گے؟''

''جیتوں یا نہ جیتوں۔ الیکشن لڑنے کا تجربہ تو ہوجائے گا نا۔''

''اور اگر نہیں جیتے تو میں اس وقت تک تمہارے انتظار میں بیٹھی رہوں؟'' سمن نے کہا۔

''مجبوری ہے جان۔ اگر میں جیتوں یا نہ جیتوں۔ تمہیں ہر حال میں حاصل کر ہی لوں گا۔''

☆☆☆

خالد میاں کو ایک مصرعے پر پوری غزل کہنی تھی۔ طرحی مشاعرے میں انہیں مدعو کیا گیا تھا۔ ''حسرت تیرے سخن پہ ہے لطف سخن تمام۔''

مطلع ذہن میں آ ہی رہا تھا کہ لاڈلا ایک سوالیہ چہرہ لیے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''ابے اب کیا لینے آگیا ہے گا میرے پاس؟'' خالد میاں نے جھلا کر پوچھا۔

''دُلہا بھائی۔ مجھے کوئی کام کرنا ہے۔'' لاڈلا نے کہا۔

''ابے بہت سے کام ہیں۔ جا جا کر کرلے۔ ہم ابھی کچن دیکھ کر آرہے ہیں گے۔ برتن پھیلے ہوئے ہیں۔ جا کر دھو دے۔''

''وہ والا کام نہیں دُلہا بھائی۔''

''تو پھر کون سا کام؟''

''آفس والا۔ جس طرح دوسرے جاتے ہیں ٹائی لگا کر۔ میں بھی جایا کروں گا۔ ویسے دُلہا بھائی یہ ٹائی کیا ہوتا ہے؟''

''خدا کے بندے۔ میں نے ایسا کون سا قصور کردیا ہے گا کہ تو جہیز میں آگیا ہے گا۔''

''میں جہیز میں نہیں آیا دلہا بھائی۔ اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ ویسے یہ جہیز کیا ہوتا ہے؟''

خالد میاں نے جھلا کر اسے گالیاں دینے کی سوچی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بول اٹھی۔ ''دیکھ جا کر کون آیا ہے۔''

لاڈلا کچھ دیر بعد معشوق نرالے عالم کو لیے ہوئے داخل ہوا۔ معشوق خان کی حالت اتنی خستہ ہورہی تھی کہ کچھ دیر تک کچھ بتانے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔

''ارے بھائی۔ خیریت تو ہے گی۔'' خالد میاں نے پوچھا۔

''خالد بھائی۔ ایک خلجان بے پروا میں بے قرار ہوگیا ہوں۔'' معشوق نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

''خدا خیر کرے۔ کون سی افتاد ٹوٹ پڑی ہے گی۔''

''یہ ہمارے ملک میں کمیشن کیوں افتاد پاؤ بھگتیں بود و باش ہوا کرتا ہے؟''

''ہاں۔ یہ بہت اہم سوال ہے گا کہ آخر ہمارے ملک میں کمیشن کیوں بنائے جاتے ہیں گے۔ تو بس اس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا ہے گا کہ جس کام کو نہ کرنا ہے گا۔ اس پر ایک کمیشن بٹھادو۔ کام خود ہی اپنی موت مرجاتا ہے گا۔''

''یہ تو ہے۔''

''لیکن کمیشن نے تمہارا حال کیوں خستہ کردیا ہے گا؟''

''یہ ایک دوسری افتاد بھلول ہے۔'' معشوق نے بتایا۔ ''آج ہم آذر بائی جان دعفران سڑک ہوگئے تھے۔ دو گھنٹوں تک فرقان حمیدہ پے چیدہ بنے رہے۔ تب جا کر شہنشاہ پارلیمنٹ کی سواری حمیدہ ہوئی ہے۔''

''ہاں معشوق بھائی۔'' خالد میاں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ وی وی آئی پی لوگ ہوتے ہیں گے۔ ان کے آنے جانے کے وقت چار چار گھنٹوں کے لیے روڈ بند کردیتے ہیں گے۔ چاہے کوئی مرے یا زندہ رہے۔ بس ان کا استحقاق مجروح نہ ہو۔''

''کاش ہم بھی چراغ خانہ زہرہ و مریخ ہوتے۔''

''ہم اسی طرح رہیں گے معشوق بھائی۔'' خالد میاں نے کہا۔ ''یقین جانو۔ جب ان کی سواریاں گزرتی ہیں گی تو ہم خود کو تیسرے درجے کا شہری سمجھتے ہیں گے۔''

''ہاں بھائی۔ چلو۔ میں تو بستر بے خوابی پہ سمندر ناز ہونے جارہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ۔ آرام کرو۔''

☆☆☆

ناظمہ کا موڈ بہت خراب ہورہا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی بھی بہت زور سے خالد میاں کے سامنے رکھی۔

''بات کیا ہوگئی ہے گی؟'' خالد میاں نے پوچھا۔ ''صبح سے موڈ خراب ہورہا ہے گا۔''

''اپنی چہیتی سے پوچھ لو۔ میں نے ایک رشتہ بتایا تھا۔ ناراض ہوگئیں۔''

''یقیناً کوئی بے ڈھنگا ہی رشتہ ہوگا۔''

''یہ لیں۔ میں اپنے پھوپی زاد بہرام کی بات کررہی ہوں۔ کیا وہ بے ڈھنگا ہے؟''

خالد میاں اچھل پڑے۔ ''بہرام۔ کیا پاگل ہوگئی ہو گی۔ تم خود سوچو کیا وہ میری سمن کے قابل ہے گا؟''

اسی دوران سمن داخل ہوئی۔ وہ کہیں جلدی میں معلوم ہورہی تھی۔ ''ابو میں جناح اسپتال جارہی ہوں۔''

''کیوں خیریت تو ہے گی نا۔''

''وہ میری دوست ہے نا غزالہ، اس کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور انتہا یہ ہوئی کہ بے چارہ ایک گھنٹے تک روڈ پر پڑا رہا، کسی نے اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔''

''ابے اس لیے تو شاعر نے کہا ہے گا کہ ''حادثے سے بھی بڑا یہ سانحہ ہوا۔ لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ قریب کا کوئی اسپتال ایسے کیس کو دیکھتا کیوں نہیں ہے۔ پولیس کے آنے کا انتظار کیوں کیا جاتا ہے۔'' سمن نے پوچھا۔

''تاکہ پولیس کے آنے سے پہلے پہلے اس کا انتقال ہوجائے۔'' خالد میاں نے کہا۔

اسی دوران لاڈلا نے داخل ہو کر بتایا۔ ''دلہا بھائی آپ کے وہ آئے ہیں۔''

''وہ کون؟''

''وہی جن کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔''

''اچھا اچھا۔ معشوق نرالے عالم آئے ہوں گے۔''

''توبہ ہے۔ آپ نے بھی کیسے کیسے لوگوں کو اپنا دوست بنا رکھا ہے۔'' ناظمہ نے برا سا منہ بنایا۔

''اچھا ابو۔ میں تو چلتی ہوں۔'' سمن نے کہا۔

''ہاں تم جاؤ۔''

خالد نے ناظمہ کی طرف دیکھا۔ ''معشوق صاحب کے لیے چائے بھجوا دینا۔''

''اس آدمی کو بھی چائے کی عادت ہی پڑ گئی ہے۔''

لاڈلا نے ناظمہ کی طرف دیکھا۔ ''آپا یہ تو سمجھ میں آگیا کہ معشوق صاحب کے لیے چائے بھیجنی ہے۔ لیکن یہ چائے کیا چیز ہے!''

''او خدا۔ لاڈلا۔ اب تو عقل کرلو۔ تم تو پاگل بنادو گے۔'' ناظمہ چڑ کر بولی۔

''اچھا تم دونوں تو اندر جاؤ۔ بے چارا معشوق دروازے پر کھڑا ہوگا۔''

☆☆☆

معشوق ایک اخبار ساتھ لیتا آیا تھا۔

''ہاں بھائی۔ انتشار یا میں سے تفاوت ہے۔''

''اب ہم یہ نہیں پوچھ رہے ہیں گے کہ تم کیا بول رہے ہیں گے۔''

''دیکھیں خالد بھائی۔ سمند ناز پہ تازیانہ بلا خیز اور کمبوڈیا ہوتا جارہا ہے۔ کتابوں کے میلے میں طفلان نونہالی کی کتابوں نے زمین و آسمان کو چراغ تہ بام کرکے رکھ دیا۔''

''ہاں بھائی۔ میں نے بھی یہ خبر پڑھ لی ہے گی کہ کتابوں کے میلے میں سب سے زیادہ بچوں کی کتابیں فروخت ہوئی ہیں گی۔''

''آخر یہ کیسا تلاطم بے محابہ ہے، وہ شوقین نے رنگین اور سنگین مرد ماں گیس بحیرہ بے کنار کو سدھار گئے۔''

''بھائی میرے اب لڑکوں کو کمپیوٹر سے فرصت ملے تب تو کتابوں پر توجہ دیں۔ چلو۔ کوئی دوسری خبر سناؤ۔''

''ذرا چشم نظارہ کو اخبار سے آشنائے ولدیت رکھوں۔''

معشوق نے خبروں پر نظریں دوڑانی شروع کردیں۔

گھر کے دوسرے کمرے میں لاڈلا ناظمہ سے الجھا ہوا تھا۔ ''آپا۔ ایک بات تو بتاؤ۔ تم نے دلہا بھائی سے شادی کیوں کی تھی؟''

''لاڈلا۔ میرے بھائی۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ بوڑھا آدمی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد دنیا میں نہیں رہے گا۔''

''لیکن اب تو تم خود ہی دنیا سے نکلنے والی ہو آپا۔'' لاڈلا نے کہا۔ ''ویسے یہ دنیا کیا ہوتی ہے؟''

''سمجھ میں نہیں آتا۔ اچھی خاصی سیدھی باتیں کرتے کرتے تم الٹی باتیں کیوں کرنے لگتے ہو۔''

''چھوڑو آپا۔ چلو تم میرا ایک کام کروادو۔ مجھے کوئی دکان کھلوادو۔''

''دکان کہاں سے کھلوادوں؟''

''دلہا بھائی سے کہونا۔ بہت پیسے ہیں ان کے پاس۔''

''تمہارے دلہا بھائی بہت کنجوس آدمی ہیں لاڈلا۔''

''تمہارے معاملے میں کنجوس نہیں ہیں آپا۔ یہ میں جانتا ہوں۔ ویسے یہ کنجوس کیا ہوتا ہے؟''

''تم نے پھر دماغ خراب کرنا شروع کردیا۔ خدا کے لیے تم چپ ہی رہا کرو تو زیادہ بہتر ہے۔''

☆☆☆

معشوق کو جب خبر تلاش کرتے ہوئے بہت دیر ہوگئی تو خالد میاں نے کہا۔ ''تم رہنے دو۔ اب ہم تمہیں ایک خبر سنا رہے ہیں گے۔''

''چلو نیل رخ کو بساط گل گوں کر جاؤ۔''

''خبر یہ ہے گی کہ پاکستان کی بلائنڈ کرکٹ ٹیم کے کیپٹن ذیشان عباسی کو پانی کی جگہ فینائل پلادیا گیا ہے گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اس سے ثابت یہ ہوا کہ بلائنڈ پینے والا نہیں تھا۔ پلانے والا تھا۔"

"واہ۔ آج تو پورا جملہ صاف صاف بول گئے ہیں گے۔" خالد میاں نے تعریف کی۔

"بس کبھی کبھی پرسش خاصہ ہو ہی جاتا ہے۔" معشوق مسکرا دیا۔ "ورنہ "ماہ میں وہی قدغن بے لگام ہے۔"

"چلو دوسری خبر سنو۔ خبر یہ ہے گی کہ ایک وزیر صاحب نے فرمایا ہے گا کہ اب ہم دہشت گردوں کو اجازت نہیں دے رہے ہیں گے۔"

"تو اس سے پہلے کیوں اجازت پاندار اور بسیار آب رواں تھا۔ کیوں منجنیق تھا؟ چوک سعید اکبر و اصغر تھا؟ کیوں؟"

"بس بس۔ ہم سمجھ گئے ہیں کہ تم یہ پوچھ رہے ہو گے کہ پہلے کیوں اجازت دے رہے تھے جواب اجازت نہیں دے رہے ہیں گے۔"

"ہاں۔ میں یہی فرستادہ تھا۔"

"تو اس کی وجہ یہ ہے گی بھائی کہ دہشت گردوں کی بہت سی اپلی کیشن وزیر صاحب کے پاس جمع ہو گئی ہے گی تو انہوں نے تنگ آ کر کہہ دیا ہے گا کہ بس اب نہیں۔ اب کسی اپلی کیشن پر غور نہیں ہو رہا ہے گا۔"

"خالد صاحب۔ ایک بات دل ناصبور و مقہور میں گردش دوراں ہے کہ سیاست میں آتے ہی اتنی بارش راحت کہاں سے ہونے لگتی ہے؟"

"اس کا تو بہت آسان جواب ہے گا۔ ہر سیاست دان قوم کو اپنا سمجھتا ہے گا۔ ملک کو اپنا ملک سمجھتا ہے گا۔"

"تو پھر اس سے کیا ثابت سیاد ہوا؟"

"اس سے یہ ثابت ہوا کہ سیاست دان قوم اور ملک کی دولت اپنی دولت سمجھ کر اپنی جیب میں بھرتا ہے گا۔ کیونکہ قوم اس کی ہے گی۔ ملک اس کا ہے گا۔ اس لیے اس کا پورا پورا حق ہے گا۔"

"تو پھر ہمارے واسطے ایسا دروازہ چشم کشا کیوں نہیں خیز ران ہوتا؟"

"اس لیے کہ ہم تیسرے درجے کے شہری ہوتے ہیں گے۔" خالد میاں نے کہا۔ "ہم شہنشاہ عالی کے گزرنے کے انتظار میں چھ چھ گھنٹوں تک کھڑے رہتے ہیں گے۔ سمجھ گئے۔"

☆☆☆

ناظمہ اس وقت کوئی کام کر رہی تھی جب لاڈلا نے اس کے پاس آ کر پوچھا۔ "آپا ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"دلہا بھائی سے جو تمہاری پرخاش تھی، وہ کیا تھی؟"

"کیا مطلب؟" ناظمہ نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ تم اپنے گھر سے یہاں کیوں رہنے لگیں؟"

"بے وقوف۔ دلہا بھائی سے میں نے شادی کی ہے۔ اسی لیے ان کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"ہاں یاد آیا۔ وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ میری شادی کیوں نہیں ہو رہی؟"

"لاڈلا۔ جب تمہارا یہ حال ہے تو پھر تم سے کون شادی کرے گا۔"

"آپا میرا حال بالکل ٹھیک ہے۔ تم کو کیا معلوم۔ پرسوں تھوڑا نزلہ ہو گیا تھا۔ اب وہ بھی بالکل صحیح ہو گیا ہے۔"

ناظمہ چڑ کر اٹھی۔ "اسی پاگل پن کی وجہ سے تو تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔"

"میرا پاگل پن بالکل ٹھیک ہو جائے گا آپا۔ بس اتنا بتا دو کہ شادی کیا ہوتی ہے؟"

اس طرف دوسرے کمرے میں خالد میاں ایک اور خبر سنا رہے تھے۔ "ایک خبر اور ہے گی معشوق بھائی۔"

"چلو۔ وہ بھی گوش گزار محفل کر دو۔"

"ایک ڈاکو حسینہ اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار ہو گئی ہے گی۔"

"وہ صرف حسینہ ماہ و چشم غزالاں ہو گی۔ اس کے پاس ادائے جانانہ دلبرانہ اور سمدھیانہ نہیں ہو گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ اداؤں سے کیا ہوتا ہے گا!"

"یہی تو چشمک دل افروز ہے۔" معشوق نے کہا۔ "اگر اس کے پاس اداؤں کا خزینہ، نگینہ اور دفینہ ہوتا تو پھر کون گرفتار کرتا۔ سب محو تماشا کے لب بام ہو جاتے۔ جس طرح ق لیگ کے منشور پیش کردن موقع پر حسینا و چھک، مشک اور مہک رہی تھیں اور کمپیئر کے نام پر ہمارے بوڑھے بوڑھے سیاست دان راحت جام شیریں اور روح افزا بے ہوئے تھے۔"

"واہ معشوق بھائی۔ کبھی کبھی تم واقعی بہت پتے کی بات کہہ جاتے ہو گے۔"

خالد میاں نے اخبار اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب شاید ان کے پاس سنانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ یا سنانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

سترھویں صدی کے اکبر آباد میں جو صوفیائے کرام خاص شہرت رکھتے تھے اور مرجع خاص و عام تھے، ان میں خلیفہ ابو القاسم کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ان کی خانقاہ میں جو لوگ حاضری دیتے، علوم باطنی اور ظاہری میں یکتا ہوتے تھے۔ کسی معمولی یا جاہل شخص کے لیے اس دربار میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ جب اکبر آباد کے ایک اور صوفی سید عبداللہ، اللہ کو پیارے ہو گئے تو عبدالرحیمؒ (والد شاہ ولی اللہ) کو عبداللہ ہی جیسے کسی بزرگ کی تلاش ہوئی۔ شاہ صاحب خود کو تنہا اور لاوارث سا محسوس کرنے لگے تھے۔ انہوں نے اپنی تنہائی اور بے سکونی کو دور کرنے کے لیے کسی دوسرے بزرگ کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جس کسی وضع دار اور لائق شخص سے ملتے یہی ذکر شروع کر دیتے کہ افسوس سید عبداللہ جیسا کوئی اور شخص نہیں مل رہا۔

اسی طرح ایک دن چند بے نیاز انسانوں کی محفل میں یہی بات کہہ دی تو ایک بزرگ نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "میاں! یہ کیسی

خلیفہ ابوالقاسم

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ کے نیک بندے اللہ کی ہر آزمائش پر پورا اترنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور شاید یہی ادا اس خالق کائنات کو پسند آتی ہے کہ انہیں اتنی خلقت کے درمیان ایک نمایاں مقام عطا کر دیتا ہے کہ ان کے در پر بادشاہت بھی سر جھکا دیتی ہے مگر ان کی عبادت و ریاضت انہیں دنیا کی کسی آسائش کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتی۔ ایک ولی کی یہی شان ہوتی ہے کہ اسے ہر دم اپنے مالک کی رضا کا خیال رہتا ہے۔

آخرت کے متمنی...... دنیا سے بے پروا ایک ولی کا قصہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بات کہہ رہے ہو؟ سید عبداللہؒ اٹھ گئے تو کیا ہوا۔ اسی اکبر آباد میں ایک دوسرے بزرگ بھی موجود ہیں۔ تم ان کے پاس چلے جاؤ۔"
شاہ عبدالرحیمؒ نے پوچھا۔ "حضرت! ان بزرگ کا نام اور پتا؟"
جواب ملا۔ "خلیفہ ابوالقاسمؒ۔ مشہور صوفی امیر ابوالعلیٰ کے نامور خلیفہ۔"
شاہ عبدالرحیمؒ اسی وقت اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں اسی وقت ان کے پاس چلتا ہوں۔"
آپ فوراً ہی خلیفہ ابوالقاسمؒ کے پاس روانہ ہوگئے۔ پوچھتے پوچھتے جب منزل مقصود پر پہنچے تو کسی نے انہیں خلیفہ کی مجلس میں لے جا کر کھڑا کیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے مجلس پر غائرانہ نظر ڈالی اور خلیفہ ابوالقاسمؒ کو پہچاننے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ان میں کوئی بھی شخص اپنے چہرے مہرے اور قیافے سے خلیفہ ابوالقاسمؒ نہیں لگتا تھا۔ پوری مجلس بھی شاہ صاحب ہی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ کئی بار جی میں آئی کہ اہالیان مجلس سے پوچھیں کہ تم میں خلیفہ ابوالقاسمؒ کون ہے؟ مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو رہے۔
آخر ایک شخص اٹھ کر شاہ صاحب کے سامنے جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ "جناب! آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ "خلیفہ ابوالقاسمؒ سے!"
اس شخص نے کہا۔ "افسوس کہ اس وقت وہ اس مجلس میں تشریف نہیں رکھتے۔"
شاہ صاحب کو بڑی مایوسی ہوئی فرمایا۔ "اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟ اور میں ان سے کس وقت اور کہاں مل سکتا ہوں؟"
اس شخص نے جواب دیا۔ "آپ ان سے اسی وقت اور یہیں مل سکتے ہیں۔ ذرا انتظار کی زحمت ضرور گوارا کرنا پڑے گی۔"
شاہ صاحب مجلس میں ایک طرف بیٹھ گئے اور کہا۔ "اگر یہ بات ہے اور وہ یہیں کہیں قریب ہی موجود ہیں تو میں ذرا دیر کیا سارا دن اور ساری رات ان کا انتظار کرلوں گا۔"
اسی وقت ایک دوسرا شخص اٹھ کھڑا ہوا اور لوگوں کے درمیان سے گزر کر شاہ صاحب کے پاس پہنچا اور کہا۔ "لیکن آپ انتظار کیوں کریں، میرے ساتھ چلیے میں اسی وقت ملوائے دیتا ہوں۔"
شاہ صاحب گومگو، حیران و پریشان اس شخص کے پیچھے پیچھے ہولیے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں خانقاہ کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں راج مزدور اپنے اپنے کام میں مشغول تھے اور ان کے سامنے ایک شخص معمار اور مزدوروں کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ اس شخص نے ہدایت دینے والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جناب والا! یہ رہے خلیفہ ابوالقاسمؒ جن کی تلاش میں آپ سرگرداں نظر آتے تھے۔"
یہ باتیں تقریباً کان میں کہی گئی تھیں۔ اس لیے خلیفہ ابوالقاسمؒ نہیں سن سکے۔ یہ شخص سرگوشی میں تعارف کرا کے واپس چلا گیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ خلیفہ ابوالقاسمؒ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اپنی زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے دو ایک بار انہیں سرسری نظر سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ کچھ دیر تو اس انتظار میں کھڑے رہے کہ کوئی مناسب موقع میسر آجائے تو بات شروع ہو۔ لیکن ایسا موقع ہاتھ نہیں آیا۔
کچھ دیر بعد خلیفہ ابوالقاسمؒ نے شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔ اور فارسی کا شعر پڑھا۔

ہر کرا ذرہ وجود بود
پیش ہر ذرہ در سجود بود

(جسے ذوق وجدان سے ذرہ بھر بھی نعمت حاصل ہے وہ کائنات کے ہر ذرے کو لائق سجدہ سمجھے گا)
شاہ صاحب نے عرض کیا۔ "حضرت! میری یہ مجال نہیں کہ میں آپ کے شعر یا کلام میں فی نکالوں لیکن اس خاکسار نے اس شعر کو یوں پڑھا ہے۔"

ہر کرا ذرہ شہود بود
پیش ہر ذرہ در سجود بود

(جسے شہود باری تعالیٰ کی نعمت کا ذرا سا عرفان حاصل ہو وہ ذرات عالم کو مسجود تصور کرلے گا)
خلیفہ ابوالقاسمؒ چونک پڑے اور حیرت سے کہا۔ "صاحبزادے! میں نے جن صحیح نسخوں کا اب تک مطالعہ کیا ہے، ان میں شہود کی جگہ وجود ہی دیکھا ہے معلوم نہیں تم نے شہود کہاں پڑھ لیا۔"
شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ "خاکسار نے بھی اب تک جتنے نسخے دیکھے ہیں ان میں سب میں شہود ہی نظر آیا۔"

خلیفہ نے شاہ صاحب کو نہایت توجہ سے دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتے ہی رہے فرمایا۔ "معلوم ہوتا ہے تم علم سے بھی بہرہ مند ہو۔"
شاہ صاحب نے کہا۔ "آپ کا خیال درست ہے لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میرا علم راہ حق میں ضرر رساں ہے تو میں اس سے توبہ کرنے کو تیار ہوں۔"
آپ نے جواب دیا۔ "نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، علم ہر شخص کے لیے نہ تو نافع ہے اور نہ نقصان دہ۔" اس کے بعد آپ نے ایک شعر پڑھا۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

(علم اگر پرورش جسم و جان کے لیے حاصل کیا جائے تو وہ سانپ کی طرح ہے اور اگر تحصیل علم اور مقصد روح کا ارتقاء ہو تو یہ رفیق راہ ثابت ہوتا ہے)
شاہ صاحب نے معصومیت سے پوچھا۔ "حضور والا! آپ کا ضمیر مصفا اور روشن ہے، بڑی نوازش ہوگی اگر آپ مجھے یہ بتا دیں کہ میرا علم میرے لیے نافع ہے یا نقصان دہ۔"
آپ نے جواب دیا۔ "کیا یہ ملاقات پہلی اور آخری ہے؟"
شاہ صاحب نے گھبرا کر کہا۔ "خدا نہ کرے، اب میں اس در کو نہیں چھوڑ سکتا۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ نے جواب دیا۔ "پھر یہ ساری باتیں اسی وقت کیوں؟ پھر کبھی ہو جائیں گی۔"
شاہ صاحب اس وقت تو اپنے گھر واپس چلے گئے لیکن دوسرے دن علی الصباح پھر پہنچ گئے اور نہایت عاجزی اور انکساری سے سلام کیا۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے خندہ پیشانی سے جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "صاحبزادے کل میں مکان کی تعمیر میں مشغول تھا اس لیے بات ادھوری رہ گئی تھی۔ بقیہ بات اس وقت ہو جائے گی۔"
شاہ صاحب نے پوچھا۔ "کون سی باتیں حضرت؟"
آپ نے جواب دیا۔ "شہود اور وجود والی باتیں۔" پھر پوچھا۔ "صاحبزادے ذرا یہ تو بتانا کہ اگر وجود کی جگہ شہود ہو تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟"
شاہ صاحب نے کہا۔ "حضرت! جس شخص کو ذرات عالم میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ جائے گا۔ وہ لامحالہ ہر ذرے کو سجدہ کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"
خلیفہ نے پوچھا۔ "لیکن میں نے شہود کی جگہ وجود ہی دیکھا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ لفظ وجود کے ساتھ شعر کی کیا تشریح ہوگی؟"
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ "حضور والا! لفظ وجود وجدان کا ہم معنی ہے۔ اس طرح یہ شہود کے قریب المعنی ہے۔ اس لیے اس کا بھی وہی مطلب ہوگا۔ جو اس عاجز نے شہود کے ساتھ بیان کیا ہے۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ کے چہرے پر شگفتگی طاری ہوگئی۔ چہرہ کھل گیا، فرمایا۔ "صاحبزادے! تم ہر روز حاضری دیا کرو۔"
اب شاہ صاحب کو چونکہ حاضری کی اجازت مل گئی تھی اس لیے نہایت مستعدی اور پابندی سے حاضری دینے لگے۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ ان پر بے حد مہربانیاں فرمانے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرانے ارادتمندوں میں حسد پیدا ہوگیا اور وہ شاہ صاحب سے جلنے لگے۔

☆☆☆

خلیفہ ابوالقاسمؒ کا لنگر عام تھا جس سے مسافر اور حاجت مند دونوں وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ خانقاہ کے گودام اشیائے خوردنی اور اجناس سے بھرے رہتے تھے، کہیں چاولوں کا ذخیرہ تھا تو کہیں گیہوں بھرا ہوا تھا، کسی حصے میں آٹے کی بوریاں رکھی رہتی تھیں۔ نمک مرچ، سبزیاں، گھی، مویشی وہاں کسی چیز کی بھی کمی نہیں تھی۔ کسی بھی چیز کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی وافر مقدار آجایا کرتی تھی۔ چنانچہ آپ کو یہ فکر بھی لاحق نہ ہوتی کہ کم ہونے والی چیز کو کہاں سے اور کس طرح فراہم کیا جائے۔
مآل اندیش کارندوں نے آپ سے کئی بار درخواست کی کہ چیزوں کا حساب کتاب رکھا جائے اور جو چیز جب بھی کم ہو اس کی مزید فراہمی کا فوری بندوبست ہونا چاہیے۔
لیکن آپ اپنے مشیر کارندوں سے کبھی بھی اتفاق نہ کرتے اور ہمیشہ یہی فرماتے کہ میں کل کی فکر کا سرے سے قائل ہی نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور یہ بات انسان کے بس کی بھی نہیں کہ وہ مشیت ایزدی کے خلاف اپنی مرضی، خواہش اور کوشش سے کوئی کام سرانجام دے سکے۔

ایک کارندے نے عرض کیا۔ ”حضرت! یہ دنیا ہے یہاں تو کل کی فکر کرنا ہی پڑے گی۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”کل کی فکر سے میں کب منع کرتا ہوں، انسان کو کل کی فکر ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن صرف آخرت کی فکر، عقبیٰ کی فکر، عاقبت اور آخرت کی فکر، اگر کسی انسان کو یہ فکر نہیں تو وہ انسان نہیں، جانور ہوگا۔“

کسی دوسرے کارندے نے کہا۔ ”حضرت! میں آپ کو جھٹلانے کی جرأت تو نہیں کرسکتا۔ لیکن میں مآل اندیشی اور مستقبل بینی کی افادیت ضرور واضح کرسکتا ہوں لیکن وہ بھی اجازت کے بعد۔“

آپ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں اس کی اجازت دیتا ہوں۔“

کارندے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ مسافروں اور حاجت مندوں کی بھیڑ بھاڑ نے کسی سرائے کا سماں پیش کررکھا تھا۔ لیکن خیال یہ ہے کہ اتنی بھیڑ بھاڑ کا سرائے کی بھیڑ بھاڑ سے مثال دینا سراسر ناانصافی اور زیادتی کی بات ہوگی۔

ایک دن شام سے ذرا پہلے کسی کارندے نے آپ سے کہا۔ ”حضرت! گھی ختم ہورہا ہے اس کا انتظام فرما دیجیے ورنہ کام ادھورا ہی رہ جائے گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر گھی ختم ہورہا ہے تو ہوجانے دو۔ ویسے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ گھی جب تک موجود ہے گا یہ ختم نہیں ہوسکتا یہ میرا ایقان ہے، یہ میرا ایمان ہے۔“

کارندے نے روکھا سا منہ بنا کر عرض کیا۔ ”حضرت! میں کوئی صاحب کشف تو ہوں نہیں، گھی ختم ہورہا تھا اس لیے پیشگی عرض کردیا۔ کل سے کھانا پانی میں پکے گا۔“

یہ بات اسی طرح ختم ہوگئی۔ کارند چلا گیا۔ اور خلیفہ نے فرمایا۔ ”انسان ناشکرا اور جلد باز ہے اس نادان کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آسکتیں۔“

دوسرے دن صبح جب کھانا تیار ہوا تو اس میں گھی نام کو بھی نہ تھا۔ آپ نے بے گھی کے کھانے کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا اور خود بھی کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا۔ ارادت مندوں اور کارندوں کا خیال تھا کہ وہ خلیفہ کو گھی منگوانے پر مجبور کردیں گے لیکن خلیفہ نے ذرا سی بھی پروا نہیں کی۔

شریر کارندہ صبح سے شام تک کئی بار آپ کو چھیڑتا رہا۔ وہ طنزاً کہتا۔ ”حضرت! آپ تو یہ فرماتے تھے کہ جب گھی ختم ہوجائے گا تو یہاں مزید گھی آجائے گا۔ اب وہ مزید گھی کہاں چلا گیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس وقت تیری باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میرا رب نہ تو مجھے شرمندہ کرے گا اور نہ اس حال میں زیادہ دنوں رکھے گا۔ یہ جو پریشانی ہے عارضی ہے۔ پریشانی کیوں ہے؟ اس کا بھی کوئی خاص جواب نہیں۔ لیکن میں اس کا جواب بھی کسی نہ کسی دن پا جاؤں گا۔“

کئی دن بعد آپ کسی کام سے چھت پر جانے لگے تو کارندوں نے آپ کو روکنا چاہا اور درخواست کی۔ ”آپ اوپر نہ جائیں کیونکہ دنیا کے مسلّم الثبوت صوفیوں نے مدتوں آسمان نہیں دیکھا اور اس سے گریز اور پرہیز کرتے رہے ہیں۔ آپ بھی آسمان نہ دیکھیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں آج آسمان ضرور دیکھوں گا اس کے بعد توبہ کرلوں گا۔“

کارندے نے بجھے بجھے دل سے عرض کیا۔ ”ہم آپ کی ہر بات مان لیں گے لیکن کہیں تضاد ہوگا تو بے لفظوں میں اس کا اظہار بھی کردیں گے۔“

آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ”بے شک، بے شک، اجازت ہے، اجازت ہے!“

آپ خانقاہ کی چھت پر چلے گئے اور ادھر ادھر گھوم پھر کر معلوم نہیں کس شے کی جستجو کرنے لگے۔ اوپر کاٹھ کباڑ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ آپ نے اس کاٹھ کباڑ کو ادھر ادھر کرنا شروع کردیا۔ لکڑی کے ٹکڑے اور خالی بوریوں کے نیچے سے کئی سربمہر پیپے نمودار ہوگئے۔ آپ نے ان پیپوں کو ان کی جگہ سے ہٹانا چاہا تو پتا چلا کہ وہ خالی نہیں ہیں۔ ان میں کچھ بھرا ہوا ہے۔

آپ نے ان پیپوں کو وہیں چھوڑا چھت کے نیچے جھانکتے ہوئے کارندوں کو آواز دی۔ ”ارے بھائی! ذرا اوپر تو آنا۔“

کئی کارندے آپ کی آواز سن کر چھت پر پہنچ گئے۔

آپ نے انہیں پیپوں کے پاس کھڑا کردیا اور فرمایا۔ ”ذرا دیکھ کر بتانا تو کہ ان پیپوں میں کیا بھرا ہوا ہے؟“

کارندوں نے پیپوں کو ہلایا اور اوپر کے تیرتے ہوئے حصوں پر ناک رکھ دی اور سونگھ سونگھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

آپ نے فرمایا۔ ”ان میں کیا رکھا ہے بتاتے کیوں نہیں؟“

کارندوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور پھر خاموش رہے۔

آپ نے قدرے تختی سے پوچھا۔ ”کیا تم قوت گویائی سے محروم ہوچکے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟“

کارندے نے مردہ آواز میں جواب دیا۔ ”حضرت! ان پیپوں میں گھی بھرا ہوا ہے۔“

آپ نے حیرت سے کہا۔ ”گھی! گھی کہاں سے آگیا؟ ذرا ایک بار پھر سونگھو، یہاں گھی کہاں سے آئے گا۔“

دوسرے کارندے نے جواب دیا۔ ”حضرت! ان پیپوں میں گھی بھرا ہوا ہے۔“

آپ نے گھی کے پیپے چھت سے نیچے پہنچا دیے اور خود بھی نیچے اتر آئے۔ جملہ کارندوں کو جمع کیا اور ان سے کہا۔ ”یہ گھی اوپر کس نے پہنچایا تھا؟“ کچھ دیر تک تو جواب کا انتظار کیا۔ جب جواب نہیں ملا تو پھر بولنا شروع کیا۔ ”میں جانتا ہوں یہ گھی کس نے اور کیوں چھپایا تھا۔ یہ گھی اس لیے چھپایا گیا تھا کہ میری غیر مآل اندیشی کا مذاق اڑایا جائے۔ مگر تم نے خود مشاہدہ کرلیا کہ جب تک یہ چھپایا ہوا گھی یہاں موجود رہا۔ ہم سب گھی سے محروم رہے۔ اب جب یہ گھی خرچ ہوجائے گا تو خدا مزید گھی کا انتظام فرما دے گا۔“

آپ نے جو فرمایا تھا، حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ جب یہ گھی بھی ختم ہوگیا تو گھی کی آمد کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

ایک دن مریدوں نے آپ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ ...... پریشان اور مضطرب پھر رہے ہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پریشانی کا سبب دریافت کرلیتا۔ اس وقت خلیفہ ابوالقاسمؒ گویا بڑی عجلت میں تھے۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے پوچھا۔ ”حضرت! کیا بات ہے؟ آپ پریشان پریشان سے نظر آتے ہیں اس کا کوئی خاص سبب ہے یا یوں ہی......؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! میں حج کرنا چاہتا ہوں۔ بس اس فکر نے پریشان کررکھا ہے، دعا کرو، خدا میری یہ مراد برلائے۔“

شاہ صاحب نے عرض کیا۔ ”حضرت! میری یہ مجال کہ میں آپ کے لیے دعا کروں۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”اس میں مجال کی کیا بات، تم میرے لیے دعا کرو کہ میں حج کی سعادت حاصل کرلوں!“

کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ خلیفہ ابوالقاسمؒ سفر حج کے لیے روانہ ہونے والے ہیں۔ ان کے ارادت مندوں نے حسب حیثیت نذرانے پیش کرنا چاہے مگر آپ نے انہیں قبول نہیں کیا۔ ایک نادار ارادت مند نے تخلیے میں ایک چونی پیش کی اور عاجزی اور شرمندگی سے کہا۔ ”حضرت اس سے زیادہ میری حیثیت نہیں ہے، خدا کے لیے اسے قبول فرمالیجیے۔“

آپ نے اپنے نادار مرید کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کچھ تامل کے بعد کہا۔ ”گوکہ میں نذرانے قبول نہیں کرتا ہوں کیونکہ اس چونی میں تیرا بے پایاں خلوص شامل ہوچکا ہے جس سے اس کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔“

آپ نے چونی لے لی اور اس کو اپنے بازو پر باندھ لیا۔

آپ نے سورت سے جہاز پکڑا۔ جہاز کے ہم سفروں نے بہت جلد آپ کی حیثیت اور مرتبے کا اندازہ لگا لیا۔ وہ سب آپ کے اردگرد جمع رہنے لگے۔ یہ لوگ آپ کی مجلس میں مختلف موضوعات پر بحث کرتے رہتے۔ ان مباحثوں میں خلیفہ نہیں شریک ہوتے تھے۔

ایک دن ان میں جہاز کا کپتان بھی شامل ہوگیا۔ اس نے حاضرین سے پوچھا۔ ”کیا آپ سب تصوف سے دلچسپی رکھتے ہیں۔“

یہاں کا ہر شخص تائید میں بولا۔ ”الحمدللہ! ماشاءاللہ۔ ہم لوگ آپ کی صحبت میں کیوں بیٹھتے ہیں؟ اس کی بس سب سے بڑی یہی وجہ ہے کہ ہم سب یہیں سکون پاتے ہیں اور اسی سکون کی خاطر ان کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

کپتان زور زور سے ہنسنے لگا۔ سارے مرید اس کی ہنسی پر ہکا بکا رہ گئے۔

ایک نے پوچھا۔ ”اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟“

کپتان نے جواب دیا۔ ”میں اس پر ہنس رہا ہوں کہ درویشوں اور اللہ والوں کی بابت معلوم نہیں کیسی کیسی افواہیں پھیلی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئی ہیں۔"

مرید نے پوچھا۔ "کیا آپ ان پر یقین نہیں رکھتے؟"

کپتان نے ایک بار پھر سرد مہری سے جواب دیا۔ "جناب والا! میں ان بے کار، ناقابل اعتبار اور فرسودہ دیو مالائی خرافات پر کس طرح یقین کرلوں۔"

مریدوں کو غصہ آگیا، بولے۔ "کپتان! اپنی زبان کو قابو میں رکھ ورنہ ہم تجھے سمندر میں پھینک دیں گے۔"

کپتان بڑا نڈر تھا، بولا۔ "حضرت! پہلے میری بات خوب اچھی طرح سن لیجیے اس کے بعد کچھ کہیے سنیے۔"

ٹھنڈے مزاج کے ایک مرید نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا۔ "بھائیو، ذرا صبر و تحمل سے کام لو اور اس کپتان کی بھی سن لو۔ یہ ہم سے کہنا کیا چاہتا ہے اور یہ تصوف اور صوفیائے کرام پر کیوں یقین نہیں رکھتا۔ یہ ساری باتیں پہلے معلوم تو ہوجائیں۔"

تندخو مرید نے کہا۔ "میں اس گمراہ اور عاقبت نااندیش کی اب ایک بات بھی نہیں سنوں گا۔ آؤ اس کے پاس سے ہٹ جائیں۔"

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ارادت مندوں کو ہٹا دیا اور خود کپتان کے پاس جا کھڑے ہوئے، پوچھا۔ "ہاں بھئی! یہ تنازعہ کس بات پر ہوا؟ تیری سمجھ میں کیا بات نہیں آرہی ہے؟"

کپتان نے جواب دیا۔ "صوفی جی! میں نے کئی صوفیوں کی بابت یہ سنا ہے کہ اپنے روحانی زور سے وہ دریا یا سمندر کے پانی پر چلنے لگے۔ دوسرے اس کو مان سکتے ہیں لیکن میں ماننے کو تیار نہیں، کیونکہ پانی پر چلنا انسانی اختیار میں نہیں یہ فضول خوش اعتقادیاں اور خوش فہمیاں ہیں جو ناداتوں میں پیدا ہوجاتی ہیں۔"

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے کپتان سے پوچھا۔ "بس اتنی سی بات ہے جس نے تجھے تصوف اور صوفی سے برگشتہ کردیا؟"

کپتان نے جواب دیا۔ "ہاں صوفی جی! یہ اتنی سی بات نہیں ہے، بڑی اہم بات ہے۔"

خلیفہ نے سمندر کی سطح پر ابھرتی بیٹھتی موجوں کی طرف دیکھا اور کپتان سے کہا۔ "یہ تماشا تو میں بھی دکھا سکتا ہوں، اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

کپتان نے حیرت سے خلیفہ کی طرف دیکھا۔ "آپ دکھا سکتے ہیں۔ یعنی آپ بھی پانی کی سطح پر چل پھر سکتے ہیں؟"

خلیفہ نے جواب دیا۔ "ہاں! اس میں کوئی خاص بات نہیں۔"

خلیفہ ابوالقاسمؒ بات کرتے ہوئے جہاز کے کنارے پر چلے گئے اور ایک بار پلٹ کر کپتان کی طرف دیکھا۔ "دیکھ میں پانی کی سطح پر جارہا ہوں تو خود بھی دیکھ اور انہیں بھی دکھا دے جو تیری ہی طرح اس پر یقین نہیں رکھتے۔"

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے اپنی بات پوری کی اور ساتھ ہی سمندر میں چھلانگ لگادی۔ کپتان نے چیخنا شروع کردیا۔ "لوگو! دوڑو، اس درویش نے جوش میں آکر پانی میں چھلانگ لگادی ہے۔ خدا اس پر رحم کرے، یہ تو خوامخواہ مارا گیا۔ میں نے اس سے بلاوجہ ایسی باتیں کیں جس سے یہ جوش میں آگیا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔"

جس جس نے کپتان کی آواز سنی، دوڑ کر اس کے پاس چلا گیا۔ سبھی کی نظریں کپتان کی نظروں کے تعاقب میں سمندر کی ایک خاص سطح پر ٹنگ گئیں۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ سطح پرسکون تھی۔

خلیفہ ابوالقاسمؒ کے ایک ارادت مند نے کپتان کا گریبان پکڑ لیا اور اس کو جھٹکے دے دے کر پوچھا۔ "کیا تو نے انہیں دھکا دے دیا ہے، بتا! پیرومرشد کہاں چلے گئے؟"

کپتان نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ "میں انہیں کیوں دھکا دیتا؟ وہ اپنی مرضی سے یہ دکھانے کے لیے سمندر میں کود گئے کہ وہ بھی بڑے بڑے صوفیائے عظام کی طرح سمندر کی سطح پر چل پھر سکتے ہیں۔"

مرید نے رونا شروع کردیا۔ "کپتان! تو کچھ بھی کہہ، میں تیرے بیان پر یقین نہیں کروں گا۔ تو نے پیرومرشد کو ضرور دھکا دیا ہے۔ اب تو انہیں نکال بھی، ورنہ میں تجھ کو دھکا دے دوں گا۔"

کپتان گھبرایا۔ کیونکہ اب دوسرے صوفی بھی کپتان کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے ارادے صحیح نظر نہیں آتے تھے۔ کپتان نے بھاگنا چاہا مگر سبھوں نے اسے محاصرے میں لے لیا۔ کپتان نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "بھائیو! اگر تم نے میرے ساتھ زیادتی کی اور مجھے سمندر میں پھینک دیا تو یہ بھی سمجھ لو کہ پھر اس جہاز کا خدا حافظ۔ یہ بھی ڈوب جائے گا اور جب یہ ڈوب جائے گا تو تم سب ڈوب جاؤ گے اور جب تم سب ڈوب جاؤ گے تو مجھے اپنے ڈوبنے کا کیا ملال؟ کیا خوف؟"

مریدوں نے کہا۔ "کچھ بھی ہو ہم تجھے معاف نہیں کریں گے۔"

انہوں نے کپتان کو پکڑ لیا اور اس کو جھلانا شروع کردیا تاکہ اسے دور پانی میں پھینک دیں لیکن اسی وقت انہوں نے پانی کی سطح پر خلیفہ ابوالقاسمؒ کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ اپنے ہاتھ کے اشارے سے منع کررہے تھے کہ کپتان کو مت پھینکو، میں آرہا ہوں۔

مریدوں نے کپتان کو تو چھوڑ دیا لیکن خود تماشائے حیرت بن گئے۔ معتقد اور غیر دونوں ہی حیرت زدہ اور مبہوت خلیفہ ابوالقاسمؒ کو دیکھنے میں مشغول تھے۔

کپتان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اپنے آس پاس موجود لوگوں سے پوچھا۔ "کیا میں سچ مچ خلیفہ ابوالقاسمؒ کو سمندر کی سطح پر چلتے پھرتے دیکھ رہا ہوں یا میں حالت خواب میں ہوں؟"

ایک مرید نے جواب دیا۔ "تو بیدار ہے اور حالت بیداری میں یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا ہے۔"

کپتان نے اپنے گال میں ناخن چبھو دیے اور کھال کو نوچ کر خون نکال لیا۔ سیاہ خون پہلی انگلی سے پونچھ کر دیکھا۔ گال میں سوزش ہونے لگی تھی۔ اس تکلیف نے اسے یقین دلایا کہ وہ حالت بیداری میں یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔

خلیفہ ابوالقاسمؒ پانی کی سطح پر چلتے ہوئے جہاز کے پاس آگئے اور بہ آواز بلند کپتان سے پوچھا۔ "کپتان! تو اب بھی مطمئن ہوا یا نہیں؟"

کپتان نے جوب دیا۔ "یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں کون ہے جو دیکھ کر بھی منکر ہی رہے گا۔"

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے عاجزی سے پوچھا۔ "تو میں اب بھی یہیں رہوں یا اوپر آجاؤں؟"

کپتان نے درخواست کی۔ "حضرت! آپ خدا کے لیے اوپر آجایئے۔"

خلیفہ ابوالقاسمؒ جہاز کی سطح پر اس طرح آگئے جس طرح کوئی شخص خشکی پر سے جہاز میں سوار ہوجائے۔

کپتان نے آگے بڑھ کر آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور روہانسی آواز میں کہا۔ "حضرت! میں شرمندہ ہوں، میں نے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا تھا، مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تمہیں ایسی باتیں ضرور کرنا چاہیے تھیں کیونکہ اگر یہ باتیں نہ کرتے تو تم اپنے شبہات اور وسوسوں کا جواب کس طرح حاصل کرتے۔"

کپتان اس درجہ مرعوب اور متاثر ہوچکا تھا کہ بے چون و چرا حلقۂ نیازمنداں میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

جب آپ حرمین شریفین میں پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ پر کوئی توجہ نہ دی۔ ان دنوں وہاں ایک ایسا شخص بھی رہ رہا تھا جسے حضرت غوث الاعظمؒ کی کلاہ مبارک تبرکاً سلسلہ وار اپنے آباواجداد سے ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ بڑی عزت سے دیکھا جاتا تھا۔

اس شخص نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ حضرت غوث الاعظمؒ تشریف فرما ہیں اور اس شخص سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس نے دریافت کیا۔ "حضرت! آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

غوث الاعظمؒ نے جواب دیا۔ "اے شخص! خلیفہ ابوالقاسمؒ اکبرآبادی ہندو کو میری کلاہ دے دے جو تیرے پاس وراثتاً چلی آئی ہے۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "حضرت! یہ کون شخص ہے؟ میں تو اس سے واقف بھی نہیں ہوں۔"

غوث الاعظمؒ نے جواب دیا۔ "یہ شخص ہندوستان کے پائے تخت اکبرآباد سے آیا ہے اور ہندیوں میں بڑی شہرت اور عظمت رکھتا ہے۔"

جب یہ شخص بیدار ہوا تو تردد میں پڑ گیا۔ اس کو شیطان ورغلا رہا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ ان بزرگ کا امتحان لے لیا جائے۔

کافی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کلاہ کے ساتھ ایک جبہ بھی خلیفہ ابوالقاسمؒ کے حوالے کرے گا اور یہ دیکھے گا کہ انہیں ان دونوں کی بابت کچھ معلوم بھی ہے یا نہیں، اگر وہ جبے کو بھی قبول کرلیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ خلیفہ ابوالقاسمؒ دنیادار اور کشف سے خالی شخص ہیں۔ اور اگر کچھ ہیں تو وہ جبہ نہیں قبول کریں گے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسرے دن صبح یہ شخص خلیفہ ابوالقاسمؒ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی دیر تک انہیں تلاش کرتا رہا۔ آخر ہندی زائرین میں انہیں پالیا۔ اس نے خلیفہ کو سلام کیا اور ان کے قدموں میں احترام سے بیٹھ گیا۔

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے اس شخص سے پوچھا۔ ”ہاں بھائی بتا۔ تو میرے پاس کیوں آیا؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! رات میں نے حضرت پیر دستگیرؒ کو خواب میں دیکھا وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ان کا کلاہ اور جبہ، دونوں چیزیں میں آپ کے حوالے کر دوں۔ چنانچہ میں انہیں لے کر حاضر ہو گیا۔ آپ قبول فرمائیں۔“

آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ”لاؤ، میری چیزیں میرے حوالے کر دو۔“

اس شخص نے کلاہ اور جبہ آپ کے حوالے کر دیا۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے دونوں چیزیں احتیاط سے رکھ لیں۔ وہ شخص بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا شکار قابو میں آچکا ہے۔ اس کو ذلیل اور رسوا کرنا چاہیے۔ وہ خاموش بیٹھا رسوا کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا۔ ”ہندی بزرگ! آپ جس مرتبے کے بزرگ ہیں اس کی اس عہد میں دوسری کوئی مثال نہیں ملے گی۔ میں اب لوگوں کو بتاتا ہوں کہ ایک ہندی بزرگ بھی ہم میں تشریف فرما ہیں اور وہ اتنے بلند مرتبہ ہیں کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے اپنے دونوں تبرکات آپ کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا۔ آج میں کلاہ اور جبہ دے کر بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں کیونکہ...... حق بہ حق دار رسید۔“

آپ نے پوچھا۔ ”ان باتوں کا مطلب؟ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

اس شخص نے کہا۔ ”بات سیدھی سی ہے، کلاہ اور جبہ میرے پاس آپ کی امانت تھے۔ آج میں نے یہ امانت آپ کو دے دی۔ تو سکون حاصل ہوا۔ اب اس خوشی میں ایک کام آپ بھی کریں۔“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”ضرور کروں گا، بتاؤ......“

اس شخص نے کہا۔ ”آپ اس خوشی میں رؤسائے شہر کی دعوت کر دیجیے تا کہ ان سے میں آپ کا تعارف کرا دوں۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔ آپ مہمانوں کو کل بلا لیجیے۔“

وہ شخص خوشی خوشی اپنے گھر گیا اور شہر کے رئیسوں کو دعوت طعام دے دی۔ دوسرے دن جب رؤسائے شہر اس شخص کے ساتھ خلیفہ ابوالقاسمؒ کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خلیفہ نے زبردست دعوت کا انتظام کر رکھا ہے۔ پوری فضا کھانے کی خوشبو سے مہک رہی تھی، آپ نے مہمانوں کے ہاتھ دھلوائے اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ رؤسائے شہر ان کی زیارت کر کے بہت خوش تھے۔

کسی رئیس نے پوچھا۔ ”حضرت! آپ ہندی درویش ہیں۔ آپ کے پاس مال وزر کے نام پر شاید کچھ بھی نہ ہو۔ اگر میرا یہ خیال درست ہے تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ دعوت کا اہتمام کیوں کر ہوا اور آپ کے پاس جب کچھ بھی نہ تھا تو یہ خرچہ کس طرح اور کہاں سے ہوا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”کل ان صاحب نے مجھے دو تبرک دیے تھے کلاہ اور جبہ، کلاہ تو میرے پاس موجود اور محفوظ ہے لیکن جبہ میں نے فروخت کر دیا اور اسی کی قیمت سے میں نے یہ دعوت کر دی۔“

اس شخص کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اشتعال میں آ کر کانپنے لگا، چیخ کر بولا۔ ”حضرات! میں نے اس ہندی فقیر کو اہل اللہ سمجھا تھا مگر یہ تو ریاکار مکار نکلا۔ میں نے اس کو غوث الاعظمؒ کے دو تبرکات کلاہ اور جبہ اس لیے دیے تھے کہ میں نے ان دونوں متبرک چیزوں کا اسے اہل اور مستحق سمجھا تھا۔ مگر اس نے ان کی قدر نہیں جانی...... افسوس۔“

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے بھی اس شخص کو ڈانٹ دیا۔ ”چپ رہ مکار انسان! جو چیز تبرک تھی اس کو میں نے محفوظ کر لیا ہے اور جس چیز کو تو نے میرا امتحان لینے کے لیے دیا تھا۔ اسے میں نے فروخت کر دیا اور اس کی رقم سے میں نے رؤسائے شہر کی دعوت کر دی۔“

آپ نے جو کچھ فرمایا اور جس انداز میں فرمایا اس سے اس شخص پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ مبہوت اور سحر زدہ گیا، پوچھا۔ ”کیا آپ جبے کی قدر و قیمت سے واقف تھے؟“

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے جواب دیا۔ ”اگر واقف نہ ہوتا تو میں تیرا جبہ فروخت ہی کیوں کرتا؟“

یہ شخص کسی عامل کے معمول کی طرح اصل حقیقت اہل مجلس کے سامنے بیان کر گیا اور کہا۔ ”حضرات! اس ہندی فقیر نے جو کچھ کہا ہے درست ہے، جب حضرت غوث الاعظمؒ نے خواب میں مجھ کو ہدایت کی کہ میں ان کی کلاہ اس فقیر کے حوالے کر دوں تو معاً میرے دل میں خیال آیا اس درویش کا امتحان لینا چاہیے۔ چنانچہ اس خیال سے میں نے کلاہ کے ساتھ اپنا جبہ

بھی اس فقیر کے حوالے کر دیا۔ اس خدا رسیدہ بزرگ نے میرا جبہ بیچ کر آپ سب کی دعوت کر دی اور اس طرح مجھ کو شرمندہ اور خوار کر دیا، میں اس سے معافی کا طلبگار ہوں اور اس کی بزرگی اور عظمت کے آگے اپنا سر جھکاتا ہوں۔“

☆☆☆

مکے کے دوران قیام ہی میں وہاں قحط پڑ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انسانوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں اور آدمی آدمی سے ڈرنے لگا۔ چند ہندی مسافروں نے فیصلہ کیا کہ آپ کی خدمت میں دعا کے لیے حاضری دی جائے، چنانچہ وہ سب بھوکے آپ کے پاس پہنچے، آپ نے انہیں بٹھا کر پوچھا۔ ”بھوکے ہو کھانا کھا لو، بقیہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔“

وہ سب بھوکے تو تھے ہی، کھانے کا نام سن کر باچھیں کھل گئیں کہا۔ ”بے شک، پہلے ہم سب کھانا کھائیں گے اس کے بعد اپنا مدعا عرض کریں گے۔“

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے ان سب کے آگے بریانی لگا دی اور اس کے ساتھ ہی چند دوسرے کھانے بھی رکھ دیے۔ بھوکوں نے اسے ذرا سی دیر میں چٹ کر دیا اور خلیفہ سے کہا۔ ”حضرت! اس قحط زدہ شہر میں اتنے اچھے اچھے کھانے آپ کو کہاں سے میسر ہوئے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جو خدا اکبر آباد میں ہے میرے ساتھ وہی یہاں بھی ہے اور اس وقت بھی میرے ساتھ ہے، پھر مجھے کوئی تکلیف کیوں ہو؟“

لوگوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

آپ نے پوچھا۔ ”تم نے اپنی آمد کا مدعا نہیں بیان کیا۔“

ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”حضرت! خدا سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں قحط سالی سے بچائے اور اس عذاب کو واپس لے لے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں دعا تو اسی وقت کیے دیتا ہوں لیکن یہ بھی طے ہے کہ اس قحط سالی میں اللہ کی مشیت بھی شامل ہے اور میں اللہ کی مشیت کے خلاف اس سے کچھ کیوں مانگوں؟“

لوگوں نے اصرار کیا۔ ”حضرت! یہ تو ممکن ہے کہ اللہ آپ کی دعا سے ناراض ہو جائے لیکن یہ ناممکن ہے کہ خدا آپ کو آزردہ اور مایوس کر دے۔“

آپ نے دعائیہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور گڑگڑانے لگے۔ ”خدایا! اس عاجز اور گنہگار کی شرم رکھ لے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ تو مجھ پر مہربان ہے اور تیری نظر کرم میرے حال پر قائم و دائم رہتی ہے، ان کے اس خیال اور خوش فہمی کی لاج رکھ لے۔ میں تجھ سے اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہتا۔ دوسروں کے لیے مانگ رہا ہوں، اس کو پورا کر دے۔“

آپؒ دعا مانگ ہی رہے تھے کہ کسی نے آ کر اطلاع دی کہ شام سے اناج اور اشیائے خورونوش سے لدے ہوئے اونٹوں کا قافلہ آ گیا ہے۔ لوگوں کے چہروں پر شگفتگی دوڑ گئی۔

☆☆☆

حج کر کے واپس آئے تو اکبر آباد والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن یہ خود ان باتوں سے بے نیاز تھے۔ ان کے اپنے معمولات اور اصولوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مہمان نوازی، آنے والوں کی قدر و منزلت اور اسوۂ حسنہ پر عمل درآمد، گفتگو کرتے تو خوش اخلاقی اور خوش کلامی کا دامن نہ چھوڑتے، کبھی کبھی کسی ایسی بات پر غصہ بھی آ جاتا کہ ان کی مجلس میں بیٹھنے والا روشناس اور زود فہم کیوں نہیں۔

ایک دن صبح صبح خلیفہ ابوالقاسمؒ حمام کے لیے گھر سے نکلے تو گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس وقت کسی طرف سے شاہ عبدالرحیمؒ بھی پہنچ گئے۔ آپ ان کو دیکھتے ہی مسکرانے لگے، شاہ عبدالرحیمؒ نے سلام کیا۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ”صاحبزادے! خیریت تو ہے؟ گرمی بڑی غضب کی پڑ رہی ہے۔“

شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ ”جی پیر و مرشد، میں نے سوچا آپ کی خانقاہ میں سکون ضرور ملے گا۔“

خلیفہ ابوالقاسمؒ ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر خانقاہ میں واپس گئے۔ یہاں انہیں بٹھا دیا اور مکان میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب مکان کے اندر سے نمودار ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں چمچہ، پیالہ، گلاب کا عرق اور بتاشے کا بوجھ تھا۔ ان چیزوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوشاہ صاحب کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔
''میاں صاحبزادے! جی چاہے تو بتاشے کھالو۔ ورنہ عرق گلاب میں بتاشے ڈال کر شربت بنالو اور پی جاؤ۔''
وہاں خلیفہ کا ایک دوسرا مرید بھی موجود تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''جناب والا! میں تو صرف بتاشے کھاؤں گا۔''
خلیفہ نے اس مرید پر کوئی توجہ ہی نہیں دی اور شاہ عبدالرحیمؒ سے پوچھا۔ ''صاحبزادے! تمہیں کیا چیز پسند ہے، شربت یا محض بتاشے؟''
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''شربت!''
خلیفہ نے پوچھا۔ ''وہ کیوں...... وجہ؟''
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''جب آپ اندر سے چمچہ، عرق گلاب اور پیالہ لے کر آئے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہوا کہ آپ کی خواہش میں بھی یہی بات مخفی ہے کہ ان چیزوں کو بھی کام میں لایا جائے۔''
خلیفہ خوشی سے اچھل گئے اور سامنے موجود مریدوں کو مخاطب کیا۔ ''صاحبان! یہ نوجوان عبدالرحیم بلا کا ذہین اور سمجھ دار ہے، اس کی ہر بات میں حکمت موجود ہے۔''
شاہ صاحب نے عرض کیا۔ ''حضرات! میں نے تو یہ سوچ کر شربت پسند کیا ہے کہ پیرومرشد ایک غیر معمولی شخص ہیں ان کا کوئی کام خالی از علت نہیں ہوسکتا۔ آپ حمام تشریف لیے جارہے تھے، اس ناچیز کو دیکھ کر واپس آگئے اور عرق گلاب، چمچہ، پیالہ اور بتاشے اندر سے لے آئے۔ میں خفقان کا مریض ہوں اور اس مرض میں یہ چیزیں مفید ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ پیرومرشد میری خاطر مدارات کے ساتھ ہی میرا علاج بھی کررہے ہیں اور پھر حمام کے بعد یہ شربت پیرومرشد کو فائدہ پہنچاتا ہے بس اسی خیال سے میں نے شربت پینا پسند کیا۔''
خلیفہ نے کہا۔ ''سبحان اللہ! سبحان اللہ! اللہ اور زیادہ عقل وفکر مرحمت فرمائے۔'' پھر اس مرید کو مخاطب کیا۔ ''او ناداں اور کم عقل شخص! تو میری مجلس سے چلا جا کیونکہ تیرے جیسوں کے لیے اس مجلس میں اٹھنا بیٹھنا حرام ہے، تو اسی وقت یہاں سے چلا جا۔''
شاہ صاحب نے خوشامد کی۔ ''پیرومرشد! اس کو مجلس سے نہ نکالیے کیونکہ یہ باہر نکل کر مجھ کو بددعائیں دے گا اور میں ان بددعاؤں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔''
خلیفہ نے کچھ سکوت اختیار کیا۔ اس کے بعد فرمایا۔ ''اس بار صاحبزادے تمہاری وجہ سے اس کو معاف کیے دے رہا ہوں اگر آئندہ ایسی حماقت کی تو میں کھڑے کھڑے اپنی مجلس سے نکلوادوں گا۔'' پھر مرید سے کہا۔ ''تو نے میری بات اچھی طرح سن لی ہے یا نہیں......؟''
مرید نے سہمے لہجے میں کہا۔ ''حضرت! یہ آج کی سرزنش میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جا! میں نے تجھے معاف کردیا۔''
مرید خوشی سے دیوانہ ہوگیا اور تکلف اور احترام کو بالائے طاق رکھ کر رقص شروع کردیا۔
آپ نے فرمایا۔ ''اب بس بھی کر۔''
اس کے بعد آپ حمام تشریف لے گئے۔

☆☆☆

آپ وعظ فرمارہے تھے آپ کے ارادت مند گوش برآواز تھے۔ ہر شخص محو ومنہمک تھا لیکن ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس نے آپ کا وعظ نہیں سنا۔ حالانکہ وہ شخص آپ کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔
وعظ ختم ہوا تو لوگ ادھر ادھر جانے لگے۔ آپ اپنی جگہ سے اٹھے اور اس مغموم، غائب دماغ اور فکر مند شخص کے پاس جاکھڑے ہوئے، کچھ دیر اس کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ''کیوں میاں سید عبدالرسول کیا بات ہے؟ تم ضرورت سے زیادہ فکر مند نظر آرہے ہو؟''
عبدالرسول کو رونا آگیا، بولا۔ ''حضرت! اب کیا عرض کروں؟ کچھ کہتے نہیں بنتا۔''
خلیفہ نے فرمایا۔ ''نہیں، تم خست سے کام نہ لو۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔''

عبدالرسول نے دوسرے مریدوں کی طرف دیکھا تو ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ کہا۔ ''ان سب کے سامنے کیا عرض کیا جائے؟''
خلیفہ نے ان سب کو باہر نکال دیا اور عبدالرسول سے کہا۔ ''ہاں اب تو بتا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟''
سید عبدالرسول نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے پیرومرشد کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''حضرت! میری ایک بیٹی ہے، اب وہ بالغ ہوچکی ہے میری معاشی حالت بہت خراب ہے، میں راتوں کو چین سے سو نہیں سکتا، دن میں سکون نہیں پاتا۔ میں چاہتا ہوں اس کا کوئی رشتہ آجائے تو میں اس فرض سے فراغت حاصل کرلوں لیکن غربت اور افلاس کی وجہ سے کوئی رشتہ بھی نہیں آتا۔''
آپ نے پوچھا۔ ''تو پھر تو چاہتا کیا ہے؟''
عبدالرسول نے جواب دیا۔ ''اپنی بیٹی کی شادی۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو دہلی جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں تاکہ میں وہاں کے اہل ثروت اور مخیر حضرات کے در پر سوالی بن کر حاضری دوں اس طرح شاید کوئی کام بن جائے۔''
آپ نے کچھ سکوت اختیار فرمایا اور پھر کہا۔ ''اگر تو نے یہ ارادہ ہی کرلیا ہے کہ امراء کے در پر سوالی بن کر صدا لگائے تو سب سے پہلے شاہ عبدالرحیمؒ کے در پر جانا اس کے بعد کہیں اور جانا اور جو چاہے کہنا سننا۔''
عبدالرسول آپ سے جدا ہوکر دہلی پہنچے اور سب سے پہلے شاہ عبدالرحیمؒ سے ملاقات کی۔ عبدالرسول نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا، پوچھا۔ ''بھائی! کیا تم بھی اہل ثروت میں شمار کیے جاتے ہو؟''
شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ ''نہیں تو! ایسی تو کوئی بات نہیں۔''
عبدالرسول نے ذہن پر زور دیا۔ ''پھر پیرومرشد نے مجھے آپ کے پاس کیوں بھیج دیا؟''
شاہ صاحب نے کہا۔ ''پہلے تم اپنی آمد کا مقصد بتاؤ۔''
عبدالرسول نے اپنی آمد کا مقصد صاف صاف بیان کردیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے ندامت سے سر جھکالیا اور کہا۔ ''میاں عبدالرسول! حضرت خلیفہ نے تمہیں میرے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمہیں کسی اور کے در پر نہ جانے دوں۔ میں تمہاری مدد ضرور کروں گا کہ تم سوالی بننے کی ذلت سے بچ جاؤ۔ خدا تمہیں معزز و موقر بنائے۔''
شاہ عبدالرحیمؒ نے عبدالرسول کو ایک ہفتہ مہمان بنائے رکھا اور جب واپسی کا ارادہ کیا تو اس حال میں، کہ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کردیا تھا اور شادی کے اخراجات کے لیے معقول رقم کا بندوبست بھی کردیا تھا۔
جب عبدالرسول خوشی خوشی واپس پہنچے اور پیرومرشد کو سارا احوال سنایا تو وہ مسکرانے لگے، فرمایا۔ ''میں نے تجھے شاہ عبدالرحیمؒ کے پاس اسی لیے بھیجا تھا کہ تو میری بات تو سمجھے گا نہیں، شاہ عبدالرحیمؒ کی باتیں جلدی ہی تیری سمجھ میں آجائیں گی۔''
عبدالرسول پھر رونے لگے۔ لیکن اس بار ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

☆☆☆

ان دنوں اکبرآباد میں اورنگ زیب کے حکم پر فتاویٰ عالمگیری کا کام بڑے زور وشور سے انجام پارہا تھا، ملک کے بڑے بڑے نامور اور جید عالم اس کام میں شریک تھے۔ ان میں شیخ حامد نامی ایک بزرگ بھی شامل تھے۔ شیخ حامد، شاہ عبدالرحیمؒ کے شریک پیر بھی رہ چکے تھے۔ شیخ حامد کو خوب اندازہ تھا کہ شاہ صاحب کس پائے کے بزرگ اور عالم ہیں۔ شیخ حامد بھاگے بھاگے شاہ عبدالرحیمؒ کے پاس پہنچے اور یہ خوش خبری سنائی کہ فتاویٰ عالمگیری کے کام میں مجھے شامل بھی کرلیا گیا ہے میری خواہش ہے کہ آپ میری اس کام میں مدد کریں میں آپ کا روزینہ مقرر کرادوں گا۔''
شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ ''میں اس کا فیصلہ خود نہیں کرسکتا والدہ سے مشورہ کرلوں تو کوئی جواب دے سکوں گا۔''
شیخ حامد نے کہا۔ ''بھائی! مشورہ جس سے چاہو کرلو۔ لیکن یہ کام تمہیں بہرحال کرنا پڑے گا۔''
شاہ عبدالرحیمؒ نے اپنی ماں سے مشورہ کیا تو انہوں نے زور دیا کہ یہ کام ضرور کرلو۔ اس کے بعد ماں نے اس کے فوائد و نفع رسانی پر ایک شاندار تقریر کرڈالی۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے جب اپنی ماں کو ادھر راغب دیکھا تو ہامی بھرلی اور شیخ حامد کی وساطت سے فتاویٰ عالمگیری میں روزینہ دار ہوگئے اور کام شروع کردیا۔ چند دنوں بعد خلیفہ ابوالقاسمؒ کی خدمت میں حاضری

WWW.PAKSOCIETY.COM

دی اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ مجھے یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں؟

خلیفہ صاحب نے جواب دیا۔ ”یہ کام مت کرو، کیونکہ اس کام میں خرابی یہ ہوگی کہ تم جو کچھ کرنا چاہو گے علما ... کو نہیں ہونے دیں گے اس لیے اس میں تمہاری شمولیت محض روزی کو تو مفید ہوگی مگر اس سے دین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں نے یہ ناگوار فریضہ محض والدہ کی وجہ سے قبول کیا ہے ورنہ میری ... ادھر راغب نہ ہوتی تھی۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”والدہ کی مرضی کو نظر انداز کردو اور اس کام کو بھی ترک کردو۔“

شاہ عبدالرحیمؒ نے حیرت سے خلیفہ کو دیکھا۔ انہیں حیرت تھی کہ اتنا بڑا بزرگ اور عالم ایسی بات کہہ رہا ہے اور ماں ... مرتبے کو نظر انداز کردینے کی بات کررہا ہے۔ شاہ صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ”حضرت! یہ آپ نے کتنی بڑی بات کہی ... کہ میں ماں کی مرضی کو نظر انداز کردوں، کیا ماں کے حکم کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”ترجمہ: (جب اللہ کا حق آجاتا ہے تو بندوں کے حقوق ساقط ہوجاتے ہیں) یہ ایک اٹل حقیقت ہے اور اس جواز سے ماں کا حکم ساقط ہوجاتا ہے۔“

شاہ صاحب نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ اس حدیث قدسی پر عمل کروں، آپ بھی دعا فرمائیں کہ میں ا... کامیاب ہوجاؤں۔“

خلیفہ نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”جاؤ، اللہ تمہاری مشکل آسان کردے گا۔“

شاہ صاحب وہاں سے چلے آئے اور خلیفہ ابوالقاسمؒ کی دعا کے اثر کا انتظار کرنے لگے۔

فتاویٰ عالمگیری کا مسودہ شاہ عبدالرحیمؒ کے سامنے نظر ثانی کے لیے رکھا گیا تو اس میں کسی مسئلے کو ... کردیا گیا تھا۔ فتاویٰ کے مرتب اعلیٰ نے اس مسئلے کو کئی کتابوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی تھی اور ہر کتاب کے مفہوم کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرکے بیان کرنے کی کوشش میں اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے اس کو پڑھا تو طبیعت ... ہوگئی اور اس کے پاس ہی ایک نوٹ لکھ دیا۔

ترجمہ: (جو دین کی سمجھ نہیں رکھتا اس نے یہاں گڑبڑ کردی ہے اور صحیح اس طرح ہے)

ان دنوں اورنگ زیب اس کام پر بڑی توجہ دے رہا تھا اور اکبر آباد میں موجود ہونے کی وجہ سے وہ اس کے مسودے ... روز پڑھوا کر سنتا تھا۔ سنانے کا کام ملا نظام کے سپرد تھا۔ ایک دن جب مسودہ پڑھ کر سنایا تو شاہ عبدالرحیمؒ کے نوٹ کو اصل ... کے ساتھ ملا کر پڑھ دیا۔ بادشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور پوچھا۔ ”کیا مطلب؟ وضاحت کی جائے۔“

ملا نظام گھبرا گئے اور عرض کیا۔ ”حضور والا! میں نے اس حصے کو پہلی بار پڑھا ہے اور اس پر نظر ثانی کا کام ابھی نہیں ہوا ... کل اس کا مطلب عرض کرسکوں گا۔“ بادشاہ نے اجازت دے دی۔

ملا نظام غصے میں لال پیلے ہوتے ہوئے گھر پہنچے اور شیخ حامد کو طلب کیا۔ ان کے آتے ہی ملا نظام نے انہیں برا بھلا کہنا شروع کردیا، کہا۔ ”شیخ صاحب میں نے اس کام میں آپ پر اعتماد کیا اور آپ نے مجھے خوار کردیا۔ آخر یہ حاشیہ کس کی ایجاد ہے؟“

شیخ حامد نے جواب دیا۔ ”میں نے نظر ثانی کا کام شاہ عبدالرحیمؒ کے سپرد کر رکھا ہے۔ ان سے معلوم کرکے کچھ عرض کرنے کے قابل ہوسکوں گا۔“

ملا نظام نے کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس طرح شاہ عبدالرحیمؒ بادشاہ پر اپنی جلیت اور دینداری کا سکہ جمانا چاہتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ شاہ صاحب ہم سب پر سبقت لے جائیں گے اور بہت ممکن ہے کہ انہیں اس کام کا نگران مقرر کردیا جائے۔“

شیخ حامد نے شرمندگی اور خجالت سے اپنا سر جھکالیا بولے۔ ”میں انہیں یہیں بلوالیتا ہوں اور آپ کے سامنے بات کرتا ہوں اگر آپ کی بات سچ ثابت ہوجائے تو پھر آپ کو یہ اختیار ہوگا کہ انہیں اس کام سے الگ کردیجیے۔“

ملا نظام شیخ حامد کی تجویز سے مطمئن ہوگئے اور کہا۔ ”انہیں یہیں اسی وقت بلوالو۔“

شیخ حامد نے ایک آدمی شاہ صاحب کے گھر روانہ کردیا کہ وہ جس حال میں بھی ہوں انہیں اپنے ساتھ لے آؤ اور ان پر واضح کردو کہ ان کی یہ طلبی بادشاہ کے حکم پر ہوئی ہے۔

آدمی شاہ صاحب کے گھر پہنچا اور اپنے ساتھ لیے چلا آیا۔

ملا نظام نے اس عرصے میں دوسرے علما کو بھی بلالیا تھا۔ ان سب کے سامنے ملا نظام نے شاہ عبدالرحیمؒ سے پوچھا۔ ”جناب! آپ نے یہ کیسا حاشیہ لگادیا کہ جو دین کی سمجھ نہیں رکھتا اس نے یہاں گڑبڑ کردی ہے اور صحیح اس طرح ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟“

شاہ عبدالرحیمؒ نے متعلقہ مسئلے پر گفتگو شروع کردی اور ذرا سی دیر میں اس کے ابہام کو دور کردیا۔ جملہ مفتی لاجواب ہوگئے اور مسئلے کے گنجلک پن کے قائل ہوگئے لیکن ان سب میں حسد پیدا ہوگیا۔

دوسرے دن ملا نظام نے اورنگ زیب سے شاہ عبدالرحیمؒ کی شکایت کردی اور کہا۔ ”اس سید زادے کو اپنے علم و دانش پر بڑا غرور ہے اور میری ناچیز رائے میں اگر اس جیسے کچھ اور اس کام میں شامل ہوجائیں تو پھر یہ کام کبھی بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے۔“

اورنگ زیب نے پوچھا۔ ”اس کو اس کام میں شریک کس نے کیا؟“

ملا نظام نے جواب دیا۔ ”شیخ حامد نے، لیکن اب وہ اپنی اس غلطی پر نادم ہے۔“

اورنگ زیب نے کہا۔ ”مجھے وہ فہرست دکھائی جائے جو فتاویٰ عالمگیری پر کام کرنے والوں سے تعلق رکھتی ہے۔“

ملا نظام نے اسی وقت فہرست بادشاہ کے روبرو رکھ دی۔ بادشاہ ہر ایک کے بارے میں سوالات کرتا رہا اور آخر میں چند ناموں پر ضرب کا نشان لگادیا ان میں شاہ عبدالرحیمؒ کا نام بھی شامل تھا۔ جب یہ خبر شاہ صاحب کے پاس پہنچی تو وہ بہت خوش ہوئے کہ ایک ایسے کام سے نجات مل گئی جو ان کے پیر و مرشد خلیفہ ابوالقاسمؒ اور خود ان کی مرضی کے خلاف تھا۔ شام کو خلیفہ کے پاس پہنچ گئے اور خوش خوش ایک طرف بیٹھ گئے۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور کہا۔ ”میاں صاحبزادے! کام اسی کو کہتے ہیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

☆☆☆

خلیفہ ابوالقاسمؒ شاہ عبدالرحیمؒ کو بلوا کر کہنے لگے۔ ”صاحبزادے! شہر کے درویشوں کی زیارت کرتے رہا کرو۔“

شاہ صاحب نے پس و پیش سے عرض کیا۔ ”حضرت! میں اپنے آپ کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر ناکام رہتا ہوں کیونکہ کسی اور بزرگ میں میں وہ کشش ہی نہیں پاتا جو آپ کی ذات میں ہے۔“

خلیفہ نے تاکید کی۔ ”لیکن میں جو کہہ رہا ہوں اس پر تمہیں بہر حال عمل کرنا ہے۔“

شاہ صاحب بھی اڑ گئے، کہا۔ ”اگر میں نے کسی اور میں آپ جیسی بات محسوس کی تو بے چون و چرا چلا جاؤں گا۔ ورنہ یہیں اسی در پر پڑا رہوں گا۔“

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے اپنے خادم کو آواز دی۔ ”ذرا ادھر تو آنا۔“

جب خادم آگیا تو اس کو حکم دیا۔ ”شاہ صاحب کی مشائخ چشت کے مشہور بزرگ سید عظمت اللہ کی خدمت میں لے جاؤ ان سے میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ ایک درویش کو آپ کی ملاقات کے لیے بھیج رہا ہوں۔“

خادم انہیں لے کر اس محلے میں پہنچ گیا جہاں وہ بزرگ رہتے تھے۔ وہ ان بزرگ کا مکان ہی بھول گیا۔ کچھ دیر تک تو وہ ادھر ادھر تلاش کرتا رہا۔ اس دوران شاہ عبدالرحیمؒ کی نظر محلے کے ان بچوں پر پڑی جو کھیل کود میں مشغول تھے۔ شاہ صاحب نے ایک بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بچہ تو بزرگ زادہ لگتا ہے، اس سے ان بزرگ کا پتا پوچھو جن سے ہمیں ملنا ہے۔“

خادم نے اس بچے سے سید عظمت اللہ کا پتا پوچھا تو وہ مسکرانے لگا، بولا۔ ”میں انہی کا بیٹا ہوں۔“

اس کے بعد وہ ان دونوں کو اپنے گھر لے گیا اور دروازے پر کھڑا کرکے اندر چلا گیا کچھ دیر بعد واپس آیا اور افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”باوا جان فرمارہے ہیں کہ میں تو بستر علالت پر پڑا ہوں، چلنے پھرنے کی طاقت سلب ہوچکی ہے اور گھر خاندان کی عورتوں سے بھرا ہوا ہے، میں انہیں ہٹا بھی نہیں سکتا۔ اس لیے سر دست ملاقات نہیں ہوسکتی۔“

ابھی بچے نے یہ جواب دیا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک دوسرا آدمی بھاگا ہوا آیا اور عرض کی۔ ”سید صاحب فرمارہے ہیں کہ حضرت خلیفہ کے درویشوں کو بٹھایا جائے، وہ تشریف لارہے ہیں۔“

اس پیغام کے ذرا دیر بعد ان دونوں نے دیکھا کہ سید عظمت اللہ کی چارپائی دو خادم اٹھا کر لیے چلے آرہے ہیں، ان دونوں کے پاس چارپائی رکھ دی گئی۔ سید عظمت اللہ لیٹے ہوئے تھے۔ شاہ عبدالرحیمؒ اور خلیفہ کے خادم نے انہیں سلام کیا۔ عظمت اللہ نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہیں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''حضرات! میں معذور ہوں جیسا کہ آپ دونوں نے خود ہی ملاحظہ کرلیا ہوگا مگر مجھے بعد میں خیال آیا کہ حضرت خلیفہؒ نے آپ دونوں کو خالی از حکمت نہیں بھیجا ہوگا۔ شاہ عبدالرحیمؒ صاحب! ذرا اپنا حسب نسب تو بتانا۔''

سید عظمت اللہ کا اپنا سلسلہ شیخ عبدالعزیز شکر بار تک پہنچتا ہے اور شیخ عبدالعزیز شکر بار شاہ عبدالرحیمؒ کے جد بزرگوار تھے۔ انہوں نے سید عظمت اللہؒ کو اپنے جد بزرگوار کا نام نہیں بتایا کیونکہ شاہ عبدالرحیمؒ خوب جانتے تھے کہ اگر انہوں نے بتا دیا تو سید عظمت اللہؒ ان کی بے حد تعظیم کریں گے اور اس بیماری میں خدمت اور تواضع سے باز نہیں آئیں گے۔

سید عظمت اللہؒ نے شاہ صاحب کے سامنے چند علمی سوال پیش کیے اور کہا۔ ''شاہ صاحب! مجھے ان کے جواب درکار ہیں، مرحمت فرمائیں۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں تو آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے فائدے حاصل کروں نہ کہ اس لیے کہ آپ کو فائدہ پہنچاؤں۔''

سید عظمت اللہؒ نے کہا۔ ''شاہ صاحب! ہمیں ان سوالوں پر مامور کیا گیا ہے اور میں اس پر مجبور ہوں کہ ان کے جواب تم سے لوں۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے سوالوں کے جوابات اتنے شاندار دیے کہ سید عظمت اللہ دنگ رہ گئے۔ ان کے جسم کو حرکت ہوئی اور وہ چارپائی کے ایک طرف کھسکنے لگے۔ کھسکتے کھسکتے کنارے تک پہنچے اور پھر مچل کر نیچے گر گئے اور خود کو شاہ عبدالرحیمؒ کے قدموں میں ڈال دیا اور عاجزی سے کہا۔ ''میں آپ کے احترام کا پابند ہوں، پہلے میں آپ کے نسبی مقام سے واقف نہیں تھا۔ نادانی میں مجھ سے کوتاہی سرزد ہوگئی۔'' پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔ ''آپ کو معلوم نہیں کہ شیخ عبدالعزیز شکر بار قدس سرہ نے میرے دادا کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر میری اولاد میں سے کوئی آپ کے پاس آئے اور ان علمی سوالوں کا یوں جواب دے تو میری امانت اس کے حوالے کر دینا چنانچہ آج وہ سب میں آپ کے حوالے کر دیتا ہوں۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے دریافت کیا۔ ''اس امانت میں کیا کیا ہے؟''

سید عظمت اللہؒ نے جواب دیا۔ ''چند تبرکات اور اجازت طریقہ۔ میرے جد محترم زندگی بھر تلاش میں رہے وہ ناکامی کے بعد میرے والد کو وصیت فرما گئے۔ والد محترم بھی تلاش و تجسس کے باوجود ناکام رہے اور یہ کام میرے سپرد کر دیا، میں بھی آپ کی تلاش میں رہا۔ اس وقت مجھے یہی غم کھائے جارہا ہے کہ اپنی ناکامی کس کے حوالے کرجاؤں میرا کوئی بالغ فرزند بھی نہیں جس کے حوالے یہ کام کیا جائے۔ لیکن اب میں خوش ہوں صاحب امانت خود ہی خوبیٔ قسمت سے میرے پاس آگیا۔''

اس کے بعد شاہ عبدالرحیمؒ کے سر پر اپنے ہاتھ سے عمامہ باندھا، کچھ نذرانہ بھی پیش کیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے کہا۔ ''حضرت! یہ سارا فیض حضرت خلیفہ ابوالقاسمؒ کا ہے۔ کیونکہ میں یہاں تک انہی کی ہدایت پر پہنچا ہوں اور اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ یہاں تک پہنچانے پر کیوں مصر تھے۔''

شاہ عبدالرحیمؒ یہاں سے اٹھ کر خلیفہ ابوالقاسمؒ کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ عرض کر دیا۔ انہیں جو کچھ ملا تھا اسے خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیا لیکن خلیفہ نے کچھ بھی نہیں لیا۔ فرمایا۔ ''صاحبزادے! نقد ظاہری جو ملا ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کبھی پریشان نہیں رہو گے۔ خوش حالی تمہارا مقدر بن گئی۔ عمامہ کا مطلب یہ ہے کہ سکون قلب کی دولت بھی تمہیں دے دی گئی اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں کوئی کسی کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔''

اس کے بعد خلیفہ نے کچھ شیرینی منگوا کر تقسیم کرادی۔

شاہ عبدالرحیمؒ کو سید عظمت اللہؒ سے تبرکات دلانے کے بعد خلیفہ ابوالقاسمؒ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔ گویا ان کے ذمے ایک فرض تھا جس کو پورا کرنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ جب یہ نصب العین حاصل ہوگیا تو وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔

ماخذات

سفینتہ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔
تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ انوار اولیاء، مرتبیں احمد جعفری۔
خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری

تعاقب

سلیم انور

بعض لوگ مصروفیات سے گھبرا کر ایسی تفریحات میں پناہ ڈھونڈتے ہیں جن کے اختتام پر حماقت کا بورڈ لگا نظر آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی شغل میں مصروف تھا کہ اچانک گڑھے میں یوں منہ کے بل گرا کہ چودہ طبق باآسانی روشن ہوگئے۔

مغربی قوانین کی پاسداری کے عذاب میں مبتلا ایک شخص کی بے چینی

بوسٹن کے افق پر شام کا دھندلکا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی رنگت ہلکی گلابی سی ہوگئی تھی۔ یہ گرمیوں کی ایک مرطوب، ہلکی سی ٹھنڈک پہنچانے والی شب کی آمد کی نوید تھی اور رات کی آمد میں بہ مشکل چند منٹ باقی تھے۔

ولیم میکلن کو اندھیرے کا انتظار تھا۔ وہ اپنا بہترین کام اندھیرے میں ہی کیا کرتا تھا۔

وہ سرخ رنگ کی مسٹنگ کوپے سیون الیون کے سامنے ڈبل پارکنگ میں کھڑی تھی۔ جو عورت اس کار سے اتر کر اسٹور میں گئی تھی اس کی عمر تیس پینتیس کے درمیان تھی اور اس کے سیاہ بال خوب صورتی سے تراشے ہوئے تھے۔

ولیم نے اس عورت کے اسٹور میں داخل ہوتے وقت اس کے خدوخال کا بہ خوبی جائزہ لے لیا تھا۔ اس عورت نے گہرے رنگ کا ایک سیاہ اسکرٹ پہنا ہوا تھا اور اسکرٹ کے نیچے اس کی خوب صورت پنڈلیاں اس کے پرکشش جسم کی گواہی دے رہی تھیں۔

ولیم کو اپنے کام کے لحاظ سے وہ ایک پرفیکٹ عورت دکھائی دی تھی۔ جبھی تو اس نے اس کا انتخاب کرلیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ دیر بعد وہ عورت سگریٹ کا ایک پیکٹ ہاتھ میں دبائے اسٹور سے باہر نکلی۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ ولیم کی بی ایم ڈبلیو فائیو فور زیرو کار پر ڈالی۔ ولیم کو اس کی آنکھوں میں ایک آرزومندانہ چمک دکھائی دی جو وہ اس سے پہلے بھی کئی عورتوں کی نگاہوں میں دیکھ چکا تھا۔ ولیم کو علم تھا کہ اس عورت نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا ہوگا کیونکہ اس کی کار کے شیشے ایسی رنگت کے تھے جن کے پار باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا اور نہ ہی اس عورت کو یہ احساس ہوا ہوگا کہ ولیم اسے اپنے کام کے لیے منتخب کر چکا ہے۔

وہ عورت اپنی میسٹنگ کار میں سوار ہوگئی۔ کار کا انجن جاگا اور کار آگے بڑھ کر ٹریفک کے ریلے میں شامل ہوگئی۔

ولیم نے چند لمحوں کے انتظار کے بعد اپنی بی ایم ڈبلیو بھی آگے بڑھا دی۔ اس نے اس عورت کی میسٹنگ اور اپنی بی ایم ڈبلیو کے درمیان چند کاروں کا فاصلہ رکھا ہوا تھا۔

تعاقب کرنا ولیم کا خاص امتیاز بن چکا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر جمی ہوئی اس کی انگلیاں اب ہلکی ہلکی پسیجنے لگی تھیں۔ تعاقب کا احساس ہمیشہ اس کے جسم میں سنسنی سی پھیلا دیتا تھا۔ یہ امکان کہ شاید اس عورت کو احساس ہوجائے کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے یا اس کے گھورے جانے کے بعد کوئی اور بدترین واقعہ پیش آجائے لیکن کچھ بھی ہو، تعاقب کرنے میں اسے ایک لطف محسوس ہوتا تھا پھر اسے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ اگر وہ کسی کا تعاقب کرتا بھی تھا تو اس میں کیا حرج تھا؟ وہ کوئی غلط کام تو نہیں کرتا تھا کہ اس کی پکڑ ہوسکتی۔ اس کے علاوہ، وہ اپنی ذاتی کمپیوٹر فرم کا پریذیڈنٹ تھا۔ اس اعلیٰ عہدے کی بنا پر پولیس اس سے الجھنے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی۔

اتنے میں میسٹنگ کار ساؤتھ ایسٹ ایکسپریس وے میں داخل ہوگئی پھر اس عورت نے اپنی کار پاسنگ لین میں رکھتے ہوئے اس کی رفتار ستر کلومیٹر سے آگے بڑھا دی۔ سڑک کے دونوں جانب موجود درخت ایک زناٹے کے ساتھ گزرتے جارہے تھے۔

ولیم نے بھی اپنی کار کے ایکسی لیریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ اسے اب لطف آرہا تھا۔ وہ عورت اسے اچھی لگی تھی۔ اپنی اس حرکت سے وہ دیوانہ وار اور پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

ولیم نے اپنی کار کے سی ڈی پلیئر کا بٹن دبا دیا۔ کار کے اسپیکرز شوپین کی موسیقی بکھیرنے لگے۔ ولیم بھی ساتھ گنگنانے لگا۔

اس نے اب بھی اس عورت کی مسٹنگ اور اپنی بی ایم ڈبلیو کے درمیان چند کاروں کا فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ ایکسپریس وے پر گاڑیاں سبک رفتاری سے دوڑ رہی تھیں۔ ولیم بھی اپنی ڈرائیونگ نشست پر اطمینان سے براجمان تھا پھر اس کا ذہن اس کی بے ترتیب زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔

اپنی سابقہ بیوی کیرولین سے اس کی ملاقات میوزیم آف فائن آرٹس میں ہوئی تھی۔ یہ ملاقات قطعی اتفاقیہ تھی۔ انہوں نے شادی تو کرلی تھی لیکن ان کی دس سالہ ازدواجی زندگی بے جا آزمائشوں کا شکار رہی تھی پھر جب نو ماہ قبل کیرولین اسے چھوڑ کر گئی تھی تو ان کے آٹھ سالہ بیٹے شون کو بھی اپنے ہمراہ لے گئی تھی۔ ولیم کو بیٹے کی جدائی کا بے حد صدمہ ہوا تھا۔

کیرولین کا کہنا تھا کہ ولیم نے اپنی فیملی کو نظرانداز کر رکھا تھا اور اپنا بیشتر وقت اپنے کام میں صرف کرتا تھا اور اپنی فیملی کے ساتھ اس کا رویہ بھی عجیب سا تھا۔ کیرولین کا یہ بھی کہنا تھا کہ شون کو ایک حقیقی باپ کی ضرورت ہے اور ولیم اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔

کیرولین نے یہ بات بھی بڑے وثوق سے کہی تھی کہ ایک ماں اپنے بچے کی بھلائی کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کرے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ بچے کی تحویل کے مقدمے کے موقع پر وہ دیکھ لے گی کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو دوبارہ اپنے کنٹرول میں لینے کے لیے کیا کرتا ہے۔

ولیم کی نگاہیں بہ دستور آگے جانے والی مسٹنگ کار پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا یہ کیرولین تھی جس نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا؟ کیا وہ سب کچھ اس لیے کررہا ہے کہ کیرولین اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور وہ اس سے اس بات کا بدلہ لینے کی کوشش کررہا ہے؟

اس نے پہلی بار کسی عورت کو کیرولین کے چھوڑ کر چلے جانے کے بعد اپنا ٹارگٹ بنایا تھا۔ وہ اپنی فیملی کے بغیر پریشان تھا اور بوریت محسوس کررہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ بے ٹھکانے ہوگیا ہو۔ اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہی دفتری کام جسے وہ بڑی تندہی سے کیا کرتا تھا اب اس کے لیے تھکا دینے والی روٹین بن گئے تھے۔ پہلے ہر کام اس کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب اسے کسی کام میں چیلنج دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اس نے اس پہلی عورت کا انتخاب اور تعاقب بغیر سوچے سمجھے کیا تھا اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا مگر یہ تعاقب کتنا فرحت بخش ثابت ہوا تھا۔

پھر ہفتے گزرتے رہے اور اس کے تعاقب کی عادت میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ تعاقب ایک معمول کی شکل اختیار کرگیا۔

وہی پک اپ کا مقام، ہمیشہ جگمگاتی کار والی دلکش عورت......

اس لگن نے اس کی زندگی میں ایک ناقابلِ یقین ہلچل مچا دی تھی اور زندگی کو ایک نئے معنی عطا کردیے تھے۔ اب وہ اس سلسلے کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جب اس کا بیٹا شون اس کی تحویل میں آجائے گا تو اس کی زندگی کا ایک نیا مقصد سامنے ہوگا لیکن اس وقت تک اسے اپنی توجہ بٹائے رکھنے کی ضرورت تھی اور اسی بنا پر وہ حسین اور جگمگاتی کاروں والی عورتوں کا تعاقب کرتا تھا۔

وہ روٹ تھری پر مسٹنگ کار سے متعدد کاروں کے فاصلے پر تھا جب اس نے مسٹنگ کے انڈیکیٹر کو جلتے بجھتے دیکھا جو مارش فیلڈ کے علاقے میں داخل ہونے کے لیے اشارہ دے رہی تھی پھر مسٹنگ کار ایکسپریس وے سے ایگزٹ کے راستے مارش فیلڈ جانے والی سڑک پر گھوم گئی۔

اب اس کا ذہن مسٹنگ میں سوار اس دلکش عورت کے بارے میں سوچنے لگا جیسا کہ وہ ہمیشہ تعاقب کیے جانے والی عورت کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ اس عورت کے بالوں کی تراش اور نفاست سے سلا ہوا لباس اس بات کی غمازی کررہا تھا کہ وہ ایک بزنس ویمن ہے اور غالباً اکاؤنٹنٹ ہے۔ اس نے تصور میں اس عورت کو اپنے کمپیوٹر پر کام میں مصروف دیکھا جہاں وہ اپنے اکاؤنٹس کے اعداد و شمار بیلنس کررہی تھی اور اسے یہ احساس تک نہیں تھا کہ اس شب بوسٹن کی تمام عورتوں میں سے اس کا انتخاب کیا جاچکا ہے۔ آج کی شب وہ ایک اسپیشل عورت کا درجہ رکھتی تھی۔

اس تعاقب کا پیچیدہ مرحلہ اب شروع ہونے والا تھا۔ وہ مسٹنگ جن سڑکوں پر دوڑ رہی تھی وہاں ٹریفک بھی کم تھا پھر جلد ہی وہ کار اپنے علاقے میں داخل ہوگئی۔ ولیم کو اس بات پر فخر محسوس ہورہا تھا کہ اس نے اس عورت کو اپنے تعاقب کا قطعی علم نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ گرگٹ کے مانند تھا اور موقع کی مناسبت سے خوب گھل مل جاتا تھا۔

اتنے میں مسٹنگ کی رفتار کم ہوگئی اور وہ دورویہ درختوں کی قطار والی ایک سڑک پر گھوم گئی۔ وہاں نئی طرز کے بڑے بڑے بنگلے بنے ہوئے تھے جن کے صحن کشادہ اور لان وسیع و عریض تھے جن میں جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں۔

تقریباً نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ مسٹنگ کار ایک ایسے عظیم الشان بنگلے کے ڈرائیو وے میں داخل ہوگئی جس کی ہر کھڑکی سے روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔

ولیم نے اپنی بی ایم ڈبلیو اس بنگلے سے قدرے فاصلے پر روک دی۔ وہ عورت اپنی مسٹنگ سے اتر کر داخلی دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ کار میں بیٹھے ہوئے ولیم کی نگاہیں اسی عورت پر جمی ہوئی تھیں جبکہ اس عورت نے ایک بار بھی پلٹ کر اس کار کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔

ولیم کی مایوسی کا آغاز ہوچکا تھا۔ کیونکہ اب وہ مقام آگیا تھا جب سنسنی سے بھرپور اس حقیقی کھیل کا اختتام ہونے والا تھا۔ وہ کبھی اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ تعاقب کی شادمانی اور جاگتی آنکھوں کا خواب ہی اس کے لیے کافی تھے۔

وہ جانتا تھا کہ چند منٹ بعد وہ اپنی بی ایم ڈبلیو ڈرائیو کرتا ہوا اپنے خالی اپارٹمنٹ کی جانب واپس روانہ ہوجائے گا اور مسٹنگ کار والی اس عورت کے بارے میں سوچتا رہے گا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی رات وہ یہ دیکھنے کے لیے اس عورت کے بنگلے پر واپس آجائے کہ وہ کس حال میں ہے۔

اتنے میں بنگلے کا داخلی دروازہ کھل گیا۔ وہ عورت اس وقت تک دروازے کی سب سے اوپری سیڑھی پر پہنچ چکی تھی۔ دروازہ ایک تنومند شخص نے کھولا تھا جس کے بال سیاہ اور تراش فوجی کٹ تھی۔ بنگلے کے داخلی دروازے کی روشنی میں وہ دونوں ولیم کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔

اس شخص نے اس عورت کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے اونچی آواز میں کچھ بولنا شروع کیا پھر اس شخص نے اس عورت کو ایک تھپڑ رسید کردیا، پھر دوسرا پھر تیسرا۔ عورت کا سر پیچھے کو گھوم گیا۔ اس شخص نے عورت کے بالوں کو اپنے ہاتھ میں جکڑا اور اسے کھینچتا ہوا بنگلے کے اندر لے گیا۔ ساتھ ہی دروازہ بھی زوردار آواز کے ساتھ بند کردیا۔

ولیم نے اپنی کار کی کھڑکی تھوڑی سی نیچے گرا دی اور اپنے کان بنگلے کی طرف لگا دیے۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ایک تیز چیخ سنائی دی۔

ولیم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بنگلے کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کا اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنے گھر واپس چلا جائے اور اس معاملے کو فراموش کردے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اس کا عورت کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آنا سرسری ہرگز نہیں ہوسکتا۔ شاید زندگی یونہی الل ٹپ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قدرت اسے اس عورت کی زندگی بچانے کے لیے یہاں تک لائی ہو۔

اسی اضطرابی کیفیت نے اسے کار سے باہر آنے پر مجبور کردیا پھر وہ اس بنگلے کے ڈرائیو وے کی جانب دوڑ پڑا۔ بنگلے کے سامنے حصے پر بنی ہوئی کھڑکیوں کو جھاڑیوں نے ڈھانپا ہوا تھا۔ لہٰذا وہ گھوم کر بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

گیا۔ اتنے میں اندر سے ایک اور چیخ کی آواز ابھری پھر خاموشی چھا گئی۔

ولیم وہیں دبک گیا اور بنگلے کے عقبی حصے کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ اسے عقبی کھڑکی سے لیونگ روم کا اندرونی منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھتا ہوا کھڑکی کے قریب ایک جھاڑی کی آڑ میں جا پہنچا۔ اس نے جھاڑی کی اوٹ سے لیونگ روم میں جھانکا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور ذہن میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

وہ عورت قالین پر ہاتھ پیر پھیلائے پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں ایک عجیب زاویے پر مڑی ہوئی تھیں۔ اس کا اسکرٹ سمٹ کر اس کی کمر پر آیا ہوا تھا۔ اس عورت کی پیشانی پر ایک زخم کا نشان تھا جس سے خون ابل رہا تھا۔

ولیم کو یہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ عورت زندہ ہے یا نہیں کیونکہ اس کے سینے کا زیرو بم واضح نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ تنومند شخص کہاں ہے؟ ولیم سوچ میں پڑ گیا۔

تب وہ شخص کمرے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے فرش پر سے ایک بڑی سی چادر گھسیٹی اور اسے عورت کے قریب قالین پر پھیلا دیا پھر اس عورت کو کروٹ دلا کر اس چادر میں لپیٹ دیا اور اس کا پورا جسم چادر سے ڈھانپ دیا بالکل اسی طرح جیسے کسی لاش کو کفنایا جاتا ہے۔

پھر وہ شخص سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کا جسم تن گیا جیسے اسے یہ احساس ہو گیا ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

ولیم پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دروازہ توڑ کر کمرے میں گھس جائے اور اس شخص سے اس عورت پر زیادتی کا بدلہ لے لیکن اس کے ذہن نے اسے اس حرکت سے باز رکھا اور کہا کہ وہ مدد طلب کرے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس عورت کا قاتل بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے پھر سوچے سمجھے بغیر وہ اپنی کار کی جانب دوڑ پڑا۔ اس نے اپنے سیل فون پر نائن ون ون کا نمبر ڈائل کیا اور صورت حال بتا دی۔

”مدد راستے میں ہے۔“ وہاں سے جواب دیا گیا۔

ولیم کی نگاہیں مستقل اس بنگلے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اب یہاں سے نکل پڑے۔ اس لیے کہ وہ پولیس کو یہاں پر اپنی موجودگی کے بارے میں کیا وضاحت بیان کرے گا؟ وہ اپنی کار کے فینڈر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بدن پسینے سے بھیگ رہا تھا اور قمیص تر ہو چکی تھی۔

وہ اس قتل کا واحد گواہ تھا اور کسی طور پر نہیں چاہتا تھا کہ وہ شخص بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ اسے رکنا ہوگا اور اسے یہ چانس لینا ہوگا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ مشکل صورت حال سے خود کو نکالنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس مرتبہ بھی وہ اس صورت حال سے نمٹ لے گا لیکن اس قاتل کو بچ نکلنے کا موقع ہرگز نہیں دے گا۔

چند منٹ بعد تین پولیس کاریں اپنی فلیش کرتی ہوئی لائٹوں کے ساتھ تیزی سے اس سڑک پر آتی ہوئی دکھائی دیں اور اس بنگلے کے سامنے پہنچ کر ان کے پہیے چرچرائے اور وہ رک گئیں۔

”وہاں اندر، جلدی کرو۔“ ولیم نے کار سے اترنے والے پولیس والوں کو اشارے سے بتاتے ہوئے کہا۔

دو پولیس مین بنگلے کے عقبی حصے کی جانب چلے گئے جبکہ دو بنگلے کے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک دراز قامت جوان کا افسر لگ رہا تھا، ٹہلتا ہوا ولیم کے پاس آگیا۔

”اس نے عورت پر وار کیا۔“ ولیم نے اس افسر کو بتایا۔ ”اس عورت کی پیشانی سے خون ابل رہا تھا۔ اس نے عورت کو ایک چادر میں لپیٹ دیا ہے۔“

پولیس افسر نے ایک اچٹتی نگاہ بنگلے کی طرف ڈالی۔ بنگلے کا داخلی دروازہ کھلا اور وہی تنومند شخص باہر نکلا۔ اس نے پولیس والوں سے کچھ بات کی اور پھر وہ تینوں اندر چلے گئے۔

ولیم نے یہ دیکھ کر اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے پولیس کی مدد طلب کر کے بالکل صحیح قدم اٹھایا تھا۔

پولیس افسر اب دوبارہ ولیم کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”تم نے یہ سب کچھ یہیں سے کھڑے کھڑے دیکھ لیا؟“

”نہیں، نہیں۔ اس شخص نے اس عورت پر داخلی دروازے کی سیڑھی پر وار کیا تھا لیکن اس عورت کو چادر میں لپیٹتے ہوئے میں نے بنگلے کی عقبی کھڑکی سے دیکھا تھا۔“

”عقبی کھڑکی؟ بہتر ہوگا کہ تم سب کچھ ابتدا سے بتانا شروع کرو، دوست۔“ پولیس افسر نے کہا۔

”میں یہاں سے ڈرائیو کرتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ واقعہ دیکھا تو مدد طلب کر لی۔“

”ایک اچھے شہری کے مانند، ایں......؟ کیا تم اسی علاقے میں رہتے ہو؟“ دراز قامت نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ولیم نے قدرے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ اسے علم تھا کہ کسی نہ کسی طور اسے سچ اگلنا پڑے گا۔ ”میرا تعلق بوسٹن سے ہے۔“

یہ سن کر پولیس افسر کی بھویں تن گئیں۔ ”کیا تم اپنے گھر سے خاصے فاصلے پر نہیں نکل آئے ہو؟ تم اس علاقے میں کیا کر رہے تھے؟“

”میں بس یونہی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ بعض اوقات میں لمبی ڈرائیو پر نکل جاتا ہوں۔ اس سے مجھے ذہنی سکون ملتا ہے۔“

اس بات پر پولیس افسر نے ایک لمحے کے لیے اس پر نظریں جما دیں پھر بولا۔ ”یہیں انتظار کرو۔“ یہ کہہ کر وہ بنگلے کی طرف چل دیا۔

اتنے میں بنگلے کا داخلی دروازہ کھلا اور وہی تنومند شخص پولیس والوں کے پیچھے چلتا ہوا پورچ میں آگیا۔ ولیم کی نگاہیں اس شخص کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تلاش کر رہی تھیں جو اسے کہیں دکھائی نہیں دیں۔ اسی اثنا میں بنگلے کے داخلی دروازے سے کوئی باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا، اس پر نگاہ پڑتے ہی ولیم کا دماغ گھوم گیا۔

یہ وہی عورت تھی جس کا تعاقب کرتا ہوا وہ اس بنگلے تک آیا تھا اور جسے چند منٹ قبل اس نے مردہ حالت میں دیکھا تھا۔

وہ سیاہ بالوں والی عورت پولیس افسر سے کچھ بات کرنے لگی پھر اس عورت نے ولیم کی جانب اشارہ کیا۔

ولیم زخم یا خون کے نشانات دیکھنے کے لیے غور سے اس عورت کا جائزہ لینے لگا۔ فاصلہ ہونے کی بنا پر اسے کچھ واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ ایک حقیقت تھی۔

وہ پولیس مین چند منٹ تک آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے پھر وہ دراز قامت تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ولیم کے پاس آگیا۔

”سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کس قسم کا گیم کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہاں پر نہ تو کوئی لاش ہے نہ کسی کے سر پر زخم کا نشان اور نہ ہی کوئی خون آلود چادر ہے۔“ یہ کہتے ہوئے دراز قامت پولیس افسر نے اپنے انگوٹھے سے پورچ میں کھڑی ہوئی عورت کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ”مسز ایلٹن کے مطابق تم نے بوسٹن سے یہاں تک ان کا پیچھا کیا ہے پھر تم یہاں رک گئے اور ان کے بنگلے کی نگرانی کرتے رہے۔ وہ مدد کے لیے ہمیں فون کرنے جا رہی تھیں کہ اتنے میں ہم یہاں پہنچ گئے۔ وہ تمہارے خلاف پیچھا کرنے اور پیچھے پڑ کر عاجز کرنے کے الزامات عائد کرنا چاہتی ہیں۔ ہم تمہیں پولیس اسٹیشن لے جا رہے ہیں۔ تمہیں وہاں پہنچ کر بہت سی باتوں کی وضاحت کرنا ہوگی۔“

☆☆☆

دو ہفتے کے بعد بچے کی تحویل کے مقدمے کی سماعت کے موقع پر ولیم، کیرولین کے وکیل کو ڈرامائی انداز میں گرجتے اور جج کو اپنے دلائل سے قائل کرتے ہوئے سن رہا تھا۔

وکیل کہہ رہا تھا کہ ”ولیم ایک اسٹاکر ہے جو اپنی کار میں عورتوں کا پیچھا کرنے کا عادی ہے۔ وہ شدید مغالطے میں مبتلا اور واہمے کا شکار رہتا ہے۔ اسے وہ چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوتیں۔ وہ بہ طور ایک باپ کسی طور پر بھی اپنی ذمے داریاں نبھا نہیں سکتا۔“

جب کیرولین کے وکیل نے اپنی ڈرامائی تقریر ختم کی تو ولیم خود اپنی صحیح الدماغی کے بارے میں شک میں پڑ گیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اپنے بیٹے شون کو اپنی تحویل میں لینے کا اب اس کے پاس کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے قانون کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔

وہ جب عدالت سے باہر آیا تو اس نے کیرولین کو فٹ پاتھ کے کنارے کسی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ کیرولین نے اپنے پرس میں سے ایک لفافہ نکال کر اس عورت کے حوالے کر دیا جس سے وہ باتیں کر رہی تھی۔

تب ولیم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ مسٹینگ کار والی وہی عورت تھی جس کا ولیم نے اس کے بنگلے تک تعاقب کیا تھا اور پھر اس عورت نے وہاں اپنی لاش کا ڈراما رچایا تھا۔

عورت نے کیرولین کا دیا ہوا لفافہ اپنی جیکٹ میں رکھ لیا اور وہاں سے چل دی۔ کیرولین نے ایک اچٹتی نگاہ ولیم پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

تب ایک لمحے میں سارا معاملہ ولیم کی سمجھ میں آگیا۔ کیرولین نے اسے اپنے جال میں پھانسا تھا۔ اس نے ولیم کا پیچھا کرنے کے لیے کسی کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس نے پیچھا کرنے والے کا تعاقب کروا کے اسے اپنے ہی کھیل سے مات دے دی تھی۔ کیرولین اس سے کہیں زیادہ اسمارٹ اور ہوشیار ثابت ہوئی تھی۔ اس لیے کہ وہ کسی طور پر کیرولین کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

تب کیرولین کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے جو اس نے بڑے وثوق سے کہے تھے۔ ”ایک ماں اپنے بچے کی بھلائی کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کرے گی۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

يوم آزادی کے موقع پر سطر سطر دل میں کسک بن کر اتر جانے والی داستان

بازگشت

کاشف زبیر

دنیا میں قربانی کا مفہوم بہت عجیب و غریب ہے... کوئی جان کی بازی ہار دیتا ہے تو کوئی خوشیوں سے دامن بھرتا ہے۔ گویا کسی کا مٹنا کسی کا بن جانا یہی قربانی کا عمل کہلاتا ہے... مگر کتنی دیر تک یہ تاثر قائم رہتا ہے، بُھلانے والے پل میں بھول جاتے ہیں کہ کس نے ہمیں کتنا چاہا... ہماری خاطر کتنی مشکلات کو سر کیا اور کون جینے کی خواہش میں زندگی ہار گیا... بالکل ایسے جیسے 1947ء میں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے موقع پر ظلمتوں کی کالی چادر میں وحشتوں نے ایک خونیں کھیل کھیلا اور جب چہروں سے نقاب اترے تو رقابتوں کی آگ نے ہر رشتے، ناتے کو جلا کر خاکستر کر ڈالا... محبت سے ایک تھالی میں ساتھ کھانے والے نفرتوں سے ذات پوچھ رہے تھے۔ جن گودوں میں بچپن گزرا وہی دامن شعلے اگل رہے تھے... پناہ کی تلاش میں کتنے ہی بے آسرا بند گلیوں میں بھٹکتے رہ گئے... موت گلی گلی اپنا شکار ڈھونڈتی پھر رہی تھی... لہولہان جسم ایک آس، ایک سائبان کی امید میں اجنبی منزلوں کی تلاش میں محو سفر تھے۔ پیروں میں دم نہیں، گردن میں خم نہیں مگر جوش اور ولولہ تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور پھر بالآخر 14 اگست کا یادگار سورج طلوع ہوا جب زمین کے ایک ٹکڑے کو پاکستان کا نام دیا گیا... اور آج اس قربانی کا ادراک ہر حساس دل اور گہری نگاہ کو یہ خوبی ہو سکتا ہے کہ کس پر کیا گزر گئی اور کس نے ہنس کر ٹال دیا مگر... بے حسی تو آج بھی جگہ جگہ بصد شوق مہمان ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہت دبلی پتلی عورت دریا کے کنارے پشتے پر ٹاہلی کے ایک گھنے درخت تلے کھڑی تھی جس کی عمر ستر برس تھی۔ جوانی میں کھلتی رنگت اب سانولی ہوگئی تھی۔ چست کھال پر کہیں کہیں جھریاں تھیں۔ سر کے تمام بال سفید ہوگئے تھے لیکن چوٹی اب بھی گھنی تھی جو ساڑی کے پلو کے ساتھ پشت پر جھول رہی تھی۔ اس عمر میں بھی اس نے زرد رنگ کی بنارسی ساڑی پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر بندیا اور ہونٹوں پر ہلکی سی سرخی چمک رہی تھی۔ عمر نے اسے کمزور نہیں کیا تھا، وہ آج بھی بغیر کسی سہارے کے سیدھی کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ کی جگہ چمک اور تیزی تھی۔ پیروں میں نازک لیکن قیمتی سلیپرز تھے اور ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں بھری تھیں۔ گلے میں سونے کا ہار اور کانوں میں سونے کے بھاری آویزے تھے۔ ناک کی لونگ میں چمکتا ہوا ہیرا جڑا تھا۔ اپنے پروقار لباس، زیورات اور انداز سے وہ اوپری طبقے کی عورت دکھائی دے رہی تھی۔

عورت سے کچھ پیچھے ایک سانولی رنگت اور کسی قدر دراز قامت نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے سر کے بال لمبے اس کے شانوں تک آرہے تھے۔ کئی دن کی بڑھی شیو اور ہونٹوں پر مونچھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی عمر چوبیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اپنی گہری سیاہ آنکھوں اور چہرے کے کھردرے تاثرات کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربے کار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آزاد منش اور کسی کی پروا نہ کرنے والا لگتا تھا مگر اس عورت کے پیچھے ادب سے کھڑا تھا۔ عورت بہت دیر سے ساکت کھڑی سامنے دریا کے پار دیکھ رہی تھی۔ بارشوں کا موسم ہونے کے باوجود دریا میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ دریا کا پاٹ ایک کلومیٹر سے زیادہ چوڑا تھا لیکن پانی درمیان میں بہ مشکل چار سو گز چوڑی پٹی میں بہہ رہا تھا۔

حالانکہ یہ مون سون کا موسم تھا اور اگست کا تیسرا ہفتہ تھا۔ کبھی یہی دریا مون سون میں ہر سال کناروں سے ابل پڑتا تھا اور آج بہ مشکل بہہ رہا تھا۔ مشرق سے ابھرنے والا سورج اب خاصا بلند ہوگیا تھا اور اس کی روشنی میں مغرب کا علاقہ دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ حبس مزید شدت اختیار کر گیا تھا۔ درختوں تلے گرمی قابل برداشت تھی اور کبھی کبھی دریا کی طرف سے ہوا کا کوئی جھونکا آتا تو حبس کی شدت بھی دم بھر کے لیے گھٹ جاتی تھی۔ اچانک عورت نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ ”راج تو سوچتا ہوگا کہ میں ہر سال یہاں کیوں آتی ہوں؟“

”ہاں دادی ماں۔“ نوجوان نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں تم اتنا لمبا سفر کر کے یہاں کیوں آتی ہو......؟ میں نے جب تم سے پوچھا تم نے ٹال دیا۔ اس بار تو تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”اسی لیے آج میں تجھے یہاں لائی ہوں اور تجھے بتاؤں گی کہ میں یہاں کیوں آتی ہوں۔“ بوڑھی عورت نے گہری سانس لی۔ ”مجھے لگ رہا ہے میرا وقت قریب ہے اور میں شاید اگلے سال یہاں نہ آسکوں اس لیے میں دل کا بوجھ ہلکا کرکے جانا چاہتی ہوں۔“

نوجوان گھبرا گیا۔ ”ایسی باتیں نہ کرو، تم جانتی ہو اس دنیا میں میرا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔“

عورت مسکرائی۔ ”اچھا نہیں کرتی لیکن تو میری کہانی تو سنے گا نا؟“

☆☆☆

دونوں کم عمر بچیاں تھیں۔ مشکل سے تین سال کی ہوں گی۔ دو بڑی حویلیوں کے سامنے میدان میں پھیلے برگد کے بوڑھے اور بے شمار تنوں اور جڑوں والے درخت تلے وہ دونوں بجی سنوری گڑیا سی لگ رہی تھیں۔ ایک سرخ و سفید تھی اور دوسری کی رنگت میں ملاحت غالب تھی لیکن دونوں ہی بہت پیاری اور جاذب نظر نقوش والی تھیں۔ ایک بچی نے کہا۔

”میری سکھی بنوگی......؟ میرا نام سرینا سورج ہے۔“

”ہاں بنوں گی۔“ دوسری نے معصومیت سے سر ہلایا۔ ”میں سارہ خان ہوں۔“

سرینا کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ ”ہمیشہ کے لیے نا؟“

”ہاں ہمیشہ کے لیے۔“ سارہ نے یقین سے کہا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے گرم جوشی سے تھام لیا۔

جب ان کی دوستی پروان چڑھ رہی تھی تو برصغیر میں انگریز راج جنگ عظیم کے بوجھ تلے لڑکھڑا رہا تھا۔ برطانیہ سے سوگنا بڑے رقبے پر دو صدی تک حکومت کرنے کے بعد بالآخر گوروں کے لیے وہ وقت آگیا تھا جب انہیں رخت سفر باندھنا تھا۔ انگریزوں کی روایت رہی ہے جب وہ اپنی کسی کالونی سے رخصت ہوتے ہیں تو وہاں اختلاف اور فساد کے ایسے بیج بو جاتے ہیں جو آنے والے سالوں میں وہاں جنگوں اور بربادی کی فصل دیتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی انہوں نے برصغیر میں بھی کیا تھا۔ اختلافات کی کمی نہیں تھی۔ ہندو اور مسلمان دو متضاد قومیں تھیں۔ گویا ایک کا ہیرو، دوسرے کا ولن تھا۔ ایک قوم کا فرد دوسرے کو چھولے تو وہ ناپاک ہوجاتا تھا اور وہ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتے تھے۔ ایسے لوگوں کو لڑانا بہت آسان تھا بس جس میں

چنگاری ڈالنے والوں کی ضرورت تھی تو اس کی بھی کمی نہیں تھی۔

انگریز کو اپنے بعد جنگیں چھوڑ کر جانے کا ایسا سنہری موقع دنیا کے اور کسی خطے میں نہیں ملا تھا۔ اس کے ایجنٹوں نے ان اختلافات کو اتنا بڑھا دیا کہ اب دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے کو تیار نہیں تھیں۔ جب انگریز لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی استعمال کر رہا تھا، اس وقت برصغیر کے مغرب میں سوویت یونین کا ظہور ہو رہا تھا اور جب وہ خطرہ بن کر سامنے آیا تو انگریز نے پالیسی بدلنا چاہی، اب وہ متحدہ ہندوستان چھوڑ کر جانا چاہتا تھا تاکہ روسی ریچھ کو گرم پانیوں تک پہنچنے سے روکا جائے مگر اختلافات اتنے بڑھ چکے تھے کہ دونوں قومیں ساتھ رہنے پر بالکل راضی نہیں تھیں۔ ہندو مکمل اقتدار چاہتا تھا اور مسلمان اسے اپنے لیے موت سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ ان دونوں اقوام کو ایسے چھوڑ کر جانے کا مطلب تھا کہ یہ خطہ بڑی خانہ جنگی کا شکار ہوجائے اور روس کو یہاں آنے کا معقول بہانہ مل جائے۔ انگریز مجبوراً تقسیم پر راضی ہوا لیکن وہ تقسیم کے ایجنڈے کو اپنی مرضی سے مسلط کرنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ملکوں کی سرحد کو خونی لکیر بنانا چاہتا تھا اور اس لیے اس لکیر کو اپنی مرضی سے تشکیل دے رہا تھا۔ عالمی سیاست کے بازی گروں کو اس کی کوئی فکر نہیں تھی کہ ان کے فیصلے کتنے ہی لوگوں کو ہمیشہ کے لیے بچھڑنے پر مجبور کردیں گے۔ کتنا خون بہے گا اور کتنی نفرتیں پروان چڑھیں گی۔

ضلع گورداسپور کے قصبے دینا نگر سے کوئی پندرہ کلومیٹر مغرب میں ایک چھوٹا سا گاؤں بیا پور تھا۔ اس کی آبادی مشکل سے ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور ان میں سے بیشتر لوگ دو جاگیرداروں لالہ کشن مل سورج اور دلاور خان کے ملازم تھے۔ ان دونوں کی زمین دو آبے کے درمیان دور تک پھیلی تھی۔ اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ کچھ گھرانے سکھوں کے تھے اور ہندو بس چند ایک ہی تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں اپنی خدمات کے صلے میں لالہ کشن مل کو یہ زمین ملی تھی۔ دلاور خان کا خاندان کئی نسلوں سے یہاں آباد تھا۔ زمین بھی جدی پشتی چلی آرہی تھی۔ خوش قسمتی سے اس خاندان میں سمجھدار لوگ جاگیر کے سربراہ بنتے رہے تھے جنہوں نے دوسرے مسلمان جاگیرداروں کی طرح زمین اور دولت کو فضول کی نمائش یا عیاشیوں میں نہیں اڑایا تھا۔ دونوں گھرانوں میں مذہب کے فرق کے باوجود اچھے تعلقات تھے۔

لالہ کشن مل سورج کے والد رل مل سورج تو چھوت چھات کا خیال رکھتے تھے لیکن لالہ کشن مل نے یہ دیوار بھی گرادی تھی۔ وہ ذات کے کائستھ برہمن تھے۔ جن کے رسم و رواج، لباس اور زبان مسلمانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ لالہ کشن مل سورج کے گھر میں بھی اردو بولی جاتی تھی۔ وہ خود اردو اور فارسی زبان سے واقف تھے۔ حویلی کا ایک بڑا کمرا صرف کتابوں کے لیے مخصوص تھا۔ مرد کرتہ پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے جبکہ ان کی عورتیں غرارہ اور شلوار سوٹ پہنتی تھیں۔ اگر ساڑی پہنتیں تو وہ بھی مسلم عورتوں کی طرح۔ لالہ کشن مل نے چھوت چھات کی دیوار گرائی تو دونوں گھرانوں میں آنا جانا اور میل جول شروع ہوا۔ لالہ کشن مل کی دو اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا مہیش سورج اور بیٹی سرینا سورج۔

دلاور خان کی حویلی کا ماحول خالص پٹھان مسلم گھرانے کا تھا۔ عورتیں سخت پردہ کرتی تھیں اور حویلی میں زنان خانہ بالکل الگ تھا۔ عورتیں گھر سے باہر جاتیں تب بھی سخت پردے میں جاتی تھیں۔ سفر کے دوران تانگے یا گاڑی پر چادریں ہوتی تھیں۔ وہ رامپوری پٹھان تھے اپنے رسم و رواج میں نہایت کٹر تھے۔ بہنوں کو حویلی کے کھلے صحن میں بلا اجازت آنا منع تھا کہ کہیں کوئی مرد نوکر نہ دیکھ لے۔ بیوی کا یہ حال تھا کہ اس اللہ کی بندی نے شادی کے بعد کہیں دور جانے کے لیے کل چار پانچ بار حویلی سے باہر قدم رکھا تھا۔ وہ بھی سخت پردے میں اور خان صاحب کے ساتھ۔ خان صاحب کی لالہ کشن مل سے دوستی بڑھی اور گھروں میں آنا جانا بڑھا تو خانم بھی لالہ کشن مل کی بیوی سے ملنے چلی جاتی تھیں۔ اس کے لیے بھی پردے کا اہتمام ضروری تھا۔

مگر جب سارہ ہوئی تو خان صاحب تمام رسم و رواج بھول گئے۔ شادی کے پانچ برس بعد منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس بیٹی کے سامنے وہ موم کی ناک ہوگئے تھے۔ کہاں تو اس خاندان کی بچیاں سات آٹھ سال کی عمر سے پردے میں بٹھادی جاتی تھیں اور کہاں سارہ دس سال کی ہوکر بھی صرف دوپٹے میں آزادی سے گھومتی تھی اور دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتے کہ یہ دلاور خان کی بیٹی ہے لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ آنکھ سے ہی اشارہ کردیتا۔ خان صاحب سے سب ہی ڈرتے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں اس نے پڑھنے کی ضد کی تو خان صاحب نے لاہور سے ایک چھوڑ دو خواتین ٹیچرز مستقل حویلی میں بلوالیں جو یہیں رہ کر سارہ کو پڑھاتی تھیں اور وہ سال کے سال نزدیکی اسکول کے امتحان میں شرکت کرکے سند حاصل کرلیتی تھی۔

سرینا کے ساتھ پردے کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ لالہ کشن مل چھوت چھات کے ساتھ عورتوں پر پابندی کے قائل بھی نہیں تھے۔ انہوں نے کم عمری سے سرینا کو نزدیکی اسکول میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

داخل کرا دیا تھا۔ اس کے لیے ایک تانگا مخصوص تھا جو اسے اسکول لے جاتا اور لے کر آتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی آیا بھی جاتی تھی اور اسکول میں موجود رہتی تھی۔ لالہ کشن مل نے خان صاحب کو بھی راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ سارہ کو اسکول میں داخل کرادیں مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہاں ان کو شاید اپنی خاندانی روایات کا خیال آ گیا ہوگا۔ صرف دوپٹے میں گاؤں اور گلیوں میں پھرنا الگ بات تھی اور اسکول جاکر تعلیم حاصل کرنا الگ۔ لالہ کشن مل نہیں جانتے تھے کہ خود سارہ نے کتنی بار مچل کر باپ سے اسکول جاکر پڑھنے کی فرمائش کی تھی اور خان صاحب ہر بار دل پر پتھر رکھ کر انکار کرتے رہے تھے۔

سارہ اور سرینا ہم عمر تھیں، دونوں میں صرف بیس دن کا فرق تھا، سرینا بیس دن بڑی تھی۔ بچپن سے دوست تھیں۔ اسکول جانے سے ایک سال پہلے کے دنوں میں یہ حال تھا کہ وہ صبح سے شام تک کا وقت ایک ساتھ ہی گزارتی تھیں۔ سارہ سرینا کے گھر ہوتی یا سرینا خان صاحب کی حویلی میں آجاتی تھی۔ دونوں امن پسند تھیں اس لیے شاذ ہی کبھی لڑائی ہوتی۔ لیکن جب لڑائی ہوتی تو دونوں کئی دن ایک دوسرے سے نہیں ملتی تھیں۔ اس معاملے میں ان کی انا اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ ملنے میں پہل کریں۔ اس لیے ان کی ماؤں کو کوشش کرنا پڑتی تھی۔ وہ بہلا پھسلا کر انہیں ایک دوسرے کے گھر لے جاتیں اور کسی بہانے سے سامنے کر دیتی تھیں۔ ایک بار سامنے ہوتیں تو بات بھی کرنی پڑ جاتی اور ذرا سی دیر میں ناراضی کی دیوار گر جاتی۔ جب سرینا نے اسکول جانا شروع کیا تو اس نے سارہ سے بہت اصرار سے کہا۔ ”سارہ تو بھی چل نا...... مجھے اکیلے اسکول جانا اچھا نہیں لگتا وہاں میری کوئی دوست نہیں ہے۔“

دل تو سارہ کا بھی بہت چاہتا تھا کہ وہ اسکول جائے۔ یہ کوئی عام اسکول نہیں تھا بلکہ انگریزوں نے علاقے کے معززین کے بچوں کے لیے قائم کیا تھا۔ یہاں جاگیردار اور دولت مند گھرانوں کے بچے پڑھنے آتے تھے۔ اسکول کا معیار بہت اچھا تھا اور یہاں ساری سہولتیں میسر تھیں زیادہ تر انگریز ٹیچرز تھیں اور دوسرا اسٹاف بھی اچھا تعلیم یافتہ تھا۔ سرینا یہ باتیں سارہ کو بتاتی تو اس کا دل بھی چاہتا کہ وہ اسکول میں پڑھے لیکن اسے معلوم تھا اس کا باپ اسے کتنا ہی کیوں نہ چاہتا ہو وہ اسے اسکول میں داخل نہیں کرائے گا۔ وہ ضد کرے تب بھی نہیں کرائے گا۔ اس نے بے دلی سے سرینا کو جواب دیا۔ ”بابا مجھے اسکول نہیں بھیجیں گے۔“

”تو خان چچا سے بات کر...... ویسے تو تیری ہر بات مان لیتے ہیں۔“

سرینا کے کئی بار مجبور کرنے پر اس نے باپ سے کہا۔ ”بابا مجھے اسکول میں داخل کرا دیں جہاں سرینا پڑھتی ہے۔“

اگر کوئی اور یہ بات کہتا تو شاید حویلی میں طوفان آجاتا لیکن سارہ خان صاحب کی لاڈلی تھی۔ اس لیے وہ نرمی سے منع کرنے پر مجبور تھے۔ ”سارہ! تو اسکول نہیں جاسکتی۔“

”پر بابا میں پڑھنا چاہتی ہوں سرینا کی طرح۔“ سارہ نے التجا کی۔ ”وہ اسکول جانے لگی ہے۔“

خان صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”وہ جائے پر تو اسکول نہیں جائے گی۔“

سارہ روہانسی ہو گئی۔ ”بابا میں اس سے پیچھے رہ جاؤں گی۔“

یہ بات خان صاحب کے دل کو لگ گئی۔ سارہ کو اسکول جانے کی اجازت تو نہیں دے سکتے تھے لیکن وہ اسے گھر میں تعلیم دلا سکتے تھے اگرچہ خاندان میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی لڑکی نے سوائے قرآن پاک کے اور کچھ پڑھا ہو۔ وہ اچانک ہی لاہور چلے گئے اور ایک ہفتے بعد واپس آئے تو ان کے ساتھ دو خواتین تھیں۔ خانم دم بہ خود رہ گئی تھیں یہ سوچ کر کہ بالآخر شادی کے پندرہ سال بعد خان صاحب نے بیک وقت دوسرا اور تیسرا عقد کر لیا تھا۔ لیکن جب انہوں نے ڈرتے ڈرتے خان صاحب سے اس بارے میں پوچھا تو وہ ہنس دیے۔ ”نیک بخت اگر میں دوسری یا تیسری شادی کروں گا تو کیا گناہ کروں گا جو یوں چھپ چھپا کر کروں گا۔ جیسے تمہیں لایا تھا ایسے ہی دوسری بھی لے آؤں گا۔“

خانم کو کسی قدر اطمینان ہوا لیکن تجسس برقرار رہا تھا۔ ”پھر یہ دونوں کلموہیاں کون ہیں؟“

”یہ سارہ کی استانیاں ہیں اور یہیں حویلی میں رہ کر اسے تعلیم دیں گی۔“

خانم کے لیے یہ ایک اور ناقابل یقین بات تھی۔ ان کی پشتوں میں کسی عورت نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور سارہ کے لیے خان صاحب ایک چھوڑ دو استانیاں لے آئے تھے۔ جس نے حیران رہ گیا لیکن خان صاحب سے کہنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ سارہ ان استانیوں سے پڑھنے لگی۔ سرینا کے اسکول کا معیار بہت اچھا تھا لیکن سارہ جن استانیوں سے پڑھ رہی تھی قابلیت کے لحاظ سے وہ اسکول ٹیچرز سے کسی طرح کم نہیں تھیں اور پھر یہاں انہیں ایک ہی بچی کو پڑھانا پڑتا تھا اس لیے سارہ نے مختصر عرصے میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ وہ صبح سے

دوپہر تک ان استانیوں سے پڑھتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرکے مقامی مسجد کے مولوی صاحب کی بیوی اسے قرآن پاک پڑھانے آتی تھیں۔ اس کے بعد کا وقت اس کا ہوتا اور یہ سارا سرینا کے لیے مخصوص تھا۔

سرینا جو کچھ اسکول میں سیکھ کر آتی تھی وہ سارہ پہلے ہی سیکھ چکی ہوتی تھی۔ وہ حیران رہ جاتی تھی۔ پھر وہ کوشش کرکے کچھ ایسا سیکھ لیتی جو سارہ کو نہیں آتا تھا مگر اگلی بار سارہ اسے پھر حیران کر دیتی تھی۔ یوں دونوں میں ایک طرح سے مقابلہ چل نکلا تھا۔ خان صاحب نے پہلے سرینا کے اسکول کی انتظامیہ سے بات کی کہ وہ سارہ کو سالانہ امتحان میں شامل کرلیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ جو بچی ان کے اسکول سے نہ پڑھی ہو وہ اسے امتحان میں شرکت کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ مجبوراً خان صاحب نے لاہور کے ایک مسلم گرلز اسکول سے سارہ کو امتحان دلوایا اور وہ پورے اسکول میں اول آئی تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ سارہ سارے سال گھر میں پڑھتی اور سال میں ایک بار لاہور جاکر امتحان دے آتی تھی۔ لاہور میں بھی خان صاحب نے کوٹھی لے رکھی تھی۔ وہ جب لاہور جاتے تو وہیں ٹھہرتے تھے۔

وقت گزرتا گیا، سرینا اور سارہ نے پانچویں کا امتحان دیا۔ سارہ حسب معمول پورے اسکول میں اول آئی تھی۔ سرینا اپنی کلاس میں پہلے نمبر پر تھی لیکن اس کے خیال میں وہ زیادہ اچھی طالبہ تھی کیونکہ اس نے اسکول سے پڑھ کر امتحان دیا تھا جبکہ سارہ کے خیال میں وہ زیادہ اچھی طالبہ تھی کیونکہ گھر میں پڑھنے کے باوجود اس نے پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ اس بات پر دونوں میں تکرار ہوئی اور پھر لڑائی ہو گئی۔ اس بار لڑائی میں شدت بھی تھی اور ابھرتے شعور کا پختہ رنگ بھی تھا۔ پہلے تو دونوں کے گھر والوں نے توجہ نہیں دی تھی لیکن جب کئی دن گزرنے کے باوجود دونوں میں سے کوئی دوسرے کے گھر جانے کو تیار نہیں ہوا تو ان کی ماؤں کو تشویش لاحق ہو گئی۔ خانم سرینا کی ماں کوشلیا کے پاس آئی۔

”پتا نہیں کیا ہوگا، کیسی لڑائی ہوئی ہے۔“

”یہ دونوں ایک دوسرے سے بات کرنے کو تیار نہیں ہیں۔“ کوشلیا نے فکرمندی سے کہا۔

”بات کرنا تو دور کی بات ہے، سارہ یہاں آنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ جانتی ہے میں اس کی صلح کرانے لا رہی ہوں۔“

”یہی حال اس کا ہے۔ وہ تمہارے گھر جانے کا سن کر ہی کمرے میں بند ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی زیادہ تر کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ کھانا بھی نہ ہونے کے برابر کھا رہی ہے۔ کل تو سارا دن سوائے ایک پوری کے اور کچھ نہیں کھایا۔“

”یہی حال اس کا ہے...... کچھ کرنا پڑے گا۔“ خانم روہانسی ہو گئی۔ ”اگر وہ آج نہیں مانی تو میں اس کے باپ سے بات کروں گی۔“

”نہیں ہمیں خود کچھ کرنا پڑے گا۔“ کوشلیا نے سوچتے ہوئے کہا۔

دونوں حویلیاں پاس پاس تھیں درمیان میں خالی جگہ تھی جس پر شیشم اور ٹاہلی کے درخت لگے تھے۔ زمین خان صاحب کی تھی لیکن انہوں نے لالہ جی کی وجہ سے کبھی اسے استعمال نہیں کیا تھا۔ حویلیوں میں آنے جانے کے راستے آگے تھے یا پیچھے تھے اس لیے یہ جگہ آمدورفت کے لیے بھی استعمال نہیں ہوتی تھی۔ خانم واپس حویلی آئی تو موسم بارش والا ہو رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سارہ کو بارش کتنی پسند ہے۔ ذرا دیر بعد جب زوردار بارش شروع ہوئی تو وہ سارہ کے کمرے میں آئی۔ سارہ خاموش بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔

”سارہ باہر بارش ہو رہی ہے۔“

”مجھے پتا ہے۔“ وہ بے دلی سے بولی۔

”تو چل نا باہر۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔“

خانم کو پتا تھا کہ اس کا دل کیوں نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ کسی طرح منا کر اسے باہر صحن میں لے آئی۔ دوسری طرف کوشلیا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی، اس نے سرینا کو بلا لیا۔ وہ خود چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ سرینا ماں سے بہت محبت کرتی تھی اسے یوں لیٹے دیکھ کر بے تاب ہو گئی۔

”ماتا جی کیا ہوا؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو جاکر چاچی کو بلا لا۔“

”چاچی کو کیوں، حکیم جی کو بلاتے ہیں۔“

”نہیں تو چاچی کو بلا لا۔“ ماں نے اصرار کیا۔

مجبوراً سرینا نے چھتری لی اور باہر نکل آئی۔ وہ خان صاحب کی حویلی میں داخل ہوئی تو سارہ صحن میں چوکی پر بیٹھی تھی۔ بارش نے اسے شرابور کر دیا تھا لیکن اس کی توجہ بارش کی طرف نہیں تھی۔ سرینا نے اسے متوجہ کیا۔ ”اے... سارہ“

وہ چونکی۔ ”تم......“

”ہاں ماتا جی کی طبیعت خراب ہے وہ چاچی کو بلا رہی ہیں۔“

”میں بلاتی ہوں۔“ سارہ فکرمند ہو گئی اور اندر کی طرف لپکی۔ خانم اسے چھوڑ کر اندر چلی گئی تھیں۔ اس نے ماں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو بتایا وہ تو اسی وقت چھتری لے کر اور چادر اوڑھ کر جانے کو تیار ہو گئی۔ اس نے سارہ سے کہا۔
''سرینا کو اپنے پاس روک لینا۔ مجھے کوشلیا سے اکیلے میں ملنا ہے۔''
سارہ نہیں سمجھی تھی لیکن اس نے ماں کی بات پر عمل کیا، سرینا رک گئی تھی۔ اس نے سرینا سے کہا۔ ''امی جا رہی ہیں لیکن انہوں نے کہا ہے تم یہیں رکو۔''
خود سرینا کا بھی رکنے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے اس نے سارہ کی بات مان لی اور کچھ دیر میں دونوں یوں بات کر رہی تھیں جیسے ان میں کبھی لڑائی تھی ہی نہیں۔ ان کو احساس نہیں ہوا کہ ان کی ماؤں نے کتنی ہوشیاری سے ان کے درمیان خفگی کی دیوار گرا دی تھی۔ وہ پہلے کبھی اتنے دن ایک دوسرے سے خفا نہیں رہی تھیں۔ اس لیے دونوں ہی پہلے سے زیادہ ٹوٹ کر ملی تھیں۔ سارہ روئی تو سرینا بھی رو دی تھی۔ اس نے سارہ سے کہا۔ ''اب ہم کبھی نہیں لڑیں گے۔''
''لیکن ہم لڑتے رہتے ہیں۔''
''نہیں میں نے سوچ لیا ہے ہم کیا کریں گے کہ پھر ہم میں کبھی لڑائی نہیں ہوگی۔ میری ماتا جی نے اپنی بچپن کی سکھی کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا پھر ان میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔'' سرینا نے یقین سے کہا۔
''کیا کرو گی؟''
''کل جب سورج نکلے گا تو تم چپکے سے آنا اور اپنی پہنی ہوئی پرانی چوڑیاں لے آنا۔''
سارہ نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن سرینا نے اسے ٹال دیا۔ اس نے کہا۔ ''کل ضرور آنا اور چوڑیاں بھی لانا۔''
''امی اتنی صبح نہیں آنے دیں گی۔'' سارہ نے خدشہ ظاہر کیا۔
''تم کہہ دینا سرینا نے سامنے برگد تلے بلایا ہے تو آنے دیں گی۔''
لاڈلی اور اکلوتی ہونے کے باوجود سارہ کو گھر میں سب کرنے کی آزادی نہیں تھی خاص طور سے حویلی سے باہر آنے جانے پر کئی قسم کی پابندیاں تھیں۔ اول وہ اکیلی نہیں جا سکتی تھی، اس کی آیا اس کے ساتھ جاتی تھی۔ دوسری اسے صرف چڑھے دن میں باہر جانے کی اجازت تھی۔ بہت صبح سویرے اور دن ڈھلے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سارہ کو خطرہ تھا کہ امی اسے روک نہ لیں اس لیے جب وہ صبح جانے کے لیے تیار ہوئی تو اس نے پہلے خانم سے اجازت لی۔ ''امی سامنے برگد کے ساتھ سرینا میرا انتظار کر رہی ہے، چلی جاؤں؟''

''اتنی صبح؟'' خانم نے حیرت سے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''
''پتا نہیں امی۔'' سارہ نے معصومیت سے کہا۔ ''لیکن اس نے بلایا ہے، چلی جاؤں؟''
''اچھا جلدی آنا اور رضیہ کو ساتھ لے جاؤ۔''
رضیہ اس کی آیا تھا۔ وہ تقریباً تیس برس کی پختہ کار عورت تھی۔ جب سارہ صرف چند مہینے کی تھی تو رضیہ کو اس کے لیے رکھا گیا اور تب سے وہ اب تک اس کے ساتھ تھی۔ رضیہ پڑھی لکھی اور تہذیب یافتہ تھی۔ اس کا خاندان کئی نسلوں سے یہی کام کرتا آیا تھا۔ خان صاحب نے اسے دہلی سے بلوایا تھا۔ چند سال پہلے اس کی شادی ہوئی تو خان صاحب نے اس کے شوہر اسد اللہ کو بھی اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ وہ پڑھا لکھا تھا خان صاحب نے اسے اپنا منشی بنا لیا۔ سارہ رضیہ کو لے کر باہر آئی۔ سرینا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ سارہ نے رضیہ سے کہا۔
''باجی تم یہاں رکو۔''
رضیہ کو برگد کے درخت کی حد سے باہر چھوڑ کر وہ سرینا کے پاس تنوں کے درمیان والے حصے میں آئی۔ یہاں ابھی نیم تاریکی تھی۔ یہ بہت بڑا اور گھنا درخت تھا۔ اس پورے علاقے میں اس سے بڑا اور گھنا درخت نہیں تھا۔ جب گاؤں میں کوئی شادی ہوتی تو اس کی تقریب اسی درخت کی گھنی چھاؤں تلے ہوتی تھی۔ سرما کی راتوں میں لالہ کشن مل اور خان صاحب اس کے نیچے الاؤ جلا کر محفل جماتے تھے جس میں گاؤں کے چیدہ چیدہ لوگ شریک ہوتے۔ اس کے نیچے چارپائیاں اور کچھ تخت ہمیشہ پڑے رہتے تھے۔ اگر کوئی مسافر یہاں سے گزرتا تو وہ یہاں آرام کرنے کے لیے رک جاتا۔ لالہ جی اور خان صاحب نے ایسے مہمانوں کی میزبانی مذہب کے لحاظ سے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ درخت اور اس کے آس پاس کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کنویں تھے جن سے گاؤں کے لوگ پانی بھرتے تھے۔ غیر مسلموں کا کنواں الگ تھا اور مسلمانوں کا کنواں الگ۔ یہ کوئی بے آباد اور اجاڑ جگہ نہیں تھی اس لیے سرینا اور سارہ بھی بے کھٹکے وہاں چلی جاتی تھیں۔ سارہ دوپٹے میں لپیٹ کر اپنی چوڑیاں لائی تھی۔ سرینا کے پاس ایک پوٹلی تھی اس نے سارہ سے اس کی چوڑیاں لیں اور زمین میں ایک چھوٹی چھری سے گڑھا کھودنے لگی۔
''یہ کیا کر رہی ہو؟''
''شش!'' سرینا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس نے کوئی چھ سات انچ گہرا

گڑھا کھودا۔ پھر اسے چوڑا کرنا شروع کر دیا۔ مٹی نرم تھی اس لیے اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ جب گڑھا بن گیا تو اس نے گڑھے کی تہ ہموار کی اور پھر اپنی پوٹلی کھولی۔ اس میں اوپر پیپل کے تازہ پتے بھرے ہوئے تھے۔ سرینا نے یہ پتے گڑھے کی تہ میں بچھائے۔ پھر اپنی اور سارہ کی چوڑیاں ملا کر اس میں رکھیں صرف ایک چوڑی اپنے پاس رکھ لی۔ اس نے یہ چوڑی توڑی اور اسے اپنی انگلی میں چبھو لیا۔ خون کی بوندیں نمودار ہوئیں اور قطرہ قطرہ کر کے چوڑیوں پر گرنے لگیں۔ سارہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''یہ کیا کر رہی ہے؟''
جواب میں سرینا نے چوڑی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے کچھ کہا نہیں تھا لیکن سارہ سمجھ گئی۔ اسے بھی اپنی انگلی سے خون چوڑیوں پر ٹپکانا تھا۔ سارہ نے آنکھ بند کر کے انگلی میں چوڑی ماری۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی چیخ ضبط نہیں کر سکی۔ مگر چیخ ہلکی سی تھی، درخت سے باہر موجود رضیہ کے کانوں تک نہیں گئی تھی۔ اس نے اناڑی پن سے چوڑی ماری تھی اس لیے زخم بھی زیادہ گہرا آیا اور خون کے قطرے تیزی سے گرنے لگے۔ سرینا نے بے تاب ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور زخم کو اپنی چنری سے دبا لیا۔
''پاگل اتنے زور سے ماری ہے۔''
خون کچھ دیر میں رک گیا تھا۔ تکلیف کم ہوئی تو تجسس غالب آ گیا۔ ''سرینا یہ کیا کر رہی ہے؟''
''اپنا اور تیرا سمبندھ یہاں دفن کر رہی ہوں جب تک یہ چوڑیاں یہاں رہیں گی تیری میری دوستی بھی رہے گی۔''
خان صاحب توہمات سے دور رہتے تھے اس لیے سارہ بھی ان چیزوں کو نہیں مانتی تھی۔ اس سے پہلے کبھی اس کی سرینا سے اس بارے میں بات ہوتی تو وہ مذاق اڑاتی تھی لیکن آج وہ سرینا کا مذاق نہیں اڑا سکی۔ بات ان کی دوستی کی تھی، اس نے کہا۔ ''تجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا؟''
''ہاں مجھے یقین ہے۔'' سرینا نے کہا۔ ''ماتا جی نے ایسا ہی کیا تھا پھر ان کی اپنی سکھی سے کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔''
سرینا نے چوڑیوں پر دوبارہ پتے رکھے اور انہیں پوری طرح ڈھک دیا۔ پھر اوپر سے مٹی ڈال کر گڑھا ڈھک دیا تھا۔ اچھی طرح مٹی دبا کر اس نے اوپر سے پتے بھی بکھیر دیے تاکہ کسی کو پتا نہ چلے کہ یہاں کوئی گڑھا کھودا گیا تھا۔ سارا کام سرینا نے کیا تھا اس لیے اس کے ہاتھ اور کپڑے مٹی زدہ ہو گئے تھے۔ اس نے جانے سے پہلے سارہ سے کہا۔ ''یاد رکھ اس بارے میں کسی کو نہیں بتانا ہے۔ اپنے ماتا پتا کو بھی نہیں۔''

''ٹھیک ہے نہیں بتاؤں گی۔''
''یہ ہم دونوں کا راز ہے۔''
سارہ نے اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر لیا کسی کو نہیں بتایا۔ چند مہینے بعد علاقے میں سیلاب آیا۔ بے پناہ بارشوں کے بعد دریا بپھر گیا تھا۔ گاؤں کی نصف آبادی بے گھر ہو گئی تھی۔ کیونکہ خان صاحب اور لالہ کشن مل کی حویلیاں اونچی تھیں اس لیے پناہ گزین وہیں چلے آئے۔ پانی اترنے کے بعد انہوں نے اپنے گھروں کی تعمیر دوبارہ شروع کی تھی۔ خان صاحب اور لالہ کشن مل نے بھی اپنے مزارعوں کی مدد کی تھی اس لیے وہ جلد دوبارہ آباد ہو گئے۔ پانی ایک مہینے سے بھی زیادہ عرصے تک چڑھا رہا تھا۔ جب پانی اترا اور زمین خشک ہوئی تو سارہ اور سرینا کو اس جگہ کا خیال آیا جہاں انہوں نے چوڑیاں دفن کی تھیں لیکن جب وہ درخت تلے گئیں تو انہیں وہ جگہ نہیں ملی۔ کیونکہ وہاں متعدد نئے تنے نکل آئے تھے اور سیلاب کے ساتھ آئی مٹی نے زمین کی شکل ہی بدل دی تھی۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی تھیں۔
''وہ جگہ کہاں گئی؟'' سرینا نے پریشان لہجے میں کہا۔
سارہ ہنس کر بولی۔ ''تم چاہتی تھیں نا وہ راز رہے تو وہ اب ہمیشہ کے لیے راز بن گئی ہیں، خود ہمیں بھی نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں۔''
سرینا کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ ''ہاں یہ تو ہے لیکن کسی اور کو مل گئیں تو؟''
''اس سے کیا ہوگا؟''
''سمجھا کر...... ہماری دوستی میں فرق آ جائے گا۔'' سرینا بولی۔ ''جب تک وہ چوڑیاں یہاں دفن ہیں کوئی ہماری دوستی نہیں ختم کر سکتا۔''
''سرینا، میں نہیں مانتی کہ ہماری دوستی اتنی کمزور ہے کہ چند چوڑیاں کوئی زمین سے نکال لے تو وہ ٹوٹ جائے گی۔''
''تو نہیں جانتی میں نے اس پر عمل بھی کیا تھا۔ وہ عمل ختم ہو جائے گا اور اس سے بہت برا نتیجہ بھی سامنے آ سکتا ہے۔''
''کچھ نہیں ہوگا تیرے بھگوان اور میرے اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک رہے گا کوئی ہماری دوستی نہیں ختم کر سکے گا۔''
''پتا نہیں۔'' سرینا بے دلی سے بولی۔ ''پر یہ اچھا نہیں ہوا۔''
وہ دونوں جب دس سال کی تھیں تب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی اور برصغیر کے مسلمانوں نے پہلی بار لفظ پاکستان سنا تھا۔ اس دور دراز گاؤں بیاپور میں بھی اس کی گونج سنائی دی تھی مگر خان صاحب اور لالہ کشن مل کو سیاست سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہ کوئی بھی کام کرنے سے اپنے آقا انگریز کی خوشنودی کا پہلے خیال رکھتے تھے اور انگریز اپنے کارپردازوں کے لیے سیاست ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے رات کی چوپال میں اس واقعے کا ذکر چند دن ہوا اور پھر بات ختم ہوگئی۔ مگر ساتھ ہی ایک غیر محسوس انداز میں مسلمانوں کے اندر الگ وطن کا جذبہ اپنی جگہ بنانے لگا۔

چند سال بعد جب جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی۔ تب برصغیر پر برٹش راج کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ اس وقت مسلمان زیادہ تیزی سے تحریک پاکستان کی طرف راغب ہونے لگے۔ چند سال پہلے صوبوں میں بننے والی کانگریسی وزارتوں نے انہیں نوشتہ دیوار دکھا دیا تھا کہ جب انگریز یہاں سے چلے جائیں گے اور ملک کی باگ ڈور مکمل طور پر کانگریس یعنی ہندوؤں کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ کیا کریں گے۔ یکے بعد دیگرے ہونے والے مسلم کش فسادات نے تحریک پاکستان کو مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کی طرح ناگزیر بنا دیا تھا۔ سوائے چند فیصد ایلیٹ کلاس اور کانگریس نواز مسلمانوں کو چھوڑ کر باقی تمام مسلمان بغیر کسی تفریق کے پاکستان کے حامی اور اسے حاصل کرنے کے لیے پرعزم تھے۔ یہ جذبہ یوں پروان چڑھ رہا تھا کہ چند سال میں مسلمانوں کا بچہ بچہ اس جذبے سے سرشار ہوگیا تھا۔

بیاپور میں ابھی یہ جذبہ اتنی شدت سے نہیں پہنچا تھا۔ اگرچہ مسلمان کہیں بھی تھا وہ اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر آبادی۔۔ اور علاقے کی مناسبت سے اس جذبے میں کمی بیشی موجود تھی۔ کچھ ایسا ہی بیاپور میں تھا۔ جاگیردارانہ کنٹرول کی وجہ سے یہاں سیاسی سرگرمیاں بہت کم تھیں اور اگر لوگ آزادی یا تحریک پاکستان کے بارے میں بات کرتے تو ڈھکے چھپے انداز میں کرتے تھے۔ سرعام کسی سرگرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خان صاحب گھر میں بھی سیاسی گفتگو سے پرہیز ہی کرتے تھے اس لیے سارہ بھی تقریباً بے خبر تھی۔

ایک دن سرینا کے گھر میں مٹی سے گڑیا بناتے ہوئے سرینا نے پاکستان کی بات کی۔

"سارہ تجھے معلوم ہے مسلمان اپنا الگ ملک بنا رہے ہیں جسے وہ پاکستان کہتے ہیں۔"

"ہاں میں نے سنا تو ہے۔" سارہ نے اپنے گیلی مٹی سے سنے ہوئے ہاتھ سے بال پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"اگر مسلمانوں کا ملک بن گیا تو کیا تم لوگ وہاں چلے جاؤ گے؟"

"ہم چلے جائیں گے؟" سارہ نے تعجب سے کہا۔ "ہم کیوں چلے جائیں گے۔ ہمارا گھر اور زمین تو یہاں ہے۔"

"میں نے باپو جی سے سنا ہے تب سے مجھے خیال آرہا تھا کہ کہیں تم پاکستان نہ چلی جاؤ۔"

"میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔" سارہ نے یقین سے کہا۔

مگر جب وہ گھر واپس آئی تو سرینا والی خلش اس کے اندر بھی اتر چکی تھی۔ اس نے کھانے کے بعد صحن میں حقہ گڑگڑاتے ہوئے خان صاحب سے پوچھا۔ "بابا یہ پاکستان کہاں بنے گا؟"

خان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تجھے کیا پاکستان سے؟"

"بابا آج سرینا پوچھ رہی تھی کہ اگر مسلمانوں کا ملک بن گیا تو کیا ہم وہاں چلے جائیں گے؟"

"ہم کہیں نہیں جائیں گے۔" خان صاحب نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ "ہم یہیں رہیں گے جہاں ہمارا گھر ہے۔"

سارہ باپ کی لاڈلی تھی لیکن اس سے ڈرتی تھی جب خان صاحب کا موڈ خراب ہوتا تو وہ دیکھ بھال کر بات کرتی تھی۔ اس نے دبے انداز میں کہا۔ "پر بابا یہ پاکستان کہاں بن رہا ہے اور کون بنا رہا ہے؟"

"کچھ پاگل سر پھرے ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں، پاکستان کبھی نہیں بنے گا۔" خان صاحب نے یقین سے کہا۔

سارہ یہ سن کر مطمئن ہوگئی کہ پاکستان کبھی نہیں بنے گا یعنی انہیں یہاں سے نہیں جانا پڑے گا اور اس کا مطلب تھا کہ اسے کبھی سرینا سے جدا نہیں ہونا پڑے گا۔ وہ بارہ سال کی ہو رہی تھی اور اس سال اسے ساتویں کا امتحان دینا تھا۔ امتحان مارچ میں ہوتا تھے لیکن خان صاحب اسے ایک مہینا پہلے ہی لے کر لاہور چلے جاتے تھے جہاں وہ اپنی کوٹھی میں قیام کرتے تھے۔ اس دوران میں اس کی دونوں ٹیچرز کو چار مہینے کی چھٹی مل جاتی تھی۔ ان سات سالوں میں اس کی ٹیچرز بدلی تھیں اور کبھی اسے ایک ہی ٹیچرز سے پڑھنا پڑا تھا لیکن سارہ کے تعلیمی معیار میں فرق نہیں آیا تھا وہ ہمیشہ اچھی پوزیشن حاصل کرتی تھی۔ خان صاحب اسے امتحان دلوانے کے لیے لاہور روانہ ہوئے۔ جب تک سارہ پیپرز دیتی تھی تب تک خان صاحب اپنے دوستوں اور احباب سے ملاقاتیں کرتے تھے۔

سارہ کو پیپرز دینے کی خوشی اور جوش ہوتا تھا لیکن وہ

یہاں آکر بور ہوتی تھی۔ کوئی اس سے بات کرنے یا اس کے ساتھ کھیلنے والا نہیں ہوتا تھا۔ اسکول میں جو لڑکیاں ملتی تھیں وہ بھی بس صرف پرچہ دیتے وقت ہی ملتی تھیں اور اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان سے بات کرسکتی۔ اس لیے وہ شدت سے انتظار کرتی تھی کہ امتحان کا نتیجہ ہاتھ میں آئے اور وہ واپس جائے۔ اس بار خان صاحب سے ملنے والے لوگ بہت زیادہ تھے۔ خدا خدا کرکے سارہ کے امتحان ختم ہوئے۔ اس کا نتیجہ بھی نکل آیا لیکن خان صاحب کی مصروفیت ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس بار وہ خلاف معمول ایک ہفتہ مزید رکے تھے اور سارہ کا دل بہلانے کے لیے اسے لاہور گھمایا تھا۔ وہ اسے اس جگہ بھی لے گئے تھے جہاں قرارداد پاکستان کا جلسہ ہوا تھا۔ سارہ کو مزہ نہیں آرہا تھا، وہ بے دلی سے گھومتی رہی اور اندر سے واپس جانے کے لیے بے تاب تھی۔ آخر خان صاحب کی ملاقاتیں ختم ہوئیں اور وہ واپس روانہ ہوئے۔ سارہ اور سرینا آپس میں ٹوٹ کر ملی تھیں اور انہوں نے غیر حاضری کی ایک ایک بات بتائی تھی۔ سرینا کو شکوہ تھا کہ وہ اس بار دیر سے آئی۔ سارہ نے صفائی پیش کی۔

"اس بار بابا سے ملنے والے بہت آرہے تھے اس لیے واپسی میں دیر ہوگئی۔"

"میں تجھ سے دور نہیں رہ سکتی۔ شکر ہے تو پاکستان نہیں جائے گی۔"

"ہاں میرے بابا نے بھی کہا ہے کہ ہم پاکستان نہیں جائیں گے اور پاکستان بن بھی نہیں رہا ہے۔"

سرینا نے سکون کا سانس لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی ہر بات بتا دیتی تھیں مگر نہ سرینا سارہ کے گھر کی باتیں اپنے گھر میں بتاتی تھی اور نہ سارہ اپنے گھر میں لالہ کشن لال کے راز بیان کرتی تھی۔ اگلے سال انہوں نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو باتوں کا انداز بدل گیا تھا۔ اگرچہ ان میں وہی معصومیت تھی جو آج سے ساٹھ ستر سال پہلے گاؤں دیہات میں پلنے والی لڑکیوں میں پائی جاتی تھی۔ جن کے لیے شادی انکشاف کا ایک دروازہ ہوتا تھا جو زندگی میں پہلی بار کھلتا تھا۔ اس کے باوجود جوانی کے ساتھ جو شوخی، چلبلاپن، بانکپن اور ادائیں آتی ہیں وہ ان میں بھی آئی تھیں۔

خانم نے سارہ پر پابندی لگا دی تھی۔ اب وہ پردہ کیے بغیر باہر نہیں جاسکتی تھی اور اکیلے جانے پر بھی مکمل پابندی لگ گئی تھی۔ اب اسے سرینا کے پاس بھی جانا ہوتا تھا تو رضیہ اس کے ساتھ جاتی تھی۔ بے شک وہ ان سے دور کہیں بیٹھ جاتی تھی لیکن وہیں موجود رہتی تھی اور پھر سارہ کو ساتھ لے کر آتی تھی۔

سارہ نے اس پر ہنگامہ کیا تھا اور باپ سے بھی شکایت کی تھی لیکن اس معاملے میں وہ بیوی کے ہم نوا تھے۔ انہوں نے سارہ سے کہا۔ "بیٹا جی اب آپ بڑی ہوگئی ہیں اور ہمارے ہاں تو بچیاں بھی پردہ کرکے باہر جاتی ہیں۔"

"تب مجھے کیوں پردہ نہیں کرایا۔" سارہ خفگی سے بولی۔ "میں عادی ہوجاتی اب بہت مشکل ہوتی ہے۔"

"ہوجائے گی عادی۔" خانم نے اسے ڈانٹا۔ "زیادہ دیدہ ہوائی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"امی اکیلے بھی نہیں جانے دیتی ہیں۔" اس نے منہ بسور کر کہا۔

"یہ بھی ٹھیک کرتی ہے تیری ماں..... سارہ تو اس طرح اکیلے منہ اٹھائے پھرے گی تو لوگ میرے بارے میں کیا کہیں گے کہ ولاور خان میں غیرت نہیں رہی ہے۔" خان صاحب کو غصہ آگیا۔ "تو اپنے باپ کا شملہ نیچے کرے گی؟"

سارہ کا سارا احتجاج دم بھر میں ختم ہوگیا۔ باپ اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اس کی عزت اسے سب سے پیاری تھی اس لیے اس نے سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔ "جی بابا جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔"

"شاباش!" خان صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "اور بیٹا لالہ جی کے ہاں بھی ہر وقت مت جایا کرو ان کا جوان بیٹا ہے۔ کوشش کرو کہ سرینا تم سے ملنے یہاں آجایا کرے۔"

خود سارہ کو بھی مہیش پسند نہیں تھا کیونکہ جب ان کا سامنا ہوتا تو وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا تھا۔ وہ خود اٹھارہ سال کا جوان تھا۔ پھر دیہات کے کھلے ماحول میں پلنے سے اس کا قد کاٹھ اپنی عمر سے کہیں زیادہ لگتا تھا۔ سارہ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ نہیں پائی تھی لیکن اسے وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ سرینا کے گھر میں پردہ نہیں کرتی تھی صرف دوپٹا لیتی تھی۔ جب خان صاحب نے منع کیا تو وہ محتاط ہوگئی۔ وہ سرینا کے گھر میں صرف اس کے کمرے میں چادر اتارتی تھی اور اس نے سرینا سے بھی کہہ دیا تھا کہ اب وہ اس کے بھائی کے سامنے نہیں آئے گی اس لیے جب وہ یہاں ہو تو مہیش سرینا کے کمرے میں بھی نہ آیا کرے۔ سرینا کے لیے یہ چیز انوکھی نہیں تھی اسے معلوم تھا مسلمانوں کے ہاں غیر مردوں سے پردہ نہ کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس نے سارہ کو اطمینان دلایا کہ مہیش اس کے کمرے میں نہیں آیا کرے گا۔

وقت تیزی سے گزرا۔ آنے والے تین سالوں میں سارہ اور سرینا دونوں نے میٹرک کا امتحان دیدیا تھا۔ اب وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

آگے پڑھنا چاہتی تھیں۔ لالہ کشن مل تو مان گئے تھے اور انہوں نے سرینا کو لاہور کے ایک اچھے گرلز کالج میں داخل کرانے کا فیصلہ کرلیا لیکن خان صاحب اب سارہ کو مزید آگے نہیں پڑھانا چاہتے تھے۔ سارہ پڑھنا چاہتی تھی مگر یہ بات خود کہتے ہوئے ڈرتی تھی اس لیے اس نے سرینا کو آگے کیا۔ اس نے خان صاحب سے التجا کی۔ ''خان چاچا سارہ کو میرے ساتھ کالج میں پڑھنے کے لیے بھیج دیں۔''

دلاور خان سرینا کو بھی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے انہوں نے نرمی سے کہا۔ ''بیٹا ہمارے ہاں رہ کر سارہ نے اتنی تعلیم بھی حاصل کر لی تو اسے بہت سمجھو۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں ہے۔''

''پر چاچا جی سارہ نے اتنا بھی پڑھا ہے نا۔ آگے پڑھے گی تو کیا حرج ہوگا۔ باپو جی نے جہاں میرا داخلہ کرایا ہے وہاں سب لڑکیاں ہیں اور ٹیچرز بھی عورتیں ہیں۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا اگر آپ سارہ کو صرف دو سال اور پڑھنے دیں۔''

خلاف توقع خان صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ سرینا کی یہ بات ان کے دل کو لگی تھی۔ واقعی انہوں نے اسے میٹرک تک تعلیم دلوائی تھی، بے شک اس نے گھر میں رہ کر پڑھا تھا اور خاتون ٹیچرز سے پڑھا تھا لیکن اس کالج میں بھی تو صرف لڑکیاں تھیں اور پڑھانے والی ٹیچرز بھی خواتین تھیں۔ اگر وہ دو سال اور پڑھ لیتی تو انٹر ہو جاتی۔ خان صاحب ذاتی طور پر عورتوں کی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ خانم اسے بالکل بھی ضروری نہیں سمجھتی تھیں اس لیے جب انہیں پتا چلا کہ خان صاحب سارہ کو شہر جا کر کالج میں پڑھنے کی اجازت دینے کا سوچ رہے ہیں تو انہوں نے ہنگامہ کر دیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کا رشتہ طے کرنے کا سوچ رہی ہوں اور آپ اسے کالج بھیج رہے ہیں۔''

''نیک بخت ابھی سارہ کی عمر ہی کیا ہے پندرہ برس کی تو ہوئی ہے۔''

''تو کیا ہوا جوان تو ہے اور جب میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی تو میں اس سے بھی کم عمر تھی۔''

''نیک بخت وہ زمانہ اور تھا اور اب زمانہ اور ہے۔'' خان صاحب نے رسانیت سے کہا۔ ''آج کل عورت کا تعلیم حاصل کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔''

خانم کی مخالفت رائگاں گئی۔ خان صاحب نے فیصلہ کر لیا۔ بلکہ انہوں نے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ خانم بھی سارہ کے ساتھ لاہور والی کوٹھی میں منتقل ہو جاتی اور سرینا بھی ان کے ساتھ رہتی۔ لالہ کشن مل اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے کیونکہ دوسری صورت میں سرینا کو وہاں کسی ہاسٹل میں رہنا پڑتا اور وہ اسے ہاسٹل میں نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خان صاحب سے کہا۔ ''آپ نے میرا بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے بچ لیں آپ نے احسان کیا ہے مجھ پر۔''

''کیسی بات کرتے ہیں لالہ جی! سرینا میرے لیے سارہ کی طرح ہے۔'' خان صاحب نے کہا۔ ''ویسے وہاں سب ہوں گے نوکر بھی یہیں سے جائیں گے لیکن میں خود بھی دو مہینے میں ایک بار چکر لگا تا رہوں گا۔ آپ بھی جب چاہیں سرینا کو دیکھنے، اس سے ملنے جاسکتے ہیں۔''

سرینا اور سارہ کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ ایک تو انہیں لاہور جیسے شہر میں رہ کر پڑھنے کا موقع مل رہا تھا دوسرے اب وہ دن رات ایک ساتھ رہتیں۔ گھر تو ایک ہی ہوتا کالج میں بھی وہ ساتھ ساتھ ہوتیں۔ دونوں نے آرٹس لی تھی اس لیے ان کی کلاسیں بھی ایک ہی ہوتیں۔ مگر جب ان کے جانے میں چند دن رہ گئے تو سرینا پریشان نظر آنے لگی، سارہ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے تو چپ چپ کیوں ہے؟''

سرینا روہانسی ہو گئی۔ ''پتا نہیں کیا بات ہے بھیا میرے لاہور جا کر پڑھنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' سارہ بے چین ہو گئی۔ اگر سرینا نہ جاتی تو لاہور جا کر کالج میں پڑھنے کی کشش آدھی سے کم رہ جاتی۔ سرینا کا ساتھ اس کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر تھا۔ سرینا بتاتے ہوئے جھجکی لیکن وہ سارہ سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی اس نے بتا دیا۔

''بھائی کو اعتراض ہے کہ جب تم ہمارے گھر میں اس طرح آتی ہو کہ اس سے بھی پردہ کرتی ہو تو میں لاہور جا کر تمہارے گھر کیوں رکوں۔''

''مگر ہمارے ہاں تو کوئی غیر مرد نہیں ہے، بابا ہیں وہ بھی یہیں ہوں گے۔ پھر میں چاچا جی سے پردہ تو نہیں کرتی ہوں۔ اس طرح بابا بھی تیرے باپو جی کی طرح ہیں اور تم لوگ تو ویسے بھی پردہ نہیں کرتے ہو۔''

''میں سمجھتی ہوں باپو جی بھی یہی کہہ رہے تھے لیکن بھائی مان نہیں رہا ہے، مجھے ڈر ہے باپو جی کہیں اس کے کہنے میں آ کر مجھے روک نہ لیں۔'' سرینا رونے والی ہو گئی۔ سارہ بے چین ہو گئی۔

''ایسا نہیں ہوگا، میں بابا سے کہتی ہوں وہ خود چاچا جی سے بات کرتے ہیں۔''

''ابھی نہیں اگر بھائی نے بابا کو زیادہ مجبور کیا تو میں

تمہیں بتاؤں گی تب تم خان چاچا سے کہنا کہ وہ باپو جی سے بات کرلیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سارہ مان گئی۔

ایک بار اس نے خان صاحب کو خانم سے بات کرتے سنا تھا کہ مہیش کی صحبت ٹھیک نہیں ہے وہ جن سنگھیوں میں اٹھ بیٹھ رہا ہے یہ چیز آگے چل کر لالہ کشن مل کے لیے مشکل پیدا کر سکتی تھی۔ سارہ نے یہ بات سرینا کو نہیں بتائی تھی اس کے خیال میں یہ کوئی ایسی ضروری بات نہیں تھی جو سرینا کو بتائی جاتی۔ ویسے بھی وہ مہیش اور اس کے تذکرے بھی پسند نہیں کرتی تھی، یہ بات سرینا بھی سمجھتی تھی اس لیے وہ بھی اس کے ساتھ مہیش کی کوئی بات کرنے سے گریز ہی کرتی تھی۔ بہر حال لالہ کشن مل نے کسی طرح مہیش کو راضی کر لیا اور سرینا، سارہ خانم کے ہمراہ لاہور آ گئی تھیں۔ خان صاحب نے سارہ کو کالج میں داخل کرایا۔ سرینا کے لیے لالہ کشن مل پہلے ہی انتظام کر چکے تھے۔ خان صاحب کی کوٹھی خاصی بڑی اور شہر میں تھی اس لیے انہیں کالج آنے جانے میں بھی دشواری نہیں ہوتی تھی۔

کالج ایک مختلف دنیا تھی۔ سارہ اور سرینا نے میٹرک تک تعلیم ضرور حاصل کی تھی لیکن بنیادی طور پر وہ بیاپور کے محدود ماحول میں رہی تھیں اس لیے کتنے دن تو وہ گھبرائی اور پریشان رہی تھیں لیکن رفتہ رفتہ وہ اس ماحول میں ڈھل گئیں۔ کالج میں آنے کے بعد سارہ کو صحیح معنوں میں علم ہوا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور یہ خطہ جسے برصغیر کہتے ہیں کس انقلاب کے دہانے پر ہے۔ وہ پاکستان جسے خان صاحب چند پاگلوں کا ذہنی فتور قرار دے چکے تھے اب حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔ کالج میں زیادہ غیر مسلم لڑکیاں تھیں۔ ان میں ہندو اور سکھ نمایاں تھیں۔ مسلم لڑکیاں کم تھیں اور وہ بھی زیادہ سارہ کی طرح انگریز کی غلام جاگیردار کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لیے پاکستان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سارہ کو غیر مسلم لڑکیوں کے معاندانہ رویے سے بہتر طور پر پتا چلتا تھا۔ وہ جب پاکستان کا ذکر کرتیں ان کے لہجے میں زہر آجاتا تھا۔ اکثر لڑکیوں کا رویہ متعصبانہ تھا اور وہ اس حوالے سے مسلم لڑکیوں کے منہ لگنے کی کوشش کرتی تھیں۔

چونکہ سارہ کو پاکستان سے کوئی ذہنی وابستگی نہیں تھی اس لیے اس نے زیادہ توجہ نہیں دی لیکن تحریک پاکستان کے بارے میں اس کی معلومات اپ ڈیٹ ہوتی رہتی تھیں۔ سرینا کو بھی سیاست سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بس ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہتی تھیں۔ لاہور میں ہونے کی وجہ سے انہیں یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ بیاپور میں کیا ہو رہا ہے۔ خان صاحب ہر دوسرے مہینے چکر لگاتے رہتے تھے اور جب وہ دوسرے سال آئے تو سارہ نے محسوس کیا کہ وہ پریشان اور فکر مند تھے۔ خانم اور سارہ نے پوچھا بھی لیکن انہوں نے ٹال دیا تھا۔ دوسرے سال وہ سردیوں کی چھٹی میں گھر آئیں تب انہیں احساس ہوا کہ ملکی سیاست بیاپور تک پہنچ گئی ہے۔ گاؤں کی چوپال میں کھلم کھلا سیاست پر بات ہوتی تھی اور اب خان صاحب یا لالہ کشن مل کا رعب بھی لوگوں کو اس پر بات کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر تو سارہ حیران رہ گئی کہ گاؤں کے بعض گھروں پر مسلم لیگ کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اس نے خان صاحب سے کہا۔ ''بابا یہ کیا آپ تو کہتے تھے کہ پاکستان نہیں بن سکتا اور ہم یہیں رہیں گے۔''

''یہ پاگل ہیں۔'' خان صاحب برہمی سے بولے۔ ''آنے والے وقت سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ کتنا بڑا طوفان ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

سارہ سہم گئی تھی۔ ''کیسا طوفان بابا؟''

''دیکھو بیٹا پاکستان کا مطلب ہے دوسری قوموں سے لڑائی اور ہم مسلمان اقلیت میں ہیں ان لوگوں سے نہیں لڑ سکتے جو تعداد میں ہم سے کئی گنا زیادہ ہیں۔''

''پر بابا اگر مسلمان الگ ہونا چاہتے ہیں تو ان کو کیا ہے وہ وہی حصہ الگ کریں گے نا جہاں ان کی اکثریت ہے۔''

''یہی تو فساد کی بات ہے۔ ہندو اسے ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ سکھ ان کے ساتھ ہیں، ان کا کہنا ہے پاکستان ایسے نہیں بنے گا، اس کے لیے بہت خون خرابا ہوگا اور انہوں نے اس کے لیے تیاری بھی شروع کر دی ہے۔'' خان صاحب نے فکر مند لہجے میں کہا۔ اس روز وہ بہت پریشان تھے اس لیے سارہ سے وہ باتیں کر رہے تھے جو عام حالات میں کسی صورت اس سے نہیں کر سکتے تھے۔ خان صاحب اپر کلاس سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کی معلومات عام مسلمانوں کی نسبت کہیں زیادہ تھیں اور انہیں سینتالیس کے آغاز میں پتا چل گیا تھا کہ ہندو اور سکھ مسلم کش فسادات کی تیاری کر رہے ہیں۔ عام مسلمان یہ تو سمجھتا تھا کہ ہندو اور سکھ آسانی سے پاکستان کے لیے نہیں مانیں گے لیکن اس کے بدلے کے لیے وہ قتل عام کی کیسی تیاری کر رہے تھے، اس سے بے چارے عام مسلمان بے خبر تھے۔

اس بے خبری کی کئی وجوہات تھیں۔ اول تو سارا پریس اور اطلاعات کے ذرائع ہندوؤں کے قبضے میں تھے۔ انگریز ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ بلکہ انگریز ان کے ہمنوا تھے۔ دوسرے مسلمانوں میں بدقسمتی سے جو لوگ پڑھ لکھ گئے تھے یا

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ اطلاعات کی دنیا سے وابستہ تھے ان کا رجحان خود کانگریس یا انگریز کی طرف تھا اور وہ دل سے پاکستان کے مخالف تھے اس لیے انہوں نے جان بوجھ کر اپنی زبان بند رکھی اور مسلمانوں کو بے خبر رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس وقت ان کا خیال تھا کہ ان کی اس خدمت کے صلے میں ان کی جاں بخشی ہو جائے گی لیکن بعد میں ان میں سے اکثر کا خیال غلط ثابت ہوا۔

خان صاحب بھی جان گئے تھے کہ آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا ہے۔ روایتی جاگیر دار کلاس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ دل سے اس کے مخالف تھے۔ مگر ساتھ ہی وہ جانتے تھے کہ اگر پاکستان بن گیا تو اس کی سزا ان کو بھی ملے گی۔ بیا پور... ضلع گورداسپور میں تھا اور یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس لیے خان صاحب کو یہ اطمینان تھا کہ اگر پاکستان بنا تو ان کا علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا۔ مگر یہاں ہندو اور سکھ بھی کم نہیں تھے اس لیے فسادات کا خدشہ تو تھا اور مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم پوری طرح مسلح تھے۔ مسلمانوں کے پاس بیا پور میں واحد آتشیں اسلحہ دلاور خان کی دو بندوقوں کی صورت میں تھا جس کا انگریز سرکار نے لائسنس دیا تھا۔

اس کے مقابلے میں لالہ کشن مل کے پاس کوئی نصف درجن لائسنس تھے۔ اگرچہ انہوں نے اسلحہ کم رکھا تھا اور صرف ایک بندوق تھی۔ اسی طرح دوسرے ہندو گھرانے بھی مسلح تھے۔ مگر ان سے بڑا خطرہ بیا پور کے آس پاس موجود ہندوؤں اور سکھوں کے دیہات میں جمع ہونے والے جن سنگھی اور سکھ بلوائی تھے جو اسلحے اور تربیت کے لحاظ سے پوری طرح مسلح تھے۔ بلوائیوں میں تربیت یافتہ فوجی تھے جن کے پاس خطرناک اسلحہ بھی موجود تھا۔ ان دیہات میں بسنے والے اکا دکا مسلم گھرانے چپکے چپکے گھر چھوڑ کر مسلم اکثریت والے دیہات میں جا رہے تھے۔ یہ سارے اشارے بدترین حالات کی عکاسی کر رہے تھے۔

سارہ اور سرینا جب انٹرنس کا امتحان دینے کے لیے واپس لاہور گئیں تو وہ دونوں ہی پریشان تھیں۔ پاکستان ایک حقیقت بن کر سامنے آ رہا تھا۔ اگر پاکستان بنتا تو ان کو الگ ہونا پڑتا اور یہ سوچ کر ہی ان کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اتنی سمجھ تھی ان میں کہ بیا پور پاکستان میں شامل ہو یا ہندوستان میں، ان میں سے ایک کو یہاں سے جانا ہوگا۔ سرینا نے روتے ہوئے سارہ سے کہا۔ ”میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”میں کون سا تیرے بغیر رہ سکتی ہوں۔“ سارہ نے کہا۔ ”پر بابا کہہ رہے تھے کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا اور اس صورت میں وہ چاچا جی کو نہیں جانے دیں گے۔ وہ خود ان کی حفاظت کریں گے۔“

”یہی بات باپو جی بھی کہہ رہے تھے۔“ سرینا کو ذرا تسلی ہوئی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے ہم الگ نہیں ہوں گے؟“

”اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔“

سارہ اور سرینا نے سترھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ دونوں پر نوخیز جوانی بہار بن کر آئی تھی۔ بدن بھر گئے تھے، چال میں لچک آ گئی تھی، رنگت اور آنکھیں دمکنے لگی تھیں۔ سارہ رنگت اور قد و قامت کے لحاظ سے سرینا سے آگے تھی لیکن چہرے کے نقوش اور ملاحی رنگت کی وجہ سے سرینا میں کشش زیادہ تھی۔ ان کی مائیں اب ان کے لیے فکر مند ہو گئی تھیں۔ خاص طور سے خانم نے سوچ لیا تھا کہ ادھر سارہ انٹر کرے گی اور ادھر وہ اس کے لیے رشتے کی تلاش شروع کر دیں گی۔ رشتے تو اب بھی بہت تھے لیکن خان صاحب نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ جب تک سارہ پڑھ رہی ہے اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ خانم کی ایک بہن دہلی کے ایک نواب خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ ان کے بیٹے انتظار مرزا کا رشتہ موجود تھا اور خود خانم کی بھی یہی خواہش تھی کہ سارہ اس کی بہن کے گھر جائے مگر خان صاحب نے ابھی تک منظوری نہیں دی تھی۔ ان کے سامنے اور بھی مسائل تھے جبکہ خانم کو سیاست اور دوسری چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

سرینا اور سارہ پیپرز دے کر لوٹ آئی تھیں۔ جون تک موسم کی گرمی ماحول میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ تقسیم کے منصوبے کا اعلان ہوتے ہی بلوائی پوری تیاری کے ساتھ نکل آئے تھے اور اب انہیں اس وقت کا انتظار تھا جب مشرقی پنجاب الگ ہوگا اور وہ یہاں رہنے والے مسلمانوں پر قیامت ڈھا سکیں گے۔ کشمیر کو باقی ہندوستان سے جوڑنے والا ضلع گورداسپور تھا۔ کشمیر سے پاکستان میں بہنے والے تمام دریا کشمیر سے نکلتے تھے اس لیے ہندوؤں نے طے کر لیا تھا کہ کشمیر پر بہر صورت قبضہ کرنا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے زمینی راستہ حاصل کرنے کے لیے باؤنڈری کمیشن میں بیٹھے اپنے کار پرداز ریڈ کلف سے دھاندلی کرائی اور اس نے بہ یک جنبش قلم ضلع گورداسپور سمیت مشرقی پنجاب میں آنے والے بہت سارے مسلم اکثریتی علاقے ہندوستان کو بخش دیے۔

عام مسلمان اس فیصلے سے بے خبر سکون سے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے۔ خود خان صاحب بھی مطمئن تھے کہ گورداسپور پاکستان میں شامل ہوگا اس لیے ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ان کی زمین اور حویلی اسی طرح قائم دائم رہے گی۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ ان کا علاقہ پاکستان میں ہے۔ خان صاحب نے مسلم لیگی رضا کاروں کے ساتھ مل کر ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد تقسیم کے دوران بیا پور میں امن و امان قائم رکھنا تھا اور غیر مسلموں کی جان و مال و عزت کا تحفظ کرنا تھا۔ انہوں نے لالہ کشن مل کو ذاتی ضمانت دی۔ ”لالہ جی آپ جانتے ہیں دلاور خان بات کا دھنی ہے میں قرآن پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں پہلے دلاور خان کی لاش گرے گی اس کے بعد آپ کے گھر کی اینٹ کو نقصان ہوگا۔“

لالہ کشن مل یہ سن کر پریشان تھے کہ یہ علاقہ پاکستان میں شامل ہو رہا ہے اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ ان کی برادری سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف کیا منصوبے بنا رہی ہے۔ لازمی بات ہے مسلمانوں کی طرف سے بھی اس کے ردعمل کا اظہار ہوگا اور اس کا خمیازہ انہیں اور دوسرے غیر مسلموں کو بھگتنا پڑے گا۔ جیسے ہی تقسیم کے منصوبے کا اعلان ہوا وہ اور اس علاقے میں رہنے والے دوسرے غیر مسلم خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اس لیے جب خان صاحب نے انہیں تسلی دی تو ان کے دل کو ڈھارس ہوئی۔ یہ ان کے پرکھوں کی سرزمین تھی جسے وہ چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں دلاور خان کی بات کا پورا اعتبار تھا پھر وہ مسلم قوم کے مزاج آشنا بھی تھے۔ صدیوں سے ان کے آبا و اجداد مسلمانوں کے بہت قریب رہتے آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مسلمان جذباتی ہو کر کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے تھے لیکن وہ منصوبہ بنا کر کسی دوسری قوم کا بے رحمانہ قتل عام نہیں کر سکتے تھے۔ بادشاہوں کی بات اور تھی جو اپنے مخالفوں کے خلاف طاقت کا استعمال ضروری سمجھتے تھے۔

لالہ کشن مل مہیش کی وجہ سے زیادہ خوف زدہ تھے کیونکہ اس کا تعلق جن سنگھیوں سے تھا اور یہ بات سارا علاقہ جانتا تھا۔ بعد میں مہیش کا یہ تعلق ان کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ ایسا کوئی خطرہ سامنے آیا جو مہیش کے لیے ہو تو وہ اسے اس کی ننھیال دہلی بھیج دیں گے۔ خواہ انہیں اکیلے یہاں رہنا پڑے۔ مگر خود مہیش ان کے قابو سے باہر ہو گیا تھا، اس کی سرگرمیاں پراسرار تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر سے غائب رہتا اور جب واپس آتا تب بھی اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ اس دوران جب اس کی لالہ جی سے بات ہوئی اس نے ایک ہی مطالبہ کیا۔ ”باپو جی آپ خان دلاور سے تعلق ختم کر دیں۔ آنے والے وقت میں یہاں ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہے گا۔“

لالہ جی امن پسند آدمی تھے مہیش کی خوفناک باتیں سن کر وہ ڈر جاتے تھے اور انہیں لگتا کہ مہیش اپنے ہی جنون کا شکار ہو جائے گا۔ وہ اس کے لیے پریشان تھے جبکہ مہیش کا کہنا تھا وہ اس کی فکر نہ کریں اسے کچھ نہیں ہوگا۔ تقسیم کے منصوبے کا اعلان ہونے کے بعد یہ پریشانی اور بھی بڑھ گئی تھی لیکن خان صاحب کی تسلی نے لالہ جی کو مطمئن کر دیا تھا۔ دو دن بعد جب مہیش گھر آیا تو لالہ جی نے اسے بلا کر خوش خبری سنائی۔ اس نے سن کر ایک قہقہہ لگایا۔ ”باپو جی ہم خان دلاور کو ایسی کوئی تسلی نہیں دے سکتے۔ اب ان مسلوں کے لیے ہمارے پاس سوائے ہتھیار کے اور کچھ نہیں ہے۔“

”مہیش۔“ لالہ جی چلائے۔ ”تو پاگل ہو گیا ہے تجھے معلوم ہے بیا پور اور پورا گورداسپور پاکستان میں شامل ہو رہا ہے۔“

”میرے بھولے باپو جی آپ کو کچھ نہیں معلوم بیا پور اور گورداسپور پاکستان میں نہیں انڈیا میں شامل ہو رہا ہے اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ بس چودہ اگست کا دن آنے دیں اس کے بعد یہاں موجود ایک بھی مسلمان زندہ نہیں رہے گا۔ ہم نے ساری تیاری کر لی ہے۔ چن چن کر ماریں گے۔“

لالہ جی بیٹے کی باتیں سن کر ڈر رہے تھے۔ ”مہیش تو پاگل ہو گیا ہے، کیا کہہ رہا ہے۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں باپو جی۔“ مہیش نے صاف کہا۔ ”کانگریس کی اعلیٰ قیادت نے کچھ شرائط پر تقسیم کے منصوبے کی منظوری دی تھی ان میں سے ایک شرط گورداسپور اور فیروز پور کی انڈیا میں شمولیت تھی۔ آنے والے دنوں میں جب پاکستان مہاجروں کے لٹنے پٹے سیلاب کا سامنا کر رہا ہوگا تب ہم اس کا پانی بھی بند کر دیں گے۔“

مہیش اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اس نے دو سال پہلے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ وہ کوئی عام جاہل ہندو نہیں تھا۔ ملکی سیاست اور حالات پر اس کی گہری نظر تھی۔ لیکن تعصب اور مذہبی جنونیت نے اس کے علم کو اپنے تابع کر لیا تھا اور وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان لوگوں کے قتل عام کے لیے تیار ہو گیا تھا جو صدیوں سے اس کے آبا و اجداد کے ساتھ رہتے آئے تھے۔ لالہ جی بھی لاعلم تھے کہ مہیش جن سنگھ پریوار کی مقامی شاخ کا صدر تھا اور یہاں ہونے والے تمام کاموں کی نگرانی اور ذمے داری اسی پر تھی۔ تقسیم کے موقع پر ہونے والے قتل عام اور بلووں کا پروگرام نہ صرف اس کے علم تھا بلکہ اس پروگرام کا ایک بہت بڑا حصہ اس نے تشکیل دیا تھا۔ خاص طور سے بیا پور کے مسلمانوں سے نمٹنے کا کام اس نے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ذمے لے رکھا تھا۔ اس کے لیے اس نے علاقے کے ہندوؤں اور سکھوں کا ایک خاص دستہ ترتیب دیا تھا جو تیرہ اگست کی رات لالہ جی کی حویلی میں جمع ہوتا اور پھر صبح سویرے جب مسلمان اپنے گھروں میں بے خبر پڑے سو رہے ہوتے تو یہ ان پر ٹوٹ پڑتا۔ اگر لالہ جی اس کے اصل منصوبے سے واقف ہو جاتے تو شاید مارے خوف کے ان کا دم ہی نکل جاتا۔ ان کے خیال میں مہیش کی باتیں دیوانے کی بڑ سے زیادہ نہیں تھیں۔ دوسری طرف مہیش لالہ جی کو ایک ایسا احمق ہندو سمجھ رہا تھا جس میں انسانیت کچھ زیادہ ہی تھی اور اسے آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں تھا۔

سارہ اور سرینا کا انٹر کا نتیجہ آ گیا اور دونوں نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ سرینا کا آگے پڑھنے کا ارادہ تھا لیکن سارہ جانتی تھی اس نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا تھا۔ ایک تو خانم اسے مزید آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دے گی دوسرے ملک کے حالات غیر یقینی تھے۔ جولائی کے وسط تک خان صاحب اور دوسرے مسلمان عمائدین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے کیونکہ گورداسپور کی مختلف تحصیلوں میں تھانوں سے مسلمان نفری کو ہٹا کر وہاں ہندو اور سکھ تعینات کیے جا رہے تھے۔ مسلمان سپاہیوں سے اسلحہ لے کر ان کو دفتری قسم کے کاموں میں لگا دیا تھا۔ اسی طرح ضلع کی دوسری اہم پوسٹوں سے مسلمانوں کو ہٹا کر ان کی جگہ کٹر ہندوؤں اور سکھوں کو لایا جا رہا تھا۔ خان صاحب اور حالات کو سمجھنے والے دوسرے مسلمان پریشان تھے کہ جب گورداسپور پاکستان میں شامل ہونے جا رہا تھا تو اس قسم کی انتظامی تبدیلیاں کیوں کی جا رہی تھیں۔ جو ذرا سمجھدار تھے انہوں نے بوریا بستر باندھنا شروع کر دیا تھا لیکن اکثریت ناواقف اور سادہ لوح مسلمانوں کی تھی جو اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ ان کا علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا اور وہ آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں گے۔ وہ سب مارے گئے۔

اگست کا مہینا شروع ہوا تو حالات پہلے سے زیادہ خراب دکھائی دینے لگے تھے۔ مسلم علاقوں میں بلوائی جتھے گشت کرنے لگے تھے اور جہاں کوئی اکا دکا مسلمان نظر آتا اسے کاٹ پیٹ کر رکھ دیتے تھے۔ ایسے گھر جو آبادی سے باہر تھے وہاں حملہ کر کے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیتے اور عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ ان حالات نے سب کو سہما دیا تھا اور مسلمان احتیاطی تدابیر کرنے لگے تھے۔ یہ تو اگست کے دوسرے ہفتے میں واضح ہو گیا تھا کہ گورداسپور پر انڈیا کا قبضہ ہوگا یا یہ علاقہ اسے دے دیا جائے گا لیکن ابھی تک سرکاری اعلان نہیں ہوا تھا، ایک گومگوں کی کیفیت برقرار تھی اور فساد کے منصوبہ ساز یہی چاہتے تھے تاکہ مسلمان اسی کیفیت میں اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کر سکیں۔ اگر ایک مہینا پہلے بھی اعلان ہو جاتا کہ گورداسپور انڈیا کو دیا جا رہا ہے تو مسلمانوں کی بڑی تعداد ہجرت کر کے اپنی جان بچا سکتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ ملین مسلمان یوں بے بسی سے نہ مارے جاتے اور پچاس ہزار سے زیادہ عفت مآب خواتین اغوا ہو کر ذلتوں سے نہ گزرتیں اور ہماری تاریخ کا ایک دردناک باب رقم نہ ہوتا۔

خان صاحب پاکستان کے لیے اپنی مخالفت بھول گئے تھے اور اب ان کو اپنی اور اپنے لوگوں کی جان کی فکر تھی کیونکہ غیر جانبدار رہنے کا صلہ نہ تو ان کے پڑوسی ہندو اور سکھ دینے کو تیار تھے اور نہ برٹش حکومت جس کے لیے خان صاحب جیسے لوگوں نے اپنوں کے مفادات کو زک پہنچائی تھی۔ جب برا وقت آیا تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے تھے سارے محمود و ایاز اور کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ اس وقت شیدو موچی جتنا غیر محفوظ تھا، اتنا ہی غیر محفوظ خان دلاور بھی تھا۔ اسی چیز نے سب کو متحد کر دیا تھا۔ خطرے کا احساس کرتے ہی بیاپور کے مسلمان مل کر سوچ بچار کرنے لگے کہ اگر ان کے گاؤں پر حملہ ہوا تو وہ کیا کریں گے۔ جوشیلے نوجوان لڑ مرنے کو تیار تھے۔ روایتی ہتھیار جیسے لاٹھی، کلہاڑی، درانتی اور خنجر چاقو سب کے پاس تھے لیکن آتشیں اسلحہ، تلوار اور نیزے جیسا مہلک اسلحہ بہت کم لوگوں کے پاس تھا کیونکہ اسے رکھنے کے لیے سرکار کی اجازت لازمی تھی اور مسلمانوں کو اس کی اجازت مشکل سے ملتی تھی۔

بیاپور میں مشکل سے ہزار مسلمان تھے ان میں سے جوانوں کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ نہیں تھی۔ نصف تو عورتیں تھیں اور باقی پچیس فیصد بوڑھے اور بچے تھے۔ خان دلاور کے پاس دو رائفلیں تھیں لیکن اچانک ہی ایک دن پولیس کی پارٹی آئی اور سرکاری حکم کے تحت خان دلاور کی دونوں رائفلیں لے لی گئیں۔ یہ اتنا اچانک ہوا کہ وہ احتجاج بھی نہ کر سکے اور احتجاج بھی کس سے کرتے کیونکہ انتظامیہ میں تمام پرانے لوگ بدلے جا چکے تھے۔ انگریز بوریا بستر سمیٹ کر جا چکے تھے اور جو اکا دکا تھے وہ عضو معطل بنے ہوئے تھے۔ مسلم اہلکاروں اور افسران کو چھٹی پر یا تبادلے پر بھیج دیا گیا تھا۔ ہر جگہ جن سنگھی ہندو یا سکھ بیٹھے تھے۔ اس اقدام سے خان دلاور کا رہا سہا شک بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب صرف ایک چیز انہیں

اور ان جیسے دوسرے مسلمانوں کو روکے ہوئے تھی کہ ابھی تک سرکاری اعلان کے مطابق گورداسپور پاکستان کا حصہ تھا اور ابتدائی نقشوں میں ایسا ہی دکھایا گیا تھا۔ اس کے باوجود خان دلاور نے مسلمانوں سے کہہ دیا کہ وہ ہجرت کی تیاری کریں۔ جیسے ہی اعلان ہو ہر فرد اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل کھڑا ہو۔

بیاپور سے کچھ ہی دور راوی بہہ رہا تھا۔ بارشوں کا موسم تھا اور اس سال بارشیں بھی بے حساب ہوئی تھیں۔ اس لیے دریا پوری طرح چڑھا ہوا تھا۔ غنیمت تھا کہ وہ اپنے کناروں سے ابلا نہیں تھا لیکن اس وقت اسے کشتی کی مدد سے عبور کرنا بھی بہت مشکل کام تھا۔ دریا کے ساتھ ہی ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی جس میں کوئی دو درجن گھرانے تھے وہیں ان کی کشتیاں بھی ہوتی تھیں۔ یہ سب مسلمان ماہی گیر تھے۔ خان دلاور نے چپکے سے اپنے آدمی ان کے پاس بھیجے تھے کہ اگر موقع پڑے تو وہ انہیں دریا عبور کرا دیں گے۔ مگر وہ سوچ رہے تھے کہ ضرورت پڑنے پر ہزار سے بھی زیادہ مسلمان کس طرح تیزی سے دریا عبور کر سکیں گے جبکہ بارش کی وجہ سے راستے بھی خراب تھے اور دریا چڑھا ہوا تھا۔

ایک طرف حالات کشیدہ تھے اور آنے والے کل کا پتا نہیں تھا کہ وہ اس علاقے کے لیے کیا لے کر آتا ہے تو دوسری طرف سرینا اور سارہ کو بس یہی فکر تھی کہ وہ بچھڑ نہ جائیں۔ وہ جب ملتیں ان کی گفتگو کا موضوع یہی ہوتا تھا۔ سارہ نے سرینا کے گھر جانا بہت کم کر دیا تھا، زیادہ تر وہی آتی تھی مگر وہ بھی کئی کئی دن بعد آ رہی تھی۔ سارہ کو خان صاحب نے حویلی سے باہر جانے سے منع کر دیا تھا خاص طور سے جب وہ خود گھر میں نہ ہوں۔ یہ اگست کا دوسرا ہفتہ تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور شدید حبس ہو رہا تھا۔ سرینا آئی اور سارہ کو لے حویلی کی چھت پر آ گئی۔ یہاں ان کی باتیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ حبس کی شدت کچھ کم تھی مگر اس سے زیادہ حبس ان کے اندر تھا۔ سرینا رونے والی ہو رہی تھی۔ "سارہ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، پتا نہیں کیا ہونے جا رہا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" سارہ نے اسے تسلی دی۔ "بابا کہہ رہے تھے کہ بیاپور پاکستان میں شامل ہوگا اور تم لوگوں کی حفاظت بابا خود کریں گے۔"

"تو نہیں جانتی۔" سرینا بولی۔ "بھائی کہہ رہا تھا کہ بیاپور اور پورا گورداسپور انڈیا میں شامل ہوگا اور اس کے بعد یہاں بہت خون خرابا ہوگا۔ کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

سارہ دہل کر رہ گئی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ بابا کچھ دن سے بہت پریشان تھے اور وہ کچھ بتا بھی نہیں رہے تھے۔ اب سرینا کے انکشاف نے اسے ہلا دیا تھا۔ یقیناً خان صاحب اسی وجہ سے پریشان تھے۔ اس نے خوف زدہ انداز میں کہا۔ "تو سچ کہہ رہی ہے؟"

"ہاں۔" سرینا نے اپنے آنسو صاف کیے۔ "اسی بات نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے ورنہ میں تو خوش تھی کہ بیاپور پاکستان میں شامل ہوگا اور باپوجی نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں سے نہیں جائیں گے مگر اب......"

سرینا نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن سارہ سمجھ گئی تھی وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اگر بیاپور انڈیا میں شامل ہو گیا تو انہیں یہاں سے جانا ہوگا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ "نہیں ایسا نہیں ہوگا، بیاپور پاکستان میں شامل ہوگا۔"

"سارہ مجھے ڈر لگ رہا ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ بھائی کہہ رہا ہے کہ ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں کو یہاں سے مار کر نکالنے کی ساری تیاری کر لی ہے۔"

"لیکن ہم یہاں سے کیوں جائیں۔" سارہ کو غصہ آ گیا تھا۔ "یہاں ہماری زمین ہے ہمارے پرکھوں کی قبریں ہیں۔"

سرینا نے سارہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ خود اس کا بھائی مسلمانوں کے خلاف ہے اور وہ بھی انہیں یہاں سے نکالنے کی بات کرتا ہے بلکہ وہ انہیں سارہ اور اس کے گھر والوں سے تعلق رکھنے سے بھی منع کرتا ہے۔ گزشتہ رات جب وہ گھر آیا تو اس نے لالہ کشن مل اور سرینا کو واضح طور پر منع کر دیا تھا کہ وہ اب سارہ اور اس کے گھر والوں سے نہیں ملیں گے۔ سرینا نے انکار کیا تو مہیش نے زندگی میں پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس نے سرینا کو تھپڑ مارا اور غضب ناک انداز میں کہا۔ "بکواس مت کر، اب تو ان مسلوں کے گھر گئی تو میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"میں تو بچپن سے وہاں جاتی رہی ہوں۔" سرینا نے روتے ہوئے کہا۔

"پچھلی باتیں بھول جا، اب وہ ہمارے دشمن ہیں اور کچھ دن بعد ان کا وجود بھی اس زمین پر باقی نہیں رہے گا۔" مہیش نے کہا اور پھر لالہ کشن مل سے بولا۔ "باپو تیرہ اگست کی رات میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آؤں گا حویلی کا آگے والا حصہ کھول کر رکھنا۔ میں کسی وقت بھی آ جاؤں گا۔"

لالہ کشن مل نے پوچھنا چاہا کہ وہ کن کو لے کر حویلی میں آئے گا لیکن مہیش نے باپ کے سوال کا جواب دینا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ضروری نہیں سمجھا اور سرینا کو گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ سرینا کے ذہن میں یہ ساری باتیں گردش کر رہی تھیں اور وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس نے سارہ کو بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔ اب اسے پتا چلا کہ اس کا باپ پچھلے کچھ دنوں سے کیوں اتنا پریشان تھا۔ یقیناً خان صاحب کو بھی یہی سب معلوم ہو گیا تھا۔ اچانک سرینا نے سارہ سے کہا۔

''سن، اگر یہ پورا انڈیا میں شامل ہو گیا تو مجھ سے وعدہ کر تو یہاں سے چلی جائے گی۔''

''نہیں۔''

''تجھے میری قسم، میں تجھے کچھ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

''میں نہیں جاؤں گی، میں تجھ سے دور نہیں رہ سکتی۔''

دونوں سہیلیاں گلے مل کر رونے لگیں۔ ان کے بس میں اس سے زیادہ اور کچھ تھا بھی نہیں۔ جاتے وقت سرینا نے کہا۔ ''اس وقت بھی میں چھپ کر آئی ہوں۔ پتا نہیں اب آسکوں یا نہیں۔ بھائی نے مجھے اور باپو کو تم لوگوں سے ملنے سے منع کر دیا ہے۔''

''میں بھی تیرے گھر نہیں آسکتی، بابا نے گھر سے نکلنے سے منع کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں حالات ٹھیک نہیں ہیں آس پاس بلوائی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرتے پھر رہے ہیں۔''

اگرچہ سارہ نے اس انداز سے نہیں کہا تھا لیکن سرینا شرمندہ ہو گئی۔ یہ اس کے ہم قوم تھے جو اپنے ہی پڑوسیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔۔ وہ سارہ سے گلے مل کر وہاں سے نکل آئی تھی۔ ماں نے اسے منع کر دیا تھا کیونکہ ماں ڈرتی تھی اگر مہیش کو پتا چل گیا تو وہ اس کے ساتھ پھر برا سلوک کرے گا۔ مہیش وحشی قسم کا شخص تھا جسے بہن اور ماں باپ کی پروا نہیں تھی۔ وہ باپ سے یوں پیش آتا جیسے خود اس کا باپ ہو۔ سرینا بھی اس سے ڈرنے لگی تھی کیونکہ وہ عام حالات میں بھی اس سے درشتی سے پیش آتا تھا۔ ان دنوں اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی خراب تھا۔

تیرہ اگست کے دن موسم صبح سے بارش والا تھا۔ شام سے ذرا پہلے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش اتنی شدید تھی کہ ذرا سی دیر میں سب جل تھل ہو گیا تھا۔ بجلی رہ رہ کر کڑک رہی تھی اور سرِشام ہی ماحول تاریک ہو گیا تھا۔ سرینا کی طبیعت صبح سے عجیب سی ہو رہی تھی، ایک بے کلی تھی جو اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ سارہ کے گھر جائے لیکن اسے معلوم تھا کہ آج مہیش آئے گا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ دن میں نہ آجائے اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ سارہ کے گھر گئی تھی تو وہ اسے پھر مارے گا۔ پھر بارش شروع ہو گئی اور ایسے میں ماں اسے باہر کہاں جانے دیتی؟ رات ہونے تک باہر جل تھل ہو گیا تھا۔ پھر بارش رک گئی لیکن آسمان پر بادل رہے تھے جس سے ماحول تاریک لگ رہا تھا۔ سرینا اپنے کمرے میں دبکی ہوئی تھی، اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ماں نے کہا تو اس نے منع کر دیا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ماں جی بس دل گھبرا رہا ہے۔'' سرینا نے کہا۔

''اچھا دودھ پی کر سو جا۔''

ماں کے اصرار پر اس نے دودھ پی لیا اور لیٹ گئی پر نیند آنکھوں سے دور تھی۔ گیارہ بجے کے بعد دوبارہ ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا مگر سرینا نے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سن لی تھی اور آوازیں بتا رہی تھیں کہ آنے والے کئی تھے۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر کھڑکی تک آئی۔ اس کا کمرا مردانے سے کچھ ہی دور تھا۔ مردانے میں جانے والا راستہ اس کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتا تھا۔ اس نے دیکھا یکے بعد دیگرے کئی سائے مردانے میں گئے تھے اور ان کے پاس ہتھیار تھے۔ کئی رائفلوں سے مسلح تھے اور باقیوں نے نیزے اور دوسرے ہتھیار اٹھا رکھے تھے۔ سرینا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا، اگر یہ وہی لوگ تھے جن کے بارے میں مہیش نے بتایا تھا تو ان کا اس طرح مسلح ہو کر آنا اچھا شگون نہیں تھا۔ آخر وہ کس لیے یوں مسلح ہو کر آئے تھے۔ سرینا کچھ دیر سوچتی رہی پھر دبے قدموں کمرے سے باہر آئی تو نشست گاہ سے لالہ کشن مل اور مہیش کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لالہ کشن مل کہہ رہے تھے۔ ''مہیش تو ان غنڈے بدمعاشوں کو کیوں لایا ہے اس گھر میں......؟''

''باپو جی اس معاملے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے آپ شانت ہو کر بیٹھیں۔ کل تک آپ کی زمین میں دوگنے سے بھی زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔''

''کیا کہہ رہا ہے مہیش۔'' لالہ جی کی آواز کانپنے لگی۔ ''تو کیا کرنے جا رہا ہے، ان مسلح غنڈوں کو کیوں لایا ہے؟''

''باپو جی آج رات خان دلاور اور اس کا خاندان باقی نہیں رہے گا۔'' مہیش کا لہجہ جنونی ہو رہا تھا۔

''مہیش!'' لالہ جی چلائے۔ ''تو نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں اسے اپنا دوست کہتا ہوں۔''

''باپو جی وہ صرف ایک مسلا ہے اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تیرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میرا تو ہے۔'' لالہ جی کھڑے ہو گئے۔ ''مہیش میں وہ سب نہیں ہونے دوں گا جو تو چاہتا ہے۔ اس حویلی اور اس گاؤں سے باہر تو جو چاہے کر لیکن یہاں کسی آدمی کو ہاتھ بھی مت لگانا۔''

''باپو جی یہ تو ہو کر رہے گا، آپ یا کوئی اور اسے نہیں روک سکے گا۔'' مہیش نے خطرناک لہجے میں کہا۔ سرینا کا سر گھوم رہا تھا، اس کا بھائی مہیش، خان چاچا کی حویلی پر حملہ کرنے کے لیے آدمی لے کر آیا تھا۔ ان کی تعداد کم سے کم بھی درجن بھر تھی۔ وہ پوری طرح مسلح تھے اور خان دلاور کی حویلی میں کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لالہ جی اور مہیش کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن سرینا کچھ نہیں سن رہی تھی، اس کے ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی۔ اسے ہر صورت میں سارہ اور اس کے گھر والوں کو خبردار کرنا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ لالہ جی کی آواز اچانک بند ہو گئی ہے۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آئی، اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کھڑکی سے باہر نکل گئی۔ حویلی کا ایک پچھلا دروازہ بھی تھا جو عام طور سے بند رہتا تھا، اس پر تالا لگا رہتا تھا لیکن اس کی چابی پیچھے برآمدے میں لٹکی رہتی تھی۔ خطرہ صرف رات کو وہاں سونے والے ملازم سریش سے تھا۔ وہ بوڑھا تھا اور ساری رات جاگتا اور کھانستا رہتا تھا۔

مگر اس وقت خوش قسمتی سے وہ اپنی چارپائی پر نہیں تھا شاید کسی حاجت سے کہیں گیا تھا۔ سرینا نے جلدی سے چابی اتاری اور عقبی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی لیکن مسلسل جاری تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے خان دلاور کی حویلی تک آئی اور دروازہ بجانے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ ایک نوکر کریم بخش دروازے کے پاس ہی چھپر تلے ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد کریم بخش نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے اس وقت؟''

''کریم چاچا میں ہوں سرینا دروازہ کھولو جلدی......''

کریم بخش سرینا کی آواز اچھی طرح پہچانتا تھا۔ پھر بھی اس نے تصدیق کی اور پھر دروازہ کھولا۔ سرینا اندر گھس گئی۔

''خان چاچا کہاں ہیں؟''

''وہ اندر ہیں، شاید سو رہے ہیں۔'' کریم بخش نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ لیکن خان صاحب جاگ رہے تھے۔ وہ حویلی کے برآمدے میں موجود تھے اور انہوں نے کریم بخش کو دروازہ کھولتے اور سرینا کو آتے دیکھ لیا اور خود بھی چلے آئے۔

''سرینا پتر، تو اس وقت...... خیریت تو ہے لالہ جی ٹھیک ہیں؟''

''ہاں خان چاچا، بابا ٹھیک ہیں پر میں آپ سے کچھ کہنے آئی ہوں۔''

سرینا کے لہجے میں بدحواسی محسوس کر کے خان صاحب اسے اندر لے آئے۔ ''کیا بات ہے، آرام سے بتا......''

''خان چاچا وقت نہیں ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ہندو اور سکھ غنڈے آپ کی حویلی پر حملہ کریں گے اور سب کو مار دیں گے۔'' سرینا رونے لگی۔ ''بھگوان کے لیے آپ لوگ جلدی سے یہاں سے چلے جائیں۔''

سرینا جس حال میں پہنچی تھی اور اس کا لہجہ خود گواہی دے رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ خان صاحب نے اپنے حواس بحال رکھے۔ ''سرینا تجھے کیسے پتا چلا؟''

اس سوال پر سرینا کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئی لیکن وہ چھپا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے دکھی لہجے میں بتایا کہ حملے کا منصوبہ بنانے والا کوئی اور نہیں اس کا اپنا بھائی مہیش ہے اور اس وقت اس کے دو درجن سے زیادہ مسلح ساتھی لالہ کشن مل کی حویلی میں موجود ہیں۔ جب وہ حویلی سے نکلی تو لالہ جی بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خان صاحب مہیش کے بارے میں پہلے بھی جانتے تھے کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا جن سنگھیوں میں ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ انہیں بچپن سے چاچا کہنے والا اور ان کی گود میں بیٹھنے والا ان کے دوست کا لڑکا ان کی حویلی پر حملہ کرنے اور ان سب کو مارنے کا ارادہ کرے گا۔ صدمہ شدید تھا لیکن یہ وقت صدمے میں گنوانے کا نہیں تھا۔ خان صاحب نے فوراً ایک نوکر کو گاؤں کی طرف روانہ کیا کہ وہ سب کو ہوشیار کر دے اور پھر خانم اور سارہ کو اٹھانے چلے گئے۔

سرینا کے لیے ایک ایک لمحہ بے چینی سے گزر رہا تھا۔ اگر مہیش اور اس کے ساتھی حملہ کر دیتے تو وہ سب حویلی میں پھنس کر رہ جاتے۔ ان کا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ کچھ دیر بعد سارہ بھی باہر آگئی، وہ سرینا سے گلے لگ کر رونے لگی۔ خان صاحب نے اسے اور خانم کو سوتے سے اٹھا کر روانگی کا کہا تھا۔ ان کا خاص سامان پہلے ہی پیک تھا۔ ایک دھاتی ٹرنک میں قیمتی اشیا جیسے سونا، رقم اور زمینوں کے کاغذات تھے۔ خان صاحب نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اگر ایسا موقع آیا تو وہ خانم اور سارہ کو نوکروں کے ساتھ روانہ کر دیں گے اور خود یہاں گاؤں والوں کے ساتھ نکلیں گے۔ اس مقصد کے لیے ایک تانگا اور دو نوکر پہلے سے تیار تھے۔ یہ انہیں دریا کی طرف لے جاتے اور دریا پار کرا کے خان صاحب کے ایک دوست زمیندار کے پاس چھوڑ آتے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سارہ رو رہی تھی۔ ”سرینا میں تیرے بغیر کیسے رہوں گی؟“

”جیسے میں تیرے بغیر رہوں گی۔“ سرینا نے حوصلے سے کہا۔ ”سارہ تو زندہ اور سلامت رہے میرے لیے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔“

اسی وقت کریم بخش دروازے کی طرف سے دوڑتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے خان صاحب سے کہا۔ ”خان جی دروازے پر بلوائی جمع ہو رہے ہیں ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔“

خان صاحب کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، انہوں نے سارہ سے کہا۔ ”جلدی کر وتانگا تیار ہے۔“

حویلی کے پچھلی طرف والے دروازے کے ساتھ تانگا اور نوکر تیار تھے۔ ایک نوکر کے پاس غیر قانونی پستول بھی تھا، یہ خان صاحب نے منہ مانگے داموں کہیں سے حاصل کیا تھا اور کسی ایسے وقت کے لیے ہی تھا۔ خانم اور سارہ روتے دھوتے تانگے میں سوار ہوئے، دروازہ کھلا خان صاحب نے پہلے باہر کا جائزہ لیا کہ کہیں بلوائی پچھلی طرف بھی تو نہیں آ گئے تھے لیکن اس وقت یہاں دور تک کوئی نہیں تھا اس لیے خان صاحب نے نوکروں کو روانگی کا حکم دیا۔ تانگا روانہ ہوا اور حویلی کا دروازہ بند ہو گیا۔ سارہ اور خانم کو اللہ کے سپرد کر کے خان صاحب واپس آئے تو نوکر مقابلے کی تیاری کر رہے تھے۔ سرینا پھنس گئی تھی وہ سامنے سے باہر نہیں جا سکتی تھی اور عقبی طرف سے جاتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا۔ حویلی میں خان صاحب سمیت کل سات مرد تھے۔ وہ سب لاٹھیوں اور دوسرے دھار والے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ سرینا نے ان کو بتا دیا تھا کہ حملہ آوروں کے پاس آتشیں ہتھیار بھی تھے اس لیے سب ہی خوف زدہ تھے۔

”سرینا بیٹا تیرا یہی احسان بہت ہے کہ تو نے بروقت خبردار کر دیا۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”لیکن اب تو چلی جا۔“

”میں کیسے جاؤں؟“

”ایسا کر پیچھے سے چلی جا۔“

”خان چاچا، مجھے اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“

خان صاحب نے سوچا اور پھر بولے۔ ”چل تجھے میں چھوڑ آؤں۔“

سرینا خان صاحب کے ساتھ حویلی کے پچھلے دروازے سے نکلی۔ دونوں حویلیاں پاس پاس تھیں۔ جیسے ہی وہ دونوں حویلیوں کے درمیان پہنچے اچانک ہی ایک طرف درختوں سے چند گھڑ سوار نمودار ہوئے۔ خان صاحب چلائے۔ ”سرینا بھاگ......“

سرینا بے اختیار اپنی حویلی کی طرف بھاگی تھی لیکن اسے زیادہ دور جانا نصیب نہیں ہوا، ایک گھڑ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے پاس آیا اور اسے اچک کر گھوڑے پر ڈال لیا۔ مارے خوف کے سرینا پر غشی طاری ہونے لگی تھی اور پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اسی بے ہوشی کی کیفیت میں اس نے محسوس کیا کہ وہ بے انتہا اذیت سے گزر رہی ہے۔ اس کا نازک وجود درندوں میں گھرا ہوا ہے اور یہ درندے اس کے گوشت اور خون سے اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھے، وہ ہوش میں کہاں تھی۔ پھر اسے ہوش آیا تو وہ حویلی میں تھی اور ماں کو سکتہ طاری تھا۔ مہیش غائب تھا۔ سرینا پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور دوسری قیامت یہ جان کر ٹوٹی کہ کسی نے لالہ جی کو حویلی کے باہر قتل کر دیا تھا اور پھر وہ بے ہوشی کی حالت میں حویلی کے سامنے پائی گئی تھی۔ یہ دو دن پرانی بات تھی۔ وید کی کوششوں سے اسے ہوش آیا تھا۔ مہیش باپ کے قتل اور اس کی بے آبروئی کے بعد پاگل ہو کر کہیں نکل گیا تھا۔

چند دن بعد جب سرینا کی حالت اس قابل ہوئی کہ وہ باہر نکل سکے تو اسے پتا چلا کہ خان چاچا کی حویلی جلا کر خاکستر کر دی گئی تھی اور حویلی میں موجود لوگوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بیاپور کے مسلمان یہاں سے جا چکے تھے اور جو نہیں گئے تھے وہ مارے گئے تھے۔ اب بیاپور میں ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہا تھا۔ مہیش کی وحشت ناک صورت ایک ہفتے بعد دکھائی دی تھی اور اس نے آتے ہی سرینا کو بہت مارا تھا، وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کی ہمدردی میں بھاگی گئی تھی جنہوں نے اس کے باپ کو قتل کیا اور پھر اسے بے آبرو کر دیا۔ سرینا روتی رہی اسے کچھ نہیں معلوم تھا لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ اس کے باپ کے اور آبرو کے قاتل خان چاچا کی حویلی یا ان سے کوئی تعلق رکھتے تھے۔ کوشلیا زیادہ دن زندہ نہیں رہی تھی۔ بیوگی اور بیٹی کے صدمے نے اس کی جان بھی لے لی تھی۔ دو بھرے پرے گھر چند دن میں اجڑ کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

راج کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر ضبط کر رہا تھا۔ عورت جو سرینا سورج تھی، اب خاموش تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ”دادی ماں تم نے پہلے نہیں بتایا تمہارے ساتھ یہ سب ہوا تھا؟“

”ہاں اس رات ایک نہیں دو گھر اجڑ گئے تھے۔“ سرینا نے سرد آہ بھری۔ ”ایک گھر ہمارا تھا اور دوسرا سارہ کا۔“

”خان دلاور کا گھر۔“ راج نے تلخی سے کہا۔ ”وہی تو اس تباہی کا ذمے دار تھا۔“

سرینا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”راج تو بھی اپنے دادا کی زبان بول رہا ہے۔ یہ سب تو اس نے کیا تھا، خان چاچا کی حویلی پر حملہ کرنے کے لیے آدمی وہ لایا تھا۔“

”لیکن بڑے دادو کا قتل اور پھر تمہارے ساتھ جو ہوا اس کا ذمے دار تو خان دلاور ہی تھا۔“

سرینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے یقین نہیں ہے راج! تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا تھا اور مجھے یقین ہے وہ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”مگر خان دلاور نے خود کچھ نہیں کیا تو کسی سے کرایا ہو گا۔“ راج اپنی بات پر قائم رہا۔

”تیرے منہ میں اپنے دادا مہیش کی زبان بول رہی ہے۔“ سرینا نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”میں تو سمجھتی تھی کہ تو میری بات سمجھے گا کیونکہ اب اس دنیا میں ایک تو ہی میرا واحد رشتہ ہے۔“

راج خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سرینا نے شادی نہیں کی تھی۔ مہیش نے بعد میں اس پر زور دیا کہ وہ شادی کے لیے مان جائے لیکن سرینا کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ کسی شریف آدمی کی بیوی بن سکے۔ مہیش نے لالہ کشن مل کی زمین اور حویلی فروخت کر دی تھی کیونکہ یہ سکھوں کا علاقہ تھا۔ وہ خود دہلی آ گیا اور یہاں کاروبار کرنے لگا۔ اس نے اپنے ایک جن سنگھی ساتھی کی بہن سے شادی کر لی تھی لیکن وہ آوارہ نکلی۔ جو خود کرتی تھی اس کے طعنے سرینا کو دیتی تھی۔ سرینا خاموشی سے اس کی باتیں برداشت کرتی لیکن ایک دن مہیش نے بیوی کی باتیں سن لیں۔ اس نے غصے میں آ کر اسے گھر سے نکال دیا اور اپنا بیٹا راجیش اس سے چھین لیا۔ اس کے چند مہینے بعد مہیش کی بیوی اپنے میکے میں قتل کر دی گئی اور اس کے دو ہفتے بعد مہیش آگرے سے دہلی آتے ہوئے راستے میں نامعلوم حملہ آوروں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ پولیس کے مطابق دونوں قتل کا آپس میں تعلق تھا لیکن اس سے زیادہ پولیس بھی معلوم نہیں کر سکی تھی۔

راجیش سرینا کی ذمے داری بن گیا تھا۔ اس نے ماں اور باپ بن کر اسے پالا تھا۔ ہائی اسکول کے بعد راجیش فوج میں چلا گیا تھا اور ان ہی دنوں سرینا نے اس کی شادی بھی کر دی تھی۔ سیاچین کی جنگ چھڑنے کے بعد کرنل راجیش کو محاذ پر بھیج دیا گیا اور وہاں سے اس کی لاش واپس آئی تھی۔ سرینا کے لیے یہ ایک اور صدمہ تھا۔ راجیش سے اسے اولاد جیسی محبت تھی۔ اس کی نو عمر بیوہ پریتو اب سرینا کی ذمے داری تھی لیکن اس کے گھر والے اسے لے جانا چاہتے تھے۔ پھر پتا چلا کہ وہ امید سے ہے۔ سرینا نے اسے خوش رکھنے کے لیے بہتر سمجھا کہ اسے اس کے میکے بھیج دے۔ پریتو نے وہیں راج کو جنم دیا۔ سرینا اسے دیکھنے گئی تو راج کو اس کی گود میں ڈال دیا گیا کہ اب اسے وہ لے جائے۔ سرینا حیران تھی کہ کوئی ماں اپنے نومولود بچے کو کسی کے حوالے کر سکتی ہے۔ مگر جلد اسے معلوم ہو گیا کہ پریتو کے گھر والے اس کی شادی کہیں اور کرنا چاہ رہے تھے اور بچہ اس معاملے میں رکاوٹ تھا اس لیے انہوں نے بچے سے نجات حاصل کر لی۔ سرینا کو جینے کا ایک اور سہارا مل گیا اور وہ راج کو لیے واپس آ گئی۔ ویسے بھی سورج خاندان کی دولت اور کاروبار کا مالک وہی تھا۔ کاروبار کی دیکھ بھال سرینا کرتی تھی جو اب بہت پھیل گیا تھا۔ راج اب جوان تھا۔ سرینا اس کی شادی کرنا چاہ رہی تھی لیکن وہ ابھی پڑھنا چاہتا تھا۔ کچھ عرصے پہلے وہ امریکا سے سافٹ ویئر انجینئرنگ کی ڈگری لے کر آیا تھا اور آگے پڑھنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ وقت سرینا کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔

”دادی ماں جب تم خان دلاور کو اس معاملے میں بے قصور سمجھتی ہو تب یہاں کیوں آتی ہو؟“

”کیونکہ اس دریا کے پار کہیں میری سکھی ہے۔ میں اس سے نہیں مل سکتی لیکن اس جگہ کو تو دیکھ سکتی ہوں جہاں وہ آخری بار آئی تھی۔ یہیں مسلمان ماہی گیروں کی ایک بستی تھی جو بعد میں اجاڑ دی گئی۔“

”آپ نے کبھی سارہ سے ملنے کی کوشش نہیں کی؟“

”ضرور کرتی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں ہے۔“ سرینا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”پر اتنے بڑے ملک میں اسے کہاں تلاش کرتی۔“

”دادی ماں تم کہو تو میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں؟“ راج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

سرینا چونک گئی۔ ”تو کیسے تلاش کرے گا؟“

”تم جانتی ہو میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا ماہر ہوں، میں کوئی بھی چیز اور کسی بھی شخص کو تلاش کر سکتا ہوں۔“

سرینا کا چہرہ روشن ہو گیا تھا۔ ”سچ تو سارہ کو تلاش کر سکتا ہے؟“

راج نے سر ہلایا۔ ”کوشش کر سکتا ہوں اور شاید تلاش کر بھی لوں۔“

سرینا کانپنے لگی تھی۔ ”میں مرنے...... سے پہلے ایک بار اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

عین اس وقت جب دریا کے بھارتی کنارے پر سرینا، راج کے ساتھ واپس جارہی تھی اور سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا، پاکستانی کنارے پر ایک لگژری فور وہیل ڈرائیو آکر رکی اور اس سے ایک بوڑھی عورت اور ایک نوجوان نکلے۔ البتہ وردی پوش ڈرائیور اپنی سیٹ پر موجود رہا تھا۔ عورت نے آف وائٹ شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی عمر ستتر برس تھی اور اس عمر میں بھی وہ صحت مند اور سرخ وسفید تھی۔ میک اپ کے بغیر بھی اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں طلائی کنگن اور کانوں میں آویزے تھے۔ نوجوان کی صورت اس سے مشابہہ تھی۔ وہ کسی قدر طویل قامت کا خوش شکل اور ورزشی جسم کا نوجوان تھا۔ اس کی عمر بائیس برس کے آس پاس تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے لائٹ بلیو جینز پر رائل بلیو ٹی شرٹ پہن رکھی تھی آنکھوں پر سن گلاسز تھے۔ اس نے گاڑی سے اتر کر ناقابل یقین نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور عورت سے کہا۔

''دادی جان آپ ہر سال اس ویرانے میں آتی ہیں۔''

''ہاں میرے بچے...... کیونکہ میری زندگی میں بہار کا آغاز اسی ویرانے سے ہوا تھا۔'' عورت نے کہا اور دریا کے کنارے چڑھنے لگی۔ کسی زمانے میں دریا کو اپنی حد میں رکھنے کے لیے یہ پشتہ بنایا گیا تھا لیکن بہت عرصے سے یہ بے مصرف پڑا تھا کیونکہ اب دریا میں اتنا پانی ہی نہیں آتا تھا کہ پشتوں تک آسکے۔ نوجوان عورت کے پیچھے آنے لگا۔

''میں سمجھتا تھا کہ یہ کوئی خوب صورت جگہ ہوگی۔''

''خوب صورتی کیا ہے۔'' عورت نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''یہ تو آدمی کا حسن نظر ہے۔ صحرا میں رہنے والے کو صحرا خوب صورت لگتا ہے اور دلدل میں بسنے والے دلدل کو خوب صورت سمجھتے ہیں۔''

دریا کے اس کنارے جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ اگر کبھی درخت تھے تو لوگ کاٹ کر لے گئے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا ٹاہلی اور شیشم کے درخت کھڑے تھے لیکن یہ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ جھاڑیوں میں تھوہڑ کے بدصورت پودے نمایاں تھے۔ سب سے بلندی پر ٹاہلی کا ایک گھنا درخت تھا۔ لڑکا اور عورت اس کے سائے میں آگئے۔ باقی جگہوں پر بڑی خوفناک قسم کی دھوپ تھی۔ دو دن پہلے بارش ہوئی تھی لیکن زمین دوبارہ سے خشک ہوگئی تھی۔ حبس شدید تھا جسے کبھی کبھی دریا کی طرف سے آنے والا ہوا کا جھونکا توڑ دیتا تھا لیکن جیسے ہی جھونکا گزرتا حبس ویسا ہی شدید ہوجاتا۔ انہیں پشتے کے اوپر تک آنے کے لیے کوئی ایک فرلانگ چلنا پڑا تھا۔ عورت کی سانس کسی قدر تیز ہوئی تھی لیکن اسے ہانپنا نہیں کہہ سکتے تھے۔ نوجوان کا سانس ہموار تھا۔

''دادی جان یہاں آنے کا مقصد؟''

''میں اس جگہ کو دیکھنے آتی ہوں۔'' عورت نے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔ ''جہاں سے میں آج سے ساٹھ سال پہلے آئی تھی۔''

نوجوان نے حیرت سے اپنی دادی ماں کی طرف دیکھا۔ ''آپ دریا کے اس طرف سے آئی تھیں۔''

عورت نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ہاں ہم اس طرف رہتے تھے۔ تقسیم سے پہلے دریا سے چند میل کی دوری پر ہمارا گاؤں تھا...... بیاپور۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ بیاپور اتنے پاس ہے۔''

''میرے بچے ابھی تو تمہیں بہت کچھ نہیں معلوم ہے۔''

☆☆☆

بارش جاری تھی اور ان کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ سارہ سرینا سے بچھڑنے کے صدمے سے بے حال تھی اور حالات کی سنگینی کی طرف اس کا دھیان کم جا رہا تھا تو دوسری طرف خانم شوہر کا سوچ سوچ کر ہراساں تھی۔ اسے حالات کی سنگینی کا اندازہ تھا اور اسے یہ خوف مارے ڈال رہا تھا کہ بلوائیوں نے حویلی پر حملہ کیا تو خان صاحب اور دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا؟ اس سے زیادہ خوف یہ تھا کہ راستے میں بلوائی مل گئے تو ان کا کیا ہوگا؟ یہ دو نوکر کس طرح ان کی حفاظت کریں گے؟ اگر وہ مارے گئے یا بھاگ گئے تو جوان دونوں کمزور اور بے بس عورتوں کے ساتھ ہوسکتا تھا اس کا سوچ کر ہی خانم کو ہول آرہا تھا۔

ایسے قصے تو خانم کے علم میں بھی تھے کہ بلوائی مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کو اٹھا کرلے جارہے تھے اور ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرنے کے بعد انہیں بے دردی سے قتل کردیتے تھے۔ خانم کو موت کا خوف نہیں تھا لیکن وہ آبرو سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ یہی سوچ کر اس نے گھر سے نکلتے ہوئے ایک تیز دھار چھری ساتھ لے لی تھی۔ اگر راستے میں کہیں ہندو سکھ انہیں روک لیتے تو وہ کم سے کم عزت سے جان تو دے سکتی تھیں۔ سارہ رو رہی تھی، خانم نے اسے آواز دی اور پھر ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ دونوں نوکر آگے بیٹھے تھے۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ خانم باقاعدہ پردہ کیے بغیر گھر سے نکلی ہو۔ ''سارہ میری بات سن......''

دو تین بار بلانے پر سارہ متوجہ ہوئی تھی، اس نے روتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب میں کبھی سرینا سے نہیں مل سکوں گی۔''

''سارہ ہوش کر۔'' خانم نے تیز لہجے میں کہا۔ ویسے بھی بارش کے شور میں انہیں اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔ ''سرینا کو بھول جا اپنی فکر کر......''

سارہ ہراساں ہوئی۔ ''کیا ہوا امی، ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''ہمیں دریا کے پار جانا ہے لیکن دریا ابھی دور ہے اور راستے میں بلوائی مل سکتے ہیں۔''

''بلوائی!'' سارہ بولی۔ ''وہ ہمیں ماردیں گے؟''

''موت پھر بھی قبول ہے لیکن تو جانتی ہے ایک عورت کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے؟''

سارہ جانتی تھی اس طرف اس کا دھیان گیا نہیں تھا اور اب خانم نے توجہ دلائی تو وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ ''نہیں امی...... ایسا نہیں ہوگا۔''

''ہاں اللہ خیر کرے گا لیکن اگر ایسا موقع آیا تو سارہ اپنے باپ کی عزت رکھنا، جان دیدینا لیکن اپنی آبرو پر آنچ نہ آنے دینا۔''

سارہ جیسے بیدار ہوگئی تھی اس نے جھرجھری لے کر کہا۔ ''امی ایسا ہی ہوگا۔''

''میرے پاس ایک چھری ہے جو میں نے اسی مقصد کے لیے لی ہے۔ اگر ہمیں بلوائی روک لیں اور وہ زیادہ ہوں تو میں خود کو چھری گھونپ لوں گی اور میرے بعد تمہیں بھی یہی کرنا ہے زندہ ان کے ہاتھ نہیں آنا۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو سارہ چھری سے انگلی کٹ جانے کا سن کر ہی خوف زدہ ہوجاتی لیکن اس وقت اسے چھری سینے میں اتار لینا بھی آسان اور خوش آئند لگ رہا تھا کیونکہ جان کے مقابلے میں اسے عزت کہیں زیادہ پیاری تھی۔ بلوائی صرف اس کی جان و عزت کے دشمن نہیں تھے وہ یہ سب اس کی قوم اور مذہب کی دشمنی میں کررہے تھے۔ ان کے عزائم کو ناکام بنانا ضروری تھا چاہے یہ جان کی قیمت پر کیوں نہ کیا جائے۔ سارہ سنبھل گئی تھی۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں تانگا دریا کی طرف دوڑا جارہا تھا۔ نوکروں نے روشنی نہیں کی تھی کیونکہ اس طرح دیکھ لیے جانے کا خطرہ تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے دہشت گرد جتھے جگہ جگہ پھر رہے تھے اور جہاں انہیں کوئی مسلمان یا ان کا قافلہ نظر آتا، وہ اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ دور دراز دیہات میں رہنے والے مسلمانوں نے تیرہ اگست سے پہلے ہی ہجرت شروع کردی تھی۔ ان کے قافلے مغرب اور جنوب کی طرف رواں تھے۔ ان پر شب خون مارنے کے لیے بلوائی بھی اس علاقے میں مسلسل گشت کررہے تھے۔

تاریکی میں سفر کرتے ہوئے وہ ایک خطرے کو نظر انداز کرگئے تھے کہ اگر کسی گھوڑے کا پاؤں گڑھے میں چلا گیا اور وہ گرا تو تانگا الٹ سکتا تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ اچانک ہی دونوں گھوڑے بیک وقت گرے اور تانگا الٹ گیا۔ سارہ اڑ کر ایک طرف جا گری۔ چند لمحے کے لیے اس کے ہوش ہی اڑ گئے تھے مگر خانم کا خیال کرتے ہوئے اس نے خود کو جلدی سے سنبھالا۔ وہ اٹھتے ہوئے چلائی۔ ''امی ...... امی...... آپ کہاں ہیں؟''

خانم کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ سارہ کو چوٹ نہیں آئی تھی وہ پانی سے بھرے ایک گڑھے میں گری تھی۔ وہ اٹھی اور زمین پر ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھی۔ تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نوکر بھی سنبھل گئے تھے اور اب گھوڑوں کو اٹھانے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ بدستور تانگے سے بندھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی وہ خانم اور سارہ کو بھی پکار رہے تھے۔ سارہ نے جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں امی کہاں ہیں؟''

اسی لمحے اسے خانم مل گئی۔ وہ زمین پر بے سدھ پڑی تھی۔ سارہ نے بے تابی سے اسے ٹٹولا۔ وہ پانی اور کیچڑ سے لت پت ہوگئی تھی اس لیے سارہ کو اندازہ نہیں ہوا کہ خانم کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تاریکی میں کچھ پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ مگر اسی لمحے بجلی چمکی اور سارہ نے خانم کے پیٹ سے ابلتا ہوا خون دیکھ لیا تھا۔ اس نے چیخ ماری اور خانم کا پیٹ ٹٹولا، اس کے ہاتھ بھی خون سے بھر گئے تھے۔ خانم نے پیٹ سے جو چھری باندھ رکھی تھی گرنے کے دوران وہی اس کے پیٹ میں اتر گئی تھی۔ زخم اتنا بڑا تھا کہ خون کے ساتھ آنتیں بھی باہر آگئی تھیں۔ سارہ کی چیخیں سن کر دونوں نوکر بھی دوڑے آئے تھے۔ ''کیا ہوا...... کیا ہوا بی بی؟''

''امی...... امی......'' وہ سسکنے لگی۔ ''ان کے پیٹ سے خون نکل رہا ہے۔''

ان نوکروں نے کبھی خانم کا ہاتھ یا پاؤں تک نہیں دیکھا تھا، چہرہ دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ پردے کا خیال کرتے۔ انہوں نے خانم کو دیکھا۔ ایک نوکر بشیر نے ان کی نبض دیکھی جو تقریباً رک گئی تھی۔ زخم نہایت کاری تھا اور خون بے تحاشا بہہ رہا تھا۔ خانم

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ سارہ نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔ ”بشیر چاچا، امی ٹھیک ہو جائیں گی نا؟“

یہ موقع جھوٹ بولنے کا نہیں تھا، بشیر نے صاف کہہ دیا۔ ”پتر خانم بس کچھ دیر کی مہمان ہے۔“

سارہ مرتی ماں سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ نوکر بوکھلا گئے تھے۔ اس ویرانے میں اگرچہ بارش کا شور تھا لیکن سارہ کی چیخیں دور تک سنی جا سکتی تھیں اور آس پاس سکھ یا ہندو موجود ہوتے تو وہ فوراً آ جاتے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پہلے تانگے کی طرف توجہ دی۔ یہ دیکھ کر ان کو مایوسی ہوئی کہ تانگے کا ایک پہیا نکل گیا تھا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح گھوڑے تانگے سے الگ کیے۔ خوش قسمتی سے انہیں چوٹ نہیں آئی تھی ورنہ وہ سفر کے قابل نہ رہتے مگر ان پر زین نہیں تھی صرف لگام تھی۔ انہوں نے دھاتی ٹرنک ایک گھوڑے پر باندھا۔ پھر وہ سارہ کی طرف آئے۔

”بی بی، ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“

سارہ چیخی۔ ”میں امی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

نوکر نے ایک بار پھر خانم کی نبض دیکھی اور اسے خاموش پا کر بلند آواز سے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ سارہ سمجھ گئی کہ اس کی ماں زندہ نہیں رہی ہے۔ وہ عزت سے جینا اور عزت سے مرنا چاہتی تھی اس لیے خدا نے اس کی یہ خواہش پوری کر دی۔ سارہ کی چیخیں بلند ہوئیں تو نوکر بوکھلا کر اسے خاموش کرانے لگے۔ وہ اس کا منہ تو دبا نہیں سکتے تھے اس لیے منت سماجت کرنے لگے۔ ”بی بی...... خدا کے لیے چپ کر جاؤ...... ادھر سکھ ہندو پھرتے ہیں، آپ کی آواز سن کر وہ آ جائیں گے۔“

سارہ خود پر قابو پانے لگی۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا امی کو یہیں چھوڑ جائیں گے؟“

”مجبوری ہے بی بی! تانگے کا پہیا ٹوٹ گیا ہے ورنہ ساتھ لے جاتے پر اب یہ کر سکتے ہیں کہ آپ کو دریا پار کرا کے ہم واپس آ کر خانم کو بھی لے جائیں۔“

”تم امی کو لے کر آؤ گے؟“ سارہ نے امید سے پوچھا۔

”جی بی بی اگر زندہ رہے تو ضرور لائیں گے۔“ انہوں نے وعدہ کیا۔

اسی لمحے انہیں پاس کہیں شور سنائی دیا اور پھر روشنی دکھائی دینے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ گھڑ سوار اس طرف آ رہے ہوں۔ نوکر گھبرا گئے، انہوں نے سارہ سے کہا۔ ”بی بی جلدی کرو بلوائی آ گئے ہیں۔“

بلوائیوں کا سن کر سارہ نے جلدی سے خانم کی لاش کے پاس پڑی چھری اٹھالی۔ نوکر نے سہارا دے کر اسے گھوڑے پر سوار کرایا۔ اس نے پہلے کبھی گھوڑے پر سواری نہیں کی تھی اس لیے جب گھوڑا اچھلا تو وہ ڈر کر اس کی گردن سے چمٹ گئی۔ نوکروں نے دونوں گھوڑوں کی لگامیں تھامیں اور ان کے آگے آگے دوڑنے لگے۔ تاریکی میں وہ ہر ممکن تیزی دکھا رہے تھے لیکن عقب میں آنے والے گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کی رفتار کہیں تیز تھی۔ جلد وہ ان کے نزدیک آ گئے پھر سکھوں کے مخصوص نعروں نے ان کا رہا سہا شک بھی دور کر دیا تھا۔ سکھ جتھے نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ ان کے پاس ٹارچیں تھیں اور آتشیں ہتھیار بھی تھے لیکن صرف تین افراد کے لیے انہوں نے فائر کھولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پھر انہوں نے دیکھ لیا کہ گھوڑے پر ایک لڑکی ہے تو ان کے جوش و خروش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ نوکروں نے ان کی آوازیں سن لی تھیں وہ ہر ممکن تیزی سے دوڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن گھوڑے زیادہ تیز رفتار تھے۔ اسی لمحے وہ درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں گھسے اور دوسرے نوکر نے بشیر سے کہا۔ ”بشیرے تو بی بی کو لے کر جا میں ان کو روکتا ہوں۔“

”تو اکیلا......؟“ بشیر بولا۔

”ہاں تو گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جا میں بچ گیا تو پیچھے آ جاؤں گا۔ دیر مت کر ورنہ وہ گھیر لیں گے۔“

بشیر مجبوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور سارہ کے گھوڑے کی لگام بھی تھام کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ خان صاحب کا دیا ہوا پستول دوسرے نوکر کے پاس تھا۔ اس نے درختوں کی آڑ سے سب سے آگے آنے والے سکھ کو نشانہ بنایا۔ وہ فوج میں رہ چکا تھا اور اس کا نشانہ بہت اچھا تھا اسی لیے خان صاحب نے پستول اس کے حوالے کیا تھا۔ گولی ٹھیک آگے والے سکھ کے سینے میں لگی اور وہ بھیانک چیخ کے ساتھ گرا تھا۔ سارہ نے گھوڑے پر یہی آخری منظر دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ آگے نکل گئے اور عقب میں پے در پے فائر ہونے لگے تھے۔ پتا نہیں کون مرا اور کون بچا لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ سکھ اب ان کے پیچھے نہیں رہے تھے اور گھوڑوں پر سوار ہونے کی وجہ سے ان کی رفتار بھی کہیں تیز ہو گئی تھی۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی اور بارش بھی تیز ہو گئی تھی۔ بجلی چمکنے سے انہیں راستہ دکھائی دے رہا تھا لیکن مسلسل بارش سے ہر طرف پانی جمع ہو گیا تھا اور یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ کہاں ہموار زمین ہے اور کہاں اس میں گڑھے ہیں۔ بشیر بہت ہوشیاری سے دونوں گھوڑوں کو سنبھال رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ سارہ پر بھی نظر رکھے

ہوئے تھا۔ اگر اس کی گرفت گھوڑے کی گردن پر ڈھیلی ہوتی تو اسے خبردار کرتا تھا۔ ”بی بی سنبھل کر......“

سارہ خود کو سنبھال رہی تھی لیکن اسے کبھی گھڑ سواری کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے یہ کام بہت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ جھٹکوں سے برا حال تھا اور بارش کا پانی مزید مشکل پیدا کر رہا تھا، گھوڑے کی گردن اس کے ہاتھوں سے پھسلنے لگتی تھی۔ اوپر سے صدمے نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا ابھی تک وہ اپنے حواس کیسے سلامت رکھے ہوئے تھی؟ یہ بات وہ بھی نہیں جانتی تھی، شاید خطرے کا احساس اسے ہوشیار کر رہا تھا ورنہ اب تک وہ بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کر اس کے ذہن میں آ رہا تھا جیسے ماں اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی تھی اسی طرح اب اسے اپنے باپ کو دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوگا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ماں باپ کو بھی... کھو چکی تھی۔ آنسو بہہ رہے تھے لیکن اس نے اپنی آواز پر قابو رکھا تھا پہلے ہی اس کی چیخوں کی وجہ سے سکھ ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور ایک نوکر حفاظت کرتے ہوئے شاید اپنی جان قربان کر چکا تھا۔

وہ پانی سے بھرے کھیتوں کے کنارے سفر کر رہے تھے جن میں دھان کی فصل لگی تھی۔ کچھ دیر میں وہ دریا کے پاس تھے۔ یہاں ماہی گیروں کی بستی تھی مگر ابھی بستی خالی تھی کیونکہ ماہی گیروں نے اپنے بیوی بچوں اور گھر والوں کو سامان سمیت دوسرے کنارے پہنچا دیا تھا اور اس وقت وہ لٹے پٹے آنے والے مہاجروں سے کمائی کرنے میں مصروف تھے۔ یہاں پیچھے سے آنے والے لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا اور وہ سب کسی بھی طرح دریا کے پار جانا چاہتے تھے لیکن پار صرف وہی جا رہے تھے جن کے پاس دینے کے لیے منہ مانگی رقم تھی۔ ماہی گیر مسلمان تھے لیکن اس وقت پکے کاروباری بنے ہوئے تھے ایک طرف وہ منہ مانگے داموں یہاں کے مسلمانوں کو دریا کے پار پہنچا رہے تھے تو دوسری طرف سے آنے والے غیر مسلموں کو اس طرف لا رہے تھے لیکن غیر مسلموں کی تعداد پار جانے کے منتظر مسلمانوں کے مقابلے میں اتنی بھی نہیں تھی جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ ان میں سے سب کے پاس پیسا نہیں تھا۔ جن کے پاس تھا وہ دے کر کشتیوں میں سوار ہو کر پار جا رہے تھے یہ ایک درجن کے قریب کشتیاں تھیں۔ یہ مسلسل پار آ جا رہی تھیں۔ ماہی گیر بھی جانتے تھے کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، سکھ اور ہندو جتھے یہاں آ گئے تو انہیں نہیں چھوڑیں گے اس لیے وہ فرار کے لیے بھی ہمہ وقت مستعد تھے۔

سارہ حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ جانے والی کشتیوں میں کچھ افراد کی جگہ خالی ہوتی تھی اس کے باوجود ملاح کسی کو مفت میں نہیں بٹھا رہے تھے۔ یہ بے حسی اور سفاکی کی انتہا تھی جو وہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھی عورت دھاڑیں مار کر رو رہی تھی اور ان لوگوں سے التجا کر رہی تھی کہ وہ اسے نہ سہی اس کی دو جوان بیٹیوں کو ساتھ لے جائیں ورنہ سکھ آ گئے تو وہ انہیں اٹھا لے جائیں گے۔ صرف یہی عورت نہیں اور بھی غریب تھے جو ملاحوں کے آگے گڑگڑا رہے تھے مگر وہ ان کی التجائیں نظر انداز کرتے ہوئے ان لوگوں سے بات کر رہے تھے جن کے پاس انہیں دینے کے لیے رقم تھی۔ ایک کشتی روانہ ہونے والی تھی۔ بشیر نے دونوں گھوڑے ایک درخت کے ساتھ باندھے اور کشتی کے مالک سے مذاکرات کرنے لگا۔

سارہ گھوڑوں کے ساتھ کھڑی تھی اسے اندازہ ہوا کہ صرف وہی نہیں بلکہ مشرقی پنجاب میں رہنے والے بے شمار مسلمان اسی آفت کا شکار ہوئے تھے۔ وہ لٹ پٹ کر اپنا گھر بار چھوڑ کر اور اپنے پیاروں کو گنوا کر یہاں آئے تھے مگر اب بھی ان کی زندگیاں محفوظ نہیں تھیں۔ پاکستان اور ان کے درمیان میں یہ چڑھا ہوا دریا تھا۔ اسے پار کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا یعنی کشتیاں اور وہ ان سفاک ملاحوں کے قبضے میں تھیں جو قیامت کی اس گھڑی میں بھی مال کمانے میں مصروف تھے۔ بشیر کے مذاکرات کامیاب رہے تھے اس نے کشتی میں دو نشستیں حاصل کر لی تھیں لیکن جب وہ دھاتی ٹرنک اٹھا کر لایا تو کشتی کے مالک نے اعتراض کر دیا۔

”یہ کیا، میں نے صرف دو آدمی لے جانے کا پیسا لیا ہے۔“

”تو کیا سامان یہیں چھوڑ جائیں۔“ بشیر نے کہا مگر کشتی والا اس وقت تک نہیں مانا جب تک اس نے اسے ٹرنک کا معاوضہ بھی نہیں دے دیا۔ مالک کی حریص نظریں ٹرنک پر مرکوز تھیں۔ اتنا تو وہ سمجھتا تھا کہ ایسے میں انسان صرف قیمتی سامان اٹھا کر بھاگتا ہے ورنہ معمولی سامان کی جان کے مقابلے میں کون پروا کرتا ہے۔ پھر وہ اتر کر کچھ اور لوگوں سے بات کرنے گیا۔ وہ ساحل سے دور چلا گیا تھا۔ کشتی میں دو تین افراد کی مزید گنجائش تھی۔ کشتی میں سوار ہونے والے بے چین تھے کہ جلد از جلد روانگی اختیار کی جائے کیونکہ بلوائیوں کی آمد کسی وقت بھی متوقع تھی اور وہ عین ساحل پر پہنچ کر نہیں ڈوبنا چاہتے تھے۔ مسافروں نے شور کرنا شروع کر دیا۔ وہ ملاحوں سے کشتی چلانے کو کہہ رہے تھے مگر ملاح اپنے مالک کے بغیر نہیں جا سکتے تھے اس لیے وہ چپو ہاتھ میں تھامے بیٹھے رہے۔

اچانک ایک طرف سے شور اٹھا اور یہ موت کا شور

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ بلوائیوں کے جتھے وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ خون کی بو پر نکلے درندوں کی طرح ٹھیک اس جگہ آن پہنچے جہاں ان کے لیے شکار موجود تھا۔ ساحل پر موجود بے آسرا اور نہتے لوگ جان بچانے کے لیے بھاگنے لگے مگر ان کے لیے کہیں امان نہیں تھی۔ موت بلوائیوں کے روپ میں ان پر جھپٹ رہی تھی۔ بلوائی چن چن کر جوانوں اور مردوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ وہ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو بھی بے دریغ قتل کر رہے تھے لیکن جوان عورتوں اور لڑکیوں کو کچھ نہیں کہہ رہے تھے ان کے لیے بلوائیوں کے عزائم کچھ اور تھے۔ دوسری کشتیاں مارکاٹ شروع ہوتے ہی ساحل سے دور جانے لگی تھیں مگر وہ کشتی رکی رہی جس پر سارہ اور دوسرے لوگ سوار تھے۔ مسافر چلانے لگے۔

"چلو..... نکلو یہاں سے..... "

ملاح تذبذب میں آ گئے تھے۔ اگر وہ نکل جاتے تو ان کا مالک پیچھے رہ جاتا اور مالک کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ اس پر مسافر بپھر گئے اور انہوں نے ملاحوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے کشتی نہیں چلائی تو وہ انہیں پانی میں پھینک دیں گے اور خود کشتی چلا کر لے جائیں گے۔ ملاحوں اور مسافروں میں جھگڑا شروع ہو گیا لیکن جیسے ہی ایک سکھ جتھا کشتی کے پاس نمودار ہوا ملاح جھگڑا بھول گئے اور انہوں نے کشتی عجلت میں کھینا شروع کر دی۔ وہ تجربے کار کشتی ران تھے اگر یہی کام مسافر کرتے تو کشتی اتنی تیزی سے دریا میں نہ جاتی۔ سکھوں کے پاس پستول تھے وہ اس سے فائر کرنے لگے۔ جان بچانے کے لیے مسافر کشتی میں لیٹ گئے تھے۔ خوش قسمتی سے کسی کو گولی نہیں لگی اور نہ ہی کشتی میں کوئی سوراخ ہوا۔ جلد ہی وہ منجدھار میں پہنچ گئے۔ کشتی کا لالچی مالک یقیناً ساحل پر کہیں پھنس گیا تھا اور اب اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس بات نے بھی ملاحوں کو مجبور کیا کہ وہ کشتی چلا دیں۔

سکھوں سے بچ نکلنے کے بعد کچھ لوگ تو اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے اور کچھ دریا کی بپھری ہوئی لہروں کو دیکھ کر خوف زدہ تھے، خاص طور سے عورتوں اور بچوں کے رونے دھونے سے کشتی کا ماحول ماتمی ہو رہا تھا۔ مرد ان کو چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سارہ اشک بار نظروں سے دریا کا کنارا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماں باپ اور اس کا گھر اس طرف رہ گئے تھے اور دوسری طرف وہ اکیلی بچ کر جا رہی تھی۔ دریا کا پاٹ ایک کلومیٹر سے بھی زیادہ چوڑا ہو رہا تھا اور اس کی روانی خاصی تیز تھی اس لیے کشتی آگے بڑھنے سے زیادہ دریا کے رخ پر کھنچ رہی تھی۔ ملاح لہروں کی توانائی کو اس طرح استعمال کر رہے تھے کہ کشتی تیزی سے آگے جا رہی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ دوسری طرف ایک ویران جگہ پر اتر گئے۔ کشتی میں چار ملاحوں کے علاوہ کوئی پندرہ سولہ افراد آئے تھے۔ بشیر نے سہارا دے کر سارہ کو ساحل پر اتارا اور پھر ٹرنک بھی لے آیا۔ سارہ ہراساں تھی۔

"بشیر چاچا ہمیں کہاں جانا ہے؟"

"ادھر دوآبے میں خان جی کے دوست لیاقت حسین رہتے ہیں ہمیں ان کے پاس جانا ہے۔" بشیر نے بتایا۔ "ہم نہیں کہاں اترے ہیں، ہمیں کوئی آبادی تلاش کرنا ہوگی۔"

دوسرے مسافر بھی اس ویران جگہ پر خوف زدہ تھے وہ جتنی قتل و غارت گری دیکھ کر آ رہے تھے پاکستان کی سرزمین پر اترنے کے باوجود ان کا خوف کم نہیں ہوا تھا۔ ملاح انہیں اتارتے ہی کشتی لے کر ساحل کے ساتھ ساتھ ایک طرف روانہ ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ جگہ کہاں ہے لیکن انہوں نے مسافروں کی رہنمائی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ مسافروں نے آپس میں مشورہ کیا اور اپنا سامان اور عورتوں بچوں کو سنبھال کر آگے چل پڑے۔ انہیں کسی آبادی کی تلاش تھی۔ یہ دوآبہ تھا، پنجاب کے چند زرخیز ترین اور گنجان ترین علاقوں میں سے ایک تھا۔ یہاں انہیں کوئی نہ کوئی آبادی مل جاتی مگر تاریکی اور مسلسل ہونے والی بارش میں چلنا آسان نہیں تھا۔ وہ سب خستہ تن اور بھوکے پیاسے تھے۔ زمین پر جمع پانی نہیں پی سکتے تھے۔ اس کا سیدھا سا مطلب ہیضہ یا ڈائریا ہو سکتا تھا۔ وہ اوپر سے برسنے والے پانی کو براہ راست پی کر اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ بارش اگر زحمت کا باعث بن رہی تھی تو ساتھ ہی یہ صاف پانی کی صورت میں نعمت بھی تھی ورنہ شدید گرمی میں پیاس الگ پریشان کرتی۔ رات کے تین بج رہے تھے اور ابھی صبح میں کچھ وقت باقی تھا۔ جب ایک گھنٹے بعد بھی انہیں کوئی آبادی نظر نہیں آئی تو انہوں نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک نہر کے کنارے جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہیں بیٹھ گیا۔ سارہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بشیر نے اس سے کہا۔

"بی بی آپ سو جاؤ میں جاگتا رہوں گا۔"

سارہ کو خان صاحب کی فکر تھی۔ "بشیر چاچا، بابا آ جائیں گے نا؟"

"بی بی آپ کو لیاقت صاحب کے پاس چھوڑ کر میں دوبارہ واپس جاؤں گا اور خان صاحب کے ساتھ ہی واپس آؤں گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اب ہم کبھی اپنی حویلی اور گاؤں واپس نہیں جا سکیں گے؟" سارہ ڈوبتے لہجے میں بولی۔

"نہیں بی بی، انگریزوں نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے گورداسپور انڈیا کو دیدیا ہے۔" بشیر نے افسردگی سے کہا۔ "ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ اب مشرقی پنجاب میں کوئی مسلمان زندہ سلامت نہیں رہ سکتا۔"

ہندوؤں اور سکھوں کی خوں آشامی خود سارہ نے دیکھ لی تھی اور اس کے بعد اسے امید کم رہ گئی تھی کہ خان صاحب بھی محفوظ ہوں گے۔ جب وہ حویلی سے نکلے تھے تب بھی حویلی کے دروازے پر بلوائی جمع ہو رہے تھے۔ ایسے میں خان صاحب اور بیاپور کے دوسرے مسلمانوں کے بچنے کا امکان بہت کم تھا۔ سارہ آگے کا سوچ کر پریشان ہونے لگی کہ اگر اس کا باپ بھی نہ بچا تو وہ کہاں جائے گی اور کیا کرے گی۔ اس کا خاندان مشرقی پنجاب میں مختلف مقامات پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ بچتا ہے یا نہیں اور بچ کر کہاں جاتا ہے۔ اس بارے میں ابھی سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگر کوئی بچ کر آ جاتا تو وہ کیسے جان سکتا تھا کہ سارہ بچ کر آ گئی ہے اور یہ کیسے جانتا کہ وہ کہاں ہے؟ کیا وہ لاوارث ہو گئی تھی۔ سترہ سال کی کنواری لڑکی اپنے بل بوتے پر زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ اسے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت تھی۔

صبح کی روشنی نمودار ہوئی اور بارش رکی تو لوگوں کی جان میں جان آئی۔ مسلسل بھیگنے سے شدید گرم موسم میں بھی سب کی حالت بری تھی۔ سارہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے بخار ہو گیا ہے۔ بشیر نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور وہ آبادی کی تلاش میں آگے روانہ ہوئے۔ سب گھسٹ کر چل رہے تھے اور جب ان کی توانائی بالکل جواب دینے والی تھی، ان کو ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آ گیا۔ یہ دوآبے میں ایک چھوٹا سا گاؤں چک بیلا تھا۔ چند سو گھروں پر مشتمل اس بستی میں تمام ہی مسلمان آباد تھے اور جب فجر کی نماز سے فارغ ہونے والے لوگوں کو پتا چلا کہ یہ لوگ گورداسپور سے لٹ پٹ کر آ رہے ہیں تو ہر گھر کا دروازہ ان کے لیے کھل گیا تھا۔ گاؤں میں تمام ہی معمولی درجے کے کاشت کار تھے۔ ان کے گھر چھوٹے لیکن دل بڑے تھے۔ انہوں نے تمام مہاجروں کو آپس میں بانٹ لیا۔

سارہ اور بشیر زمیندار کرم الٰہی کے گھر رکے تھے۔ اس کی سادہ مزاج بیوی نے سارہ کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ حد یہ کہ اس نے سارہ کے خراب ہو جانے والے کپڑوں کے بدلے اپنا ایک سوٹ اسی وقت کتر بیونت کر کے پہننے کو دیدیا۔ وہ سارہ کے مقابلے میں کہیں جسیم اور موٹی تھی۔ دوپہر کے بعد جب گاؤں کی چوپال میں بچ کر آنے والے مردوں نے اپنا احوال سنایا تو لوگوں میں اشتعال پھیل گیا تھا۔ خاص طور سے نوجوان سخت غصے میں تھے۔ ان کے علاقے سے ہندو اور سکھ مہینے بھر پہلے ہی نہایت سکون سے اپنے مکانات اور زمین بیچ کر اور سارے سامان کے ساتھ گئے تھے، کسی نے انہیں انگلی بھی نہیں لگائی تھی اور جو رہ گئے تھے وہ بھی پورے امن و امان سے رہ رہے تھے۔

"ہم انہیں نہیں چھوڑیں گے۔" نوجوانوں نے فیصلہ سنایا۔ "جو ہمارے لوگوں کو برداشت کرنا پڑا ہے وہی ہم ان کے ساتھ کریں گے۔"

گاؤں کے بڑے بوڑھے نوجوانوں کو سمجھانے بجھانے میں لگ گئے تھے۔ بشیر کو ان سے دلچسپی نہیں تھی اسے تو سارہ کو ٹرنک سمیت لیاقت حسین کے پاس پہنچانا تھا۔ اس نے لیاقت حسین اور گاؤں کا بتایا تو ایک نوجوان اپنے تانگے میں انہیں وہاں لے جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ بشیر کو واپس بھی جانا تھا، اگرچہ آنے والوں نے جو حالات بیان کیے تھے ان سے لگتا تھا کہ بشیر کا واپس جانا کسی صورت ممکن نہیں تھا، وہ دریا پار کرتے ہی سکھوں کے جتھے چڑھ جاتا۔ تانگے نے شام تک انہیں لیاقت حسین کے گاؤں اس کی حویلی پہنچا دیا تھا۔ حویلی دیکھ کر سارہ کو اندازہ ہوا کہ لیاقت حسین، خان صاحب سے بڑا نہیں تو ان سے چھوٹا جاگیردار بھی نہیں تھا۔ اس نے سارہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

لیاقت حسین عمر میں خان صاحب سے بڑا اور چہرے سے سخت مزاج لگ رہا تھا لیکن اس نے سارہ سے نہایت نرمی سے بات کی اور اسے اندر زنان خانے میں بھجوا دیا جہاں لیاقت حسین کی دو بیویاں اور سات بیٹیاں موجود تھیں۔ ان کے علاوہ پانچ بیٹے بھی تھے۔ بشیر نے لیاقت حسین کو حالات سے آگاہ کیا اور روانگی سے پہلے چند منٹ کے لیے سارہ سے مل کر اسے ایک چابی دی۔ "بی بی جی یہ ٹرنک کی چابی ہے اس میں رقم بھی ہے اور زیور بھی۔ اس کے علاوہ خان جی کی زمینوں کے کاغذات بھی ہیں، یہ چیزیں آپ نے سب سے چھپا کر رکھنی ہیں اور کسی کو ان کے بارے میں نہیں بتانا۔"

"میں ٹرنک کے بارے میں کیا کہوں؟"

"یہی کہ اس میں آپ کے کپڑے ہیں۔ ویسے اس میں کپڑے بھی ہوں گے۔" بشیر نے کہا۔ "آپ دیکھ لینا اور اب مجھے اجازت دو مجھے ابھی خان جی کو بھی دیکھنا ہے۔"

"بشیر چاچا......" سارہ رندھے گلے سے بس اتنا کہہ سکی تھی کہ بشیر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہاں سے نکل

گیا۔ سارہ اشک بار نظروں سے اس واحد فرد کو جاتے دیکھتی رہی جس پر وہ اعتماد کر سکتی تھی۔

☆☆☆

بوڑھی عورت سارہ تھی اور نوجوان اس کا پوتا منصور مرزا تھا۔ وہ غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ سارہ چپ ہوئی تو اس نے کہا۔ "دادی جان پھر آپ دادا جان تک کیسے پہنچیں؟"

"میں نہیں پہنچی انہوں نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔" سارہ نے کہا۔ "بابا جان کے دوست لیاقت کی نیت خراب ہو گئی تھی، وہ مجھ سے شادی کر کے بابا جان کی زمینوں کے کاغذات پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے ڈرایا، دھمکایا اور لالچ بھی دیا لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے سامنے اپنے انکار پر قائم رہی۔ تمہارے دادا انتظار مرزا کو علم ہو گیا تھا کہ ہماری حویلی پر کیا گزری ہے خود، ان کے خاندان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ دہلی سے پاکستان آتے ہوئے ساری ٹرین راستے میں کاٹ دی گئی، ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ خود انتظار مرزا بہن اور اس کے بچوں کو لینے میرٹھ گئے تھے اس لیے بچ گئے۔ واپسی میں وہ ان سب کو بائی ائیر لے کر آئے۔ پاکستان آ کر انہوں نے مجھے تلاش کرنا شروع کیا لیکن میرا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ دو مہینے بعد مایوس ہو گئے تھے کہ شاید میں بھی اس دنیا میں نہیں رہی ہوں۔" سارہ بولتے بولتے تھک گئی۔ اس لیے کچھ دیر کو خاموش ہوئی۔

"تب دادا جان نے آپ کو کیسے تلاش کیا؟"

"بس میری قسمت اچھی تھی۔ بشیر چاچا بابا کو تلاش کرنے میں ناکامی کے بعد انتظار مرزا کو تلاش کر رہے تھے اتفاق سے وہ انہیں لاہور میں مل گئے اور پھر انہیں پتا چلا کہ میں لیاقت حسین کی حویلی میں قید ہوں تو انہوں نے پولیس اور مقامی انتظامیہ کی مدد سے مجھے وہاں سے چھڑا لیا اور لاہور لے آئے۔ یہاں میں ان کی بیوہ بہن اور پھوپی کے ساتھ رہی جیسے ہی میری عمر اٹھارہ سال ہوئی تمہارے دادا سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ ہم سب نے مل کر اپنی کلیم کے بدلے یہاں شکر گڑھ میں مشترکہ زمین حاصل کر لی۔ جب تک تمہارے دادا سروس میں رہے ہم جگہ جگہ رہے لیکن جب ان کی ریٹائرمنٹ ہوئی تو ہم یہاں زمینوں پر آ گئے۔"

منصور مرزا کے لیے یہ بہت حیرت انگیز کہانی تھی۔ بشیر کا خاندان ان کی زمینوں پر آباد تھا اور سب ان کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔ اب منصور کو پتا چلا کہ اس گھر کا اتنا خیال کیوں رکھا جاتا ہے۔ بشیر سارہ کا محسن تھا۔ زمین ملنے کے بعد انتظار مرزا نے بہن کو بچوں سمیت یہاں بھیج دیا تھا اور پھوپی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ بشیر کو زمینوں کو نگران بنا دیا تھا۔ اس نے وہیں شادی کر لی تھی اور اب اس کے چار بیٹے تھے جن میں سے دو بہ دستور زمینوں پر کام کر رہے تھے اور دو شہر چلے گئے تھے۔ انتظار مرزا کو مرحوم ہوئے بھی بیس سال ہو چکے تھے اس لیے منصور کو وہ یاد نہیں تھے۔ اس وقت منصور صرف دو سال کا تھا۔ وہ نوابزادہ ضرور تھا لیکن اس کی پرورش بہت اچھے انداز میں ہوئی تھی۔ یعنی ان رئیس زادوں کی طرح نہیں ہوئی تھی جو دودھ کی بوتل چھوڑتے ہی شراب کی بوتل پکڑ لیتے ہیں اور ماں کی گود سے نکلتے ہی پرائی عورت کی گود تلاش کرتے ہیں۔ جن کی زندگی کا مقصد ہی سوائے عیاشی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ نوابزادہ افتخار مرزا اولاد کے معاملے میں جتنا سخت تھا۔ منصور کی والدہ امینہ شوہر سے زیادہ سخت تھی۔ اس لیے بچپن سے اب تک منصور کے لیے سایہ عافیت سارہ کی ذات تھی۔ کیونکہ اس کی صورت دادا جان انتظار مرزا سے بہت زیادہ ملتی تھی۔ بہت سارے مواقعوں پر جب شامت بس آیا ہی چاہتی تو سارہ ہی تھی جو بچا لیا کرتی تھی۔

منصور نے مری کانونٹ میں اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ایک اعلیٰ درجے کے کالج سے گریجویشن کیا۔ کیونکہ تعلیم میں کوئی خاص تیر نہیں مارا تھا اس لیے افتخار مرزا نے واپس بلا لیا۔ پہلے اس کا ارادہ منصور کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجنے کا تھا۔ لیکن جب دیکھا کہ اسے تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے تو افتخار مرزا نے مناسب سمجھا کہ واپس بلوا کر زمین پر لگا دیں مگر منصور کو کاشت کاری سے بھی شغف نہیں رہا۔ اس سے بڑے وقار مرزا کو کاشت کاری سے دلچسپی تھی۔ اس نے ایگریکلچرل یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے اپنی زمینوں کو سائنسی خطوط پر منظم کیا اور اس کے نتیجے میں پیداوار اور آمدنی میں اتنا اضافہ ہوا کہ افتخار مرزا نے ایک چھوٹی سی رائس مل لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کی زمینوں پر پیدا ہونے والا اعلیٰ درجے کا باسمتی چاول یہاں صاف، پالش اور پیک ہو کر دبئی کے راستے دنیا بھر کو جا سکتا تھا۔

افتخار مرزا چاہتا تھا کہ یہ مل منصور سنبھالے۔ کیونکہ اس کا سب سے بڑا بیٹا مصور مرزا اسم بامسمیٰ تھا۔ اسے اسکول کے زمانے سے مصوری سے شوق تھا اور بعد میں اس نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فنون سے ماسٹرز بھی کیا تھا۔ مصور مرزا نے حویلی کے اوپری حصے میں اپنے لیے اسٹوڈیو بنوایا تھا اور ہمہ وقت وہیں پایا جاتا تھا۔ اسے راہِ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش میں ناکامی کے بعد افتخار مرزا نے اعتراف کر لیا تھا کہ مغلوں میں بھی فن کے جراثیم پائے جا سکتے ہیں۔ منصور سب

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے چھوٹا تھا۔ اس نے کالج میں فزکس کا مضمون لیا تھا۔ اس کی بی ایس سی میں فرسٹ ڈویژن ضرور آئی تھی مگر اس کا مزید تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اس لیے جب افتخار مرزا نے واپس بلایا تو وہ بغیر کسی احتجاج کے واپس بھی آ گیا تھا، کیونکہ اس دوران میں اس نے دلچسپی کا ایک اور میدان تلاش کر لیا تھا۔ شکر گڑھ کا یہ علاقہ شہر سے دور تھا اور یہاں جدید زندگی کی وہ آسائشیں فراوانی سے نظر نہیں آتی تھیں جو شہر کا خاصہ ہوتی ہیں۔ یہاں سڑکیں بہت کم تھیں، بجلی ہر جگہ نہیں تھی۔ اسی طرح فون اور دوسری جدید سہولیات بھی صرف دولت مندوں کو میسر تھیں۔ منصور اور سارہ ایک فور وہیل ڈرائیو میں دریا کے اس کنارے آئے تھے۔ کیونکہ یہاں آنے کے راستے بھی ناپید تھے۔ منصور کے لیے یہ ناقابل یقین بات تھی کہ کبھی اس کی دادی کا خاندان دریا کے دوسرے کنارے پر سرحد پار آباد تھا اور عملاً یہ جگہ ان کی زمینوں سے دس میل دور بھی نہیں تھی۔ اب وہ سرزمین ان کے لیے اجنبی ہو چکی تھی۔ منصور نے پوچھا۔ ”آپ نے سرینا کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”جتنا کسی کو تلاش کیا جا سکتا ہے میں نے اس سے زیادہ ہی تلاش کیا لیکن وہاں اب نہ لالہ کشن لال کی اولاد آباد ہے اور نہ ہی کسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں چلے گئے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی بڑی جاگیردار فیملی اپنا اتا پتا چھوڑے بغیر کہیں چلی جائے۔“ منصور نے بے یقینی سے کہا۔ ”ضرور ان کے ساتھ کوئی اور چکر ہوا ہوگا۔“

”کیسا چکر؟“

”مہیش ایک بدمعاش آدمی تھا۔ اس نے مسلمانوں کا قتل عام کرایا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی اس کے اور مجرمانہ افعال ہوں گے اور ممکن ہے وہ دشمنوں یا پولیس کے خوف سے یہ جگہ چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ اس صورت میں اس نے اپنا اتا پتا بھی کسی کو نہیں دیا ہوگا۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے لیکن کیا اس صورت میں سرینا کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں دادی جان...... مگر یہاں کھڑے ہو کر دھوپ میں جلنے سے وہ نہیں ملے گی۔ ذرا دیکھیں آپ کا میدے کی طرح سفید رنگ ایسا ہو رہا ہے جیسے میدے کو خمیر لگ گیا ہو۔ دادا جان حیات ہوتے تو انہیں کتنا صدمہ ہوتا۔“

”بدتمیز۔“ سارہ شرمائی۔ افتخار مرزا کے ذکر پر آج بھی اس کے چہرے پر رنگ آ جاتے تھے۔ منصور حیران تھا کیا محبت اتنے طویل عرصے تک بھی برقرار رہتی ہے جبکہ ایک فریق دنیا سے گزر چکا ہو۔ سارہ نے گہری سانس لی۔ ”تو ٹھیک کہتا ہے وہ مجھے دھوپ میں بھی نہیں جانے دیتے تھے۔“

”دیکھا...... میں دادا جان کو کتنا جانتا ہوں۔“ منصور نے چہک کر کہا۔ ”اگر میں وعدہ کروں کہ میں ان خاتون کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا تو آپ واپس حویلی چلیں گی؟“

”تو بہت چالاک ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”دھوپ برداشت نہیں ہو رہی ہے؟“

”نہیں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ایسی ویران جگہ اتنی دیر موجود رہتی ہوں گی۔ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ اس لیے مجھے دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے۔“

”میں ہر سال اسی تاریخ کو یہاں آتی ہوں اور دریا کے پار اس سرزمین کو دیکھتی ہوں تو مجھے خیال بھی نہیں آتا کہ موسم کیسا ہے اور دھوپ کتنی تیز ہے۔ کئی بار میں یہاں تیز بارش میں بھی گھنٹوں کھڑی رہی ہوں۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوتا۔“ سارہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی اور دنیا میں چلی جاتی ہوں۔“

منصور اس کی کیفیت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھی اس میں انسان بعض اوقات کسی اور دنیا میں جینے لگتا ہے اور اس کا اپنے حال سے واسطہ کم رہ جاتا ہے۔ مگر سارہ اپنے معاملات میں پوری طرح ایکٹو تھی۔ صبح نماز اور قرآن سے فارغ ہونے کے بعد وہ سورج نکلنے اور بلند ہونے تک حویلی کے لان میں چہل قدمی کرتی۔ اس کے بعد رات کے کھانے کے بعد جب وہ سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں جاتی تب ہی آرام کرتی تھی۔ حویلی میں کسی نے اس کو دن میں بھی بہت کم آرام کرتے یا فارغ بیٹھے دیکھا تھا۔ شام کو وہ عقبی صحن میں اپنے لگائے ہوئے پودوں کی خود دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس قسم کی جسمانی ایکٹی وٹی رکھنے والے بزرگ عام طور سے ماضی کی یادوں میں کھونا پسند نہیں کرتے مگر پھر بھی انسان کے بارے میں یقین سے کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہر بوڑھے میں اس کا ماضی کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔

”آپ کو اپنی سہیلی سرینا سے بہت محبت ہے؟“

”ہاں رشتوں سے ہٹ کر میں نے کسی انسان سے اتنی محبت نہیں کی جتنی سرینا سے کی ہے۔“ وہ یقین سے بولیں۔ ”تم یوں اس کا نام مت لو اگر لیتا ہے تو سرینا دادی کہو۔“

”میں گرینی کہوں گا، دادی صرف آپ ہیں۔“ منصور نے کسی قدر ضدی لہجے میں کہا۔ ”آپ ان سے دوبارہ ملنا چاہتی تھیں؟“

”ہاں۔“ ان کے لہجے میں مایوسی آ گئی۔ ”لیکن میں اس سے مل نہیں سکی۔ پتا نہیں وہ زندہ بھی ہے یا......“

”اگر آپ زندہ ہیں تو اس کا امکان ہے وہ بھی زندہ ہوں گی اور شاید وہ بھی آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”تو نے بتایا نہیں کہ اسے کیسے تلاش کر سکتا ہے۔“ سارہ نے پرامید ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا تو انڈیا جائے گا؟“

”اگر ضرورت پڑی تو وہاں بھی جاؤں گا۔“ منصور نے کہا۔ ”اگر آپ کا چلنے کا موڈ نہیں ہے تو میں آپ کے لیے یہاں کرسی لا دیتا ہوں آپ کم سے کم بیٹھ جائیں۔“

سارہ مان گئی۔ منصور گاڑی سے اس کے لیے کرسی اور پانی کی بوتل و گلاس لے کر آیا۔ ڈرائیور صاحب داد گاڑی کے پاس ہی موجود تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے گاڑی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کرسی فولڈ ہو جانے والی تھی منصور نے چھاؤں میں کرسی کھول کر رکھی اور سارہ کو بوتل سے پانی نکال کر پیش کیا، سارہ نے پانی پی کر کہا۔ ”منصور تو چلا جا، تھک جائے گا۔“

”نہیں دادی جان! شکار کے دوران میں سارا دن بھی دھوپ اور گرمی میں گھومتا رہا ہوں، آپ میری فکر نہ کریں۔“

تین دن پہلے سارہ کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور ساری رات اسے بخار رہا تھا۔ اگلے دن بخار اتر گیا تھا لیکن ڈاکٹر نے انہیں آرام کا مشورہ دیا تھا۔ آج صبح افتخار نے بیٹے کو طلب کیا۔ ”منصور تم ماں جی کے ساتھ جاؤ گے۔“

”دادی جان کے ساتھ...... لیکن کہاں؟“

”تم بھول رہے ہو آج تیرہ اگست ہے اور وہ دریا کے کنارے جاتی ہیں۔“

”لیکن ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”درست ہے اور یہی بات میں نے کل رات ان سے کہی تھی لیکن وہ نہیں مانیں، آج جائیں گی۔ میں اکیلے نہیں بھیجنا چاہتا اس لیے تم ان کے ساتھ جاؤ گے۔“

اتفاق سے منصور پہلے کبھی اس طرف نہیں آیا تھا۔ حالانکہ یہ جگہ ان کی زمینوں اور حویلی سے صرف دس کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ صبح منصور ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوا تو سارہ حیران ہوئی تھی۔ ”لڑکے تو میرے ساتھ جائے گا؟“

”جی، ابا جان کا حکم ہے کہ آپ اکیلے نہیں جائیں گی۔“

”اکیلے کہاں، میں ہمیشہ ڈرائیور کے ساتھ جاتی ہوں۔ صاحب داد تیرے دادا کے زمانے سے کام کر رہا ہے۔“

”جی میں جانتا ہوں لیکن پھر بھی آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے ابھی آپ کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔“

سارہ نے مخالفت نہیں کی۔ دریا کے کنارے رفتہ رفتہ شام ہونے لگی۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ گرمی کی شدت میں کمی آ رہی تھی۔ یہاں آنے کا بہترین وقت یہی تھا کیونکہ صبح سورج مشرق کی طرف ہوتا ہے اور دریا کا مشرقی کنارا صاف نظر نہیں آتا، دوپہر کے بعد سورج جب مغرب کی طرف جا چکا ہوتا ہے تو مشرقی کنارہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ منصور پشتے کے سب سے اوپری حصے میں کھڑا تھا یہاں سے مشرقی کنارہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ دریاؤں اور نہروں کے ساتھ پشتوں کو بچانے کے لیے بڑے درخت لگائے جاتے ہیں جو سیلاب کو روکتے ہیں، انڈیا والی طرف ایسے درخت تھے لیکن پاکستانی کنارے پر درخت بہت کم تھے۔ تین چار سال بعد جب انڈیا پانی چھوڑتا ہے تو یہ پانی ہماری طرف کے پشتوں کو توڑ دیتا ہے۔ لیکن درختوں کی وجہ سے انڈیا کی طرف کے پشتے محفوظ رہتے ہیں۔

”منصور۔“ عقب سے دادی جان نے پکارا۔ ”واپس نہیں جانا ہے؟“

منصور چونکا شام گہری ہو رہی تھی اور مشرقی افق دھندلا ہو گیا تھا۔ سارہ خلاف توقع تھکی نہیں تھی لیکن اداس ضرور تھی۔ اسے یہ شام دیکھ کر خیال آیا تھا اس کی زندگی کی شام بھی قریب تھی۔ منصور نے سامان سمیٹا اور وہ گاڑی کی طرف چل پڑے جہاں صاحب داد ان کا انتظار کر رہا تھا۔ صاحب داد پچاس سال کی عمر میں بھی صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ اس کا تعلق ہری پور سے تھا۔ صرف اٹھارہ سال کی عمر سے حویلی میں ملازمت کرنے لگا تھا اور تب سے یہیں تھا۔ اس کی شادی ہو گئی تھی اور اب تو اس کے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ وہ حویلی پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ سارہ آرام کرنے چلی گئی۔ منصور اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ امینہ مل گئی۔

”تمہارے بابا نے وارننگ دی ہے، آج کھانے کی میز پر نظر آؤ۔“

”جی امی۔“ اس نے سعادت مندی سے کہا اور کمرے میں گھس گیا۔ نہا دھو کر اس نے عقبی راستہ اختیار کیا کیونکہ سامنے امینہ موجود ہوتی۔ حویلی کے عقب میں بڑا سا صحن تھا۔ اس کے آخری حصے میں ایک چھوٹی سی چار دیواری منصور کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں اس نے اپنی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ شام کے بعد وہ یہیں پایا جاتا تھا۔ رات کا کھانا وہ یہیں کھا لیتا اور اسی وجہ سے امینہ نے وارننگ پہنچائی تھی۔ منصور نے سوچا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

رات کے کھانے میں شریک ہو کر انہیں بھی مطمئن کیا جاسکتا تھا۔ ہفتے میں ایک دو بار اسے سب کے ساتھ کھانا پڑتا تھا۔

چار دیواری سرخ لکھوری اینٹوں سے بنی تھی۔ اندر ان ہی اینٹوں سے ایک درمیانے سائز کا کمرا بنا ہوا تھا جس پر گلابی کھپریل کی چھت تھی۔ یہ اصلی کھپریل تھا کنکریٹ کو کھپریل کی صورت نہیں دی تھی۔ احاطے میں جاپانی اسٹائل کا باغ لگا تھا۔ اس کے پودے بھی منصور نے خاص طور سے منگوائے تھے۔ ایک کونے میں کھردرے رنگ برنگے پتھروں سے تالاب بنا تھا جس میں سرخ اور سیاہ مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ باغ کے وسط میں ایک ٹی وی ڈش لگی تھی اور ایک سیٹلائٹ انٹرنیٹ اینٹینا لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سولر پینل لگے تھے جو سورج کی روشنی سے بجلی پیدا کر کے اسے بیٹریوں میں ذخیرہ کرتے تھے۔

منصور نے کمرے کا دروازہ کھولا اور پہلے اے سی آن کیا۔ سوائے اس اے سی کے باقی بجلی کی ساری ضرورت سولر انرجی سے پوری ہو جاتی تھی۔ کمرے میں ایک میز تھی جس پر ایک عدد جدید ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر اور اس کے تمام لوازمات رکھے تھے ساتھ ہی ایک چھوٹا لیپ ٹاپ بھی تھا۔ میز کے ساتھ ایک آرام دے کرسی تھی اور ایک طرف ٹو سیٹر صوفہ رکھا تھا۔ کمرے کے دوسرے کونے میں ایک درمیانے سائز کا بیڈ تھا۔ اس کے ساتھ ہی واٹر ڈسپنسر تھا جس کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا فریج بھی تھا۔ اس میں کولڈ ڈرنکس، جوس اور منصور کی پسند کے پھل موجود رہتے تھے۔ بہ وقت ضرورت وہ گرم پانی اس سے لے کر چائے یا کافی بنالیا کرتا تھا۔ گویا اسے کسی بھی چیز کے لیے یہاں سے باہر نہیں جانا پڑتا تھا۔ فرش پر ہلکے نیلے رنگ کا دبیز قالین تھا اور کھڑکیوں پر اسی رنگ کے پردے تھے۔ اے سی نے ایک منٹ میں کمرے کی گرمی اور حبس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ کمرا ٹھنڈا ہونے کے بعد منصور نے کمپیوٹر آن کیا اور فریج سے کوک کا ٹن نکال کر کرسی پر آ گیا۔

یہ سارا سیٹ اپ مع انٹرنیٹ اور ڈش ٹی وی کے خاصا مہنگا تھا لیکن نوابزادہ منصور مرزا کے لیے مہنگا نہیں تھا۔ خدا نے اتنی دولت دی تھی کہ یہ سارا خاندان پرآسائش زندگی گزارنے کے بعد اپنے شوق بھی پورے کر سکتا تھا۔ انتظار مرزا کی تین اولادیں تھیں۔ افتخار کے بعد انتساب تھا جو کینیڈا چلا گیا۔ اس نے کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کی اور وہیں یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں، وہ ابھی پڑھ رہی تھیں اور امکان تھا کہ ان میں سے چھوٹی والی منصور سے بیاہی جائے گی۔ سب سے چھوٹی عمارہ تھی، وہ بیاہ کر چند میل دور گئی تھی۔ شوہر بھی زمیندار تھے۔ عمارہ کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب کے بچے بڑے ہو گئے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے تھے یا کوئی بزنس یا ملازمت کر رہے تھے۔ عید کے موقع پر سب جمع ہوتے تو حویلی میں رونق بڑھ جاتی تھی۔

منصور کا شوق کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تھا۔ کالج لائف میں اسے ان چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور نہ اس وقت تک کوئی کمپیوٹر لیا تھا لیکن پھر ایک دوست کے گھر اتفاق سے منصور نے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ استعمال کیا۔ یہ اسے اتنا اچھا لگا کہ اس نے اسی وقت اپنا کمپیوٹر لینے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دن منصور اس دوست کے ساتھ رہا۔ حویلی میں مخصوص احاطہ اس نے صرف دس سال کی عمر میں اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا اور یہاں یہ کمرا بنوایا تھا۔ جب بھی اس کا موڈ ہوتا تو یہاں آ جاتا۔ اسکول اور کالج کے دور میں حویلی آنے کے بعد اسے یہاں وقت گزارنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ کالج کے دنوں میں تو یہ جگہ ویران ہی ہو گئی تھی۔ عدم توجہی کی وجہ سے باغ اجڑ گیا تھا۔ جب منصور نے کمپیوٹر لانے کا سوچا تو اس کے لیے اسی کمرے کو منتخب کیا۔ اس نے احاطہ نئے سرے سے آراستہ کیا، باغ بنوایا اور پھر کمپیوٹر اور اس کا دوسرا سامان لایا۔

شکر گڑھ کے اس دور دراز علاقے میں بجلی اور فون کی سہولت ہی بہت مشکل سے میسر تھی، انٹرنیٹ کہاں سے ملتا؟ اس لیے منصور نے سیٹلائٹ انٹرنیٹ لگوایا۔ یہ بہت مہنگا تھا لیکن وہ برداشت کر سکتا تھا۔ شروع کے دو سال تو اس نے سیکھنے میں لگائے۔ کمپیوٹر کے آن لائن کورس کیے۔ اس معاملے میں وہ باصلاحیت نکلا اور اس نے بہت جلد کمپیوٹر کے تمام شعبوں پر عبور حاصل کر لیا۔ بعد میں اس کا تعلق ہیکرز سے بھی ہوا اور اس نے اپنے چند خاص دوستوں کے ساتھ مل کر بہت سے کارنامے بھی انجام دیے تھے۔ اس کے نیٹ فرینڈز مشرق وسطیٰ سے لے کر ترکی تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب مسلمان تھے اور ان ویب سائٹس کے خلاف کام کرتے تھے جو مسلمانوں یا اسلام کے خلاف تھیں۔

منصور اور اس کے ساتھیوں کی تعداد پانچ تھی اس لیے انہوں نے اپنے ہیکرز گروپ کا نام آئی فائیو رکھا تھا۔ منصور کے علاوہ اس گروپ میں پاکستان کا محمود جو دبئی میں تھا۔ شام کا فہد جو سعودی عرب میں پیٹرولیم انجینئر تھا۔ نادیہ جو ترکی کی وزارت خارجہ میں افسر تھی اور صبا جو ایک لبنانی طالبہ تھی، وہ بیروت یونیورسٹی سے آئی ٹی میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ ان کے مخالف گروپ بھی موجود تھے۔ ان میں بھارتی اور اسرائیلی گروپ نمایاں تھے۔ کچھ عرصے پہلے منصور اور اس کے

ساتھیوں کا شیو آرمی نامی ہیکرز گروپ سے ٹاکرا ہوا جس کا سربراہ گرو نامی شخص تھا، اس نے آئی فائیو کو چیلنج کیا کہ وہ کوئی انڈین سائٹ ہیک کر کے دکھائیں۔ شیو آرمی کا دعویٰ تھا کہ بھارتی سائٹس دنیا میں سب سے زیادہ محفوظ ہیں اور انہیں ہیک کرنا ناممکن ہے۔ آئی فائیو نے شیو آرمی کا چیلنج قبول کر لیا اور ایک مہینے کی لگاتار کوشش کے بعد انہوں نے ایک بھارتی ایٹمی تحقیقاتی مرکز کی سائٹ ہیک کر کے اس کی انتہائی خفیہ دستاویز انٹرنیٹ پر جاری کر دیں۔ آئی فائیو کی اس کارروائی نے پورے بھارت بلکہ ہیکرز کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ آئی فائیو کا نام بھی سامنے آیا تھا۔ ان کی واہ واہ بھی ہوئی تھی مگر ساتھ ہی ان کے دشمنوں میں اضافہ بھی ہو گیا تھا۔

منصور نے سرینا سورج کو سب سے پہلے فیس بک اور اس قسم کی سوشل سائٹس پر تلاش کرنا شروع کیا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اسے زیادہ دیر کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ اندر سے کھانے کا بلاوا آ گیا۔ منصور کو جانا پڑا۔ افتخار موجود تھا اور اس نے گھور کر منصور کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ شاید اس لیے کہ سارہ بھی موجود تھی۔ منصور نے کھانے کے دوران اسے بتایا۔ ”میں نے سرینا گرینی کی تلاش شروع کر دی ہے۔“

سارہ چونک گئی۔ ”کیسے؟“

”دادی جان گوگل سب تلاش کر لیتا ہے۔“ منصور نے طنز کیا۔

”جی ہاں جمعے کی نماز میں مسجد سے چوری ہو جانے والی جوتیاں بھی تلاش کر سکتا ہے۔“ منصور نے طنزیا تائید کی۔ سارہ نے منصور کو گھورا تو وہ سر جھکا کر کھانے لگا۔ سارہ نے کسی قدر بے تابی سے کہا۔ ”کچھ کامیابی ہوئی؟“

”ابھی تو نہیں ہوئی لیکن ڈنر کے بعد دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔“ منصور نے جواب دیا۔

سارہ کو سکون نہیں مل رہا تھا جب منصور میز سے اٹھا تو اس نے کہا۔ ”رک جا، میں بھی چلوں گی۔“

”آپ تھکی ہوئی آئی ہیں ابھی آرام کریں۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ سارہ نے جلدی سے کہا۔

منصور سارہ کے ساتھ واپس آیا تو اسے اسکرین پر نیو ای میل کا میسج بلنک کرتا نظر آیا، اس نے سارہ سے کہا۔ ”آپ بیٹھیں میں ذرا ای میل چیک کر لوں۔“

میل کسی راج سن 88 کی طرف سے تھی۔ منصور اسے نہیں جانتا تھا۔ وہ عام طور سے اجنبی ای میلز نہیں کھولتا تھا اور انہیں ویسے ہی ڈیلیٹ کر دیتا تھا مگر اسے تجسس تھا کہ یہ اجنبی کون ہے اس نے سیف بکس میں جا کر میل کھولی۔ اندر صرف ایک سطر میں پیغام تھا۔ ”اف یو تو سارہ خان ڈاٹر آف دلاور خان...... رپلائے می۔“

منصور دم بہ خود رہ گیا تھا، اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔ ”دادی جان حیرت انگیز بات ہے۔ کسی راج سن نے آپ کے بارے میں پوچھا ہے۔“

”میرے بارے میں؟“ سارہ حیران ہوئی۔

”یہ دیکھیں۔“ منصور نے اسکرین سارہ کی طرف گھمائی۔

”ہاں سارہ خان ولد دلاور خان میں ہی ہوں اس سے پوچھو یہ کون ہے؟“

منصور نے پہلے راج سن کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن اس کی پروفائل خالی تھی۔ منصور نے کچھ اور ترکیبیں بھی آزمائیں، اس کا ای میل اکاؤنٹ ہیک کرنے کی کوشش کی لیکن جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ راج سن بھی اسی میدان کا کھلاڑی تھا۔ اس نے اپنے ای میل اکاؤنٹ کی حفاظت کا غیر معمولی بندوبست کر رکھا تھا۔ آخر میں اس نے راج سن کو جوابی میل کی اور اس سے پوچھا کہ وہ سارہ خان کو کیسے جانتا ہے۔ اس کا جواب فوراً ہی ملا تھا۔ ”پہلے میرے سوال کا جواب دو پھر میں بتاؤں گا کہ سارہ خان کو کیسے جانتا ہوں۔“

منصور نے سارہ سے کہا۔ ”دادی جان وہ آن لائن ہے۔ اس نے پھر وہی سوال کیا ہے۔“

”اسے بتا دے کہ میں تیری دادی ہوں۔“ سارہ بولی۔ وہ راج سن کی میل کا جان کر بے چین ہو گئی تھی۔ منصور نے جواب دیا۔

”وہ میری دادی جان ہیں۔“

”اس سے پوچھو وہ کسی سرینا سورج کو جانتی ہے۔“ راج سن نے پھر میل کی۔ منصور کو اس کا انداز برا لگا تھا لیکن اس نے تحمل سے کام لیا۔

”ہاں سرینا سورج ان کی بچپن کی سہیلی ہے۔“

”وہ میری دادی ماں ہیں اور انہوں نے سارہ خان کو تلاش کرنے کو کہا ہے۔“

منصور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس کام کا اس نے آغاز کیا تھا وہ اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔ اسے سرینا سورج کو تلاش نہیں کرنا پڑا تھا اس سے پہلے ہی سرینا کے پوتے نے سارہ کو تلاش کر لیا تھا۔ منصور نے اس سے کہا۔ ”اپنے گھر کا یا کوئی ایسا فون نمبر دو جس پر سرینا سورج سے بات کی جا سکے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میری دادی جان ان سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"
راج سن نے اگلی میل میں دوفون نمبر بھیج دیے۔ منصور نے سارہ کی طرف دیکھا۔ "حیرت انگیز دادی جان جیسے آپ نے مجھ سے کہا کہ میں سرینا سورج کو تلاش کروں اسی طرح انہوں نے اپنے پوتے سے کہا کہ وہ انٹرنیٹ پر آپ کو تلاش کرے۔ اس کی ای میل مجھے ابھی ملی ہے اور اس نے اپنے گھر کے دونمبر بھیجے ہیں جس پر آپ سرینا سورج سے بات کر سکتی ہیں۔"
خود سارہ نے جب منصور سے یہ بات کی تھی تو اسے زیادہ امید نہیں تھی کہ سرینا یوں مل سکے گی اور یہ امید تو بالکل ہی نہیں تھی کہ وہ آج کے دن چند گھنٹوں میں مل جائے گی۔ سارہ نے بے تابی سے کہا۔ "اسے کال کر۔"
منصور کے پاس انٹرنیٹ سے کال کرنے کا اکاؤنٹ تھا۔ اس نے سائٹ کھول کر راج سن کا دیا ہوا ایک نمبر ملایا اور لیپ ٹاپ کا اسپیکر آن کر دیا، اب سارہ بھی سن سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد کسی عورت نے کال ریسیو کی۔
"ہیلو کون بات کر رہا ہے۔"
سارہ چونک گئی۔ "یہ...... یہ سرینا بات کر رہی ہے؟"
منصور نے اشارے سے سارہ کو بات کرنے سے روکا اور پھر ہیڈ فون مائک اس کے کان سے لگا کر اشارہ کیا کہ اب بات کریں۔ سارہ نے سنبھل کر کہا۔ "تم سرینا بات کر رہی ہو، لالہ کشن مل سورج کی بیٹی؟"
دوسری طرف عورت خاموش ہو گئی پھر اس نے کچھ دیر بعد بدلے ہوئے انداز میں کہا۔ "تم کون ہو؟"
"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔" سارہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔
"ہاں میں لالہ کشن مل سورج کی بیٹی سرینا ہوں لیکن تم......"
"کوشلیا چاچی کی بیٹی......؟"
سرینا نے چیخ ماری۔ "سارہ...... سارہ، تم سارہ ہو نا......" وہ کہتے ہوئے بلند آواز سے رونے لگی۔ ادھر سارہ بھی رونے لگی۔ منصور نے جلدی سے سارہ کو شانوں سے تھام کر کرسی پر بٹھایا، وہ کھڑے کھڑے لرز رہی تھی۔
"آرام سے دادی جان! بیٹھ کر بات کریں روئیں مت...... پلیز۔"
"سرینا...... سرینا۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولیں۔
"تو کیسی ہے؟"
"تو بتا، تو کیسی ہے۔" وہ بھی روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
منصور کو کچھ عجیب سا لگا کہ اس موقع پر یہاں موجود رہے۔ بے شک سارہ اس کی دادی تھی اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ منصور سے چھپا ہوا نہیں تھا مگر وہ اس وقت جیسے ماضی میں چلی گئی تھی اور منصور نے مناسب سمجھا کہ اسے بات کرنے کے لیے وہاں اکیلا چھوڑ دے۔ منصور باہر نکل آیا جہاں بارش شروع ہو گئی تھی۔ موسم شام سے ابر آلود ہو رہا تھا۔ کتنی انوکھی بات تھی آج سارہ نے اسے اپنی زندگی کی کتاب کا ساٹھ سال پرانا ورق دکھایا اور آج ہی منصور نے اس ورق کا گم شدہ پیرا گراف تلاش کر لیا تھا۔ یہ کوشش سے زیادہ اتفاق تھا۔ اسے خوشی تھی کہ دادی جان کی برسوں پرانی آرزو پوری ہو گئی۔ ممکن ہے وہ پہلے بتاتی تو منصور پہلے ہی سرینا سورج کو تلاش کر لیتا لیکن قدرت کی جانب سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔
"منصور۔" سارہ نے دروازہ کھول کر اسے پکارا۔ اسے باہر آئے ہوئے شاید آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ اندر آ گیا۔
"جی دادی جان؟"
"سرینا تجھ سے بات کرے گی۔" وہ بولی اور ہیڈ فون منصور کی طرف بڑھا دیا۔
"آداب گرینی۔" منصور نے ادب سے کہا۔ "دادی جان کی دوست ہونے کے ناتے آپ بھی میرے لیے اسی طرح محترم ہیں۔"
"جیتے رہو بیٹے، بھگوان تمہیں وہ سکھ اور خوشیاں دے جو تم نے سوچی بھی نہ ہوں، تمہیں وہ کامیابی دے جس کی تم نے تمنا نہ کی ہو۔ آج تم نے دو سکھیوں کو ملا کر بہت بڑی نیکی کمائی ہے۔"
"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، میں نے کوشش کی تھی لیکن راج پہلے کامیاب رہا۔"
"سارہ نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا ہے کہ تم کمپیوٹر کے ماہر ہو میرا پوتا راج بھی کمپیوٹر کی تعلیم امریکا سے حاصل کر کے آیا ہے۔"
منصور کا اندازہ درست نکلا تھا راج کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال کا ماہر تھا۔ سرینا کہہ رہی تھی۔ "میں نے سارہ سے کہہ دیا ہے تم اس کے ساتھ دہلی آؤ گے میرے گھر۔"
دونوں سہیلیوں نے پروگرام بھی بنا لیا تھا۔ "جی ضرور آؤں گا۔"
"مجھے تم سے مل کر بھی خوشی ہوگی اور میرے پوتے کو

بھی۔" وہ بولیں۔ "اچھا اب سارہ سے بات کراؤ، کال بہت لمبی ہو گئی ہے۔"
"نہیں آپ اس کی پروا کیے بغیر جتنی دیر چاہیں بات کر سکتی ہیں، ساری رات بھی۔" منصور نے کہا اور ہیڈ فون سارہ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ پھر اپنی سہیلی سے باتوں میں لگ گئی۔ اس وقت ان دونوں کو وہ باتیں بھی یاد آ رہی تھیں جو انہوں نے پہلی ملاقات میں کی تھیں۔ منصور نے کہیں پڑھا تھا کہ بڑھاپے کی ایک علامت یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان کو پچاس منٹ پہلے کی بات یاد نہیں ہوتی لیکن پچاس سال پرانی باتیں خوب یاد ہوتی ہیں۔ اگرچہ سارہ کی یادداشت اب بھی بہترین تھی اور وہ شاید ہی کوئی بات بھولتی تھی۔ بارہ بجے امینہ چلی آئی تھی۔ اسے سارہ کی فکر تھی کیونکہ وہ زیادہ سے زیادہ دس بجے سونے چلی جاتی تھی۔
"یہ کیا چکر ہے؟"
"دادی جان کی بچپن کی دوست مل گئی ہیں ان سے بات کر رہی ہیں۔"
"اچھا۔" امینہ نے سکون کا سانس لیا۔ "مجھے فکر ہو رہی تھی۔"
"آپ آرام کریں جب دادی جان بات کر لیں گی تو میں خود انہیں ان کے بیڈروم تک چھوڑ آؤں گا۔"
امینہ مطمئن ہو کر چلی گئی۔ منصور کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ دادی جان اور ان کی سہیلی نہ جانے کن باتوں میں مگن تھیں۔ اسے غنودگی سی آ گئی۔ پھر سارہ نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔ "چل لڑکے مجھے چھوڑ کر آ۔"
"آپ کی بات ہو گئی؟" منصور نے گھڑی کی طرف دیکھا تین بج رہے تھے۔ "اتنی دیر تک بات کرتے رہے آپ دونوں؟"
"ہاں بیٹا۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "اتنے عرصے بعد مجھے بچپن کی سہیلی ملی تھی بات ختم کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔"
"اب تو مل گئی ہیں، آپ جب چاہے ان سے بات کر لیجیے گا۔"
"ہاں مگر ابھی تو دل نہیں بھرا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن وہ بیمار ہے، زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتی۔ تجھے پتا ہے وہ بھی تیرہ اگست کے دن دریا کے کنارے آتی ہے۔ وہ صبح آتی ہے کیونکہ اس وقت ہماری طرف کا کنارہ صاف دکھائی دیتا ہے اور میں دوپہر کے بعد جاتی ہوں۔"
منصور حیران ہوا تھا۔ "آپ دونوں کی کیمسٹری کتنی ملتی ہے۔"
"بچپن کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے آدمی کے اندر تک اتر جاتی ہے۔" سارہ نے سرخوشی کے عالم میں کہا۔ "سرینا نے مجھے بلایا ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ورنہ وہ خود آتی۔ منصور، تو میرے ساتھ چلے گا؟"
منصور کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ سرحد کے اس پار اس کے لیے کیا ہے۔ یہ بات وہ سرحد پار کیے بغیر نہیں جان سکتا تھا۔

☆☆☆

دہلی ائرپورٹ پر امیگریشن کے عملے نے گرین پاسپورٹ دیکھتے ہی انہیں لائن سے الگ کر لیا تھا۔ دوسرے ممالک کے مسافر اور بھارتی مسافر آرام سے چلے گئے۔ ان کی سرسری سی چیکنگ ہوئی تھی لیکن منصور اور سارہ کے سامان کی کسٹم حکام نے اس طرح تلاشی لی تھی کہ بس چیزوں کو ادھیڑ کر دیکھنے کی کسر رہ گئی تھی۔ ان لوگوں کا رویہ دیکھ کر منصور کا خون کھول رہا تھا لیکن سارہ سکون سے کھڑی تھی۔ ایک کسٹم آفیسر نے منصور کے شانے سے لٹکتے لیپ ٹاپ کو بھی چیک کیا لیکن منصور نے اسے آن کر کے دکھانے سے انکار کر دیا۔ خدا خدا کر کے ان لوگوں کی تسلی ہوئی اور انہیں جانے کی اجازت ملی۔ منصور اور سارہ کے سوٹ کیسوں میں سامان نفاست سے پیک تھا۔ کسٹم حکام نے چیزوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی یہ سامان ایکسرے روم سے گزر کر آیا تھا۔ اگر اس میں کوئی مشکوک چیز ہوتی تو وہیں پکڑ لی جاتی۔ یہ سلوک شاید پاکستانی شہری ہونے کی وجہ سے کیا گیا تھا۔
"یہ کیا تھا دادی جان؟" منصور نے بیگیج لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔
"ان لوگوں کا تعصب پاکستان کے لیے۔" سارہ نے جواب دیا۔
"لیکن ہم تو ایسا نہیں کرتے ہیں۔"
منصور نے واہگہ بارڈر پر بارہا بھارتی مسافروں کا استقبال پھولوں کے ہاروں سے ہوتے دیکھا تھا۔ بھارت سے آنے والوں کو پاکستان میں ہر جگہ وی آئی پی پروٹوکول دیا جاتا ہے اور پاکستان سے آنے والوں کے ساتھ یہاں یہ سلوک ہو رہا تھا۔ رائیول لاؤنج میں سرینا سورج بے تابی سے ان کی منتظر تھی۔ سارہ کو دیکھتے ہی وہ لپک کر آئی۔ انٹرنیٹ کی مدد سے دونوں سہیلیوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا اس لیے پہچان لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ایک بار پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

رونے دھونے کا دور چلا۔ سرینا سورج کے ساتھ کھڑا نوجوان اپنی کسی قدر بڑھی شیو اور تاثرات سے درشت مزاج لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، سر اور شیو کے بال بالکل سیاہ تھے۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں منصور کو خیال آیا کہ اس کا دل بھی اسی طرح تاریک ہوگا۔ وہ سرینا سورج کا پوتا راج سورج تھا۔ منصور نے سرینا سورج کو آداب کہا تھا لیکن راج نے سارہ کے لیے ایسی کوئی بات نہیں کی اور ساکت کھڑا رہا۔ اس لیے منصور نے بھی اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی اور اسی کے انداز میں ساکت کھڑا ہو گیا۔ جب سرینا اور سارہ رو دھو کر فارغ ہوگئیں تو سرینا نے کہا۔ ''ارے راج تم ملے نہیں...... یہ سارہ کا پوتا ہے منصور۔''

''جی۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''اب گھر چلیں؟''

''اِل مینرڈ۔'' منصور نے زیر لب کہا تو راج نے چونک کر اس طرف دیکھا، شاید سمجھ گیا کہ منصور نے اس کے بارے میں بات کی ہے۔ اس نے ان کا سامان اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

''ہاں چلتے ہیں۔'' سرینا سورج جھینپ کر بولی۔ شاید وہ پوتے کے رویے پر شرمندہ ہو رہی تھی۔ منصور نے ایک پورٹر کو اشارہ کیا، اس نے ان کا سامان ٹرالی پر رکھا اور وہ ٹرمنل سے باہر آئے۔ سرینا کی پرانی لیکن شاندار بیوک پارکنگ میں موجود تھی۔ اس میں ائرپورٹ سے روانہ ہوئے۔ سارہ دو مہینے سے انڈیا آنے کی تیاری کر رہی تھی۔ پہلے ویزے کے لیے درخواست دی جب ویزے مل گئے تو ایر ٹکٹ لیے اور دوسری تیاریاں کیں۔ سارہ اپنی بچپن کی سہیلی کے لیے ہر وہ چیز لے جانا چاہتی تھی جو اس کے ذہن میں آ رہی تھی۔ منصور نے بڑی مشکل سے اسے باز رکھا کیونکہ اتنا سامان لے جانے کی اجازت کیسے ملتی۔ اس کے باوجود سارہ نے بہت کچھ لے لیا تھا۔ سرینا اور اس کے پوتے راج کے لیے خریدی ہوئی چیزوں سے دو سوٹ کیس الگ بھرے ہوئے تھے۔

سارہ کا جوش و خروش تو قابل دید تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی منصور بھی خاصا پرجوش ہو گیا تھا لیکن دہلی ائرپورٹ پر اترتے ہی اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کی جگہ ایک قسم کی بے زاری نے لے لی تھی۔ ان کے پاس تین مہینے کا ویزا تھا مگر منصور نے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک مہینے سے زیادہ نہیں رکیں گے۔ سارہ مشکل سے مانی تھی۔ اب منصور کو یہ ایک مہینا بھی بہت طویل لگ رہا تھا۔ لیکن مجبوری تھی، وہ سارہ کو چھوڑ کر بھی واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ یہ ایک مہینا بھی جلد گزر جائے گا۔ راستے میں دونوں خواتین تو مصروف گفتگو تھیں تاہم منصور، راج کے ساتھ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کا رویہ شروع سے منصور کے ساتھ معاندانہ تھا۔ حالانکہ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی اور اس رویے کی وجہ سوائے مخصوص روایتی بھارتی تعصب کے کچھ نظر نہیں آتی تھی۔ سارہ نے اس خاندان کے بارے میں جو بتایا تھا اس نسل کے آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ اس شخص کا پوتا تھا جس نے سارہ کے خاندان کو ختم کر دیا تھا قسمت تھی جو سارہ بچ گئی۔ جب سارہ نے سرینا سے ملنے کا ارادہ کیا تو منصور نے اس سے کہا۔

''آپ بھول رہی ہیں، سرینا سورج آپ کی سہیلی ہیں لیکن ان کا باقی خاندان ہمارا دشمن ہے۔ آپ کے خاندان کو سرینا سورج کے بھائی نے ختم کیا تھا۔''

''میرے بچے یہ بات اب ساٹھ سال پرانی ہو گئی ہے۔ اب صرف سرینا کا پوتا ہے جو اس واقعے کے بہت سالوں بعد دنیا میں آیا۔ جو اصل مجرم تھا وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اس لیے ماضی کو لے کر بیٹھے رہنے کا فائدہ؟''

''دادی جان آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن کیا ان دونوں ملکوں کے تعلقات میں ماضی نہیں حائل ہے؟''

''یہ سیاسی معاملات ہیں ان کا میرے اور سرینا کے تعلق سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' دادی جان نے بات ختم کر دی۔

آواز کی طرح ماضی کی بھی ایک بازگشت ہوتی ہے اور وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سائنسی تحقیق کے مطابق ایک بار آواز یا روشنی کی لہر پیدا ہو جائے تو وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ کمزور ہوتی جاتی ہے مگر اس کا وجود برقرار رہتا ہے۔ حد یہ کہ اربوں سال پہلے کائنات جس دھماکے سے وجود میں آئی اس کی گونج یا بازگشت ابھی تک برقرار ہے۔ انسانی رویوں اور رشتوں میں نفرت سے زیادہ طاقتور جذبہ اور کوئی نہیں ہے۔ یہ برسوں اور صدیوں برقرار رہتا ہے نسل در نسل جاری رہتا ہے۔ اس کا ثبوت راج کا رویہ تھا۔ ابھی منصور کو بھارتی سرزمین پر قدم رکھے چند گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ راج نے اپنے رویے سے منصور کے اندر ایک رائے قائم کر دی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ دہلی کے کسی نواحی علاقے میں ایک عالی شان پیلس میں داخل ہوئے۔ یہاں سارے مکانات اسی قسم کے تھے اور یہ یقیناً دولت مندوں کا علاقہ تھا۔ بیوک پورچ میں رکی اور دو ملازم نمودار ہوئے، انہوں نے بغیر کہے ڈکی سے سامان نکالنا شروع کیا اور اندر چلے گئے۔ سرینا اور سارہ بھی نیچے اتر آئے تھے۔ وہ اب پیلس کو دیکھ رہے تھے۔ اکتوبر کا آخری ہفتہ ہونے کی وجہ سے گرمی کی شدت برقرار نہیں رہی تھی۔ پیلس

کے چاروں طرف شاندار قسم کا لان تھا۔ راج گاڑی کے بونٹ سے ٹکا ہوا تھا۔

''تم نے دیکھا انڈیا نے کتنی ترقی کی ہے؟'' اس کا انداز جتانے والا تھا۔

''ہاں، بہ ظاہر انڈیا نے بہت ترقی کی ہے۔'' منصور نے سرسری سے انداز میں کہا تو اس کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

''کیا مطلب؟''

''سوکس کے ماہرین کہتے ہیں کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ اخلاقی لحاظ سے دوسری قوموں سے برتر نہ ہو جائے۔ میرا خیال ہے اس میدان میں انڈیا کو ترقی کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔''

راج کا رنگ بدل گیا اور وہ تلملا کر کچھ کہنے جا رہا تھا کہ سرینا اور سارہ وہاں آ گئے۔ ''ارے تم ابھی تک باہر کھڑے ہو، اندر چلو یہاں گرمی ہے۔''

''یہ جہاں سے آئے ہیں وہاں اس سے زیادہ گرمی ہوتی ہے۔'' راج نے بدتمیزی سے کہا تو سرینا نے اسے گھورا۔ اس نے نظریں چرا لیں۔ وہ واضح طور پر متعصب ہندو تھا جس سے ان دونوں کا مسلمان اور اس سے بھی زیادہ پاکستانی ہونا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ منصور کو کھٹک ہونے لگی۔ سارہ نے اسے بتایا تھا کہ عام حالات میں ہندو دکھاوے کے لیے سہی لیکن بہت با اخلاق ہوتے ہیں اور دوسرے سے اس طرح ملتے ہیں کہ اس کا دل جیت لیتے ہیں بے شک وہ اس سے نفرت ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔ ہاں اس وقت وہ اپنی اصلیت پر آ جاتے ہیں جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ دوسرے پر مکمل طور پر حاوی ہیں اور انہیں ظاہری اخلاق برتنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات سب ہندوؤں کے بارے میں نہیں تھی بلکہ ان کے لیے تھی جو مسلمانوں اور پاکستان سے تعصب رکھتے ہیں۔ اس وقت راج کا رویہ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔

سورج پیلس اندر سے بھی اتنا ہی شاندار تھا جتنا کہ باہر سے دکھائی دیتا تھا۔ منصور اور سارہ کے لیے دو گیسٹ رومز کھولے گئے۔ یہ بھی بہترین فرنیچر اور فکسچر سے آراستہ تھے۔ یقیناً سورج کیمیکلز کا بزنس عروج پر جا رہا تھا۔ سرینا نے سارہ کو بتایا تھا کہ بعض وجوہات کی بنا پر وہ بیاپور سے زمین اور حویلی فروخت کر کے جانے پر مجبور ہوئے تھے۔ مہیش نے دہلی میں ایک کیمیکل کمپنی خرید لی اور پھر اس کا کاروبار ترقی کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا تھا کہ اس کا شمار بھارت کی چند بہترین کیمیکلز کمپنیوں میں ہوتا تھا۔ مہیش کے بعد سرینا اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ سرینا نے بعد میں کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد بزنس ایڈمنسٹریشن میں اعلیٰ ڈگری بھی حاصل کی تھی۔ اسے مہیش کے بعد کاروبار کی دیکھ بھال میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ منصور نے سارہ سے پوچھا تھا کہ سرینا نے شادی کیوں نہیں کی تو اس نے جواب نہیں دیا مگر وہ بہت دکھی نظر آنے لگی تھی۔

منصور اور سارہ آرام سے پہنچ گئے تھے۔ وہ تازہ دم ہی تھے۔ بس منہ ہاتھ دھو کر وہ کھانے کی میز پر آ گئے۔ لنچ کا وقت تھا اور سرینا نے ایک مسلمان باورچی سے وہ سارے کھانے بنوائے تھے جو مسلمان شوق سے کھاتے ہیں حد یہ کہ گوشت بھی موجود تھا۔ گوشت بکرے اور چکن کا تھا۔ ساتھ میں مچھلی اور جھینگے تھے۔ سرینا نے صرف دو افراد کے لیے باقاعدہ دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ مسلمان باورچی عبدالحمید کو ایک مہینے کے لیے منہ مانگے معاوضے پر رکھا گیا تھا۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا، کھانا واقعی لذیذ تھا۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود منصور نے اچھا خاصا کھا لیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا کیونکہ وہ صبح سویرے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ ایک دن پہلے حویلی سے لاہور آ گئے تھے یہاں افتخار مرزا کے ایک دوست کے گھر رکے تھے، صبح اس نے انہیں ائرپورٹ پہنچایا تھا۔ انہیں سونے کا موقع کم ملا تھا۔ اس لیے منصور لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ وہ جاگا تو سارہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ ''آپ کب آئیں؟ مجھے جگا دیا ہوتا۔''

''نہیں تم تھکے ہوئے تھے۔''

''تھکی ہوئی تو آپ بھی تھیں۔''

''ہاں لیکن سرینا سے ملنے کی خوشی میں احساس نہیں ہوا۔'' وہ بولی۔ ''ابھی تک میں اس کے پاس تھی۔''

''آپ نے محسوس کیا کہ راج ہم لوگوں کی آمد سے خوش نہیں ہے۔''

''ہاں...... سرینا نے بھی محسوس کیا اور وہ معذرت کر رہی تھی۔ راج کچھ اکھڑ قسم کا انسان ہے۔''

''اکھڑ تو نہیں، مجھے تو متعصب لگ رہا ہے۔ گرینی کی بات اور ہے لیکن ان کے پوتے نے ہمیں پسند نہیں کیا ہے بلکہ شاید نفرت کرتا ہے۔''

''ہمیں کیا......؟ ہم سرینا سے ملنے آئے ہیں۔''

''دادی جان اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک درخواست کر سکتا ہوں۔''

''میں سمجھ رہی ہوں میں خود بھی ایک مہینا نہیں رکوں گی۔ میں نے سرینا سے کہہ دیا ہے کہ میں پندرہ دن بعد چلی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاؤں گی۔"

منصور نے اطمینان کا سانس لیا۔ "تھینک یو وادی جان یہ پندرہ دن میں کسی نہ کسی طرح گزار لوں گا۔"

"تم گھومو پھرو، سرینا نے ایک گاڑی اور ڈرائیور تمہارے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ دہلی میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔"

ان کا ویزا صرف دہلی کے لیے مخصوص تھا اس لیے وہ یہاں سے کہیں اور نہیں جا سکتے تھے۔ منصور کو کہیں اور جانے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ اسے پندرہ دن گزارنے تھے اور اس کے لیے دہلی بھی برا نہیں تھا اور یہاں بہت ساری جگہیں دیکھنے کے لائق تھیں۔ سرینا نے ڈرائیور اور گاڑی مخصوص کر کے اچھا کام کیا تھا۔ منصور، راج کی صورت دیکھنے سے بچ گیا تھا۔ وہ تیار ہو کر باہر آیا تو کثاری دار مونچھوں والا سیاہ فام ڈرائیور ایک سی گرین مرسیڈیز کے ساتھ موجود تھا۔ سرینا اور سارہ لان میں چائے پی رہی تھیں۔ سرینا نے اسے بلا لیا۔

"چائے پیتے جاؤ۔"

چائے کے دوران سرینا نے راج کے بارے میں بتایا کہ وہ آئی ٹی کا ماہر ہے۔ اسے کئی بار جاب کی پیشکش ہوئی لیکن وہ کسی کی ملازمت کرنا پسند نہیں کرتا وہ اپنا کام کرتا ہے۔

منصور چونکا۔ "اپنا کام...... کیا کرتا ہے؟"

"بس گھر میں رہ کر کمپیوٹر سے کرتا ہے اسے تو بزنس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پتا نہیں میرے بعد اس بزنس کا کیا ہوگا؟"

"خود سے کام کرنے میں مزہ آتا ہے لیکن اس سے آدمی کبھی کبھی مشکل میں بھی پڑ جاتا ہے۔" منصور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"راج کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ کچھ مہینے پہلے وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ سرکار کے آدمی آتے رہے تھے اس سے بات کرنے کے لیے، اسے بھی بلایا جاتا تھا۔ نہ جانے اس سے کیا غلطی ہوئی تھی بعد میں بڑی مشکل سے پیچھا چھوٹا تھا۔" سرینا نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ چائے کے ساتھ لوازمات بھی تھے۔ لیکن منصور نے صرف چائے لی اور اجازت لے کر کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور منتظر تھا، وہ گاڑی میں بیٹھا تو اس نے پوچھا۔

"کہاں جائیں گے صاحب؟"

"کہیں لے چلو...... جہاں آدمی کچھ شاپنگ بھی کر سکے۔"

"کناٹ پیلس لیے چلتا ہوں صاحب۔" وہ بولا۔

"ادھر سے ہر چیز مل جاتی ہے۔"

"تب وہیں چلو۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ کناٹ پیلس میں تھے۔ کچی آبادیوں اور غریب بستیوں سے قطع نظر انڈیا کے دارالحکومت کو خوب سجا سنوار کر رکھا گیا تھا۔ کچی آبادیوں میں نچلی ذات کے لوگ تھے اور غریب آبادیاں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے محلے تھے ان میں شاہی مسجد اور اس کے آس پاس کا علاقہ بھی شامل تھا۔ گاڑی اس کے پاس سے گزری تھی لیکن کناٹ پیلس کا علاقہ بہت خوب تھا۔ چمکتا دمکتا اور روشنیوں سے بھرپور شام ہو چکی تھی اس لیے یہاں کی رونقیں بھی عروج پر تھیں۔ گاڑیوں اور لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو امڈ آیا تھا۔ افراد میں خواتین کی اکثریت تھی جو یہاں شاپنگ کرنے یا تفریح کرنے آئی تھیں۔ یہ سب اوپری یا اوپری مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ زرق برق ساڑھیوں اور جدید مغربی انداز کے لباس میں تھیں۔ منصور نے ڈرائیور کو پارکنگ میں چھوڑا اور اپنا لیپ ٹاپ لے کر باہر آ گیا۔

اسے یو ایس بی انٹرنیٹ ڈیوائس درکار تھی۔ اس نے ڈرائیور سے نہیں پوچھا لیکن اسے امید تھی کہ یہاں مل جائے گی۔ دو تین دکانداروں سے پوچھنے کے بعد اسے بالآخر ایک جگہ کا پتا مل گیا جہاں انٹرنیٹ سے متعلق چیزیں مل جاتی تھیں۔ یہاں یو ایس بی ڈیوائس مل گئی۔ خوش قسمتی سے دکان والے نے کوئی شناختی چیز ضمانت بھی نہیں مانگی۔ منصور نے بھی اردو بولنے کی غلطی نہیں کی تھی بلکہ مستقل انگریزی میں بات کرتا رہا اور انگریزی دونوں ملکوں کے لوگ ایک جیسے انداز میں بولتے ہیں۔ اگر وہ اردو بولتا تو دکان دار چونک جاتا۔ اس نے منصور کو ایک تیز رفتار انٹرنیٹ یو ایس بی ڈیوائس دی۔ دکاندار کا دعویٰ تھا کہ پورے انڈیا میں کام کرتی ہے۔ ڈیوائس دکاندار نے اسی وقت ایکٹو کرا کے دیدی جسے لے کر منصور نے ایک اوپن ایئر فٹ پاتھی ریستوران کا رخ کیا۔ یہاں چٹ پٹی چیزیں تھیں۔ اس نے چاٹ کی پلیٹ کا آرڈر دیا۔ لیپ ٹاپ اوپن کر کے اس میں یو ایس بی ڈیوائس لگائی۔ انٹرنیٹ آن ہو گیا اور منصور نے سب سے پہلے اسکائپ آن کیا اور ہیڈ فون کان سے لگا لیا۔ یہ چھوٹا سا سنگل ایئر سیٹ تھا، اس میں مائک بھی لگا تھا۔ محمود اور فہد آ گئے تھے۔ صبا یونیورسٹی اور نادیہ دفتر سے نہیں آئی تھی۔

"شکر ہے تیری صورت تو نظر آئی۔" محمود نے کہا۔

"لیکن یہ کہاں بیٹھا ہے؟"

"دہلی میں کناٹ پیلس نامی جگہ پر ہوں، یوں سمجھ لو

جیسے کراچی میں تین تلوار یا لاہور میں لبرٹی کا علاقہ ہے۔"

"وہ تو نظر آ رہا ہے بھیا، پیچھے بڑی رونق ہے۔" محمود نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہاں دبئی تک دکھائی دے رہی ہے۔"

"بیٹے دبئی میں یہاں سے زیادہ رونق ہوتی ہے فارن مال آتا ہے۔" منصور نے جواب دیا۔ "اب فضول باتیں چھوڑو اور کام کی طرف آؤ۔ تمہیں معلوم ہے کہ سرینا کا ایک عدد پوتا بھی ہے، راج سورج نام ہے اور مجھے شبہ ہے کہ اس کا شیو آرمی سے کوئی تعلق ہے۔"

محمود اور فہد مصطفیٰ دونوں چونک گئے۔ فہد نے پوچھا۔

"شبہ کیوں ہے؟"

"ایک تو وہ متعصب قسم کا ہندو ہے اور اس کا پس منظر بھی ایسا ہی ہے یعنی اس کا دادا اور باپ بھی متعصب تھے۔ اس کا باپ سیاچین کی جنگ میں مارا گیا تھا اس لیے اس کی پاکستانیوں سے دشمنی مسلمہ ہے۔ دوسرے سرینا سورج نے بتایا کہ وہ ارب پتی ہوتے ہوئے بھی گھر میں کمپیوٹر پر کچھ کرتا ہے اور کچھ عرصہ پہلے وہ کسی مشکل میں پڑ گیا تھا سرکاری لوگ اس سے پوچھ گچھ کرنے آتے رہے تھے اور بڑی مشکل سے اس کی جان چھوٹی تھی۔"

"وہی معاملہ ہوگا۔" محمود نے واضح انداز میں کہنے سے گریز کیا۔

"بالکل اور اسی سے مجھے شبہ ہوا کہ اس کا تعلق شیو آرمی سے ہے۔"

"اسے تیرے بارے میں پتا ہے؟" محمود کے لہجے میں تشویش آ گئی۔

"میں جو کرتا ہوں اس کا تو میرے گھر والوں کو بھی پتا نہیں ہے۔"

"بھائی وہ تیرے گھر والے ہیں۔" محمود بولا۔ "یہ ہیکر ہے۔"

"اس کا مطلب ہوا تم خطرے میں ہو۔" فہد نے فکر مندی سے کہا۔ "میرا خیال ہے تم جہاں بیٹھ کر بات کر رہے ہو یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔"

"یہاں جو لوگ تمہارے آس پاس گھوم رہے ہیں پتا نہیں کون ان میں جاسوس ہو۔" محمود بولا۔ "تم کہیں اور چلے جاؤ جیسے کسی اعلیٰ درجے کے ریستوران میں جہاں کوئی تمہاری پرائیویسی میں دخل نہیں دے گا۔"

منصور خود بھی خطرہ محسوس کر رہا تھا اس نے چاٹ ادھوری چھوڑی اور بل ادا کر کے نزدیک ہی ایک اعلیٰ درجے

MoB: 0300-2219514, 0344-2609828
Tel: 021-34519074
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
بذریعہ ڈاک
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھیے
ہنر سیکھیے روزگار لیجیے
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
حکمت — ڈسپنسر — ایکوپنکچر — لیڈیز ٹیلرنگ — کشیدہ کاری — U.P.S
علاج نبوی — ہڈو اکوپری — بیوٹی سلمنگ — فیملی پلاننگ — کیمیکل — عینک سازی
یوگا — ایروبک — بیوٹی پارلر — مہر سازی — سرویئر — کمپیوٹر
میٹل ورک — ہوٹل مینجمنٹ — شارٹ ہینڈ — اردو/انگریزی خطاطی
فارسی — ویلڈنگ — الٹراساؤنڈ — فن مصوری — میجک
باغبانی — بازی بلڈنگ
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ریستوران کا رخ کیا مگر وہاں بھی ڈنر ٹائم ہونے کی وجہ سے رش تھا۔ بھارت میں آبادی کا اژدحام ہے اور کوئی جگہ انسانوں سے خالی نہیں ملتی۔ بڑی مشکل سے منصور کو ایک کونے میں خالی میز ملی اور اس نے مینو دیکھ کر ڈنر کا آرڈر کر دیا لیکن ساتھ ہی کہہ دیا کہ کھانا اسے ایک گھنٹے بعد دیا جائے اور کافی منگوالی۔ اس نے لیپ ٹاپ نکال کر اسکائپ آن کیا تو صبا اور نادیہ بھی آگئی تھیں۔ صبا بہت خوش تھی کیونکہ آج اس کے باپ نے اس کی پسند کی نئی میک بک گفٹ کی تھی۔ میک بک اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ سب نے اسے مبارک دی پھر منصور کا مسئلہ سامنے رکھا۔ نادیہ بھی فکر مند ہوگئی تھی۔

"یہ بہت نازک مسئلہ ہے اور اگر منصور پر الزام آگیا تو یہ پھنس بھی سکتا ہے۔"

"بھارت میں پاکستانیوں پر صرف شک ہونا بھی کافی ہے۔ بہت سے پاکستانی برسوں سے بے گناہ بھارتی جیلوں میں قید ہیں اور ان میں سے بہت سارے تشدد کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں یا اپنا ذہنی توازن ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں۔" منصور نے احتیاطاً بولنے کے بجائے لکھنا زیادہ مناسب سمجھا کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ "دیکھا جائے تو میں بے گناہ بھی نہیں ہوں۔ پکڑا گیا تو نہ جانے میرے ساتھ کیا ہو؟"

"میرا تو مشورہ ہے کہ تم جلد از جلد یہاں سے واپس چلے جاؤ۔" محمود نے کہا۔ "تمہیں عزیز ماموں کے بارے میں بتایا تھا نا؟"

محمود کے یہ رشتے کے ماموں اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے انڈیا آئے تھے یہاں وہ غلطی سے ایک ایسے شہر رشتے داروں سے ملنے کے لیے چلے گئے جہاں کا ان کو ویزا نہیں ملا تھا اور وہ گرفتار ہوگئے۔ اس بات کو چھ سال ہو گئے تھے مگر وہ اب تک آزاد نہیں ہو سکے تھے، بھارت کی جیل میں پڑے ہوئے تھے۔ نادیہ حیران ہوئی۔ "تمہاری حکومت اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرتی کیوں نہیں ہے۔ یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ یونان نے گزشتہ سال ہمارے چند سیاحوں کو کسی وجہ سے گرفتار کر لیا تھا اور ہمارے وزیر اعظم نے ذاتی طور پر یونان کے وزیر اعظم سے رابطہ کیا اور اس وقت تک رابطہ رکھا جب تک یہ ترک سیاح رہا ہو کر ترکی واپس نہیں آگئے۔"

"یہ چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں، ہماری حکومت کے پاس اس سے بڑے مسائل ہیں۔" منصور نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ویسے میرا بھی یہی خیال ہے ہمیں جلد از جلد یہاں سے چلے جانا چاہیے لیکن اس کے لیے اپنے میزبانوں کے سامنے وجہ کیا پیش کریں گے؟"

"کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔" محمود نے کہا۔ "گھر میں کسی کی طبیعت خراب کر دینا۔"

"دادی جان گھر کال کریں گی اور پول کھل جائے گا۔"

"تو اپنی دادی جان کو بھی اعتماد میں لے لو۔" نادیہ بولی۔ "پکڑے جانے سے تو بہتر ہے۔"

"اس سے زیادہ اہم یہ جاننا ہے کہ کیا راج کو شک ہوا ہے یا نہیں۔" صبا نے کہا۔ "اگر اسے منصور پر شک ہوگیا ہے تو وہ یہاں سے اتنی آسانی سے نہیں نکل سکے گا۔"

"وہ منصور کو کس طرح روک سکتا ہے؟" فہد نے بے یقینی سے کہا۔

"بھارتی پولیس یا خفیہ اداروں کو پیچھے لگا کر...... شیو آرمی سے تعلق ہونے کی صورت میں اس کے روابط لازمی ان سے ہوں گے انڈیا میں ہیکرز کو حکومتی مدد حاصل ہوتی ہے۔" نادیہ نے یقین سے کہا۔ "بلکہ اب مجھے شک ہو رہا ہے منصور کو اس کی ای میل آنا بھی سازش ہے۔"

"تاکہ منصور کو انڈیا بلایا جا سکے۔" فہد نے کہا۔ "مگر ان کے پاس منصور کے خلاف کیا ثبوت ہے؟"

"ثبوت نہیں پاکستانیوں کے لیے صرف شک ہونا کافی ہے۔" محمود تلخی سے بولا۔ "منصور، میری چھٹی حس خطرے کا اشارہ دے رہی ہے تم بس نکلنے کی فکر کرو۔"

منصور بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کھانا آگیا اور اس نے ان لوگوں کو خدا حافظ کہہ کر کھانا زہر مار کیا۔ اس کی بھوک مر گئی تھی۔ کھانا ادھورا چھوڑ کر وہ بل ادا کر کے باہر آگیا۔ سرینا کا ڈرائیور کار سمیت پارکنگ میں اسی جگہ موجود تھا۔ اس نے منصور کی اتنی لمبی غیر حاضری پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ منصور کار میں بیٹھا تو اس نے پوچھا۔ "اب کہاں چلنا ہے صاحب؟"

"اب واپس چلو۔"

اس نے بے حد سفید دانت نکالے۔ "صاحب آپ نے سارا وقت ایک ہی جگہ لگا دیا۔"

"ہاں اس جگہ دیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔"

"پر آپ نے کچھ لیا ہی نہیں۔" اس نے کہا تو منصور کو احساس ہوا کہ وہ کناٹ پیلس سے کچھ لیے بغیر ہی آگیا تھا۔ منصور نے کوئی جواب نہیں دیا اور باہر دیکھنے لگا۔ ڈرائیور بھی چپ ہوگیا تھا لیکن کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "پیلس سے کال آئی تھی راج بابو آپ کا پوچھ رہے تھے۔"

"کیا پوچھ رہے تھے؟"

"یہی کہ کہاں ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ دیا کہ مجھے پارکنگ میں چھوڑ کر کہیں گئے ہیں۔"

راج نے اسے کیوں فون کیا تھا؟ وہ منصور سے بات کرنا پسند نہیں کر رہا تھا تو اس کے بارے میں کال کر کے کیوں پوچھا؟ منصور سوچ میں پڑ گیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ پیلس پہنچ گئے۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور سارہ تھک کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا چکی تھی۔ سرینا اور راج بھی نظر نہیں آئے تھے۔ ایک ملازم نے منصور کو کمرے تک پہنچایا۔ وہ پورچ میں اس کا منتظر تھا اور کمرے کے دروازے تک اس کے ساتھ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے ہدایت تھی کہ منصور کو پیلس کی حدود میں اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ منصور نے اس سے سرینا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ سونے جا چکی ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر اس نے کھانے پینے کا پوچھا۔ منصور اسے چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آیا اور لیپ ٹاپ بیگ میز پر رکھ دیا۔ البتہ یو ایس بی ڈیوائس اپنے پاس رکھ لی تھی۔ لیپ ٹاپ پر پاس ورڈ لگا تھا اور کوئی اسے کھول نہیں سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے پاس یو ایس بی ڈیوائس دیکھے۔

راج کے بارے میں منصور کو جو شبہ تھا، اپنے ساتھیوں سے بات کر کے اس میں اضافہ ہوگیا تھا اور یہ تقریباً یقین کی حد میں داخل ہوگیا تھا۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا راج جانتا ہے کہ وہ آئی فائیو سے تعلق رکھتا ہے؟ اگر وہ جانتا تھا تو محمود کا خدشہ درست ثابت ہو سکتا تھا منصور اتنی آسانی سے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ راج نے اس کے لیے کوئی جال بچھایا ہوگا اور ایک بار وہ اس جال میں پھنس گیا تو یقیناً نکلنا مشکل ہوتا۔ کچھ دیر میں ملازم اس کے لیے چائے لے آیا۔ منصور چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا کہ دادی جان کو کیسے قائل کرے؟ ان کا جلد از جلد یہاں سے چلے جانا لازمی تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب چائے کے چند گھونٹ لینے کے بعد وہ صوفے پر ہی سو گیا۔ دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور راج اسی ملازم کے ساتھ اندر آیا، اس نے سوتے ہوئے منصور کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھول کر معائنہ کیا اور سر ہلایا۔ "بے ہوش ہے۔"

ملازم نے دانت نکالے۔ "سرکار دوا تیز ہے۔ دیکھیں چائے دو گھونٹ پی ہے۔"

"تم باہر جاؤ۔" راج نے حکم دیا تو ملازم باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی راج نے منصور کا لیپ ٹاپ نکال کر آن کیا لیکن اس پر پاس ورڈ تھا۔ راج حقارت آمیز انداز میں مسکرایا۔ اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈیوائس نکالی اور اسے لیپ ٹاپ کی یو ایس بی پورٹ میں لگا دیا پھر اس نے ایک بٹن دبایا اور ڈیوائس کے اوپر ایک سرخ ایل ای ڈی جلنے بجھنے لگی۔ راج کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں۔ اچانک ڈیوائس کی سرخ روشنی سبز ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی لیپ ٹاپ آن ہوگیا۔ ڈیوائس نے پاس ورڈ توڑ دیا تھا۔ راج نے منصور کی تلاشی لی اور اس کے پاس سے انٹرنیٹ ڈیوائس نکالی۔ اس نے ڈیوائس لگا کر انٹرنیٹ آن کیا اور کی بورڈ پر اس کا ہاتھ تیزی سے چلنے لگا۔ جیسے جیسے وہ منصور کی مختلف چیزیں کھول کر دیکھ رہا تھا، اس کے تاثرات پُرجوش ہو رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور منصور کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میرا شک ٹھیک تھا۔"

راج کا تعلق شیو آرمی سے تھا۔ وہی گروہ کے نام سے کام کرتا تھا۔ سرینا کو معلوم ہی نہیں تھا کہ راج آئی ٹی کا ماہر ہے اور اس کی بے خبری میں ایک ایسا بزنس چلا رہا ہے جسے کبھی منظر عام پر نہیں لایا جا سکتا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھارتی سرکاری اور دفاعی اداروں کے کمپیوٹرز سسٹم کی حفاظت کے ٹھیکے لیتے تھے۔ یہ ادارے ہر سال اربوں ڈالرز اسلحے اور اس کے ڈلیوری سسٹم کی تیاری پر خرچ کرتے تھے۔ یہ ادارے ہر سال خاموشی سے کروڑوں روپے شیو آرمی اور اس جیسے ہیکرز گروپ کو ادا کرتے تھے تاکہ ان کے سسٹم ہیکنگ سے محفوظ رہیں۔ شیو آرمی اس ایٹمی تجربہ گاہ کے کمپیوٹرز کی حفاظت کرتی تھی جس میں آئی فائیو نے نقب لگائی اور اس کی خفیہ ترین دستاویزات کو انٹرنیٹ پر شائع کر دیا۔ شیو آرمی کو اس کا ذمے دار قرار دیا گیا۔ ان سے ٹھیکا تو واپس لیا ہی تھا ساتھ ہی ان سب کو شامل تفتیش کر لیا گیا کیونکہ یہ بات سامنے آئی تھی کہ شیو آرمی کی طرف سے آئی فائیو نامی گروپ کو چیلنج کیا گیا تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ تحقیقی ایجنسیاں یہ بات ثابت نہیں کر سکیں کہ لیب کا سسٹم آئی فائیو نے ہی ہیک کیا تھا اگرچہ انٹرنیٹ پر اس کا چرچا تھا لیکن کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے شیو آرمی اور راج عرف گرو پر صرف غفلت اور غیر ذمے داری کا الزام آیا تھا ورنہ شاید ان سب کو جیل کی ہوا کھانی پڑتی۔ جب راج نے سرینا کے لیے سارہ کو تلاش کرنا شروع کیا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے وہ شخص مل جائے گا جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی ناکامی کا ذمے دار تھا۔ یہ شک اس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب منصور نے اس کی میل کا جواب دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ پھر ایک دن اسے خیال آیا اور اس نے منصور کے سسٹم اور ای میل کو ہیک کرنے کی کوشش کی تب اسے معلوم ہوا کہ وہ بھی آئی ٹی کا ماہر تھا اور اس نے اپنی ان چیزوں کی حفاظت کا مکمل بندوبست کر رکھا تھا۔

لیب والے واقعے کے بعد راج اور اس کے ساتھیوں نے پاگلوں کی طرح دن رات آئی فائیو کے اراکین کا پتا چلانے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ کسی ایک فرد کا بھی پتا نہیں چلا سکے تھے۔ انہیں صرف ایک کامیابی ہوئی تھی۔ لیب میں ہیکنگ کے واقعے کی تحقیق کرتے ہوئے انہیں پتا چلا کہ ایک ہیکر پاکستان کے علاقے شکر گڑھ میں موجود تھا لیکن جب انہوں نے شکر گڑھ کے بارے میں جانا تو اس امکان کو مسترد کر دیا کہ اس جیسے پسماندہ علاقے میں کسی بین الاقوامی ہیکر کی موجودگی ناممکن ہے۔ اسے انہوں نے دھوکا سمجھا تھا جو ہیکرز اکثر دیتے ہیں، وہ ہوتے کسی اور ملک میں ہیں لیکن ان کا آئی پی ایڈریس کسی اور ملک کا آرہا ہوتا ہے مگر جب راج کو پتا چلا کہ منصور اور سارہ شکر گڑھ میں ہی رہتے ہیں تو اسے شک ہو گیا تھا کہ منصور کا تعلق آئی فائیو سے ہے۔

آج جب منصور باہر گیا اور اس نے انٹرنیٹ ڈیوائس لی اور پہلے فٹ پاتھی ریستوران اور پھر ہوٹل میں بیٹھ کر انٹرنیٹ پر کسی سے بات کرتا رہا۔ اس دوران راج کے ساتھی اس کی مکمل نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے راج سے کہا کہ منصور مشکوک ہے۔ اس کے بعد راج نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے کوٹھی کے منتظم اور سب سے قابل اعتماد ملازم للت سے کہا۔ ”جب منصور آئے تو اسے کسی بہانے نیند کی دوا دینی ہے۔“

للت ہچکچایا۔ ”پر سرکار مالکن......“

”ان کی فکر مت کرو ان کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔“ راج بولا۔ ”تمہیں یہ کام کرنا ہی ہے۔“

للت مجبور ہو گیا، اس نے ہوشیاری سے منصور کی چائے میں نیند کی دوا شامل کر دی جو راج نے اسے دی تھی۔ جب منصور دوا کے اثر سے سو گیا تو راج اس کے کمرے میں آیا اور اس کا لیپ ٹاپ کھول کر دیکھتا رہا۔ للت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راج گھر آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہا ہے۔ وہ تیس برس سے اس گھر کا نوکر تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ سرینا سورج کتنی وضعدار عورت تھی۔ راج اگرچہ اکھڑ مزاج اور درشت آدمی تھا لیکن للت نے کبھی اسے بھی اخلاق سے گری حرکت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا اور نہ ہی کبھی عورتوں کے ساتھ نظر آیا۔ مگر اس وقت وہ اخلاق سے گری حرکت کر رہا تھا۔ مگر للت ملازم تھا، مالک کو کیسے ٹوک سکتا تھا۔ جب راج نے اپنا کام کر لیا تو اس نے لیپ ٹاپ ویسے ہی بند کر کے رکھ دیا۔ انٹرنیٹ یو ایس بی بھی واپس منصور کی جیب میں ڈال دی اور للت کو بلا کر کہا۔ ”یہ چائے پھینک کر دوسری پیالی اتنی ہی چائے کے ساتھ رکھ دو۔“

☆☆☆

سارہ تھکی ہوئی تھی۔ ڈنر اس نے سرینا کے ساتھ کیا کیونکہ نہ منصور تھا اور نہ ہی راج آیا تھا۔ سرینا نے راج کے بارے میں بتایا کہ وہ من موجی تھا، اکثر گھر سے باہر ہی رہتا تھا۔ شاذ ہی کھانے کی میز پر نظر آتا تھا۔ اسے بزنس کی پروا نہیں تھی لیکن سرینا سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے ذرا سی تکلیف ہوتی تو راج سب بھول کر اس کے پاس رہتا۔ پچھلے دنوں سرینا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تین دن اسپتال میں داخل رہی تو راج بھی تین دن اسپتال میں بیٹھا رہا تھا۔ سرینا کو اپنے بھائی کے پوتے سے بے پناہ محبت تھی، اس کے لیے دنیا میں وہی سب کچھ تھا۔ سارہ نے کہا۔ ”جب تیری طبیعت خراب تھی تو، تو اتنا لمبا سفر کر کے دریا کے کنارے کیوں گئی؟“

”میرا جانا ضروری تھا۔“ سرینا بولی۔ ”کوئی میرے اندر سے کہہ رہا ہے کہ میرے پاس سمے کم ہے شاید اگلے سال مجھے موقع نہ ملے۔“

”اللہ نہ کرے...... دیکھ تو زندہ رہی تب ہی مجھ سے مل سکی۔“

”مجھے لگتا ہے میں تجھ سے ملنے کی خاطر ہی زندہ تھی۔“ سرینا نے گہری سانس لی۔ ”اب میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔“

سارہ کو شبہ تھا کہ سرینا کو کوئی بیماری ہے اور وہ اس سے چھپا رہی ہے۔ سارہ نے پوچھا بھی لیکن وہ اسے ٹال گئی کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے بس ذرا دل کا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے اسے تین دن اسپتال میں داخل رہنا پڑا تھا۔ سارہ رات کے کھانے کے بعد جلد سو جانے کی عادی تھی پھر تھکن بھی ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ منصور کے آنے کا انتظار کیے بغیر سونے چلی گئی۔ صبح اس کی آنکھ چھ بجے کھل گئی اس نے جلدی سے اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی اور پھر منصور کی کمرے کی طرف آئی۔ اس نے دستک دی۔ منصور کچی نیند سوتا تھا، ہلکی سی آہٹ پر اٹھ جاتا۔ جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو سارہ نے پھر دستک دی اور تیسری بار اس نے دروازہ کھولا تو وہ کھل گیا۔ سارہ اندر آئی۔ منصور صوفے پر نیم دراز سو رہا تھا، اس کے سامنے میز پر چائے کی پیالی رکھی تھی جس میں

سے کچھ ہی چائے کم تھی۔ سارہ کو تعجب ہوا۔ منصور چائے پیتے پیتے سو گیا تھا۔ اس نے منصور کو ہلایا۔

”منصور...... اے منصور...... یہاں کہاں سو رہا ہے، اٹھ۔“

منصور گہری نیند میں تھا کئی بار ہلانے پر بہ مشکل اٹھا تھا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے سارہ کو دیکھا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ ”دادی جان آپ؟“

”یہاں صوفے پر کیسے سو گیا؟“

منصور کو بھی تعجب ہوا تھا۔ ”میں یہاں کیسے سو گیا...... مجھے یاد ہے، میں رات کو چائے پی رہا تھا پھر پتا نہیں کب سو گیا؟“

”تو بھی تھکا ہوا تھا۔“ سارہ نے کہا۔ ”اس لیے پتا نہیں چلا ہوگا۔ چل اب بستر پر لیٹ جا۔“

لیکن منصور کی نیند اڑ گئی تھی، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اسے ہرگز ایسی تھکن نہیں تھی کہ وہ یوں بے خبر صوفے پر سو جاتا اور پھر ساری رات سوتا رہتا۔ وہ سارہ کے جگانے پر بھی مشکل سے اٹھا تھا۔ جبکہ وہ ہمیشہ کچی نیند سوتا تھا، ایک آواز یا آہٹ پر اٹھ جاتا تھا۔ وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ کسی قدر سرد پانی سے نہا کر اس کی رہی سہی غنودگی بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ بہتر طور پر سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ رات میں کچھ ہوا تھا۔ اس نے چائے کے صرف چند سپ لیے تھے اور پھر اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس نے باہر آ کر پیالی کو دیکھا جس میں باقی چائے موجود تھی۔ ذرا سی چائے چکھی اس کا ذائقہ منصور کو نارمل لگا لیکن وہ کسی طرح سے تصدیق نہیں کرا سکتا تھا کہ چائے میں کوئی خواب آور دوا ملی ہے۔ پھر وہ چونکا اور لیپ ٹاپ آن کیا۔ اس نے پاس ورڈ ڈالا اور چند بٹن دبائے۔ اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی۔ اس نے یو ایس بی ڈیوائس لگائی اور انٹرنیٹ پر کچھ کام کیا۔ اس کی تشویش بڑھ گئی تھی اسے خاصی حد تک یقین ہو گیا کہ کسی نے اس کا لیپ ٹاپ کھول لیا تھا اور ساتھ ہی اس کا ای میل اور اسکائپ بھی کھول لیا تھا۔

اس نے سوچا اور سسٹم ری فریش کیا اور اپنی ہارڈ ڈسک فارمیٹ کر دی۔ اب کوئی اس میں سے اس کے خلاف ثبوت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ایسے ای میل ایڈریس سے اپنے ساتھیوں کو میل کی کہ اس کا سسٹم اور آئی ڈیز ہیک ہو گئی ہیں اس لیے وہ سب محتاط رہیں اور اب اس سے رابطہ نہ کریں۔ یہ کام کر کے اس نے یو ایس بی نکال کر اسے جوتے سے کچل کر توڑ دیا اور پھر لے جا کر واش روم کے فلیش میں بہا دیا۔ اس کے باوجود اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے سلا کر لیپ ٹاپ اور اس کی آئی ڈیز کھولنے والا راج ہی تھا اور دوسرا شک یہ تھا جواب یقین کی حد تک جا پہنچا تھا کہ راج کا تعلق شیو آرمی سے تھا۔ یو ایس بی ڈیوائس تباہ کرنے کے باوجود اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ لیپ ٹاپ ری فریش کرنے کے باوجود اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کر فرش پر دے مارا اور پھر میز پر موجود بھاری ماربل ایش ٹرے سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر دیے۔ پھر یہ ٹکڑے بھی فلیش میں لے جا کر بہا دیے۔ جو ٹکڑے بڑے رہ گئے تھے ان کو مزید توڑا اور پھر انہیں بھی بہا دیا۔ لیپ ٹاپ کا آخری ٹکڑا بھی بہا کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اب اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں رہا تھا۔ آئی فائیو سے اس کا تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اپنے تمام ای میل ایڈریس اور ویب پر موجود اپنی ساری معلومات بھی اڑا دی تھیں۔ راج زیادہ سے زیادہ اس کے اکاؤنٹس کھول سکتا تھا لیکن اس میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ناشتے کا بلاوا آ گیا۔ ناشتے کے بعد اس نے موقع پا کر سارہ سے کہا۔

”دادی جان مجھے اکیلے میں آپ سے کچھ کہنا ہے۔ سمجھ لیں ایمرجنسی ہے۔“

سارہ فکر مند ہو گئی۔ سرینا کچھ دیر کے لیے ناشتے کی میز سے گئی تھی، اس دوران میں وہ واپس آ گئی اس لیے سارہ نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے صرف سر ہلا دیا تھا۔ ناشتے کے بعد منصور اپنے کمرے میں آ گیا۔ چائے کی پیالی اب میز پر نہیں تھی، اس کا مطلب تھا، اس کی عدم موجودگی میں کوئی کمرے میں آیا تھا۔ وہ ملازم تھا یا خود راج۔ منصور نے لیپ ٹاپ کا خالی بیگ اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا تھا اور اس میں اپنی ایک پتلون تہ کر کے اس طرح رکھی تھی کہ بہ ظاہر اس میں لیپ ٹاپ محسوس ہو رہا تھا۔ منصور کی باقی چیزیں اسی طرح تھیں صرف لیپ ٹاپ چھیڑا گیا تھا۔ کچھ دیر میں سارہ آئی، اس کے کچھ کہنے سے پہلے منصور نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اسے لے کر باہر نکل آیا۔ سارہ اس کے انداز پر پریشان ہو گئی۔ منصور اسے گیسٹ ہاؤس کے ساتھ موجود لان میں لے آیا۔ یہاں کوئی امکان نہیں تھا کہ ان کی بات کہیں سنی جاتی۔ منصور کو شبہ تھا کہ اس کے یا سارہ کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کہیں اور سنی جا سکتی تھی۔

”منصور یہ کیا حرکت ہے؟“ سارہ نے کہا۔

”دادی جان ہمیں فوراً واپس پاکستان جانا ہے ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

سارہ سنجیدہ ہوگئی۔ ”منصور کیا ہوا ہے، تجھ سے کوئی جرم ہوگیا ہے؟“

”نہیں دادی جان میں نے کوئی جرم نہیں کیا میں آپ کو تفصیل سے نہیں بتا سکتا لیکن یوں سمجھ لیں کہ ہم جلد از جلد واپس نہ گئے تو میں یہاں پکڑا جاؤں گا۔ بھارتی مجھے پاکستان کا جاسوس قرار دے کر جیل میں ڈال دیں گے اور میں کبھی رہا نہیں ہوں گا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ سارہ دہل گئی تھی۔ ”تو نے ایسا کیا، کیا ہے میرے بچے؟“

”دادی جان یوں سمجھ لیں راج کا تعلق انٹرنیٹ سے ہے۔ نیٹ پر ہماری کچھ بھارتیوں سے لڑائی تھی اور مجھے یقین ہے راج ان میں سے ایک ہے۔ اس لڑائی میں ہم نے ان کو کچھ نقصان پہنچایا تھا اور اب راج جان گیا ہے کہ میں کون ہوں اس لیے وہ بھارتی پولیس یا ایجنسیوں کو میرے بارے میں اطلاع دے سکتا ہے۔ آپ سوچ سکتی ہیں کہ ایک بار کوئی پاکستانی بھارتی پولیس یا ایجنسیوں کے گرفت میں آجائے تو وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔“

سارہ پڑھی لکھی اور دور حاضر سے واقفیت رکھنے والی عورت تھی، اسے معاملہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ انتظار مرزا کچھ عرصے محکمۂ خارجہ میں رہے تھے۔ ان سے سارہ کو بین الاقوامی معاملات کا پتا چلتا رہتا تھا۔ اس نے منصور سے بحث نہیں کی اور اس کی بات کو مان لیا۔ اسے معلوم تھا منصور کسی بھی وجہ سے اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن میں سرینا سے کیا کہوں کہ ہم اچانک کیوں جا رہے ہیں؟“

”کسی کی بیماری کا بہانہ کردیں۔ کہہ دیں کہ بابا جان کی طبیعت خراب ہے۔“

”تیرے منہ میں خاک۔“ سارہ نے دہل کر کہا۔ ”میرے بچے کو اللہ ہر بیماری سے بچائے۔“

”تب بہو کو بیمار کردیں لیکن سرینی حیران ہوں گی کہ بہو کی خاطر آپ واپس جا رہی ہیں۔“

”بکواس نہ کر۔“ سارہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔ ”یہ میرا کام ہے کہ اسے کس طرح قائل کرتی ہوں۔ پر ہم جائیں گے کیسے؟ واپسی کی ٹکٹ تو کنفرم ہے نہیں۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ منصور نے کہا۔ ”ممکن ہے چوبیس گھنٹے میں کسی فلائٹ میں جگہ مل جائے ورنہ کوئی اور راستہ دیکھیں گے۔“

لیکن جب منصور نے ائیر کمپنی کو کال کی تو اس کی نمائندہ خاتون نے جواب دیا۔ ”سوری سر تین دن بعد تک کی تمام فلائٹس پیک ہیں ایک سیٹ کی بھی گنجائش نہیں ہے۔“

”پلیز مس، کچھ کریں مجھے فوری دو سیٹیں درکار ہیں۔ معاملہ کسی کی زندگی و موت کا ہے۔“

یہ سن کر عورت ذرا نرم پڑی تھی، اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے سر میں یہ کرسکتی ہوں کہ جیسے ہی کسی نے سیٹ کینسل کرائی وہ میں آپ کو ٹرانسفر کردوں گی۔ اس کے علاوہ آپ چاہیں تو تین دن بعد صبح کی فلائٹ میں دو سیٹیں مل سکتی ہیں۔“

منصور مایوس ہوا مگر اس کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا، مجبوراً اس نے ہاں کردی۔ ”یہ میرا نمبر ہے جیسے ہی کوئی کینسل سیٹ آئے آپ مجھے اس پر کال کرسکتی ہیں۔“

منصور اور سارہ دونوں اپنے موبائل لائے تھے۔ منصور کے خیال میں تین دن بہت زیادہ تھے۔ راج اس سے پہلے ہی اس کے خلاف کچھ کر گزرتا۔ اس پر تو ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ وہ باہر آیا تو سارہ، سرینا کے ساتھ لاؤنج میں تھی اور وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ سارہ نے یہی بتایا کہ امینہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اور انہیں فوری واپس جانا ہے۔ منصور نے سارہ کو بتایا۔ ”دادی جان کسی فلائٹ میں سیٹ تین دن سے پہلے دستیاب نہیں ہے۔“

سارہ پریشان ہوگئی۔ ”نہیں تین دن تو بہت ہیں۔“

سرینا نے کہا۔ ”میں کوشش کرتی ہوں اگر ٹکٹ کنفرم نہیں ہوئے تو پھر ہم ایک کوشش کرسکتے ہیں۔“

”کیسی کوشش؟“ سارہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تمہیں اپنی گاڑی میں واہگہ بارڈر تک چھوڑ دوں گی۔“

”لیکن یہ طویل سفر ہے۔“ منصور نے کہا۔ ”اس میں کم سے کم بھی بارہ گھنٹے لگ جائیں گے۔“

”مجبوری ہے۔“ سارہ بولی۔ ”اگر اس طرح ہم جلدی پاکستان پہنچ سکتے ہیں تو یہی کرتے ہیں۔“

”میں معلوم کرتی ہوں۔“ سرینا بولی اور اپنا موبائل فون اٹھا کر اس نے اپنے ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ ”مسٹر سورتی، میں سرینا سورج بات کررہی ہوں...... نمستے...... مجھے پاکستان کے لیے آج یا کل کی دو سیٹیں کنفرم کرانی ہیں...... نہیں فلائٹس پیک ہیں...... انہوں نے انکار کردیا ہے...... تم یہ کام کراسکتے ہو...... ٹھیک ہے میں ایک گھنٹے بعد کال کروں گی۔“ اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔ ”میرا ٹریول ایجنٹ سیٹس تلاش کررہا ہے، ایک گھنٹے میں پتا چل جائے گا۔“

”اگر سیٹ نہ ملی تو......؟“ منصور نے پوچھا۔

”تب ہم بائی روڈ جائیں گے۔“

”ہمارا ویزا دہلی تک محدود ہے۔“ منصور بولا۔

”تم اس کی فکر مت کرو یہ میرا کام ہے۔“ سرینا نے اعتماد سے کہا۔ ”حکومت میں میرے رابطے ہیں۔ ہر بزنس مین کے ہوتے ہیں اس کے بغیر ہمارا کام نہیں چلتا۔“

”سرینا، مجھے افسوس ہے میں اتنے عرصے بعد تجھ سے ملنے آئی اور اب اتنی جلدی جانے پر مجبور ہوں۔“

”ایسا مت کہو...... اصل چیز تو ملنا ہے...... تم آکر مجھ سے مل گئیں میرے لیے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔“

منصور سرینا کے لہجے کی محبت پر حیران تھا۔ کیا دو انسانوں میں اتنے طویل عرصے بعد بھی محبت برقرار رہ سکتی ہے جبکہ ان میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ نفرت بھی تو نسل در نسل برقرار رہی۔ راج کے دادا اور باپ سے ہوتی اس میں آئی۔ منصور وہیں بیٹھا تھا۔ ایک گھنٹے سے پہلے ٹریول ایجنٹ کی کال آگئی۔ اس نے معذرت کے ساتھ بتایا تھا کہ دو دن بعد کی سیٹیں مل رہی تھیں لیکن یہ بھی بہت دیر تھی اس لیے سارہ نے بائی روڈ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ سرینا نے کہا۔ ”ہم ابھی دوپہر میں نکل جاتے ہیں۔ رات دس گیارہ بجے تک آدھے سے زیادہ فاصلہ طے ہوجائے گا۔ رات کسی ہوٹل میں رک کر ہم صبح سویرے روانہ ہوں گے اور دوپہر تک واہگہ بارڈر پہنچ سکتے ہیں۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ سارہ بولی۔

”بس تو تم لوگ تیاری کرو۔ میں گاڑی تیار کراتی ہوں۔ راستے میں کھانے پینے کا سامان بھی رکھنا ہوگا۔“

اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ سارہ اور منصور اپنے کمروں کی طرف چلے گئے جبکہ سرینا انتظامات کرانے لگی۔ وہ کچن میں کھانے کے سلسلے میں ہدایت دے رہی تھی کہ راج آگیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”دادی ماں کیا ہو رہا ہے؟“

سرینا نے کہا۔ ”روانگی کی تیاری...... سارہ کی بہو کی طبیعت خراب ہوگئی ہے...... یہ لوگ جلدی میں واپس جا رہے ہیں۔“

راج کچھ دیر کے لیے تو دنگ رہ گیا تھا۔ ”واپس جا رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور پھر سنبھل کر بولا۔ ”کیسے...... ان کی ٹکٹیں تو کنفرم ہیں نہیں...... اتنی جلدی سیٹیں مل گئی ہیں کیا؟“

”نہیں سیٹیں دو دن سے پہلے نہیں مل سکتیں اس لیے میں انہیں واہگہ کے راستے چھوڑنے جا رہی ہوں۔“

”آپ اس حالت میں...... ابھی چند دن پہلے آپ اسپتال میں رہ کر آئی ہیں۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوتا لڑکے اور پھر ہم دو حصوں میں سفر کریں گے۔ آج رات کسی ہوٹل میں رکیں گے اور باقی سفر کل کریں گے۔“

راج بے چین ہوگیا تھا۔ اس نے جو سوچا تھا وہ سب ملیا میٹ ہوتا نظر آرہا تھا۔ جب اس نے منصور کی حقیقت جان لی تب ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے واپس جانے نہیں دے گا۔ وہ اب ساری عمر انڈیا کی جیلوں میں گزارے گا۔ اس نے سرینا کو قائل کرنے کی ایک کوشش اور کی۔ ”اچھا آپ مجھے ان کے ساتھ جانے دیں۔“

”نہیں لڑکے میں ساتھ جاؤں گی...... اب دوبارہ سارہ آئے یا نہ آئے میں زندہ رہوں یا نہ رہوں...... میں اس سرزمین پر ایک ایک لمحہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

راج نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”دادی ماں آپ اتنا لمبا سفر نہیں کرسکتی ہو۔“

”کرسکتی ہوں۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”بس اب اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں امرتسر سے بائی ایئر واپس آجاؤں گی، گاڑی ڈرائیور لے آئے گا۔“

راج کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ کمرے میں آکر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر اپنا لیپ ٹاپ آن کرکے اس نے سر پر ہیڈ فون لگا لیا۔ منصور کا شک درست تھا راج نے اس کے اور سارہ کے کمرے میں مائک لگا رکھے تھے اور ان کی ساری گفتگو ریکارڈ ہوتی رہی تھی۔ اس ریکارڈنگ سسٹم کی یہ خوبی تھی جب آواز آتی تو سسٹم کام کرتا تھا اس طرح راج انتظار کیے بغیر مسلسل ریکارڈنگ سن سکتا تھا۔ اس ریکارڈنگ کو چلانے والا پلیئر وقت بھی بتاتا تھا کہ ریکارڈنگ کس وقت ہوئی تھی۔ اس نے ایک گھنٹے میں ساری ریکارڈنگ سن لی تھی لیکن اسے کہیں بھی ایسی گفتگو سنائی نہیں دی جسے مشکوک قرار دیا جاسکتا۔ راج کو سب سے زیادہ مشکوک بات یہی لگی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں منصور جان تو نہیں گیا ہے کہ اس نے لیپ ٹاپ کھول لیا تھا اور اس کی اصلیت سے واقف ہوگیا ہے۔ اب وہ بہانہ کرکے یہاں سے نکل رہا ہو۔ راج نے میز پر ہاتھ مارا۔

”یہی بات ہے، اسے معلوم ہوگیا ہے اور اب وہ بھاگ رہا ہے۔“

راج اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے انداز میں اس شکاری کی سی بے چینی تھی جس کا شکار نشانے پر آتے آتے رہ گیا ہو۔ اس کے تاثرات رہ رہ کر بدل رہے تھے۔ بالآخر اس نے موبائل نکال کر کسی کو کال کی اور رابطہ ہونے پر بولا۔ ”پلان

WWW.PAKSOCIETY.COM

چینج ہو گیا ہے...... اب وہ کل واہگہ سے جا رہا ہے۔"

☆☆☆

دو بجے سرینا نے سب تیار کرا لیا تھا اور خود بھی تیار ہو گئی تھی۔ باورچی نے راستے کے لیے بہت کچھ تیار کر دیا تھا۔ منرل واٹر، کولڈ ڈرنکس، چائے اور کافی کے تھرماس کے ساتھ کھانے کی کئی اشیا تھیں۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور روانگی کے لیے باہر آئے۔ سرینا کے ملازموں نے منصور اور سارہ کا سامان پہلے ہی گاڑی میں رکھوا دیا۔ سرینا نے بیوک کا انتخاب کیا تھا۔ اس میں نشستیں بہت بڑی اور آرام دے تھیں۔ سرینا اور سارہ پیچھے بیٹھ جاتے جبکہ منصور آگے ڈرائیور کے ساتھ آ جاتا۔ وہ باہر آئے تو ڈرائیور غائب تھا۔ سرینا نے للت سے پوچھا۔ "ڈرائیور کہاں ہے؟"

"میں دیکھتا ہوں مالکن۔" اس نے کہا اور جانے لگا کہ راج وہاں آ گیا۔ اس نے ان سب کی طرف دیکھا۔

"آپ بیٹھے نہیں گاڑی میں؟"

"ڈرائیور نہیں آیا ہے۔" سرینا نے خفگی سے کہا۔ "اسے یہاں ہونا چاہیے تھا۔"

"وہ نہیں آئے گا۔" راج نے اطمینان سے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ گاڑی میں ڈرائیو کروں گا۔" راج بولا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ للت نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا۔ سرینا خوش ہو گئی تھی۔ سارہ نے کوئی تاثر نہیں دیا لیکن منصور کے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے تک کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا کہ خطرہ اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا وہ محسوس کر رہا ہے۔ شاید سرینا کی وجہ سے راج کوئی حرکت نہیں کر پا رہا تھا لیکن اب اسے اندازہ ہوا۔ راج نے پہلے سے کچھ سوچا ہوا تھا مگر جب انہوں نے اچانک جانے کا فیصلہ کیا تو وہ بھی ان کے ساتھ لگ گیا تاکہ منصور کے خلاف اپنی سازش کو تکمیل تک پہنچا سکے۔ اس کے علاوہ راج کا ان کے ساتھ جانے کا اور کوئی جواز نہیں تھا۔ منصور نے کہا۔

"تم بلاوجہ زحمت کر رہے ہو۔"

"جب دادی ماں جا سکتی ہیں تو میں پھر بھی جوان آدمی ہوں۔" راج نے عیاری سے کہا۔ "ویسے مجھے افسوس ہے میں تمہیں کمپنی نہیں دے سکا۔"

منصور بادل ناخواستہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ راج نے اس کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔ "میں تمہیں آخر تک چھوڑ کر آؤں گا۔"

منصور نے راج کے لہجے میں دھمکی محسوس کی تھی۔

"ممکن ہے ایسا ہو اور یہ بھی ممکن ہے ایسا نہ ہو۔"

وہ روانہ ہو گئے۔ سرینا اور سارہ اپنی باتوں میں گم تھیں۔ راج ڈرائیونگ کر رہا تھا اور بہت خوش نظر آ رہا تھا جبکہ منصور اتنا ہی فکر مند تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر راج نے اس کے خلاف کوئی سازش کر لی ہے تو جلد یا بدیر پولیس یا کوئی بھارتی ایجنسی اسے گرفتار کر لے گی۔ اگرچہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا لیکن اس کا پاکستانی ہونا ہی کافی ہوتا۔ راج اس کی اصلیت جان گیا تھا۔ وہ اسے کسی عدالت میں ثابت نہیں کر سکتا تھا مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے سرے سے کسی عدالت کے سامنے پیش ہی نہ کیا جاتا۔ بہت سارے پاکستانی اسی طرح عدالت میں پیش کیے بغیر انڈیا کی جیلوں میں قید رکھے گئے تھے۔ اگر راج نے اسے گرفتار کرانے کی کوئی سازش تیار کر لی تھی تو وہ اس سے کس طرح بچ سکتا تھا؟ فی الحال منصور کے ذہن میں ایسی کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی جس سے وہ خود کو بچا سکتا۔

وہ ڈھائی بجے روانہ ہوئے تھے۔ پانچ بجے وہ ایک ہائی وے ہوٹل میں رکے۔ اس سفر کے دوران منصور نے دیکھا، انڈیا میں سڑکوں کا نظام بہت بہتر تھا۔ کئی لین والی ہموار موٹر ویز پر سفر میں رفتار کا پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ چین کے بعد انڈیا دوسرے نمبر پر سب سے بڑا روڈ ٹرانسپورٹ فلیٹ رکھنے والا ملک ہے اسی لیے اس نے اپنی سڑکوں کو بہتر بنایا ہے۔ یہاں انہوں نے چائے پی اور خود کو ری فریش کیا۔ ساڑھے پانچ بجے وہ پھر روانہ ہوئے۔ سات بجے وہ ہریانہ سے مشرقی پنجاب میں داخل ہو چکے تھے۔ جانی پہچانی فضا محسوس کر کے سارہ اور سرینا دونوں جذباتی ہو گئی تھیں۔ سارہ نے کہا۔ "بیاپور یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"بہت دور ہے۔" سرینا سے پہلے راج نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ سرینا نے جلدی سے بات سنبھالی۔

"ہاں وہ اس جگہ سے کوئی ڈھائی سو کلو میٹرز دور ہو گا۔"

"جہاں میں رہتی ہوں اس جگہ سے صرف پندرہ سولہ میل دور ہے۔" سارہ نے سرد آہ بھری۔

"جی دادی جان لیکن اب بیاپور آپ سے ہزاروں میل دور چلا گیا ہے۔" منصور نے کہا۔

"بیاپور اب باقی نہیں رہا ہے۔" راج بولا۔ "اس کی جگہ کھیت ہیں۔"

سرینا نے شرمندگی سے کہا۔ "ہاں مسلمانوں کے جانے کے بعد بیاپور کے گاؤں کی جگہ کھیت بنا لیے گئے تھے۔"

"صرف گاؤں کی جگہ ہی نہیں بلکہ ہماری حویلی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

قبرستان کو بھی کھیت بنالیا گیا ہوگا۔" منصور نے تلخی سے کہا۔

"ہاں لیکن اب تو وہ دور بیت گیا۔" سارہ نے سرد آہ بھری۔ "صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ دوسرے بہت سارے لوگوں کو یہ سب دیکھنا پڑا تھا۔"

"دوسرے بہت سارے مسلمانوں کو بھی۔" منصور نے کہا تو راج نے گھور کر اسے دیکھا اور زہریلے انداز میں بولا۔

"صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ ہندوؤں اور سکھوں کو بھی بہت کچھ دیکھنا پڑا تھا۔"

"بات پرانی ہو گئی ہے اس لیے اب اسے مت چھیڑو۔" سرینا نے راج سے کہا۔ راج چپ ہو کر ہونٹ کاٹنے لگا۔ نو بجے وہ امرتسر سے سو کلومیٹرز دور رہ گئے تھے۔ راج کا اصرار تھا کہ وہ امرتسر تک چلتے ہیں، دو گھنٹے اور لگیں گے لیکن سرینا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی تھی اس لیے اس نے راستے میں رکنے کا فیصلہ کیا۔ مجبوراً راج نے ہائی وے کے ساتھ کوئی معقول ہوٹل تلاش کرنا شروع کیا لیکن یہاں کوئی اچھا ہوٹل نہیں تھا جہاں وہ رات گزار سکتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بارہ گھنٹے بعد ہی امرتسر پہنچ سکیں گے لیکن ایک تو سڑکیں بہت اچھی تھیں دوسرے راج نے بیوک بہت تیز چلائی تھی۔ اس کے جاندار انجن نے اس کا پورا ساتھ دیا تھا اس لیے وہ متوقع وقت سے پہلے ہی امرتسر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ تیس کلومیٹرز بعد سرینا نے راج سے امرتسر چلنے کو کہا۔ وہ رات گیارہ بجے امرتسر میں داخل ہوئے تو سوائے چند علاقوں کے پورے شہر پر خاموشی طاری تھی۔ امرتسر میں کئی اچھے ہوٹل تھے۔ انہوں نے ایک ہوٹل کا انتخاب کیا۔

سرینا نے چار الگ کمرے لیے تھے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ فوراً سونے چلی گئی۔ سارہ بھی تھکی ہوئی تھی لیکن اسے سرینا کی فکر تھی۔ اس نے کہا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو دکھائے مگر سرینا نے انکار کر دیا، اس نے کہا کہ وہ آرام کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ منصور اپنے کمرے میں سامان رکھ کر سارہ کے کمرے میں آیا۔ انہوں نے رات کا کھانا گاڑی میں ہی ایک جگہ رک کر کھالیا تھا۔ سرینا باہر کا کھانا نہیں کھاتی تھی خود سارہ کو باہر کے کھانے اچھے نہیں لگتے تھے۔ کھانے کے بعد ہی سرینا کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ منصور نے سارہ سے کہا۔ "دادی جان مجھے لگ رہا ہے راج کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔"

"مجھے بھی اس کا یوں اچانک ساتھ آنا کھٹکا ہے۔"

"شاید وہ مجھے بارڈر پر گرفتار کرانا چاہتا ہے تاکہ اس پر الزام نہ آئے۔ دوسری صورت میں گرینی اسے روک سکتی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، سرینا کسی صورت یہ برداشت نہیں کرے گی۔" سارہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "راج اگر خاموشی سے پولیس یا کسی ایجنسی کو اطلاع کر دے تو وہ تمہیں سرحد پر روک لیں گے اور راج کہہ سکے گا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"دادی جان میں کسی صورت بھارتی قید میں نہیں جاؤں گا۔ اس سے بہتر ہے میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔"

سارہ پریشان ہو گئی۔ "لیکن بھاگ کر تم کہاں جاؤ گے؟"

منصور سوچنے لگا، اس نے کہا۔ "ہم سرحد کے پاس ہیں اگر میں یہاں سے کسی طرح سے سرحد پار کرلوں تو......"

"نہیں، اس میں بہت خطرہ ہے۔" سارہ نے فوراً انکار کر دیا۔ "دونوں طرف فوجی موجود ہوتے ہیں جو کسی بھی شخص کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں، میں تجھے یہ خطرہ مول لینے نہیں دوں گی۔"

"ضروری نہیں ہے میں یہاں سے بارڈر کراس کروں، میں کہیں اور بھی جا سکتا ہوں۔"

"نہیں، تو اکیلے نہیں جائے گا اگر جائے گا تو میں بھی ساتھ چلوں گی۔" سارہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں تیرے بغیر پاکستان نہیں جاؤں گی۔"

منصور نے سارہ کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہیں مانی تو اس نے بے بسی سے کہا۔ "ٹھیک ہے تب ہم واہگہ سے جائیں گے۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

سارہ پریشان ہو گئی تھی۔ منصور کے خدشے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا، راج جس طرح ان کے ساتھ آیا تھا اس سے ظاہر تھا وہ کوئی سازش کر رہا تھا مگر وہ منصور کو اکیلے جانے کی اجازت بھی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس غیر قانونی طریقے سے سرحد پار نہیں کر سکتی تھی، اس میں بہت مشکلات تھیں اور منصور جیسا جوان اور فٹ آدمی ہی کوشش کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود سارہ کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ اسے تنہا جانے دے۔ دوسری طرف بارڈر پر اس کی گرفتاری کا امکان بھی تھا۔ اس نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ "وہ تجھے نہیں روک سکتے۔"

"دادی جان ان کے لیے یہی بہانہ کافی ہوگا کہ ہمارا ویزا دہلی کا تھا اور ہم امرتسر تک چلے آئے۔"

"لیکن ہم تو پاکستان جانے کے لیے یہاں آئے ہیں اور پھر سرینا بھی ساتھ ہوگی۔"

"گرینی صرف اس معاملے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں لیکن اگر بھارتی حکومت نے مجھے گرفتار کرنے کا فیصلہ کرلیا تو وہ بھی کچھ نہیں کر سکیں گی۔" منصور نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "اب آپ آرام کریں اس معاملے کو صبح دیکھا جائے گا۔"

منصور چلا گیا لیکن سارہ سو نہیں سکی، اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ اسے وہ رات یاد آئی جب وہ بیا پور سے نکلی تھی اور اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ گئی تھی۔ وہ وقت اور تھا، تب پوری مسلم قوم اجتماعی قربانی سے گزر رہی تھی لیکن اب سارہ میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی سب سے قیمتی چیز یہاں چھوڑ کر جائے۔ اگر منصور گرفتار ہو جاتا تو وہ یہاں مر جانا پسند کرتی بہ نسبت زندہ پاکستان واپس جانے کے۔ منصور میں اس کی جان تھی۔ وہ سوچتی رہی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ بہت سوچنے کے بعد ایک ہی حل ذہن میں آیا تھا، اس نے موبائل اٹھایا اور سرینا کا نمبر ملایا۔ کئی بیل کے بعد اس نے کال ریسیو کی۔ "سارہ...... خیریت تو ہے؟"

"سرینا خیریت نہیں ہے۔" سارہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تجھے یاد ہے جب تیرے بھائی نے ہمارے خاندان کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور تو نے ہمیں خبردار کر دیا تھا۔"

"ہاں پر اس وقت......"

"سرینا مجھے ایک بار پھر تیری مدد کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں اکیلی یہاں سے گئی تھی اپنا سب چھوڑ کر...... پر اب میں اکیلی نہیں جا سکتی۔"

"سارہ ایک منٹ میں تیرے کمرے میں آ رہی ہوں۔"

"ٹھیک، پر راج کو پتا نہ چلے۔" سارہ نے کہا اور کال کاٹ کر دروازے پر چلی آئی، چند لمحے بعد ہلکی سی دستک ہوئی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں۔" سرینا کی آواز آئی تو سارہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آئی، نیند سے جاگنے اور طبیعت خرابی کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "سارہ کیا بات ہے، تو نے اس وقت مجھے جگا کر یہ سب کیوں کہا اور راج کو کیوں پتا نہ چلے؟"

"میرے ساتھ جو ہوا اسے ساٹھ سال گزر چکے ہیں لیکن وقت اتنے عرصے بعد خود کو دہرا رہا ہے۔ اس وقت جمیش ہمارے درپے تھا اور آج راج......"

سرینا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تجھے شک ہے؟"

"نہیں، پکا یقین ہے۔" سارہ بولی۔ "اس نے منصور کے خلاف سازش کی ہے اور اسے بارڈر پر گرفتار کرلیا جائے گا۔"

"لیکن کیوں...... اور سارہ سچ سچ بتا تو اچانک واپس کیوں جا رہی ہے؟"

"میں تجھے سب بتا دوں گی لیکن سرینا، وعدہ کر تو میری مدد کرے گی؟"

"اگر تو سرینا سے جان بھی مانگے تو دے گی۔" سرینا بلا جھجک بولی تو سارہ نے اسے سب بتا دیا۔ سرینا سنتی رہی اور جب سارہ اپنی بات کہہ چکی تو اس نے سارہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "اب تو بے فکر ہو جا...... راج نے کوئی سازش کی ہے تو وہ ناکام رہے گی۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" سارہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں عمر کے آخری دور میں ہوں، اپنی ذات پر ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہوں لیکن منصور کو کچھ ہو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔"

"سارہ حوصلہ رکھ...... کچھ نہیں ہوگا۔ کم سے کم سرینا کے جیتے جی تو نہیں ہوگا۔ اب تو سو جا، کل ہمیں لمبا سفر کرنا ہے۔"

سارہ کا اضطراب سرینا کی اس تسلی کے بعد کم ہو گیا تھا اور جب اس کے جانے کے بعد وہ لیٹی تو اسے نیند آ گئی تھی۔ وہ صبح فجر میں اٹھ گئی اور نماز پڑھ کر اس نے منصور کو اٹھایا۔ "منصور نماز، پڑھ لے...... وقت کم رہ گیا ہے۔"

آٹھ بجے ناشتا آ گیا۔ سارہ کا خیال تھا کہ وہ ڈائننگ ہال میں جا کر ناشتا کریں گے لیکن ویٹر نے بتایا کہ سرینا نے ناشتا اوپر لانے کو کہا تھا۔ سارہ اور منصور کا ناشتا ایک ساتھ لایا گیا تھا جبکہ سرینا اور راج کا ناشتا ان کے کمرے میں آیا تھا۔ سرینا نے راج کو اٹھا دیا تھا۔ سارہ اور منصور نے کشیدہ اعصاب کے ساتھ ناشتا کیا۔ سارہ سوچ رہی تھی کہ سرینا کیا کرے گی اور منصور سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا، اسے سو فیصد یقین تھا کہ واہگہ بارڈر پر اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ اس نے سارہ سے اس بارے میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اسے ٹال گئی تھی۔ نو بجے سرینا نے اسے کال کی۔ "سارہ، تم اور منصور سامان لے کر میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

وہ دونوں سامان لے کر اس کے کمرے میں آئے تو سرینا بھی تیار تھی۔ اس نے بیل بوائے کو بلوا کر سب کا سامان نیچے گاڑی میں بھجوایا۔ سارہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "سرینا، راج کہاں ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میرے ساتھ آؤ۔" سرینا نے کہا اور اسے راج کے کمرے میں لائی جہاں وہ بستر پر لیٹا سو رہا تھا۔ اس نے مکمل لباس پہن رکھا تھا۔ سرینا نے انہیں مطلع کیا۔ "یہ سو نہیں رہا ہے، بے ہوش ہے۔"

"بے ہوش ہے۔" سارہ اور منصور نے بیک وقت کہا۔

"ہاں، میں نے اسے کافی میں نیند کی دوا دی ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے دی ہوئی ہے اسی کی چار گولیاں پیس کر اس کی کافی میں ملا دیں اور اب یہ شام سے پہلے نہیں اٹھے گا۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" سارہ بولی۔

"تاکہ یہ تم دونوں کی بہ حفاظت واپسی میں رکاوٹ نہ بنے۔" سرینا سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اب یہ یہاں سوتا رہے گا اور تم دونوں سرحد پار کر جاؤ گے۔"

"کیسے......؟ یہ یقیناً سرحدی حکام کو بتا چکا ہے۔ وہ منصور کا پاسپورٹ دیکھتے ہی اسے گرفتار کرلیں گے۔" سارہ نے راج کی طرف دیکھا۔

"ہم واہگہ سے سرحد پار نہیں کریں گے۔" سرینا نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ، میں نے سوچ لیا ہے ہمیں کیا کرنا ہے۔"

وہ باہر آئے تو سرینا نے اندر سے لاک دبا کر دروازہ بند کیا اور باہر "ڈوناٹ ڈسٹرب" کا بورڈ لگا دیا۔ وہ نیچے آئے جہاں بیل بوائے نے ان کا سامان گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیا تھا۔ سرینا نے اس کے ہاتھ پر ایک نوٹ رکھ کر چابی لی اور بولی۔ "یہاں کوئی ایسی مارکیٹ ہے جہاں سے واٹر اسپورٹس کا سامان مل سکے۔"

"یس میڈم۔" بیل بوائے نے مہذب لہجے میں کہا۔ اس نے سرینا کو ایک مارکیٹ کا پتا بتایا جہاں سے اس قسم کا سامان مل سکتا تھا۔ منصور حیران تھا کہ یہ کون سا وقت تھا واٹر اسپورٹس کا سامان لینے کا۔ وہ سرینا سے پوچھنے والا تھا کہ سارہ نے اسے اشارے سے روک دیا تھا۔ سرینا نے چابی منصور کی طرف بڑھادی۔

"ڈرائیو تم کرو گے۔"

"میں نے سرینا کو سب بتا دیا ہے۔" سارہ نے منصور کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وضاحت کی۔ "اس نے وعدہ کیا ہے یہ ہمیں بہ حفاظت سرحد پار کرا دے گی۔"

"واہگہ کے راستے؟" منصور نے بے اختیار پوچھا۔

سرینا نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بیٹے...... اگر راج نے بھارتی حکام کو بتا دیا ہے تو وہاں تمہیں روک لیا جائے گا اور میں کچھ نہیں کر سکوں گی اس لیے تمہیں دوسرے طریقے سے سرحد پار کرنی ہوگی۔"

سارہ کو خیال آیا۔ "سرینا کہیں تم ہمیں......"

سرینا نے کہا۔ "ہاں میں تمہیں اسی طرف لے جا رہی ہوں، وہ جگہ میری دیکھی بھالی ہے اور وہاں عام طور سے کوئی نہیں ہوتا ہے۔"

منصور سمجھ گیا کہ دونوں خواتین بیاپور کے قریب پاکستان اور بھارت کی سرحد کی بات کر رہی تھیں۔ اس نے سرینا سے پوچھا۔ "وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"تقریباً دو سو کلومیٹرز کا سفر ہے یہاں سے۔" سرینا نے کہا۔

وہ ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ مارکیٹ زیادہ دور نہیں تھی۔ یہاں اسپورٹس گڈز کی بے شمار دکانیں تھیں۔ سرینا کی بیوک جس دکان کے سامنے رکی اس کا مالک خود دوڑا آیا تھا۔ وہ سکھ تھا لیکن بہترین انگلش بول رہا تھا۔

"میڈم میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟"

"مجھے ایک ربر کی کشتی جو چپوؤں سے چلتی ہو اور دو لائف جیکٹس درکار ہیں۔"

دکان کا مالک سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ "میڈم میرے پاس تو نہیں ہیں لیکن آپ کہیں تو میں بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"یہ تو اچھا ہے۔"

"میرے ساتھ آیئے۔" وہ انہیں اندر لے گیا۔ دکان کے پچھلے حصے میں اس کا سجا سجایا دفتر تھا جس میں اے سی چل رہا تھا اور بیٹھنے کا معقول انتظام تھا۔ ان کے منع کرنے کے باوجود اس نے بہت اچھی چائے منگوالی تھی۔ سرینا نے سارہ اور منصور کو منع کر دیا تھا کہ وہ اردو میں کوئی بات نہ کریں ورنہ پہچان لیے جائیں گے۔ اس لیے اگر بولنا پڑے تو انگریزی میں بات کریں۔ اس لیے وہ دونوں چپ تھے۔ سکھ بھانپ گیا تھا کہ وہ بڑی پارٹی ہیں اور اس لیے وہ انہیں خود چیز منگوا کر دے رہا تھا۔ وہ ایک کے دو خود وصول کر سکتا تھا۔ اس نے ان کے سامنے کالز شروع کیں اور بالآخر تیسری کال پر بات بن گئی۔ اس شخص کے پاس ربر کی کشتی بھی تھی اور لائف جیکٹ بھی۔ منصور کو تعجب نہیں ہوا جب سکھ نے ان کی قیمت بارہ ہزار روپے بتائی۔ وہ واضح طور پر دوگنی قیمت لے رہا تھا لیکن سرینا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے کہا۔

"اگر چیز اچھی ہے تو مجھے قیمت منظور ہے۔"

کشتی اور لائف جیکٹس بیس منٹ میں آگئیں۔ سکھ نے انہیں چیک کر کے دکھایا۔ کشتی کے ساتھ گیس کا چھوٹا سا سلنڈر بھی تھا اس کا ہک کھینچتے ہی کشتی میں آدھے منٹ سے بھی پہلے ہوا بھر جاتی تھی۔ اسی طرح لائف جیکٹ میں بھی رسی کھینچنے سے ہوا بھر جاتی۔ سرینا نے سکھ کو بارہ ہزار ادا کر دیے اور ساتھ ہی اسے جتا دیا کہ اگر چیزوں میں ذرا سا بھی نقص نکلا تو وہ نہیں آئے گی بلکہ کچھ اور لوگ آئیں گے اس سے حساب کتاب کرنے۔ سکھ نے پورے اعتماد سے چیزوں کی گارنٹی دی تھی۔ کشتی اور لائف جیکٹس سے ہوا خارج کر کے انہیں پیک کر کے گاڑی کی ڈکی میں رکھوا دیا گیا۔ امرتسر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے کھانے پینے کا سامان اور مشرقی پنجاب کے تفصیلی نقشے لیے تھے جن میں سڑکیں اور راستے نمایاں تھے۔ سارہ بے چین تھی، وہ جلد از جلد امرتسر سے نکل جانا چاہتی تھی۔ شاید اسے خوف تھا کہ کہیں راج وقت سے پہلے نہ جاگ جائے اور پولیس کو ان کے بارے میں خبردار کر دے۔ جب وہ امرتسر سے نکلے تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

وہ جن سڑکوں پر سفر کر رہے تھے وہ سرینا کے لیے بھی اجنبی تھیں کیونکہ وہ اس سے پہلے کبھی یہاں سے نہیں گزری تھی۔ اس کے باوجود منصور کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ سڑک کے ساتھ جگہ جگہ بورڈ لگے تھے جن پر آگے آنے والے علاقوں کے نام درج تھے، یہ نام ہندی اور انگریزی دونوں میں تھے۔ نقشے کی مدد سے وہ آسانی سے سفر کر رہے تھے۔ امرتسر سے دور آنے کے بعد وہ کسی قدر مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر اب منصور اور سارہ کو آگے کی فکر ستا رہی تھی۔ منصور نے پلٹ کر سرینا سے پوچھا۔ "گرینی آپ کو یقین ہے، بیاپور کے پاس سرحد پر خطرہ کم ہے۔"

"میں ساٹھ سال سے وہاں ہر تیرہ اگست والے دن جاتی ہوں اس دوران میں، میں نے وہاں بہت کم فوج یا بی ایس ایف کو دیکھا ہے۔ کبھی کبھی ان کے دستے گشت کرتے ہوئے وہاں سے گزرتے ہیں۔ میں کئی کئی گھنٹے وہاں رہتی ہوں اور مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آتا۔"

سارہ نے اس کی تائید کی۔ "یہی صورت حال پاکستان والی طرف بھی ہے، مجھے ساٹھ سالوں میں بہت کم رینجرس یا فوج کے لوگ نظر آئے۔"

منصور مطمئن نہیں تھا۔ "اس کے باوجود دن میں سرحد عبور کرنا بہت خطرناک ہوگا اگر اس دوران میں دونوں طرف کی فوج میں سے کوئی آ گیا تو وہ بلا وارننگ گولی چلا دیں گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، دن میں دریا عبور کرنا بہت رسکی کام ہوگا۔ مون سون کا موسم گزر گیا ہے لیکن اس وقت دریا میں پانی ہوگا۔ سرحد پار کرنے کا کام رات کو مناسب

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہے گا۔"

"تب تک ہم کہاں رہیں گے۔" منصور نے پوچھا۔

"کیونکہ بیاپور تو اس رفتار سے چار پانچ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

"وہاں ایک پرانا جاننے والا ہے، اس کا باپ کبھی ہماری حویلی میں نوکر تھا بعد میں اس نے زمین لے لی۔ اب بھی جاؤں تو بہت عزت سے پیش آتا ہے۔ جب میں سرحد کی طرف جاتی ہوں تو کچھ دیر اس کے گھر رکتی ہوں۔"

"اس وقت آپ اکیلی ہوتی ہیں، اب ہم ساتھ ہیں۔"

"تم فکر مت کرو میں بات کرلوں گی۔" سرینا نے اسے تسلی دی۔

وہ گیارہ بجے امرتسر سے نکلے تھے اور دو بجے ایک باغ کے ساتھ رک کر انہوں نے لنچ کیا۔ راستے میں کوئی اچھی چیز ملنا مشکوک لگ رہا تھا اس لیے وہ کھانا پیک کرا لائے تھے۔ باغ کے ساتھ ٹیوب ویل کا ٹھنڈا پانی بہہ رہا تھا انہوں نے وہاں منہ ہاتھ دھویا اور تازہ دم ہو کر آگے روانہ ہوئے۔ وہ پانچ بجے دھنی رام کے گھر پہنچ گئے جس کا باپ سنی رام لالہ کشن لال کا ملازم تھا۔ سرینا کو دیکھ کر وہ اس کے آگے بچھ گیا۔ مالکن...... مالکن کرتے اس کا منہ خشک ہو رہا تھا۔ وہ انہیں اندر لایا۔ اس کا چھوٹا سا کچا لیکن صاف ستھرا گھر تھا اس نے آنگن میں چارپائیوں پر نئی چادریں ڈلوا کر انہیں بٹھایا اور پھر لسی پیش کی۔ اس نے پوچھا نہیں لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ سرینا بے وقت کیسے آئی تھی۔ سرینا نے وضاحت کردی۔

"یہ جاننے والے ہیں، میں انہیں بیاپور دکھانے لائی تھی۔"

دھنی رام نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "ہم نوکر ہیں مالکن...... آج رات یہیں رکیں گے؟"

"نہیں، بیاپور دکھا دیا ہے اب واپس جا رہے ہیں کچھ دیر تمہارے پاس رک گئے۔"

"رات کا کھانا ادھر کھا کر جائیے گا۔" دھنی رام نے کہا اور اس کی بیوی فوراً کھانا بنانے میں لگ گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی نسبت کم عمر اور صحت مند عورت تھی۔ سرینا نے منع نہیں کیا اس لیے سارہ اور منصور بھی خاموش رہے ورنہ ان کا کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ دوپہر میں بھی انہوں نے بس پیٹ بھر لیا تھا۔ وہ منزل کے قریب آگئے تھے اور جلد از جلد پاکستان پہنچ جانا چاہتے تھے۔ سرینا بھانپ گئی تھی۔ دھنی رام کسی کام سے اٹھ کر گیا تو سرینا نے آہستہ سے کہا۔

"مجبوری ہے، رات تک کہیں رکنا ہے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ راج ہمارے پیچھے نہ آجائے۔" منصور نے خدشہ ظاہر کیا۔ "اب تک وہ جاگ گیا ہوگا۔"

"لیکن اسے کیا معلوم کہ میں تم لوگوں کو کہاں لے گئی ہوں۔"

"گرینی وہ ہیکر ہے اور ہیکرز بہت ذہین لوگ ہوتے ہیں۔" منصور نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں سورج غروب ہو جائے گا اور ابھی چاندنی رات بھی نہیں ہے۔ ہم ابھی نکلیں تو جب دریا کے کنارے پہنچیں گے تو رات ہو جائے گی۔"

"احتیاط بہتر ہے۔" سرینا نے اصرار کیا۔ "اور اب تو میں نے کھانے کے لیے کہہ دیا ہے۔"

دیہاتوں میں لوگ سر شام ہی کھا لیتے ہیں اس لیے سورج ڈوبنے تک کھانا بن گیا تھا۔ یہاں بجلی نہیں تھی، دھنی رام پیٹرومیکس جلا کر لے آیا۔ انہوں نے بے دلی سے کھایا۔ دھنی رام اصرار کرتا رہا کہ وہ اور کھائیں لیکن تینوں نے جلد ہاتھ کھینچ لیا۔ سرینا نے کہا۔ "دھنی رام، ہم نے دوپہر کا کھانا بھی دیر سے کھایا تھا اس لیے بھوک نہیں ہے تم برا مت منانا۔"

وہ ساڑھے سات بجے وہاں سے نکلے تو رات کی تاریکی پوری طرح چھا چکی تھی۔ سرینا نے جانے سے پہلے دھنی رام کو کچھ رقم دی تو وہ خوش ہو گیا تھا۔ منصور نے سڑک پر آکر پوچھا۔ "گرینی اب کس طرف جانا ہے؟"

سرینا رہنمائی کرنے لگی۔ سارہ کو ایک خیال آیا۔ "تو واپس کیسے جائے گی؟"

"چلی جاؤں گی...... یہیں آجاؤں گی...... دھنی رام کسی ڈرائیور کو لے آئے گا...... وہ مجھے واپس دہلی چھوڑ دے گا۔"

"اور راج......؟"

"وہ بچہ نہیں ہے اٹھنے کے بعد خود واپس چلا جائے گا۔"

"بعد میں ہنگامہ کرے گا۔"

سرینا کو غصہ آگیا۔ "اگر اسے اپنی بے عزتی کرانے کا شوق ہوا تو ضرور کرے گا ورنہ خاموش رہے گا۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ منصور نے ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں ورنہ ان کی روشنی دور سے نظر آتی۔ وہ کار کو دریا کے ممکن حد تک پاس لے گیا اور پھر ایک جگہ درختوں میں روک دی۔ سرینا یہاں سے بہ آسانی واپس جا سکتی تھی۔ منصور سامان نکالنے لگا۔ پہلے اس نے کشتی اور لائف جیکٹس نکالیں۔ ایک اس نے خود پہنی اور دوسری سارہ کو پہنا دی۔ اس کا طریقہ استعمال وہ سکھ دکاندار سے سیکھ چکے تھے۔ وہ دریا کے کنارے آئے۔ منصور نے گیس سلینڈر کی ڈوری کھینچی تو ایک منٹ سے بھی پہلے کشتی میں پوری ہوا بھر گئی۔ یہ مضبوط ربر

کی بنی کشتی تھی جس کا رنگ سیاہ تھا اس لیے رات میں اس کے دکھائی دینے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ منصور دریا کا پاٹ دیکھ کر پریشان ہوا تھا، یہ غیر متوقع طور پر نصف کلومیٹر چوڑا تھا اور بہاؤ بھی خاصا تیز لگ رہا تھا۔ کشتی کے ساتھ منسلک ہو جانے والے ہلکے فائبر سے بنے دو چپو بھی تھے۔ سرینا اور سارہ دونوں خوف زدہ بھی تھیں اور جذباتی بھی ہو رہی تھیں۔ جب منصور سوٹ کیس نکالنے گیا تو وہ دونوں لپٹ کر رو رہی تھیں۔

خوش قسمتی سے ابھی تک انہیں نہ تو بی ایس ایف کا کوئی دستہ ملا تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا بندہ بشر دکھائی دیا تھا۔ منصور کے خدشات کم ہوئے تھے۔ اب اسے امید تھی وہ دریا پار کر کے پاکستان جا سکیں گے۔ ایک بار وہ دریا پار کر جاتے تو دوسری طرف کے معاملات سنبھالے جا سکتے تھے، انہیں سارا خطرہ انڈیا والی طرف کا تھا۔ گاڑی سے دریا کا کنارا کوئی تین سو گز دور تھا، اسے دونوں سوٹ کیس باری باری لے جانے تھے۔ اس نے پہلا سوٹ کیس اٹھایا اور اسے لے کر کشتی تک پہنچا۔ کشتی ابھی ریت پر تھی۔ سوٹ کیس رکھ کر وہ واپس آیا اور ڈگی سے دوسرا سوٹ کیس نکال ہی رہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن تاریک آسمان اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ اس نے راج کی آواز سنی جس نے گالی دے کر ڈنڈا ایک طرف پھینک دیا۔ ڈنڈے سے منصور کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔

"تو کیا سمجھتا ہے بچ کر نکل جائے گا۔"

منصور خود پر قابو پاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ راج اس کے پاس ہی ٹہل رہا تھا اس نے بہ مشکل کہا۔ "تمہیں...... کیسے...... پتا چلا؟"

"ہوش میں آتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ دادی ماں نے میرے ساتھ کیا، کیا ہے اور وہ تم لوگوں کو لے کر کہاں گئی ہوگی کیونکہ تم دونوں واہگہ بارڈر نہیں پہنچے تھے۔"

"جہاں تم نے ہمیں گرفتار کرانے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔" منصور نے نفرت سے کہا۔

"ہاں، تم جان گئے تھے اور تم نے دادی ماں کو بھی ساتھ ملا لیا لیکن بچ نہیں سکے۔"

"تم خود آئے ہو۔" منصور نے وقت گزاری کے لیے بات جاری رکھی۔ وہ چاہتا تھا اس میں اتنی ہمت آجائے کہ وہ راج سے نمٹ سکے۔ وہ اس سے کمزور نہیں تھا۔ "پولیس یا بی ایس ایف کو اطلاع نہیں دی؟"

"نہیں، دادی ماں کے شامل ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ خود نمٹوں گا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے میں کس رفتار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ بھگوان کا شکر ہے وقت پر پہنچ گیا ورنہ تم نکل جاتے۔"

"اب تم کیا کرو گے؟"

"میں اسی طرح خاموشی سے تمہیں لے جاؤں گا جیسے دادی ماں خاموشی سے تمہیں یہاں لائی تھیں۔ وہ دونوں دریا کے کنارے تمہارا انتظار کریں گی اور تم کبھی واپس نہیں آؤ گے۔" راج نے کہتے ہوئے دوبارہ ڈنڈا اٹھا لیا۔ منصور سمجھ گیا وہ اسے بے ہوش کرنے والا ہے اور ایک بار وہ بے ہوش ہو گیا تو پھر اسے کسی بھارتی ایجنسی کے انٹروگیشن سیل میں ہی ہوش آئے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے اپنی تمام توانائی جمع کی اور جیسے ہی راج نے پاس آتے ہوئے ڈنڈا سر سے بلند کیا، منصور زخمی چیتے کی طرح اچھلا اور راج کو لیتے ہوئے زمین پر جا گرا۔ اسے ڈنڈا چلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ کھردری زمین پر وزن کے ساتھ گرنے سے اسے چوٹ لگی اور اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے منصور کو خود پر سے اچھالنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے ساتھ لپٹا رہا۔

منصور کو اندازہ تھا کہ ایک بار راج نے خود کو چھڑا لیا تو وہ اس پر حاوی آجائے گا۔ سر کی چوٹ سخت تھی اور اب بھی منصور کا سر چکرا رہا تھا۔ راج کی کوشش تھی کہ کسی طرح منصور کو جھٹک کر ڈنڈا اٹھا لے۔ اس کے پاس شاید کوئی اور ہتھیار نہیں تھا۔ راج عمر میں اس کے برابر تھا، جسم بھی تقریباً ایک جیسا تھا۔ اتفاق سے دونوں ہی تعلیم یافتہ، آئی ٹی اور ہیکنگ کے ماہر تھے لیکن اس وقت ایک دوسرے پر حاوی آنے کے لیے زمانہ قدیم کے وحشی انسانوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ راج بہتر پوزیشن میں تھا منصور اوپر تھا لیکن سر کی چوٹ کی وجہ سے وہ اسے قابو کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ بالآخر راج نے اسے اچھال کر پھینکا۔ منصور گرا تو اس کا سر تیزی سے چکرانے لگا، اس نے اپنی ہمت سے زیادہ کوشش کر لی تھی۔

راج لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ اس کشمکش میں اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور چوٹیں آئی تھیں۔ اسے ڈنڈے کی تلاش تھی۔ وہ زمین ٹٹول رہا تھا بالآخر اسے ڈنڈا مل گیا اور وہ اسے تولتا ہوا منصور کی طرف آیا۔ پاس آکر اس نے ڈنڈا بلند کیا، منصور نے مدافعت کے لیے ہاتھ اوپر کیے لیکن اس سے پہلے کہ راج اس پر وار کرتا، اس کے عقب سے ایک سایا نمودار ہوا۔ سائے کا ہاتھ اٹھا ہوا تھا۔ "بس راج!" سرینا کی آواز آئی۔ "اب تو نے حرکت کی تو میں گولی چلا دوں گی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

راج پہلے تو سرینا کی آواز سن کر ساکت رہ گیا پھر آہستگی سے اس کی طرف مڑا اور ناقابل یقین لہجے میں بولا۔ ''دادی ماں، تم مجھے گولی مار دو گی۔''

''ہاں، اب تو نے منصور پر ہاتھ اٹھایا تو میں یہی کروں گی۔''

''دادی ماں یہ بھارتی حکومت کا مجرم ہے۔''

''یہ سارہ کا پوتا ہے اور میں سارہ کو زبان دے چکی ہوں، یہ اس کے ساتھ واپس جائے گا۔''

''چاہے اس کے لیے تمہیں مجھ پر گولی چلانی پڑے؟''

''ہاں چاہے اس کے لیے مجھے تجھ پر گولی چلانی پڑے۔'' سرینا جذباتی لہجے میں بولی۔ ''بے شک میں بھی زندہ نہیں رہوں گی لیکن تجھے یہ سب نہیں کرنے دوں گی۔''

منصور پیچھے ہوا اور کھڑا ہو گیا اسی لمحے ہانپتی ہوئی سارہ آکر اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے ٹٹول رہی تھی۔ ''تو ٹھیک ہے نا میرے بچے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' منصور نے آہستہ سے کہا اور سارہ کو تھام لیا۔

راج نے نفرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''دادی ماں یہ ہمارے دشمن ہیں، ہمارے خاندان کی بربادی کے ذمے دار ہیں۔''

''تجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''بڑے دادو کے قاتل اور تمہاری عزت کے لٹیرے......''

''تجھے کچھ نہیں معلوم۔'' اس بار سرینا چیخ کر بولی۔ ''باپو جی کے قاتل خان چاچا نہیں...... تیرا اپنا دادا اور میرا بھائی مہیش تھا۔ جب باپو جی نے اسے خان چاچا کی حویلی پر حملہ کرنے سے روکنے کی کوشش کی تو اس نے انہیں مار دیا۔ یہ بات مجھے بعد میں اس ملازم نے خود بتائی جس نے اپنی آنکھوں سے مہیش کو باپو جی پر خنجر سے وار کرتے دیکھا تھا۔ مجھے اٹھا لے جانے والے مہیش کے دوست تھے۔ وہ مجھے جانتے تھے اس کے باوجود انہوں نے مجھے نہیں چھوڑا۔'' سرینا کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ''بعد میں مہیش کو پتا چلا تو اس نے انہیں چن چن کر مارا اور پھر اپنی جان بچانے کے لیے زمین اور حویلی بیچ کر بیاپور سے دہلی چلا گیا۔ اسے مارنے والے وہی لوگ تھے۔''

سارہ تڑپ کر سرینا کی طرف بڑھی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ ''تو اتنی بڑی بات چھپائے بیٹھی تھی مجھے بھی نہیں بتایا۔''

سرینا رو رہی تھی اور راج شاک کی کیفیت میں کھڑا تھا۔ منصور کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ اچانک سرینا چپ ہو گئی۔ ''سارہ منصور تم لوگوں کے پاس وقت کم ہے، کسی وقت بھی یہاں کوئی آ سکتا ہے۔ تم جلد از جلد نکل جاؤ۔''

''دادی ماں، مجھے معاف کر دو۔'' راج نے تھکے لہجے میں کہا۔

''راج میں تجھے معاف کر دوں گی لیکن جب سارہ اور منصور پاکستان پہنچ جائیں گے۔'' سرینا نے دوبارہ اس پر پستول تان لیا تھا۔ منصور نے سوٹ کیس اٹھایا اور وہ ساحل کی طرف چل پڑے۔ دریا کے کنارے اس نے سوٹ کیس کشتی میں ڈالا اور پھر دریا کے ٹھنڈے پانی سے منہ اور سر دھویا۔ اس سے طبیعت میں بہت فرق پڑا تھا۔ تھرماس میں بچی ٹھنڈی ہو جانے والی کافی کے چند گھونٹ پی کر اس کے حواس مکمل بحال ہو گئے۔ ڈنڈے کی ضرب سے اس کا سر نہیں پھٹا تھا لیکن گومڑ بن گیا تھا۔ کشتی میں سوار ہونے سے پہلے سارہ ایک بار پھر سرینا کے گلے لگی، دونوں سہیلیوں نے آخری بار آنسوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ منصور نے سرینا کے سامنے سر جھکایا تو اس نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

''جاؤ بیٹا، بھگوان خیریت سے لے جائے۔''

منصور نے راج کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ امید ہے تم اب یہ بات یاد رکھو گے۔''

راج نے اس سے ہاتھ ملایا لیکن کچھ کہا نہیں۔ منصور نے پہلے سارہ کو سہارا دے کر کشتی میں بٹھایا پھر اسے لہروں تک دھکیلتا ہوا لایا۔ اسے کشتی چلانے کا تجربہ نہیں تھا لیکن اسے امید تھی کہ وہ کشتی چلا لے گا۔ گہرے پانی میں آتے ہی وہ خود بھی کشتی میں سوار ہو گیا اور چپو سنبھال کر اسے پاکستانی کنارے کی طرف لے جانے لگا۔ بہاؤ کشتی کو آگے کھینچ رہا تھا اس لیے منصور کو زور لگانا پڑ رہا تھا۔ سارہ مڑ کر کنارے کھڑی سرینا کو دیکھ رہی تھی، تاریکی میں اس کا ہیولا نمایاں تھا لیکن جیسے جیسے وہ دور جاتے رہے ہیولا غائب ہوتا چلا گیا۔ سارہ کو پتا نہیں چلا کہ کب دوسرا کنارا آ گیا تھا۔ اسے منصور نے پکارا۔ ''دادی جان! ہم پاکستان پہنچ گئے ہیں۔''

سارہ نے چونک کر سامنے دیکھا اور سکون کا سانس لیا۔ ''شکر ہے، ہم پاکستان پہنچ گئے۔''

پیچھے رہ جانے والی صداؤں کی بازگشت اگرچہ تمام عمر تعاقب کرتی ہیں مگر اس آخری ملاقات کی یاد شاید آخری لمحے تک آنکھوں میں بسی رہے گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM